کالے گھاٹ والی
ایم اے راحت

عرضِ ناشر

''کالے گھاٹ والی'' ایک دہشت ناک داستان ہے۔ پراسرار اور خوف ناک کہانیوں نے ہمیشہ انسانی ذہن پر ایک پسندیدہ تاثر قائم رکھا ہے۔ یہ تحریریں بہت کم لکھی گئی ہیں۔ دنیا بھر میں خوف ناک کہانیاں لکھنے والے انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ ان کے موضوعات بھی محدود ہیں۔

پاکستان میں اس موضوع پر لکھنے والوں میں ایم۔اے راحت ایک ایسا نام ہے، جنہوں نے لاتعداد پراسرار داستانیں لکھی ہیں اور ہمیشہ الگ موضوع کا احاطہ کیا ہے۔ ان کے لکھے ناولوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ نہ صرف پاکستان بلکہ دنیا بھر میں جہاں جہاں اُردو پڑھنے والے موجود ہیں، ان کے ناول بے پناہ مقبول ہیں۔ لیجیے ''کالے گھاٹ والی'' پڑھیے اور اپنے دل کی دھڑکنوں کو قابو میں رکھیے۔

آپ کا مخلص
محمد علی قریشی

دونوں بسیں میوزیم کے سامنے رک گئیں۔ ہر طرف ایک پُراسرار سناٹا چھایا ہوا تھا۔ نگاہوں کی آخری حد تک خوب صورت مناظر بکھرے ہوئے تھے۔ سر امتیاز نے تمام اسٹوڈنٹس کا جائزہ لیا اور پھر انہیں میوزیم میں داخل ہونے کا اشارہ کیا۔ دوسرے ٹیچرز معہ خواتین ٹیچرز، لڑکوں اور لڑکیوں کو منظم کر کے میوزیم کی عمارت میں لے چلے۔

مجھے نورین کے اس ٹرپ پر نہ آنے کا سخت افسوس تھا۔ اُسے اُس کے پاپا نے اجازت نہیں دی تھی۔ مجھے نورین کی آنکھوں میں ڈبڈباتے آنسو بری طرح یاد آرہے تھے۔ لڑکے لڑکیوں نے گروپ بنا لیے اور چاروں طرف بکھر گئے۔ دس اسٹوڈنٹس کا ایک گروپ مس خیا کے ساتھ چل پڑا۔ ان میں لڑکے لڑکیاں دونوں تھے۔ ایک گائیڈ ہمیں وہاں موجود نوادرات کے بارے میں بتانے لگا۔ اس وقت ہم ٹیکسلا کے سب سے اہم دور کی اشیاء کا جائزہ لے رہے تھے۔ یہ دور سکندرِ اعظم کا تھا۔

ایک لڑکی نے مجھے چھیڑتے ہوئے کہا۔

''جناب سکندرِ اعظم صاحب! اپنے ماضی کا نظارہ کر لیجیے۔'' یہ بات اُس نے میرے نام کی مناسبت سے کی تھی۔ کیونکہ میرا نام بھی سکندر تھا۔

پتہ نہیں یہ اُس لڑکی کے جملے کا اثر تھا، یا کچھ اور کیونکہ فوراً اسی لمحے ایک عجیب سا احساس ہوا تھا۔ یوں لگا تھا، جیسے ان نظر آنے والی چیزوں سے میرا کوئی واسطہ ہو۔ میں شیشے کے شوکیس میں رکھی ایک تلوار پر جھک گیا۔ مجھے یوں لگا، جیسے یہ تلوار کبھی میرے ہاتھوں میں رہ چکی ہو۔ اسے دیکھنے میں اتنا محو ہوا کہ دوسرے لڑکے لڑکیاں باہر نکل گئے۔ پھر جب میرا انہماک ٹوٹا تو میں نے چونک کر چاروں طرف دیکھا۔ ہال نما کمرہ بالکل خالی تھا۔ لڑکے لڑکیاں وہاں سے جا چکے تھے۔ لیکن مجھے کوئی احساس نہیں ہوا۔ میں جانتا تھا کہ ابھی تو ہم میوزیم میں داخل ہوئے ہیں، وہ کہیں نہیں جائیں گے۔ چنانچہ میں پورے ہال کا جائزہ لینے لگا۔

یہ ہال یونان کے سکندرِ اعظم سے ہی منسوب تھا، اور اس میں جو کچھ موجود تھا۔۔ وہ سکندرِ اعظم کے دور کا ہی تھا، جب اُس نے اس علاقے پر حملہ کیا تھا۔

میں گھوم پھر کر دوسری چیزوں کا جائزہ لینے لگا۔ سکندر کے حریف راجہ پورس کی پوشاک، اُ
کا خود اور اس طرح کی تمام چیزیں موجود تھیں۔ انہیں دیکھتا ہوا آگے بڑھنے لگا تو کافی فاصلے پ
کر مجھے ایک خوب صورت چوبی دروازہ نظر آیا۔ بس ایک شوق دل میں پیدا ہو چکا تھا کہ زیا
سے زیادہ سکندرِ اعظم کے بارے میں معلومات حاصل کروں۔

دروازے کو کھولنے کی کوشش کی تو وہ آسانی سے کھل گیا۔ میں نے اس کے دوسری طرف
جائزہ لیا۔ کوئی سات یا آٹھ سیڑھیاں تھیں، جو انتہائی صاف شفاف نظر آ رہی تھیں، اس کے ب
ایک چکنی سی راہداری۔ بے اختیار میرے قدم اس جانب اُٹھ گئے اور میں اس راہداری میں آ
بڑھنے لگا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے کوئی نادیدہ قوت مجھے آگے دھکیل رہی ہو۔ حالانکہ چند
قدم چلنے کے بعد راہداری میں چھائے ہوئے اندھیرے نے مجھے تھوڑے سے خوف کا شکار کر
تھا۔ مجھے اس طرح اس سنسان جگہ پر آگے نہیں بڑھنا چاہیے۔ میں نے پلٹنے کی کوشش کی تو مجھ
یوں لگا جیسے میرے پلٹنے کی قوت ختم ہو گئی ہو اور میرے قدم آگے ہی بڑھتے جا رہے ہوں۔ ایک
انجانا خوف، ایک عجیب سی دہشت میرے رگ و پے میں سرایت کر گئی۔ لیکن میرے قدموں ۔
میرے احکامات کی تعمیل کرنا چھوڑ دی تھی اور میں آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔

یہ ایک تاریک سرنگ نما راستہ آخر کار ایک دروازے پر ختم ہوا اور جیسے ہی میں دروازے
پہنچا، دروازے کے دونوں پٹ ایک تیز چرچراہٹ کے ساتھ کھل گئے۔ دوسری طرف ایک بہت
ہی عظیم الشان ہال جگمگا رہا تھا۔ اُس ہال میں مجھے بے شمار لوگوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں
جو ایک خاص قسم کی پوشاک میں ملبوس تھے۔ اُن کے جسموں پر چمڑے کے بنے ہوئے لباس تھے
اور وہ خاص قسم کے یونانی سپاہی معلوم ہوتے تھے۔

فوراً ہی کچھ چوبداروں نے آواز لگائی۔

"سکندرِ اعظم تشریف لا چکے ہیں۔" سکندرِ اعظم......سکندرِ اعظم......

میں نے چونک کر چاروں طرف دیکھا کہ یہ سکندرِ اعظم کہاں سے آ گئے؟ لیکن صرف میں ہی قدم
آگے بڑھا رہا تھا، اور میرے پیچھے کوئی نہیں تھا۔ میرے قدم آگے بڑھتے رہے۔ سامنے ہی ایک
زرنگار تخت لگا ہوا تھا۔ بے حد حسین، سونے چاندی کے کام سے آراستہ۔ اس میں زر و جواہر
جڑے ہوئے تھے۔ میرے قدم مجھے اسی طرف لے جا رہے تھے۔ نیچے انتہائی حسین قالین بچھا ہوا
تھا جس پر قدموں کی آواز بھی نہیں سنائی دیتی تھی۔ میرے ہر قدم کے ساتھ سکندرِ اعظم کی شان
میں قصیدہ خوانی کی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ میں تخت تک پہنچ گیا۔ میرے پورے بدن پر
بوکھلاہٹ سوار تھی۔ میں وہ نہیں تھا، جو لوگ سمجھ رہے تھے۔ لیکن میرے اعصاب، میرے جسمانی
اعضاء میرا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔

میں تخت پر بیٹھ گیا۔ تبھی چار لمبے چوڑے قد و قامت کے لوگ میرے اطراف میں آ
کھڑے ہوئے۔

"سکندرِ اعظم کو تختِ شاہی پر خوش آمدید کہتے ہیں۔"

میں نے کہنا چاہا کہ بھائی میں سکندرِ اعظم نہیں ہوں، خالی سکندر ہوں۔ لیکن میرے منہ سے
آواز نہیں نکلی۔ پھر اچانک ہی ایک طرف سے کچھ لوگ اندر داخل ہوئے۔ یہ خاص قسم کے سپاہی
تھے، جو ایک انتہائی بدشکل عورت کو پکڑے ہوئے لا رہے تھے۔ یہ بھاری بدن کی ایک بھیانک
صورت عورت تھی جس کا رنگ گہرا کالا تھا۔ اُس کے جسم پر نظر آنے والا لباس رنگین چیتھڑوں سے
بنا ہوا تھا۔ وہ شاید یہاں آ نہیں رہی تھی، بلکہ وہ لوگ اُسے گھسیٹ کر لا رہے تھے۔ میں حیرت
سے اُسے دیکھنے لگا۔ عورت کو میرے سامنے کھڑا کر دیا گیا لیکن سپاہی اُسے پکڑے ہوئے تھے۔
عورت گڑگڑا گڑگڑا کر کہہ رہی تھی۔

"مجھے شما کر دیں مہاراج! شما کر دیں۔ معاف کر دیں مجھے کرم گردھاری۔ میں چور نہیں
ہوں۔ میں......میں تو......میں تو بس آپ کے درشن کے لیے آئی تھی۔ میں تو بس من کی اگن
بجھانے آئی تھی۔ مہاراج! مجھے شما کر دیں......ان لوگوں کو دھوکا ہوا ہے۔ جب میں آپ کے
کمرے میں داخل ہوئی تو......تو......"

"بکواس بند کر کالی عورت!......تُو سکندرِ اعظم کا تاج چرانے آئی تھی۔"

"نہیں مہاراج! نہیں......میں سچ بول رہی ہوں۔ وہ تو میری ٹھوکر سے گر گیا تھا۔ میں
نے اُسے بڑے مان سے اُٹھا کر اس کی جگہ رکھا تھا کہ ان لوگوں نے اس کے گرنے کی آواز سن
لی۔ یہ سمجھے کہ میں چور ہوں اور تاج چرانے آئی ہوں۔ نہیں مہاراج! ہم تو آپ کے درشن کے
لیے آئے تھے......بس ایک دفعہ ہم آپ کا مُکھ چومنا چاہتے تھے مہاراج!
یہ ہماری آرزو تھی۔"

"یہ کون ہے؟" میرے منہ سے ایک اجنبی آواز نکلی۔

"یہ گنتھ پوری کی جادوگرنی ہے......گنتھ پوری کی جادوگرنی ہے یہ۔ اس کا نام ترشولی
ہے۔ مہاراج! یہ آپ کا تاج چرا کر آپ کے خلاف جادو کرنا چاہتی تھی اور اس کے لیے اسے راجہ
پورس نے تیار کیا تھا۔ گنتھ پوری کی سب سے بدنام عورت ہے یہ۔ اسے بہت سے جادو آتے
ہیں۔"

"نہ مہاراج! نہ......آپ ہم سے جو چاہیں سوگند لے لیں۔ ہم تو آپ کا مُکھ چومنا چاہتے
تھے۔ بس ایک بار......یہی ہمارے من کی لگن اور اگن تھی۔ ہمیں شما کر دیں مہاراج!"

"یہ چور ہے سکندرِ اعظم! اور اسے اس کی چوری کی کوشش کی سزا دینی چاہیے۔"

"وہ سزا کیا ہوگی؟"

"اس کا ایک ہاتھ کاٹ دیا جائے۔" کہیں سے آواز اُبھری۔

"ٹھیک ہے۔ اس کا ایک ہاتھ کاٹ دو۔"

"شما کر دیں مہاراج!........شما کر دیں ہمیں........شما کر دیں........ہمارا ہاتھ نہ کاٹیں۔"

لیکن میں حکم دے چکا تھا۔ فوراً ہی دو جلاد قسم کے آدمی آ گئے۔

"دیکھیں مہاراج! دیکھیں ہمارا ہاتھ نہ کاٹیں........ دیکھیں، ہمیں شما کر دیں۔" بدشکل عورت مسلسل چلا رہی تھی۔

"کالی بھوتنی! تیرا ہاتھ ضرور کاٹا جائے گا۔" میں نے پھر غرائی ہوئی آواز میں کہا۔ آنے والے جلاد جو اپنے ہاتھوں میں پیتل کا ایک بڑا سا طشت اُٹھائے ہوئے تھے اور ان میں سے ایک کے ہاتھ میں ایک چمکدار پھرسا تھا، آگے بڑھے، عورت کو دوسرے لوگوں نے پکڑ لیا تھا۔ وہ چیختی چلاتی رہی لیکن پھرسے کے ایک ہی وار نے اُس کا ہاتھ اُس کے شانے کے پاس سے جدا کر دیا اور عورت تڑپنے لگی۔ خون کی دھاریں بہنے لگیں اور میری آنکھیں خود بخود بند ہو گئیں۔ مجھے یہ بھیانک منظر دہشت زدہ کر رہا تھا۔ عورت کے چیخنے کی آوازیں آتی رہیں، اور پھر یوں لگا، جیسے وہ لوگ اُسے لے کر چلے گئے ہوں۔

"جے بدھکنا، جے بدھکنا، جے بدھکنا۔" تین چار آوازیں آئیں اور اس کے بعد ایک بار پھر جیسے روشنیاں بند ہو گئی ہوں۔ میرے قدم خود بخود آگے بڑھے اور میں تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا نجانے کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ اور اس کے بعد جب میں نے آنکھیں کھولیں تو میں اسی کمرے میں کھڑا ہوا تھا اور سکندرِ اعظم کی وہ تلوار میری نگاہوں کے سامنے تھی، جس کے ایک سرے پر خون لگا ہوا تھا۔

میرے ساتھی چونکہ پہلے ہی جا چکے تھے اس لیے میں دروازے کی جانب بھاگا اور باہر نکل آیا۔ باہر لڑکے لڑکیاں اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے، میری طرف کسی نے توجہ نہیں دی اور آخر کار میں اپنے گروپ میں جا کر شامل ہو گیا۔ لیکن جو لمحات مجھ پر بیت گئے تھے وہ نہ تو خواب تھے، نہ کوئی کہانی، نہ میرا وہم۔ میں نے پورے ہوش و حواس کے عالم میں وہ لمحات وہاں گزارے تھے اور اپنے آپ کو سکندرِ اعظم کی جگہ تختِ زریں پر پایا تھا۔ لیکن بعض اوقات بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں، جن کا کوئی تجزیہ نہیں کیا جا سکتا اور اس وقت میری بھی یہی کیفیت تھی۔

پورے ٹور کے دوران مجھ پر وہی سحر جیسی کیفیت طاری رہی۔ میں تجزیہ نہیں کر پایا تھا کہ یہ سب کیا تھا۔ اس کے سوا اور کچھ نہیں سوچا جا سکتا تھا کہ میرے بارے میں جو لفظ کہہ دیئے گئے تھے۔ انہوں نے میرے ذہن پر یہ اثر کیا تھا لیکن یہ اثر مختصر نہیں رہا۔ میں گھر واپس آ گیا اور وہ

رات مجھ پر بہت بھاری پڑی۔ مجھے شدید بخار آ گیا تھا اور سر اور سینے میں ناقابلِ برداشت درد کی ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔ مجھے یوں لگ رہا تھا، جیسے مجھ پر ایک بھاری وزن آ پڑا ہو۔

میرے والد ایک سرکاری محکمے میں ہیڈ کلرک تھے۔ اسلام آباد میں ایک خاص علاقے میں ہمارا چھوٹا سا گھر تھا۔ یہیں پر ہم نے خاصا وقت گزارا تھا۔ میرے بڑے بھائی انٹر کر رہے تھے اور مجھ سے پانچ سال بڑے تھے۔ ایک بہن تھی جس کا نام رخسانہ تھا۔ وہ مجھ سے پانچ سال چھوٹی تھی۔ ہم ایک پُرسکون زندگی گزار رہے تھے۔ تعلیمی مشاغل بھی ہمارے یکساں تھے۔ آج تک کا ہمارا ریکارڈ بہت ہی اعلیٰ رہا تھا۔ اس دوران اور بھی بہت سارے لوگ تھے لیکن ہمارے پڑوس میں نعیمی صاحب رہا کرتے تھے، جن کی بیٹی نورین سے میری بڑی گہری دوستی تھی۔ نورین بھی اپنے دوستوں میں سب سے زیادہ مجھے ہی عزیز رکھتی تھی۔ میرے اور اُس کے درمیان خاصا مقابلہ ہوتا چلا آیا تھا اور ہم لوگ کوشش کرتے تھے کہ تعلیمی ریکارڈ میں ایک دوسرے سے آگے رہیں۔ نورین اکثر ہمارے گھر بھی آ جاتی تھی۔ اُس کے والد ایک بہت بڑے افسرِ اعلیٰ تھے لیکن بڑے اچھے انسان تھے۔ ہمیشہ خوش مزاج رہتے تھے۔ بے تکلفی سے ہمارے گھر آ جایا کرتے تھے اور بہت ہی اچھا رویہ تھا اُن کا ہمارے ساتھ۔ ابو بھی اُن کی بہت عزت کرتے تھے اور ویسے وہ ابو سے بہت ہی بڑی حیثیت کے افسرِ اعلیٰ تھے، اس لحاظ سے بھی ابو اُن سے بہت متاثر ہوتے تھے اور اُن کے اخلاق کی اکثر تعریف کرتے رہتے تھے۔

بہرحال اس ٹور میں بھی نورین کو ہمارے ساتھ جانا تھا لیکن نعیمی صاحب نے اجازت نہیں دی تھی۔ میرے ساتھ یہ واقعہ پیش آ گیا تھا۔ بخار تو خیر مجھے تھا ہی اور لازمی بات تھی کہ وہ اس خوف کی وجہ تھی، جو میرے ساتھ واقعات میوزیم میں پیش آئے تھے۔ ترشولی کا کٹا ہوا بازو مجھے رات بھر خواب میں نظر آتا رہا۔ لیکن بات یہیں تک نہ رہی، اس کے بعد کے حالات مزید سنگین ہوتے چلے گئے۔ میں جیسے ہی کبھی اندھیرے میں جاتا یا شام کی تاریکی پھیلنے لگتی اور میں تنہا ہوتا تو مجھے اپنے اردگرد سائے سے چلتے پھرتے نظر آتے اور ایک آواز سنائی دیتی۔

"شما کر دیں مہاراج! معاف کر دیں کرم گردھاری! تاج تو ہماری ٹھوکر سے گر پڑا تھا۔ ہم تو آپ کے درشن کے لیے آئے تھے۔ بس ایک دفعہ آپ کا مکھ چومنے کی منوکامنا ہمارے من میں تھی۔"

پھر دوسری آواز۔ "یہ گلکھ پوری کی جادوگرنی ہے........ بدھکنا........ گلکھ پوری کی جادوگرنی......" اور خوف سے میرا سینہ پھٹنے لگتا۔ تاریکی پھیلتے ہی مجھ پر ایک عجیب سا خوف طاری ہو جاتا۔ بجلی کی تیز روشنی بھی اس خوف کو دور کرنے میں ناکام ثابت ہوتی۔ اب یہ ہو رہا تھا کہ میں اپنے طور پر تاریکی سے بچنے اور ہر ممکن دور رہنے کی کوشش کرتا تھا پھر بھی کبھی نہ کبھی، کسی نہ کسی

تاریک گوشے پر نظر پڑ ہی جاتی اور تب اس تاریکی میں مجھے ترشولی نظر آتی۔ انتہائی خوفناک اور صورت عورت، جو منہ سے کچھ نہ بولتی لیکن میرے کانوں میں اُس کی کرب ناک چیخیں گونجتیں۔

"شما کردیں ہمیں......شما کردیں کرم گردھاری......شما کردیں......"

بہر حال یہ میرے وجود میں روگ بن گیا تھا۔ ترشولی کبھی کسی اندھیرے لمحے سے نہیں چوکتی تھی۔ جیسے ہی میں کبھی اندھیروں میں گھرتا وہ میرے قرب و جوار میں آ کھڑی ہوتی اور اُس کی گڑگڑاہٹ مجھے خوف زدہ کر دیتی...... البتہ دن میں وہ کبھی نظر نہیں آتی تھی لیکن مغرب کی اذان سے پندرہ بیس منٹ قبل مجھے ایسی تیز سرسراہٹ سی محسوس ہونے لگتی، جیسے میرے اطراف میں بہت سے لوگ موجود ہیں۔ مجھے دربار میں آوازیں آتیں۔

"مہابلی مہاراج......سکندر اعظم آ رہے ہیں۔"

مجھے یوں لگتا، جیسے میرے آس پاس پرندے منڈلا رہے ہوں۔ بہر حال یہ سلسلہ میری زندگی سے چمٹ گیا تھا۔ میں نے ابھی تک کسی کو اس بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا لیکن اب میں اکثر بیمار ہو جاتا تھا اور مجھے اپنی اس بیماری کی وجہ معلوم تھی۔ وہی خوف، اندھیرے کا خوف...... جیسے ہی اندھیرا ہوتا میں بچنے کی کوشش کرتا تھا۔ کبھی کبھی بجلی بھی چلی جاتی تھی لیکن جیسے ہی بجلی جاتی مجھ پر قیامت ٹوٹ پڑتی۔ تاریکی میں وہی بھیانک وجود میرے سامنے آ کھڑا ہوتا۔ اُس کی چمکدار بڑی بڑی سفید آنکھیں مجھ پر اس طرح مرکوز ہو جاتیں، جیسے کوئی بلی اپنے شکار پر نگاہیں گاڑ کر بیٹھ جاتی ہے کہ جوں ہی وہ حرکت کرے، اچھل کر اسے اپنے پنجوں میں دبوچ لے۔ موم بتیاں اور گیس کی لائٹوں کی روشنیاں اس منحوس صورت کو معدوم کرنے میں ناکام رہتیں۔ آنکھیں بند کرنے سے بھی کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ وہ اور زیادہ واضح نظر آنے لگتی۔

بہر حال یہ وقت مجھ پر گزر رہا تھا اور میرے ماں باپ میری اس بیماری سے پریشان تھے کہ اچانک مجھے کیا ہو گیا ہے۔ اکثر وہ اس موضوع پر گفتگو بھی کرتے رہتے تھے اور ایک طرح سے انہوں نے صحیح پوائنٹ پکڑ لیا تھا۔ ایک دن ابا نے مجھ سے کہا۔

"ایک بات بتاؤ سکندر! تمہاری اندر کی کیفیت کیسی رہتی ہے؟"

میں اس قدر چالاک تو نہیں تھا کہ اپنے آپ کو چھپانے کی کوشش کرتا، میں نے اُن سے کہا۔

"ابو! مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔"

"کیسا ڈر؟"

"بس میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ میں کیا کروں۔ جیسے ہی اندھیرا ہوتا ہے، میرے بدن میں سرد سرد لہریں دوڑنے لگتی ہیں۔ مجھے یوں لگتا ہے، جیسے میرے آس پاس کچھ لوگ موجود ہوں۔ ابو! بس یوں سمجھ لیجیے کہ میں بہت خوف زدہ ہوں۔ مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔"

"کیا یہ ڈر تمہیں اس وقت سے لگتا ہے، جس تم ٹور پر گئے تھے؟ ٹیکسلا میں کوئی ایسا واقعہ پیش آیا تھا، جو تمہارے لیے پریشان کن ہو؟"

"میں آپ کو کیا بتاؤں ابو! میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔" میں نے کہا۔ اماں نے پریشان لہجے میں کہا۔

"سنیے جی! اس کا مرض ڈاکٹروں کے بس کا نہیں ہے۔ اللہ میرے بچے کو ہر مشکل سے بچائے۔ یقیناً اس پر کوئی سایہ ہو گیا ہے۔"

ابو پڑھے لکھے آدمی تھے، ایسی باتوں پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ لیکن بس صورت حال ہی ایسی تھی۔ میری جو کیفیت تھی وہ میرے ماں باپ سے برداشت نہیں ہوتی تھی۔ بہر حال اس کے بعد میرے علاج کے لیے جتن ہونے لگے۔ اماں مجھے بہت سے مزارات پر لے گئیں۔ عاملوں اور کاملوں کی خدمات حاصل کیں، تعویذوں اور گنڈوں سے علاج ہونے لگا۔ صبح و شام دم کیے ہوئے فیتے جلانے لگے۔ عامل گھر آئے، انہوں نے گھر کو مختلف طریقوں سے جادوئی اثرات سے پاک کرنے کے لیے جتن کیے، حاضرات کرائیں۔ لیکن ترشولی نے میرا پیچھا نہیں چھوڑا۔ دوستوں، عزیزوں اور سیانوں سے مشورے ہونے لگے اور کسی نے میرے نفسیاتی علاج کا بھی مشورہ دیا۔ چنانچہ اس کی تیاریاں ہونے لگیں۔

میرے حالات بگڑتے ہی چلے گئے۔ پہلے تو مجھے وہ بدصورت عورت کم نظر آتی تھی لیکن اب اکثر میں محسوس کرنے لگا کہ دن کی روشنی میں بھی وہ میرے ساتھ ہی رہتی ہے۔ جب میں اِدھر اُدھر چلتا پھرتا مجھے اپنے قدموں کے ساتھ ساتھ دوسرے قدموں کی دھمک بھی سنائی دیتی اور مجھے اندازہ ہو جاتا کہ یہ وہی بدشکل اور خوفناک بلا ہے، جو ٹیکسلا کے میوزیم سے میرے پیچھے لگ گئی ہے۔

آخر کار میرا نفسیاتی تجزیہ کیا گیا۔ مجھے اس اُوٹ پٹانگ شخص کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا جس نے مجھ سے نہ جانے کیا کیا سوالات کیے۔ لیکن اس میں بھی ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ اس نے مجھ سے سوال کیا۔

"کیا تمہیں کسی سے محبت ہے؟"

"ہاں۔" میں نے جواب دیا۔

"کس سے؟......کون ہے وہ؟"

"امی، ابو، بھائی، میری بہن رخشانہ۔"

"اور......اور کون؟" اُس اُوٹ پٹانگ شخص نے پوچھا۔

"اور......بس، میرے اسکول کے دوست۔"

''ان میں کوئی خاص؟ جسے تم سب سے زیادہ پیار کرتے ہو؟''

''ہاں، نورین۔ میری سب سے اچھی دوست۔''

''ٹھیک.....اگر نورین سے تم محبت کرتے ہو تو کیا نورین بھی تم سے محبت کرتی ہے؟''

''ہاں........ وہ بھی مجھے چاہتی ہے۔ ہم دونوں بہت اچھے دوست ہیں۔'' میں نے معصومیت سے جواب دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت کسی اور چاہت کا تصور بھی میرے ذہن میں نہیں تھا۔ تیرہ سال کی عمر عشق و محبت کی عمر کم ہی ہوتی ہے۔ بس نورین میری بہت اچھی دوست بہت اچھی ساتھی تھی۔

''تم زیادہ تر نورین کا تصور ذہن میں رکھا کرو۔ جب بھی تمہیں ڈر لگے تم اُسے اپنے ذہن میں لے آؤ۔''

بہرحال یہ سوال جواب ختم ہو گئے۔ میں گھر واپس آ گیا۔ یہ ساری چیزیں میرے لیے دلچسپ بھی تھیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نورین مجھے سب سے زیادہ اچھی لگتی تھی۔ جب سے ڈاکٹر یا جو کوئی بھی وہ تھا، نے یہ سوال کیا تھا اور میں نے نورین کا نام لیا، اُس وقت سے درحقیقت نورین مجھے اور زیادہ اچھی لگنے لگی تھی۔

اُس شام بھی ایسا ہی ہوا۔ مغرب کا وقت تھا۔ اور میرے لیے یہی وقت سب سے زیادہ خوف کا ہوتا تھا۔ کیونکہ اس وقت ترشولی اپنی مکروہ شکل لیے بڑے بڑے سفید دانت نکالے مسکراتی ہوئی میرے سامنے آ کھڑی ہوتی تھی۔ آج جب وہ میرے سامنے آئی تو میں نے فوراً نورین کا تصور اپنی آنکھوں میں بسا لیا۔ میری آنکھوں میں ٹھنڈک سی اُترنے لگی۔ جسم میں مسرت کی لہریں دوڑنے لگیں۔

نورین ایک خوب صورت لباس میں ملبوس مسکراتی ہوئی میرے قریب آ گئی۔ لیکن میں نے ترشولی کو خوف ناک انداز میں کھڑے ہوئے دیکھا۔ پہلے وہ مسکراتی ہوئی ہی نظر آئی تھی اور اس کے منہ سے رال سی ٹپک رہی تھی لیکن اس وقت اُس کا چہرہ غضب ناک ہو گیا۔ وہ غصے سے دانت پیستی ہوئی آگے بڑھی اور اُس نے میرے سامنے کھڑی نورین کو اتنی بے دردی اور قوت سے دھکا دیا کہ نورین کافی دُور جا کر گری اور اُس کے ماتھے سے خون نکل آیا۔

پھر اچانک ہی نورین چھوٹی ہونے لگی اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک نقطے میں تبدیل ہو گئی۔ اب اُس کا وجود نہیں تھا۔ لیکن وہ کم بخت بدصورت اور بھیانک عورت کھڑی رہ گئی۔ وہ میری طرف دیکھ کر پھر مسکرا دی اور پھر ایک ایسی بھوکی عورت کی طرح اپنے موٹے موٹے ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگی، جیسے چند ہی لمحوں میں مجھے چٹ کر جائے گی۔ میرے حلق سے ایک دلخراش چیخ نکلی اور میں دہشت سے کمرے سے نکل کر بھاگ گیا۔

گھر والے میری دہشت بھری چیخ سن کر ہی میرے کمرے کی جانب دوڑ پڑے تھے۔ بمشکل تمام میری سانس قابو میں آئی۔ مجھے پانی وغیرہ پلایا گیا۔ ماں باپ کے چہروں سے پریشانی کا احساس ہوتا تھا اور مجھے اس بات کا افسوس تھا۔ لیکن میں کیا کرتا۔ میں اُن کی یہ پریشانی دور نہیں کر سکتا تھا۔

دوسرے دن میں اسکول گیا لیکن نورین کو دیکھتے ہی میرے دل کو ایک دھکا سا لگا۔ نورین کی پیشانی پر عین اُس جگہ جہاں کل مجھے خون نکلتا ہوا نظر آیا تھا، ایک ٹیپ لگا ہوا تھا۔ ایسا ٹیپ، جو زخموں پر لگایا جاتا ہے۔ میں آگے بڑھ کر نورین کے پاس پہنچ گیا۔

''نورین! یہ کیا ہوا؟''

''پتہ نہیں۔ میں نہیں جانتی۔ رات کو سوتے میں ایک خواب دیکھ رہی تھی۔ اس خواب میں کسی نے مجھے بہت زور سے دھکا دیا تھا اور میں گر پڑی تھی۔ بس میرے ماتھے سے خون نکل آیا۔ صبح ابو نے وہ خون دیکھا تو پریشان ہو گئے۔ خون بہت زیادہ نہیں نکلا تھا اور تھوڑا سا نکل کر خشک ہو گیا تھا۔ لیکن پھر بھی ابو نے اسے صاف کر کے یہ ٹیپ لگایا۔''

میں دنگ رہ گیا۔ مجھے وہ صورتِ حال یاد آ گئی تھی لیکن کسی سے اس کا تذکرہ کرنا بھی بے وقوفی تھی۔ بہرحال مجھے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے میں نے یہ جرم کیا ہو۔ جیسے میں نے ہی اُسے زخمی کیا ہو۔

بہرحال میرے ذہن میں جو سوال تھا، وہ بڑا عجیب و غریب تھا۔ میں نے اُس سے کہا۔

''نورین! مجھے ایک بات بتاؤ۔ وہ خواب جو تم نے دیکھا تھا، جس میں کسی نے تمہیں دھکا دیا تھا، وہ کون تھا جس نے تمہیں دھکا دیا تھا؟''

''میں تمہیں کیا بتاؤں سکندر! ایک بہت خوف ناک عورت تھی۔ کالا رنگ، لمبے لمبے سفید دانت۔ بس اچانک ہی اُس نے مجھے دھکا دیا تھا۔ اور سچ بتاؤں اُس وقت میں تمہارے سامنے ہی کھڑی ہوئی تھی۔ ہم لوگ بالکل خاموش تھے۔ میں نے تم سے کچھ بھی نہیں کہا تھا۔ وہ اچانک ہی آگے بڑھی اور اُس نے مجھے زور سے دھکا دیا۔''

میں انتہائی خوف زدہ ہو گیا تھا۔ یہ سب کچھ بڑا سنسنی خیز تھا۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ بھیانک عورت میرے ساتھ ساتھ نورین کے پیچھے بھی پڑ گئی ہے۔

اس بات کو کئی روز ہو گئے تھے۔ مجھے اب اکثر بخار آنے لگا تھا۔ جب بھی وہ عورت مجھے نظر آتی اور عام طور پر نظر آتی رہتی تھی، میرے دل پر ہول سوار ہو جاتا تھا اور کے بعد مجھے بخار چڑھ جاتا تھا۔ اس بار بخار کچھ زیادہ ہی ہو گیا اور میں اسکول تک نہیں جا سکا تھا۔ میں زیادہ تر اپنے کمرے ہی میں پڑا رہا کرتا تھا۔ کوئی نہ کوئی میرے پاس ضرور ہوا کرتا تھا۔ حالانکہ میں بعض

اوقات جھلا جاتا تھا اور کہتا تھا کہ کبھی کبھی مجھے تنہا بھی چھوڑ دیا جائے۔ لیکن گھر والے اتنے پریشان تھے کہ مجھے بہت کم اکیلا چھوڑا جاتا تھا۔ جب بھی میں تنہا ہوتا تو میرے سامنے وہ خوف ناک عورت آ کھڑی ہوتی۔ دن کی روشنی میں بس اُس کا سایہ محسوس کیا جا سکتا تھا لیکن شام کے سناٹوں میں وہ سراپا مجسم ہو کر آ جاتی تھی۔ جبکہ میں چاہتا تھا کہ میں تصور میں نورین کو دیکھتا رہا کروں۔

میں اُس وقت عشق کے صحیح مفہوم سے بھی ناواقف تھا لیکن نورین جب بھی میرے سامنے آتی کسی بھی شکل میں، تصور میں یا حقیقت میں مجھے ایک عجیب سا سکون محسوس ہوتا تھا اور جب وہ میرے سامنے سے چلی جاتی تھی تو میں ایک ایسا انسان بن جاتا تھا، جو پیاس سے بے حال ہو رہا ہو۔ بہرحال اب میں اس بارے میں سوچتے ہوئے ڈرنے لگا تھا کہ نورین کو میں اپنے سامنے لاؤں۔

بہرطور سب کچھ ہوتا رہا۔ اُس دن میں اپنے کمرے میں لیٹا ہوا تھا۔ اس وقت تک تاریکی نہیں پھیلی تھی لیکن بجلی چلی گئی تھی۔ مجھے ایک انجانا سا خوف محسوس ہونے لگا تھا اور میرا یہ خوف بے جا نہیں تھا۔ شمال کی طرف کھلنے والی کھڑکی سے وہ سیاہ بادل صاف نظر آ رہے تھے، جو تیزی سے آسمان پر پھیل رہے تھے۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے ان بادلوں نے مزید اندھیرا کر دیا اور بارش شروع ہو گئی۔ موٹی موٹی بوندیں آواز کے ساتھ گر رہی تھیں۔

بہرحال تھوڑی دیر کے بعد امی اندر آ گئیں۔ سب لوگ جانتے تھے کہ مجھے تاریکی سے بے پناہ خوف محسوس ہوتا ہے۔ امی نے موم بتیاں جلائیں اور بولیں۔

''اگر چاہو تو باہر آ جاؤ۔ تم تو بہت ہی کمزور ہو گئے ہو۔''

''نہیں امی! میں یہاں ٹھیک ہوں۔'' بہرحال امی تھوڑی دیر تک میرے پاس بیٹھی رہیں پھر میں نے اپنی چھوٹی بہن رخسانہ کے بارے میں پوچھا تو امی نے جواب دیا۔

''وہ باہر موجود ہے۔ بارش میں نہانے کی شوقین ہے۔''

''کہاں ہے؟ کس جگہ ہے؟''

''چھت پر چلی گئی ہے۔'' امی نے جواب دیا۔'' پھر تھوڑی دیر کے بعد اچانک ہی امی کی چیخ سنائی دی اور میں انتہائی کمزوری کے باوجود دہشت زدہ ہو کر اُٹھ کھڑا ہوا اور پھر کمزور قدموں سے کھڑا ہو کر باہر نکل آیا۔ امی چھت پر تھیں اور اوپر سے اُن کے چیخنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ابو گھر پر موجود نہیں تھے۔ لیکن بڑے بھائی گھر پر ہی موجود تھے۔ وہ اوپر پہنچے اور پھر وہ بھی چیخنے لگے۔

''میں دہشت سے اپنی جگہ کھڑا رہا اور دیکھنے لگا کہ اوپر کیا ہو رہا ہے۔ اتنی دیر میں امی اور بھائی، رخسانہ کو سنبھالے ہوئے نیچے اُترنے لگے۔ رخسانہ بڑے بھائی کی گود میں جھول رہی تھی۔ میں دہشت سے چیخ پڑا۔

''کیا ہوا؟......... کیا ہوا رخسانہ کو؟''

''ہائے میری بچی......... دیکھو میری بچی......... ارے چلو جلدی چلو، رکشہ لے کر آؤ۔'' امی بری طرح چیخ رہی تھیں۔ میں نجانے کون سی قوتیں حاصل کر کے باہر کی طرف دوڑا تو میں نے رخسانہ کو دیکھا، اُس کا ایک بازو شانے کے پاس سے غائب تھا اور وہ بے ہوش تھی۔

''یہ......... یہ......... یہ کیا ہوا؟'' میرے حلق سے مدھم آواز نکلی اور میں نیم غشی کی کیفیت میں ایک دیوار سے جا ٹکا۔ میری آنکھوں نے دھوکا نہیں کھایا تھا۔ کندھے کے پاس سے سرخ سرخ گوشت نظر آ رہا تھا، جو خون اُگل رہا تھا۔ یہ کیا ہوا؟ اور کیوں ہوا؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ آہستہ آہستہ میں بیٹھتا چلا گیا اور پھر ہوش و حواس سے بے گانہ ہو گیا۔

ہوش آیا تو میں ہسپتال کے ایک بیڈ پر تھا اور میرے اردگرد نرسیں وغیرہ آ جا رہی تھیں۔ ایک طرف ابو سر جھکائے بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھے ایک دم گزرے ہوئے واقعات یاد آ گئے۔ میں جلدی سے اُٹھ کر بستر پر بیٹھ گیا۔

''بھائی جان! بھائی جان!'' میں نے اپنے بھائی کو آواز دی اور بھائی جان میری طرف رُخ کر کے اچانک ہی ہچکیاں لے لے کر رونے لگے۔

''بھائی جان!......... بھائی جان!......... رخسانہ......... رخسانہ کہاں ہے؟''

لیکن کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ امی جان، ابو رونے لگے تھے۔ اسی وقت ایک ڈاکٹر ہمارے پاس آ گیا۔

''دیکھئے آپ لوگ حوصلہ رکھئے۔ اس طرح مریض کے سامنے رونا مناسب نہیں ہے۔ اس کا دل انتہائی کمزور ہے۔ کوئی نقصان بھی ہو سکتا ہے۔ سب لوگ اپنے آپ کو خاموش کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ لیکن مجھے قرار کہاں تھا۔ میں نے امی کا بازو پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

''امی! مجھے رخسانہ کے بارے میں بتائیے۔ مجھے یوں لگا تھا جیسے چھت سے اُترتے ہوئے وہ خون میں ڈوبی ہوئی ہو۔ ابو نے میری طرف دیکھا اور سرد لہجے میں بولے۔

''بیٹا! رخسانہ اس دنیا سے چلی گئی ہے۔''

میرے ذہن کو جو شدید جھٹکا لگا تھا، وہ ناقابل یقین تھا۔ شاید میں پھر بے ہوش ہو گیا تھا اور اس کے بعد نہ جانے کب ہوش میں آیا تھا۔

بہرحال میں ہوش اور بے ہوشی کے درمیان نجانے کتنا وقت ہسپتال میں گزار کر آخرکار گھر واپس پہنچ گیا۔ ڈاکٹروں نے مجھے چھٹی دے دی تھی لیکن اب مجھے اس بات کا بھرپور یقین ہو گیا تھا کہ میری بہن رخسانہ اس دنیا میں نہیں ہے۔ اور رخسانہ کی موت کا معمہ کسی طرح حل ہی نہیں ہو پا رہا تھا۔ ڈاکٹروں کی رپورٹ کے مطابق اُس کا بازو شانے کے پاس سے کاٹ دیا گیا تھا اور کسی

تیز دھار آلے کی مدد سے یہ کام کیا گیا تھا۔ پولیس نے تفتیش بھی کی تھی لیکن کوئی پتہ نہیں لگا سکی تھی۔ ہماری چھت بھی کسی اور گھر کی چھت سے ملی ہوئی نہیں تھی، جس سے یہ اندازہ ہوتا کہ کوئی چھتوں، چھتوں آیا ہے اور اُس نے رخسانہ پر حملہ کیا ہے۔ پھر سب سے بڑی بات یہ تھی کہ رخسانہ کا بازو ملا ہی نہیں تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے کوئی صرف بازو کاٹنے کے لیے اس کے پاس آیا ہو۔ اور بازو کاٹ کر چمپت ہو گیا ہو۔

لیکن کہاں........؟ یہ کچھ پتہ نہیں چل سکا تھا۔ ہر شخص اپنی اپنی زبان بول رہا تھا۔ بھائی جان کے ایک دوست نے کہا تھا کہ یہ بات سمجھ میں نہیں آ رہی ہے کہ ہوا کیا ہے۔ اتنی چھوٹی سی بچی کو قتل کرنے سے کسی کو کیا ملے گا؟

پھر ہم لوگوں کی تو کسی کے ساتھ دشمنی بھی نہیں تھی۔ بہر حال لوگ آج تک اُس حادثے پر تبصرہ کر رہے تھے اور کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ پھر میرے ذہن میں ایک چرخی سی چلنے لگی۔ ٹیکسلا کے میوزیم کی وہ ہولناک سرنگ، جو ایک دربار پر جا کر ختم ہوئی تھی اور یہ دربار سکندرِ اعظم کا تھا، وہاں ایک ہولناک عورت، جسے جادوگرنی بتایا گیا تھا، تاج چرانے کے الزام میں پکڑ کر لائی گئی تھی۔ اور سکندرِ اعظم یعنی میرے حکم پر اُس کا بازو کاٹ دیا گیا۔ اس کے بعد سے وہ عورت مسلسل میرا تعاقب کرتی رہی۔ یہاں تک کہ میری بہن اُس کی وحشت کا شکار ہو گئی۔

یہ بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ اس وقت بھی میں اپنے کمرے میں موجود سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ لائٹ اکثر جاتی رہتی تھی۔ اس وقت بھی لائٹ گئی ہوئی تھی اور کھڑکیوں کے شیشوں سے گلی کے کھمبے کی روشنیاں چھن چھن کر اندر آ رہی تھیں۔ میں نے پردے کھینچ کر شیشوں کو ڈھک دیا۔ پھر اس سوئچ کی طرف بڑھا، جس سے کمرے کی دونوں ٹیوب لائٹس روشن ہو جاتی تھیں۔ اندھیرے سے مجھے جو خوف محسوس ہوتا تھا اس کے پیشِ نظر میرے کمرے میں دو ٹیوب لائٹیں لگائی گئی تھیں۔ مجھے اس وقت بھی شدید بخار ہو رہا تھا۔ لیکن نجانے کس طرح میرے حلق سے غراتی ہوئی آواز نکلی۔

''ترشولی! میرے سامنے آؤ........ میں جانتا ہوں حرامزادی، تُو نے ہی میری بہن سے زندگی چھینی ہے۔ میرے سامنے آ۔ میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ اپنی معصوم بہن کا ایسا انتقام لوں گا میں کہ تُو کسی بھی دور میں ہو، یاد رکھے گی ہمیشہ۔''

میری آواز کی غراہٹ کمرے میں گونج رہی تھی اور تاریکی اور گہری ہوتی جا رہی تھی۔ میرے حلق سے پھر آواز نکلی۔ ''سامنے کیوں نہیں آتی کمینی؟ آگے آ........ ذرا میں دیکھوں کہ تُو کتنی بڑی جادوگرنی ہے۔''

اچانک ایک گوشے میں سرسراہٹ سی ہوئی۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ ایک چہرہ سامنے

گیا۔ وہی بھیانک چہرہ، وہی بھیانک دانت، وہی سیاہ ہونٹوں کو چاٹتی نیلی زبان، وہی جنم جنم کی بھوکی آنکھیں........ اُس نے فخریہ انداز میں میری طرف دیکھا۔ اُس کا ایک ہاتھ پشت کی طرف تھا، جو آہستہ آہستہ سامنے کی طرف آ رہا تھا۔ اور جب وہ سامنے آیا تو میرے منہ سے اچانک ایک دھاڑ نکل گئی۔ اُس نے اپنے ہاتھ میں رخسانہ کا کٹا ہوا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ جسے وہ جھنڈے کی طرح ہوا میں لہرا رہی تھی۔ خود اُس کا ایک ہی ہاتھ تھا۔

میں حلق سے غراہٹیں نکالتا ہوا اُس کی طرف جھپٹا لیکن اسی وقت باہر سے دھڑ دھڑ کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ میں نے ٹھوکر کھائی اور اوندھے منہ نیچے گر پڑا۔ میں ایک بار پھر بے ہوش ہو گیا۔ میں ویسے بھی ہسپتال سے آیا تھا اور خوب کمزور ہو رہا تھا۔

ہوش میں تو خیر آ ہی گیا تھا۔ میں نہیں بتا سکتا کہ میرے دل کا کیا حال تھا۔ بے شمار خنجر تھے، جو اس دل میں پیوست تھے۔ اندر ہی اندر دل خون ہو رہا تھا۔ میری ایک ہی بہن تھی اور میری وجہ سے اُس کی جان چلی گئی تھی۔ پھر دوسرے دن نورین میرے پاس آئی اور اُس نے مجھ سے میری طبیعت پوچھی۔ اُسے غالباً میرے گھر والوں نے اس بات پر آمادہ کیا تھا کہ وہ مجھے اسکول جانے کے لیے سمجھائیں تا کہ میرا دل بہلے۔ نورین نے کہا۔ ''میرا دل تمہارے بغیر اسکول میں نہیں لگتا سکندر! صبر سے کام لو اور کل سے اسکول آؤ۔''

میں خالی خالی نظروں سے اُسے دیکھنے لگا۔ پھر میں نے کہا۔ ''مجھے اندازہ نہیں ہے کہ میری کیا کیفیت ہے۔ لیکن کسی کام کے لیے دل نہیں چاہتا۔''

''میں کل تمہارا اسکول میں انتظار کروں گی۔'' نورین نے عجیب سے لہجے میں کہا اور وہاں سے چلی گئی۔ اُس کے جانے کے تھوڑی دیر بعد ابو میرے پاس آئے اور مجھ سے بولے۔ ''بیٹے! میرا بھی یہی خیال ہے کہ کل سے تم اسکول چلے جاؤ۔ گھر میں رہتے ہو تو اور زیادہ طبیعت خراب ہوتی ہے۔ ہم اپنی بچی کو نہیں بھول سکتے۔ لیکن کیا، کیا جائے۔ کرنا تو پڑے گا ہی۔''

''ابو! مجھے رخسانہ دوبارہ نہیں ملے گی۔''

''ہاں۔ میں جانتا ہوں۔''

''ابو! میں قبرستان جانا چاہتا ہوں۔''

''نہیں بیٹا! پھر کسی وقت چلے جانا۔''

''نہیں ابو! مجھے قبرستان لے جایئے۔''

پھر ہم لوگ قبرستان گئے۔ بہت دیر تک میں رخسانہ کی قبر پر بیٹھ کر اس سے معذرت کرتا رہا۔ میں اس سے کہتا رہا رخسانہ! میں شرمندہ ہوں۔ مگر میں نے جو کچھ بھی کیا تھا، جان بوجھ کر نہیں کیا تھا۔ بہرطور سب اپنی اپنی سناتے رہے۔ پھر اس رات مجھے ایک اور عجیب سا تجربہ ہوا۔ میں اپنے

کمرے میں ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا کہ سامنے والی کھڑکی سے مجھے ایک چہرہ نظر آیا اور یہ چہرہ نورین کا تھا۔ وہ مسکراتی نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نورین کہہ کر کھڑکی کی جانب دوڑا۔ لیکن جیسے ہی میں وہاں پہنچا، چہرہ غائب ہو گیا۔

بہر طور وقت کے بارے میں یہ سنا گیا ہے کہ وہ آخر کار صبر دلا ہی دیتا ہے۔ لیکن رخسانہ کے بارے میں مجھے صبر حاصل نہیں ہوا تھا۔ رات کو اکثر میرا واسطہ اُس بھیانک عورت سے پڑ جاتا تھا اور میرے اور اُس کے درمیان بہت سی باتوں کے تبادلے ہوتے تھے۔ وہ رات بھی ایسی ہی ایک رات تھی۔ میں نجانے کیا سوچ بیٹھا ہوا تھا۔ میرے پاس ایک چھری موجود تھی، جسے میں نے باورچی خانے سے حاصل کیا تھا۔ یہ نئی چھری تھی اور بظاہر چیزیں کاٹنے میں کام آتی تھی لیکن اگر وہ کسی انسان پر بھی استعمال کی جاتی تو اس کا اثر بڑا زبردست ہوتا۔

تھوڑی دیر کے بعد مجھے سرسراہٹ سنائی دی۔ یہ اُس کے آنے کی نشانی ہوتی تھی۔ اور جیسے ہی میں نے اُس گوشے کی طرف دیکھا، جہاں سے وہ برآمد ہوتی تھی، تو میں نے اسی کو آتے ہوئے دیکھا۔ وہ آہستہ آہستہ میرے قریب آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔

"ہم تو بے گناہ تھے سرکار جی! ہم نے تاج نہیں چرایا تھا۔ نہ ہم تاج چرانے اندر آئے تھے۔ پھر آپ نے ہمیں کیوں سزا دی؟ آپ نے ہمارا ہاتھ کیوں کاٹ دیا؟"

"تم نے میری بہن کو کیوں قتل کیا؟"

"وہ تو کرنا تھا سرکار جی! ہمیں جو نقصان پہنچایا تھا آپ نے۔" اُس نے بڑی بے نیازی سے انگڑائی لی۔ اُس کے جسم سے جگہ جگہ سے اُدھڑی ہوئی کھال نمایاں ہو گئی۔ مگر میں نے اُس کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا۔

"میری بات سنو...... کیا میری بہن کا ہاتھ تم مجھے واپس کر سکتی ہو؟ میں تم سے ایک سمجھوتہ کرنا چاہتا ہوں۔"

وہ ایک لمحے تک دیکھتی اور سوچتی رہی، پھر بولی۔

"اس کے لیے تمہیں میرے کئی کام کرنا ہوں گے۔"

"آؤ بیٹھو میرے پاس۔ میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا اور بڑی احتیاط سے ہاتھ پیچھے کر کے وہ چھری اپنے ہاتھ میں لے لی، جو میں نے نہ جانے کس احمقانہ جذبہ کے تحت چھپا کر رکھی تھی۔ لیکن اب یوں لگ رہا تھا، جیسے وہ چھری میرے کام آنے والی ہو۔

⊛

وہ بالکل بے پروا نظر آ رہی تھی، جیسے اُسے شبہ بھی نہ ہو کہ دوسرے لمحے میں کیا کرنے والا ہوں۔ لیکن جیسے ہی وہ میرے پاس آ کر میرے سامنے بیٹھی، میں نے انتہائی مہارت سے چھری

اُٹھائی اور پوری قوت سے اُس کے سینے میں اُتار دی۔

چھری اس طرح اُس کے سینے میں داخل ہوئی، جس طرح تربوز میں اُترتی ہے۔ اور سینے کو چاک کرتی ہوئی کرسی میں پیوست ہو گئی۔ صرف اُس کے دستے کا تھوڑا سا حصہ باہر نکلا رہ گیا تھا۔ میرا پورا جسم تھر تھر کانپ رہا تھا۔ کھڑا ہونا مشکل ہو رہا تھا۔ ایک سیکنڈ کی دیر بھی لگاتا تو شاید وہیں فرش پر جا گرتا۔ اُس عورت کو قتل کرنے کے خیال نے مجھے ادھ موا کر دیا تھا۔ پھر بھی نجانے کس طرح میں ایک ایک قدم ہٹتا ہوا پیچھے اپنے بستر پر بیٹھ گیا اور مجھ سے بیٹھا تک نہ گیا۔ چنانچہ میں اوندھے منہ بستر پر لیٹ گیا۔

پھر آہستہ آہستہ جسم میں گرمی آنا شروع ہوئی۔ خوشی سی ہونے لگی کہ میں نے اپنی معصوم بہن کے قتل کا انتقام لے لیا ہے۔ تکیے سے سر ہٹا کر میں نے ڈری ڈری نگاہوں سے اُس خوفناک کالی عورت کی طرف دیکھا۔ وہ اسی طرح کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے چھری سے چھدی ہوئی بیٹھی تھی۔ اُس کی آنکھیں باہر نکل پڑی تھیں اور منہ کھلے کا کھلا رہ گیا تھا۔ اُس کی نیلی زبان آدھی سے زیادہ باہر لٹک آئی تھی۔

میرے دل میں خوشی کی ایک لہر جاگ اُٹھی۔

اُس منحوس عورت کو قتل کر کے میں نے بہت بڑا کارنامہ سرانجام دیا تھا۔ آہ کاش! پہلے میں ایسا کر سکتا۔ کاش! میں پہلے ہی ایسا کر ڈالتا تو میری بہن کو موت کا منہ نہ دیکھنا پڑتا۔ میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ رگوں میں گرم خون دوڑ رہا تھا۔ پیشانی پسینے سے بھیگ گئی تھی۔ میں جانتا تھا کہ کسی کو قتل کرنے کا نتیجہ کیا ہو سکتا ہے۔ قانون کسی بھی قاتل کو زندہ نہیں چھوڑتا۔ مگر مجھے اس کا کوئی خوف نہیں تھا میں نے اپنی بہن کا انتقام لے لیا تھا۔

میں خوشی سے کانپتا ہوا باہر نکل آیا۔ میں لوگوں کو اپنے اس کارنامے کے بارے بتانا چاہتا تھا لیکن اس وقت مجھے کوئی اور نظر نہیں آیا۔ تھوڑا سا چکر لگانے کے بعد میں واپس اندر پہنچا تو اچانک ہی میرا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔ وہ چھری اسی جگہ کرسی میں پیوست تھی لیکن وہ عورت غائب تھی۔ اُس کا کہیں نام و نشان نہیں تھا۔ میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھتا رہا۔ چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں اور پریشانی سے اپنے بستر پر جا بیٹھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں کیا نہ کروں۔ کیا وہ زندہ بچ گئی؟ مجھے بہت زیادہ معلومات تو حاصل نہیں تھی لیکن اتنا میں جانتا تھا کہ وہ ایک پراسرار وجود تھا جس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ مادی ہے یا غیر مادی۔

دوسرے دن اسکول جانے کا فیصلہ کیا لیکن بدن نے ساتھ نہیں دیا تھا۔ البتہ شام کو نورین مجھ سے ملنے کے لیے آئی تو میں نے انتہائی معذرت سے اُسے دیکھ کر کہا۔

"نورین! مجھے یقین ہے کہ تم اس وقت میرا ساتھ نہیں چھوڑو گی۔ نہ ہی میری کسی بات پر ناراض ہوگی۔ میں اپنی بہن کی موت کو نہیں بھول سکتا۔ چنانچہ براہِ کرم مجھے معاف کر دینا۔"

"نہیں۔کوئی بات نہیں۔ جب تمہاری طبیعت ٹھیک ہو، تب آجانا۔"

میں نے نورین کا شکریہ ادا کیا۔ پھر اُس شام کمرے میں ملگجی روشنی پھیل گئی تھی، جب میں نے گزشتہ شب والی کرسی پر اُس کالی عورت کو بیٹھے ہوئے دیکھا۔ وہ بہت زیادہ غصے میں تھی۔ آنکھیں شعلے برسا رہی تھیں۔ منہ سختی سے بھنچا ہوا تھا، جس کی وجہ سے اُس کے دانت نظر نہیں آ رہے تھے۔ اس کے برعکس بالائی ہونٹ اور ناک کے درمیان مونچھوں جیسے سخت بال دکھائی دے رہے تھے۔ وہ مجھے خونخوار نگاہوں سے گھورتی رہی اور میں خاموشی سے اُسے دیکھتا رہا۔ پھر میں نے غرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"خدا تجھے غارت کرے۔ تُو نے میری خوشی چھین لی۔ میں تو سمجھا تھا کہ میں نے تجھ سے اپنی بہن کی موت کا انتقام لے لیا۔ لیکن تُو زندہ ہے۔ مگر ایک بات یاد رکھ میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی اور بھائی جان نے باہر سے آواز دی۔

"سکندر!......سکندر! آؤ۔......باہر آؤ۔ تھوڑی دیر ہمارے پاس بیٹھو۔"

"میں آتا ہوں۔ آپ چلیں۔" اُس نے اُدھر منہ کر کے کہا اور ایک بار پھر اُس کی جانب پلٹا۔ مگر وہ اب وہاں موجود نہیں تھی۔ بلکہ اس بار وہ میرے بستر پر بیٹھی ہوئی تھی اور ایک ایسی بلی کی طرح غرا رہی تھی، جس سے اُس کا شکار چھینا جا رہا ہو۔ میں خونی نگاہوں سے اُسے دیکھتا رہا اور پھر اس کے بعد میں نے اس سے کہا۔

"ایک بات تو سمجھ لے ترشولی! تُو کتنی ہی بڑی جادوگرنی ہو، بھوت ہو یا چڑیل ہو۔ بہت زیادہ عرصے تک تُو میرے ہاتھ سے نہیں بچ سکے گی۔ جب تک میں تجھ سے انتقام نہیں لوں گا، آرام سے نہیں بیٹھوں گا۔"

اُس کے حلق سے غراہٹیں نکلتی رہیں، میں نے اُسے غور سے دیکھا اور بولا۔

"تم......تم جو کچھ بھی ہو، میرے بستر سے ہٹ جاؤ۔" میں نے کہا اور وہ اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔ لیکن اس کے بعد وہ اسی گوشے میں جا کر غائب ہو گئی تھی۔

میں اپنے کمرے سے باہر آ گیا۔ بھائی جان وغیرہ میرے لیے پریشان رہا کرتے تھے۔ اب انہیں تھوڑی بہت تفصیل بھی معلوم ہو گئی تھی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا، کیا جائے۔ امی، بھائی، ابو سب کے سب پریشان تھے۔ رخسانہ اس طرح ہمارے درمیان سے نکل گئی تھی، جیسے کہیں کسی سے ملنے گئی ہو۔ وہ بہت زیادہ خوش مزاج تھی۔ ہر وقت اُس کی زبان قینچی کی طرح چلتی رہتی

تھی اور ہم اُس کی باتوں سے لطف اندوز ہوا کرتے تھے۔ بھائی جان، امی اور ابو نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"دیکھو سکندر! تم اسکول جانا شروع کر دو۔ بہن اس دنیا سے چلی گئی ہے۔ ہمارے گھر کا ماحول ویسے ہی سوگوار ہے، اوپر سے تمہیں دیکھ کر دل میں درد ہونے لگتا ہے۔ تم یوں کرو کہ کل سے اسکول جانا شروع کر دو۔ دل بہل جائے گا۔"

میں نے دوسرے دن سے اُن کی ہدایت پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ میں اسکول پہنچا تو ٹیچر سمیت سب لڑکے لڑکیوں کو اپنی جانب متوجہ پایا۔ زبان سے تو کسی نے کچھ نہ کہا مگر سب میری طرف اس طرح دیکھتے رہے، جیسے میں ان کے لیے بالکل ایک اجنبی وجود ہوں۔ اسکول میں میرا دل نہ لگا تو میں دوسرے ہی پیریڈ میں گھر بھاگ آیا۔ گھر پر بڑھئی موجود تھا۔ تھوڑا بہت کام تھا جو وہ کر رہا تھا۔

جب سکون نہ ملا تو میں کتابیں وغیرہ رکھ کر کسی کو اطلاع دیئے بغیر قبرستان پہنچ گیا اور رخسانہ کی قبر پر جا بیٹھا۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ اُس کی قبر پر پہنچ کر مجھے سکون مل گیا، بہر حال بے سکونی کے عالم میں تھوڑی سی کمی ضرور واقع ہو گئی۔ کافی دیر وہاں بیٹھا سوچتا رہا کہ اپنی بہن کا انتقام کس طرح لوں۔ ہائے کس طرح اُس کا بازو کاٹ کر لے گئی تھی وہ کمبخت۔ میری بہن کو کتنا دُکھ ہوا ہو گا۔ مجھے اس کا بھی علم ہو چکا تھا کہ اُس کا جسم تربوز کی طرح اتنا نرم تھا کہ پھل کاٹنے والی معمولی سی کمزور چھری بھی اُس میں با آسانی اُتر گئی تھی۔ مشکل یہ تھی کہ قتل کے بعد اُسے روشنی سے بچانا مشکل تھا۔ اگر اُسے کسی ایسی جگہ مار کر بند کیا جاتا جہاں روشنی کا گزر نہ ہوتا تو شاید وہ دوبارہ زندگی نہ پا سکتی۔ بس یہ میری تیرہ سالہ سوچ تھی۔

بہر حال قبرستان سے بازار ہوتا ہوا گھر واپس آیا۔ اپنی سوچ کے تابع میں اپنے ساتھ ایک بڑا چھرا اور زمین کھودنے کے لیے کدال لے کر آیا تھا۔ کدال کو میں نے کمرے کے کونے میں رکھ دیا اور سوچا تھا کہ کمرے میں چپکے چپکے قبر تیار کروں گا اور پھر اُس عورت کو مار کر اُس قبر میں دفن کرنے کی کوشش کروں گا۔

بہر حال اتنا اندازہ مجھے ہو چکا تھا کہ وہ مجھ سے زیادہ دور نہیں ہو سکتی۔ میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ اگر وہ قبر تیار ہوتے دیکھ لیتی تو کچھ نہ سمجھ پاتی۔ غصے میں آ کر وہ اُلٹا مجھی کو اس میں دبا دیتی۔ جو عورت ایک معصوم اور بے ضرر بچی کے خون سے اپنے ہاتھ رنگ سکتی ہے، وہ سب کچھ کر سکتی تھی۔ میں نے اپنے منصوبے میں تھوڑی سی تبدیلی پیدا کر لی۔ سب سے پہلا کام میں نے یہ کیا کہ اپنے کمرے کو موٹے موٹے پردے ڈال کر ڈارک روم میں تبدیل کر لیا۔ دروازے کے آگے ایک پلنگ کھڑا کر کے اُس پر سیاہ پردہ ڈال دیا۔ پھر دروازے اور پلنگ کے درمیان جو خالی جگہ رہ

گئی تھی اسے ایک دری کی مدد سے پُر کیا اور محسوس کیا کہ دروازے کے ذریعے کمرے میں داخل ہونے کے بعد اگر دروازے کو بند نہ کیا جائے تو دائیں بائیں کی خالی جگہ کا پردہ ہٹا کر اندر آتے ہوئے اچھی خاصی تیز روشنی اندر آجاتی ہے۔

یہ سارا کام کرنے کے بعد میں خاصا مطمئن ہوگیا۔ یا تو اسے میرے بچپن کی سوچ کہا جاسکتا ہے یا پھر میری لگن کہ میں کسی کو موقع نہیں دے رہا تھا۔ بھائی جان امتحانات کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ صبح کو کالج جاتے تھے، دوپہر کو اُلٹا سیدھا کھانا کھانے آجاتے تھے، پھر ٹیوشن وغیرہ پڑھنے چلے جاتے تھے۔ دس گیارہ بجے رات کو وہ گھر واپس آتے۔ بہن کی موت کا صدمہ سب کے دلوں پر جس طرح ہوسکتا تھا اسی طرح بھائی جان کے دل پر بھی تھا۔

بہرحال میں اب بالکل ہی دیوانگی کی حد میں داخل ہوگیا تھا۔ میرے ذہن میں بس ایک ہی خیال تھا کہ جس طرح بھی بن پڑے، اس بے رحم عورت سے اپنی بہن کا بدلہ لوں۔

وقت گزرتا رہا۔ اس عرصے میں ایک بھی دن ایسا نہیں گزرا تھا جب ترشولی میرے کمرے میں نہ آئی ہو۔ میں نے کمرے میں زیرو پاور کا بلب لگا لیا تھا کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ میرا کمرہ روشنی سے بالکل ہی محروم ہو جائے۔ وہ آتی تھی اور مجھ پر آنکھیں لگا کر بیٹھ جاتی تھی۔ مجھے اُس کے ہونٹ ہلتے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ مجھے یوں لگتا تھا، جیسے وہ مجھ سے کچھ کہہ رہی ہو لیکن اُس کے منہ سے کوئی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ کئی بار ایسا ہوا کہ میں اُس کے سامنے بالکل نڈر ہوکر کھڑا ہوگیا۔ میں اکثر اُس سے یہ سوالات کیا کرتا تھا کہ تُو کون ہے؟ تُو نے میری بہن کو کیوں قتل کیا؟ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے وہ ہونٹ اس طرح ہلاتی تھی جس طرح غبارے میں تھوڑی سی ہوا بھر کر اچانک ساری ہوا باہر نکال دی گئی ہو۔ دوسرے سوال کے جواب میں وہ کچھ بولنے کی کوشش کرتی اور اُس کا نچلا ہونٹ گھوم کر ناک تک پہنچ جاتا۔ فارغ اوقات میں مجھے اُس کے ہونٹ ہلانے کی نقل میں بڑا مزہ آتا تھا۔ کبھی کبھی کلاس روم میں بھی غیر ارادی طور پر مجھ سے یہ حرکت سرزد ہونے لگتی تھی۔ جن لڑکے اور لڑکیوں نے مجھے اس حرکت میں مبتلا دیکھا تھا، وہ مجھے اس انداز میں دیکھتے تھے جیسے میرا دماغی توازن خراب ہوتا جارہا ہو۔ بعض اوقات لڑکے اور لڑکیاں ہنس بھی پڑتے تھے۔ صرف ایک نورین تھی، جو میرے لیے فکر مند تھی۔

وقت گزرتا رہا۔ کافی دن گزر گئے۔ پھر سالانہ امتحان ہوا۔ اور نورین معمول کے مطابق اوّل آئی اور مجھے بھی شاید کسی کے کہنے پر پاس کر دیا گیا تھا۔ یہ سوچ کر کہ میری ذہنی کیفیت کہیں اور بھی خراب نہ ہو جائے، نورین اوّل آئی تھی اور نفیسی صاحب نے اُس کے کامیاب ہونے کی خوشی میں ایک چھوٹی سی تقریب بھی کی تھی۔

نورین مجھے اس تقریب کی دعوت دینے آئی تھی۔ امی نے اُسے چھوٹے سے کمرے میں

بٹھایا۔ جو ہمارے ڈرائنگ روم کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔

''کیا ہوگیا ہے آخر تمہیں سکندر! اپنے آپ کو ٹھیک کرو۔ ہم رخسانہ کو کبھی نہیں بھول سکتے۔ لیکن صبر تو کرنا ہی پڑے گا۔''

میں گردن ہلانے لگا۔ میں نے کہا۔

''ہاں......میں کوشش کروں گا کہ یہ سب ٹھیک ٹھاک ہو جائے۔''

''اچھا خیر، تمہیں اس تقریب میں ضرور آنا ہے۔ میں تمہارے بغیر کوئی خوشی نہیں مناؤں گی۔''

''کیوں نورین؟''

''اس لیے کہ تم مجھے بہت اچھے لگتے ہو۔'' اُس نے کہا اور ایک دم بری طرح شرما کر رہ گئی۔

میرے لیے تو یہ کوئی بہت بڑی بات نہیں تھی، لیکن یہی سنا جاتا ہے کہ لڑکیاں اپنی عمر سے بہت پہلے سمجھ دار ہو جاتی ہیں۔ نورین نے جو کچھ کہا تھا، وہ الگ بات تھی۔ بہرحال میں نے اُس سے آنے کا وعدہ کرلیا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں دل سے اُس کے ہاں تقریب میں شامل ہونا چاہتا تھا۔

مجھے اندھیرے سے بے شک خوف محسوس ہوتا تھا مگر نہ اب اندھیروں سے ڈر لگتا تھا اور نہ اندھیروں میں نمودار ہونے والی خوفناک عورت مجھے ڈرا سکتی تھی۔

جس روز اُس کے ہاں تقریب ہونے والی تھی، اُس دن مجھے یاد تھا کہ مجھے وہاں جانا ہے۔ لیکن جب شام میں زیرو پاور کے بلب میں کپڑے تبدیل کرنے اپنے کمرے میں گیا تو معمول کے مطابق میں نے اُسی ہولناک عورت کو کرسی پر بیٹھے ہوئے دیکھا۔ یوں تو میں اسے روز ہی دیکھتا تھا لیکن آج اس وقت نجانے کیوں میری آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ مجھے رخسانہ یاد آگئی تھی۔ بازار سے خریدی ہوئی چھری میرے تکیے کے نیچے رکھی ہوئی تھی۔ میں نے خاموشی سے چھری اٹھائی اور پیٹھ کے پیچھے ہاتھ کر کے اُس کے پاس جا بیٹھا۔ ''مجھے ایک بات بتاؤ ترشولی! کیا تم اسی طرح ساری زندگی میرے پیچھے پڑی رہو گی؟''

اُس نے سفید سفید دانت باہر نکال دیے۔ نیلی زبان نظر آنے لگی تھی۔

''کبھی میرا پیچھا نہیں چھوڑو گی؟'' میں نے دوسرا سوال کیا۔ اُس کے ہونٹوں نے حرکت کی۔ اُس کے منہ سے کوئی آواز نہیں نکلی تھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ چند لمحوں کے لیے بے خبر سی ہوگئی ہے۔ میں نے برق رفتاری سے چھری سنبھالی اور چھلانگ لگا کر اُس کے پلپلے سینے میں اُتار دی۔ وہ اپنے بچاؤ کے لیے کچھ بھی نہ کرسکی، صرف ہاتھ ہلا کر رہ گئی۔

مجھے اُس کی مزاحمت کا خوف تھا۔ لیکن آج بھی وہ مزاحمت نہیں کرسکی تھی۔ میں دیوانہ ہو رہا تھا۔ میں نے چھری اُس کے بدن سے نکالی اور دیوانہ وار اُس پر وار کرتا رہا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ

جیسے اُس کے جسم میں ہڈی نام کی کوئی چیز نہ ہو۔ مجھ پر اتنا جنون سوار ہوا تھا کہ جب پیٹ اور سینے پر وار کرتے کرتے تھک گیا تو میں نے اُس کی پھٹی پھٹی آنکھوں کو اُنگلیوں سے نوچ کر باہر نکال ڈالا، پھر ایک ہاتھ سے اُس کی گلجلی زبان کھینچی اور چھری کے ایک ہی وار میں، میں نے اُسے اُڑا دیا۔ میری وحشت کم ہونے کے بجائے بڑھتی جا رہی تھی۔

میں نے اُچھل اُچھل کر اُس کے چہرے اور جسم کے دوسرے حصوں میں چھری گھونپنا شروع کر دی۔ وہ مُردہ ہوتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اور جب مجھے یہ محسوس ہوا کہ اب اُس کے جسم میں زندگی نہیں ہے تو میں رک گیا۔ میں بری طرح ہانپ رہا تھا اور خوشی سے سوچ رہا تھا کہ میں نے اسے دوسری بار قتل کر دیا ہے۔

لیکن میرے انتقام کی آگ ٹھنڈی نہیں ہو رہی تھی۔ سانس کچھ اعتدال پر آئی تو میں نے چھری سنبھال کر دوبارہ کام شروع کر دیا۔ میں نے اُس کی ٹانگیں علیحدہ کر دیں، اُس کے بازو کاٹ دیئے، گردن کو جسم سے علیحدہ کر لیا، جسم کو متعدد ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا تو تھوڑا سا سکون ملا۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ میں نے اپنی معصوم بہن کا انتقام لے لیا تھا۔ بلکہ ایسے انتظامات کر دیئے تھے کہ وہ ایسی روشنی تک نہ پہنچ سکے، جو اُس کے لیے حیات بخش ثابت ہو۔ کمرہ ہمیشہ ڈارک نہیں رہ سکتا تھا لیکن میں نے اُس کا حل بھی سوچ لیا تھا۔ عورت کو ٹکڑوں میں تبدیل کرنے کے بعد میں کچھ دیر ستانے کے لیے لیٹ گیا۔ اب اُس کے غائب ہونے کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔

جب تقریباً آدھے گھنٹے تک آرام کر چکا تو میں نے کونے میں رکھی ہوئی کدال اُٹھائی اور پھر آہستہ آہستہ آواز پیدا کیے بغیر فرش کھودنے میں مصروف ہو گیا۔ کمرے کی گھڑی سے صبح ہونے کا اندازہ ہوا تو کدال رکھ دی۔ اس وقت تک میں کافی گہرا گڑھا کھود چکا تھا۔ کام ہو رہا تھا لیکن آہستہ آہستہ۔ کیونکہ گھر کے دوسرے لوگوں کو بھی ذہن میں رکھنا تھا۔

پہلے دن صبح کے وقت کمرے سے باہر نکلتے ہوئے تھوڑا سا خوف محسوس ہوا کہ کہیں میری غیر موجودگی کا فائدہ اُٹھا کر وہ کالی عورت غائب نہ ہو جائے اور میرے لیے ایک نئی مصیبت نہ اُٹھ کھڑی ہو۔ لیکن ناشتے کے بعد جب میں واپس آیا تو کالی عورت کے جسم کے ٹکڑوں کو جوں کا توں بکھرا پا کر اطمینان کا سانس لیا کہ اب وہ ڈارک روم سے نکل کر کہیں نہیں جا سکے گی۔ میں مصروف ہو گیا اور پھر مجھے محسوس ہوا کہ نورین مجھ سے ناراض ہو گئی ہے۔

بہر حال میں اپنے کام میں مصروف رہا۔ کالی عورت کے جسم میں چونکہ خون نہیں تھا اس لیے کمرے کا فرش اور میرا لباس گندا ہونے سے بچ گیا تھا۔ پھر مجھے اپنے کام سے فراغت حاصل ہو گئی۔ میں نے ایک ایک کر کے چھری سمیت سارے ٹکڑوں کو گڑھے میں جھونک دیا اور پورے کمرے کو بند کر دیا تا کہ اس عورت کے جسم کی کوئی بوٹی یا ناخن کا کوئی ٹکڑا وغیرہ دفن ہونے سے نہ

رہ جائے۔ اس کام سے فارغ ہو کر میں باہر گیا اور بہت سے پرانے اخبار اُٹھا کر لایا۔ ان اخباروں کو بھی میں نے اُس کی لاش پر بچھا دیا اور جس قدر بھی ممکن ہو سکا، میں گڑھے پر موٹی مٹی کی تہہ جما کر اسے برابر کرنے میں مصروف ہو گیا۔

وہ دفن ہو چکی تھی۔ لیکن نہ جانے کیوں مجھے اطمینان نہیں ہوا تھا۔ میرے کام کا سب سے مشکل حصہ باقی تھا۔ میں نے ہمت کر کے سارے پارٹیشن وغیرہ ہٹا دیئے، پردے وغیرہ بھی ہٹا دیئے اور بس یہ سوچتا رہا کہ روشنی گڑھے کی مٹی کو چیرتے ہوئے کالی عورت تک نہ پہنچ جائے اور وہ جی اُٹھے۔ میری نظریں گڑھے پر جمی ہوئی تھیں۔ تجربے کے طور پر دوبارہ کھڑکیوں پر پردے لٹکائے، کمرے کا جائزہ لیا، کمرے میں تاریکی نہیں اُبھری تو خوشی سے میرے پورے جسم میں سنسناہٹیں دوڑ گئیں۔ میں نے جلدی جلدی سارے پردے اُٹھا کر پھینکے اور کھڑکیاں کھول دیں۔ پلنگ کو اس طرح بچھایا کہ گڑھا اس کے نیچے چھپ گیا پھر بستر بچھایا اور چادر کو نیچے تک لٹکا دیا کہ گڑھا نہ نظر آنے پائے۔

اب مجھے تھوڑا سا اطمینان ہو گیا تھا۔ جب رات کی تاریکی بھی خیریت سے گزر گئی اور کالی عورت نظر نہیں آئی تو میری خوشی کی انتہا ہو گئی۔ میں اپنے کام میں کامیاب ہو گیا تھا۔ نجانے کیوں مجھے یقین ہوتا جا رہا تھا کہ اب وہ جادوگر، وہ بھیانک مخلوق دوبارہ میرے سامنے نہیں آ سکے گی۔ میں نے اسے موت کی گہری نیند سلا دیا ہے اور اپنی بہن کا انتقام اس سے لے لیا ہے۔ اسکول میں تو سبھی میرے ساتھ ہمدردی اور محبت کرتے تھے۔ خاص طور سے نورین زیادہ سے زیادہ وقت میرے ساتھ گزارتی تھی لیکن کئی بار میں نے میڈم میلسی کو اپنی جان نگراں پایا تھا۔ میڈم میلسی ایک کرسچن ٹیچر تھیں۔ بہت ہی نرم مزاج اور بہت ہی اعلیٰ شخصیت کی مالک۔ وہ مجھے عجیب سے انداز میں دیکھتی رہا کرتی تھیں۔ اس دن میں ذرا الگ تھلگ بیٹھا ہوا تھا کہ میڈم میلسی میرے پاس پہنچ گئیں۔

"ہیلو۔"

"ہیلو میڈم!" میں جلدی سے کھڑا ہو گیا۔

"نہیں، بیٹھو۔ یہ فرصت کا وقت ہے۔"

"جی، تھینک یو۔" میں نے کہا اور بیٹھ گیا۔

"میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں سکندر!"

"جی میڈم! بتایئے؟"

"یہ بتاؤ تم مجھے میرے گھر پر کچھ وقت دے سکتے ہو؟" میڈم نے کہا اور میں تعجب بھری نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

"میں سمجھا نہیں ہوں میڈم!"

"میں نے ایک سیدھی سی بات کہی ہے۔ اصل میں تمہارے بارے میں، میں نے تذکرہ کیا تھا اپنے ڈیڈی سے۔ میرے ڈیڈی فادر جیکسن پادری ہیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ پراسرار علوم پر اتھارٹی ہیں۔ میں نے تمہارے بارے میں اُنہیں تفصیل بتائی تھی تو وہ بولے کہ اگر ممکن ہو سکے تو سکندر کو مجھ سے ملا دو۔"

"آپ جب حکم دیں گی، میں آپ کے گھر پر پہنچ جاؤں گا۔ لیکن مجھے آپ کے گھر کا پتہ معلوم نہیں ہے۔"

"میں بتائے دیتی ہوں۔ لیکن میری بات سنو، کسی کو بتائے بغیر آنا تاکہ کوئی ہمیں ڈسٹرب نہ کر سکے۔"

"ٹھیک ہے میڈم!"

اسی روز شام کو چار بجے میں میڈم کے بتائے ہوئے پتے پر پہنچ گیا۔ بڑا اچھا سا گھر تھا مجھے پتہ چلا کہ میڈم میلسی کی شادی ہونے والی ہے۔ میڈم میلسی مجھے اپنے ڈرائنگ روم میں لے گئیں۔ سادہ سا ڈرائنگ روم تھا۔ دیوار پر بڑی سی صلیب نصب تھی۔ قدیم طرز کا صوفہ سیٹ اُ ہوا تھا۔ دوسری طرف کھانے کی میز تھی جس کے اطراف میں چار کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔

میڈم بیٹھ گئیں اور تھوڑی دیر کے بعد فادر جیکسن ہمارے سامنے آ گئے۔ واقعی شخصیت تھی فادر جیکسن نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور بولے۔

"مجھے تمہارے بارے میں تفصیل معلوم ہو چکی ہے بیٹے! تمہاری بہن کو قتل کر دیا گیا ہے او تم اس کی وجہ سے ذہنی طور پر معطل ہو کر رہ گئے ہو۔ میں نے پراسرار علوم میں تھوڑی سی معلومات حاصل کی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر تم مجھ سے رابطہ قائم کرو تو میں تمہیں بہت سی کام کی باتیں بتا سکتا ہوں۔"

"فادر! میں خود یہ چاہتا ہوں کہ مجھے تفصیلات معلوم ہوں۔" میں نے کہا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے فادر جیکسن کی آنکھیں میرے دماغ کی ہڈی توڑ کر میرے جسم کے اندر اُترتی جا رہی ہوں۔

"مجھے بتاؤ پورا واقعہ کیا ہوا تھا؟" انہوں نے کہا اور میری زبان کھل گئی۔ میں نے اُنہیں ساری تفصیل بتا دی اور یہ تک بتایا کہ میں نے اُسے ایک بار قتل کر دیا تھا۔

"ہاں......اور قتل ہونے کے باوجود وہ دوبارہ زندہ ہو گئی۔"

"ایسا ہی ہوگا......مگر اب ایسا نہیں ہوگا۔ میں نے اُسے اس طرح دفن کر دیا ہے کہ اب وہ کبھی زندہ نہیں ہو سکے گی۔"

"میں تمہیں ایک بات بتاؤں؟" فادر جیکسن بولے۔

"جی فادر!"

"تم نے غلط کیا۔ تمہیں اُس سے دوستی کرنا چاہئے تھی۔ لوگ تو روحوں کو قبضے میں کرنے کے لیے وظیفے وغیرہ پڑھتے ہیں، چلّے کھینچتے ہیں اور نجانے کیا کیا حرکتیں کرتے ہیں۔ مگر اکثر ناکام رہتے ہیں۔ وہ تو خود تمہاری طرف کھنچی چلی آ رہی تھی مگر تم نے اُس سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھایا۔"

"کیسا فائدہ......فادر......؟"

"راتوں رات تم امیر ترین بن سکتے تھے۔ اپنے دشمنوں کو ناکوں چنے چبوا سکتے تھے اور بھی لاتعداد کام سرانجام دے سکتے تھے۔"

"نہیں فادر! میں تو بس ایک بات جانتا ہوں کہ وہ میری بہن کی قاتل تھی اور قاتل بھی ایسی کہ ساری دنیا کی فوج اور پولیس مل کر بھی اُس کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتی تھی۔ کیونکہ وہ صرف مجھے نظر آتی تھی۔ میں نے اُس سے اپنی بہن کا بدلہ لے لیا ہے"

"میں تمہیں بتاؤں کہ تم نے غلط کیا ہے۔" فادر جیکسن نے کہا۔

"آخر کیوں فادر؟"

"تمہارا خیال ہے کہ تم نے اُس سے نجات حاصل کر لی؟" فادر کے ان الفاظ پر میرا دل اندر ہی اندر لرزنے لگا۔ میں نے آہستہ سے کہا۔

"جی ہاں۔"

"صاحبزادے! اگر وہ واقعی کوئی روح تھی تو یہ سمجھ لو کہ روح کو نہ کوئی قید کر سکتا ہے اور نہ قتل کر سکتا ہے۔"

"لیکن وہ روح نہیں تھی۔" میں نے کھوکھلے لہجے میں کہا۔

"روح نہیں تھی تو دوسروں کو نظر کیوں نہیں آتی؟ اپنا کیا نام بتاتی تھی وہ؟"

"میں نے آپ سے کہا تھا ناں کہ میں جب ٹیکسلا میوزیم گیا تھا اور وہاں میں ایک سرنگ میں داخل ہو کر ایک بڑے کمرے میں پہنچا تھا تو مجھے سکندر اعظم کا نام دیا گیا تھا اور اُسے ترشولی کہہ کر مخاطب کیا گیا تھا۔ کسی علاقے کا نام بھی لیا گیا تھا، جہاں کی وہ جادوگرنی تھی۔"

"ہوں......" فادر جیکسن نے آنکھیں بند کیں اور اُن کا ہاتھ گلے کی صلیب پر پہنچ گیا۔ ایک لمحے تک وہ اس طرح رہے اور پھر اُچھل گئے۔

"کیا وہ تم سے بات کرنے کے لیے اپنے ہونٹ ہلاتی تھی؟"

"ہاں۔"

"ذرا اُس کے انداز میں ہونٹ ہلا سکتے ہو تم؟ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ وہ کیا بولتی تھی۔"

میں نے اپنے ذہن پر زور دیا اور اپنے ہونٹ ہلائے۔ وہ بری طرح اپنی جگہ سے اُٹھ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ پھر وہ بے چینی سے بولے۔

"اور......اور کیا کہتی تھی؟"

"کہتی تو کچھ بھی نہیں تھی، بس ہونٹ ہلاتی تھی۔"

"ہاں......ہاں......میرا بھی یہی مطلب ہے۔" میں نے دوبارہ ہونٹ ہلائے اور وہ پھر اچھل پڑے اور پھر دوبارہ بیٹھ گئے۔

"فادر کو لپ ریڈنگ میں کمال حاصل ہے۔" میڈم میلسی نے بتایا۔

"مجھے بتائیے، میں اور کیا کہوں؟"

"تم نے جس انداز میں ہونٹ ہلائے ہیں، اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ تم سے کافی باتیں کرنا چاہتی تھی۔ درحقیقت اُس کا نام ترشولی ہی تھا۔ ہزاروں سال پہلے بھی اُسے ترشولی ہی کہا جاتا تھا اور آج بھی اُسے اسی نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ کچھ جادوگر اُسے ترشولی کا نام تو دیتے ہیں لیکن اُس کی حیثیت کو تسلیم نہیں کرتے۔ اُس کے بال جگہ جگہ مختلف شکلوں میں بکھرے ہوئے ہیں اور انہیں ترشولی کہہ کر جادو ٹونوں کی تکمیل کے لیے دیا جاتا ہے۔ وہ تم سے ایک چھوٹی سی درخواست کرتی تھی۔ پتہ ہے وہ تم سے کیا کہتی تھی؟"

"فادر! آپ اُس کے دل کی بات کیسے کہہ سکتے ہیں؟"

"تمہارے ہونٹوں کی جنبش سے اُس کے الفاظ کو پڑھ کر۔"

"تو......تو وہ کیا کہتی ہے؟"

"وہ کہتی تھی کہ میرے لیے کسی اپنی پسند کی لڑکی کا جسم مہیا کر دو۔" فادر جیکسن نے کہا اور مجھے جھرجھری سی آ گئی۔

میں فادر کا مطلب کچھ کچھ سمجھ گیا تھا۔ پھر بھی میں نے بے وقوفوں کی طرح منہ کھول کر کہا۔

"اس بات کا مطلب کیا ہوا؟"

فادر نے میری طرف گھور کر کہا اور بولے۔

"کس کلاس میں پڑھتے ہو صاحبزادے؟"

"آٹھویں جماعت پاس کر کے نویں جماعت میں آیا ہوں۔"

"پھر بھی اتنی سی بات نہیں سمجھ پائے۔ وہ عام لڑکیوں کی طرح اس دنیا میں آنا چاہتی ہے اور اس کے لیے اُسے ایک معقول اور مناسب جسم کی ضرورت ہے۔" فادر مسکرائے اور پھر بولے۔

"میرا خیال ہے کہ میں اُس کی یہ خواہش پوری کر سکتا ہوں۔"

"جی، میں سمجھا نہیں۔"

اچانک فادر آگے بڑھے اور اُنہوں نے مضبوطی سے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور بولے۔

"مجھے اپنے گھر لے چلو۔ میں ترشولی کو اس گڑھے سے باہر نکالوں گا جس میں تم نے اسے دفن کیا ہے۔ اسے بتاؤں گا کہ اُس کی آرزو پوری کی جا سکتی ہے۔ وہ ایسی عورت نہیں ہے، جو اپنے محسن کو فراموش کر دے۔ اگر وہ خوش ہو گئی تو جانتے ہو کہ ہمیں کیا مل جائے گا؟"

"میرا ہاتھ چھوڑیئے۔" میں نے غرائی ہوئی آواز میں کہا۔ مجھے فادر کی یہ بات اچھی نہیں لگی تھی۔ میں اپنی بہن کے قاتل کو اپنے کسی مقصد کے لیے زندگی نہیں دے سکتا تھا۔ میں نے اُن سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور دروازے کی طرف چھلانگ لگا دی۔ فادر تیزی سے آگے بڑھے تھے۔ اُن کی آواز اُبھر رہی تھی۔

"میری بات سنو......احمق! بے وقوف! میری بات سنو۔ میں تمہارے نفع کے لیے کہہ رہا ہوں۔ میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا۔ بس میری ایک بات سن لو۔"

میں آگے بڑھ کر گیٹ کے نزدیک پہنچ گیا اور پھر فوراً ہی گیٹ سے باہر نکل گیا۔ فادر غالباً مجھ پر غرا رہے تھے، گالیاں بھی بک رہے تھے۔ میں سیدھا وہاں سے چل پڑا۔ فادر کی باتوں پر مجھے غصہ بھی تھا اور ہنسی بھی آ رہی تھی۔ خوامخواہ بکواس کر رہے تھے۔

میں کافی دیر تک بھاگتا رہا۔ پھر مجھے ایک پارک نظر آیا اور میں وہاں جا کے ایک بینچ پر بیٹھ گیا۔ فادر کتنی فضول باتیں کر رہے تھے۔ مجھے اس کی اُمید نہیں تھی۔ وہ میری چھوٹی بہن کی قاتل تھی۔ اُس نے انتہائی بے دردی کے ساتھ رخسانہ کا بازو اُس کے جسم سے جدا کر دیا تھا اور میں اُسے اپنے قبضے میں کرنے کے لیے اس کی بات مان لوں۔ فادر جیکسن مجھے بے وقوف معلوم ہو رہے تھے۔ میں نے اُس عورت کو دو بار قتل کیا تھا۔ پہلی بار قتل ہونے کے بعد میری بے وقوفی اور لاعلمی کے باعث وہ دوبارہ جی اُٹھی تھی۔ اب جب کہ میں نے اُسے موت کے گھاٹ اُتار دیا تھا اور گڑھے میں اس طرح دبا دیا تھا کہ وہ اس سے باہر آ کر زندہ نہیں ہو سکتی تھی، فادر جیکسن اس مصیبت کو اس توقع میں گڑھے سے باہر نکالنے اور نئے سرے سے زندہ کرنے کے درپے تھے کہ وہ زندہ ہوتے ہی مجھے اور اُنہیں دنیا کی دولتوں سے مالا مال کر دے گی۔ یہ ہی نہیں بلکہ اُن کا ارشاد تھا کہ اُسے ایک نوجوان اور خوب صورت لڑکی کے بدن کی ضرورت ہے۔ ہمیں اس کے لیے کسی مناسب جسم کا انتظام کرنا ہے۔ وہ میری بہن کی قاتل تھی۔ اگر وہ فادر جیکسن کی بیٹی کو قتل کر دیتی تو میں دیکھتا کہ فادر جیکسن کس طرح اُس کی حمایت کرتے۔

یہ ساری باتیں میں سوچتا رہا۔ فادر تو دنیا کے فوائد حاصل کرنے کی غرض سے کچھ بھی کرنے کو تیار تھے لیکن میں ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ وہ میری بہن کی قاتل تھی۔ اُسے دنیا میں واپس آنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ بہرحال میں نے ایک تو یہ فیصلہ کیا ہوا تھا کہ میں جان پر کھیل جاؤں گا

مگر فادر جیکسن کو اپنے کمرے میں قدم نہیں رکھنے دوں گا۔ جو کچھ بھی ہے، اُن کی اور میری سوچ میں فرق ہے۔

میں گھر واپس آیا تو گھر کے افراد گہری نیند سو چکے تھے۔ بس امی جاگ رہی تھیں۔ اُنہوں نے مجھے دیر سے آنے کے لیے بڑے پیار سے منع کیا اور میں اُن سے وعدہ کر کے اپنے کمرے میں آ گیا۔ مگر مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ کمرے کے کونے میں جہاں وہ غروب ہوتی تھی، اُسی کونے میں، میں نے اُسے دفن کیا تھا۔ جب رات کو زیادہ دیر تک نیند نہیں آئی تو میں اپنے کمرے سے باہر نکل آیا اور ٹہلنے کے سے انداز میں چل پڑا۔

میں سامنے کے میدان کی طرف چلا تو مجھے یوں معلوم ہوا جیسے کوئی میرے پیچھے پیچھے آ رہا ہو۔ پلٹ کر دیکھا تو کچھ بھی نہیں تھا۔ دُور دُور تک سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ چند قدم آگے بڑھائے ہوں گے کہ پھر وہی احساس ہونے لگا۔ میں رُک گیا۔ بہت دُور مجھے ایک سمت ایک سایہ جاتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ میں اُسے سایہ نہیں کہہ سکتا تھا کیونکہ اُس کے بدن سے روشنی کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔ چند لمحات وہ مجھے نظر آتا رہا، اس کے بعد وہ گم ہو گیا۔ میں قرب و جوار میں قدموں کی چاپ محسوس کرنے لگا۔ اس چیز کا جائزہ لینے کے لیے میں نے دوبارہ میدان کی طرف قدم اُٹھایا تو اچانک مجھے کسی کے کھلکھلا کر ہنسنے کی آواز آئی۔

ہنسی کی آواز میرے لیے نئی نہیں تھی۔ لیکن ساری زندگی ہنسی کے اس منفرد انداز کو میں فراموش نہیں کر سکتا تھا۔ وہ ہنسی میری پیاری بہن رخسانہ کی تھی۔ لیکن خود رخسانہ وہاں موجود نہیں تھی۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں وہیں دوبارہ میدان کے اُس حصے میں بیٹھ کر رخسانہ کی ہنسی کا دوبارہ انتظار کرنے لگا۔ آدھا گھنٹہ وہاں پر گزر گیا اور مجھے نا اُمیدی ہونے لگی۔ رخسانہ کو کیا پڑی تھی کہ وہ جنت کو چھوڑ کر وہاں آتی۔ یہ صرف میرے شعور کی آواز تھی۔ کمرے میں واپس آنے کے بعد بھی میں دیر تک بستر پر لیٹا رخسانہ کو یاد کرتا اور روتا رہا۔ میرا پلنگ اس بند گڑھے پر تھا، جس میں ترشولی کے کے بدن کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کی قبر تھی۔ بہر حال نجانے کب تک میں سوچتا رہا۔

دوسرے دن صبح اس وقت جاگا جب نورین مجھے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جگا رہی تھی۔

"اُٹھنا ہے جناب! یا نہیں؟"

میں حیران ہو کر جلدی سے اُٹھ گیا۔

"نورین! تم؟"

"جی سر! گیارہ بج رہے ہیں اور میں خود نہیں آئی بلکہ مجھے بلایا گیا ہے۔"

"کس نے بلایا ہے تمہیں؟" میں نے سوال کیا۔

"امی کو ایک ضروری کام کے سلسلے میں تمہاری امی سے ملنا تھا۔ بس وہ مجھے اپنے ساتھ کھینچ لائیں۔ میں تو تم سے ناراض ہوں۔ کیونکہ تم میری تقریب میں نہیں آئے۔ اور یہ تم نے اپنے کمرے کی کیا حالت بنا رکھی ہے؟ میز کرسی کو دیوار سے لگا دیا ہے، پلنگ کمرے کے درمیان میں ڈال رکھا ہے۔"

اچانک اُس نے پلنگ سے لگی ہوئی چادر کو ہٹا کر دیکھا اور بولی۔ "یہاں کوئی خزانہ چھپا ہوا ہے کیا؟" اُس نے نیچے جھانکا اور اُس کے منہ سے حیرت کی چیخ نکل گئی۔ وہ جگہ صاف نظر آ رہی تھی جسے کھود کر میں نے ترشولی کو اس میں دبایا تھا۔

"یہ کیا ہے سکندر؟"

"جو کچھ ہے، میں تمہیں اس وقت نہیں بتا سکوں گا۔"

"آخر ہے کیا؟ مجھے بتاؤ تو سہی۔ یہ تو ایسا لگتا ہے جیسے تم نے کوئی بہت بڑا خزانہ یہاں دفن کیا ہے۔"

وہ خود ہی پلنگ کو کھینچنے لگی تو میں نے اُسے ایک طرف کر کے پلنگ ہٹا دیا۔ لیکن تعجب سے میری آنکھیں پھیل گئیں۔ فرش کے اس حصے پر جسے مٹی کا ایک ہموار ڈھیر ہونا چاہئے تھا، وہ بہت ہی خوب صورت ٹائلوں سے شطرنج کی کالے اور سفید خانوں کی بساط بنی ہوئی تھی اور بہت اچھی لگ رہی تھی۔ نورین حیرت سے بولی۔

"پہلے تو شاید یہاں ایسی جگہ نہیں تھی۔"

"نہیں، شاید جادو کے زور سے خود بخود اس کا عمل وجود میں آ گیا ہے۔" میرے منہ سے نکلا اور نورین ہنسنے لگی۔

"اچھا...... تو جناب جادوگر بھی ہیں۔" نورین نے پُر مزاح لہجے میں کہا۔

میرا دماغ اس وقت ماؤف ہو رہا تھا۔ میں نورین کی صورت دیکھتا رہا، وہ بولی۔

"اب چلیے جناب! آئیے۔" اُس نے کہا اور میں باہر نکل آیا۔ نورین میرے ساتھ باہر نکل آئی تھی۔ میں اُٹھ کر اس کمرے میں آ گیا جہاں نورین کی والدہ اور میری امی سر جوڑے باتیں کر رہی تھیں۔ سلام دعا کے بعد انہوں نے نورین سے کہا۔

"اب چلیں یا رکو گی؟"

"ٹھیک ہے، میں چلتی ہوں۔"

میں ہنستا ہوا اپنے کمرے کی طرف چل پڑا۔ اندر پہنچا تو حیران رہ گیا۔ چند لمحوں قبل جیسا کمرہ چھوڑ کر گیا تھا، اس سے بالکل ہی مختلف نظر آ رہا تھا۔ میرا پلنگ نفاست سے بچھا ہوا تھا۔ فرش آئینے کی طرح چمک رہا تھا۔

یہ سب کچھ کیسے ہو گیا؟........ میرا دل و دماغ اُلجھنوں میں پھنسا ہوا تھا۔ سمجھ میں نہیں آ تھا کہ راتوں رات فرش میں یہ ٹائل کس نے لگائے؟ کون تھا یہ سب کچھ کرنے والا؟ انتہ پراسرار حالات ہو گئے تھے۔

سہ پہر کو امی نے بتایا کہ نورین کی والدہ کیوں آئی تھیں۔

اُن کی ایک بھانجی تھی۔ خوش شکل، باسلیقہ اور امورِ خانہ داری میں ماہر۔ تعلیم حاصل کر ر تھی۔ والدین نے ایک اچھے کھاتے پیتے گھرانے کے لڑکے کے ساتھ اُس کی منگنی کر دی۔ کچھ دنوں اُس لڑکے نے اچانک منگنی توڑ دی اور مشہور کر دیا کہ لڑکی کا کردار اچھا نہیں ہے۔ اُن کا ک تھا کہ اگر امی اپنے بھائی یعنی ہمارے ماموں جان سے اُس لڑکی کا رشتہ طے کرا دیں تو لڑکی ک والدین میاں بیوی کو تعلیم کے لیے باہر بھیجنے اور ان کے تمام اخراجات اُٹھانے کے لیے تیار ہیں.

امی جانتی تھیں کہ میرے چھوٹے ماموں کو باہر جا کر تعلیم حاصل کرنے کی بڑی آرزو تھی۔ موقع مل رہا تھا تو امی بھی خوش ہو گئی تھیں۔ مجھے بھی معلوم تھی یہ بات کہ چھوٹے ماموں کو امریکا جانے کی بہت خوشی تھی۔ لیکن گھر کے حالات اس قدر خراب تھے کہ ایسا بالکل نہیں ہو سکتا تھا۔ تذکرہ نعیمی صاحب کے خاندان والوں سے بھی ہوا تھا اور اسے یاد رکھتے ہوئے ہی یہ بات سوچ گئی تھی۔

ابھی ہمارے درمیان یہ باتیں ہی ہو رہی تھیں کہ اچانک ہی بیل بجی۔ میں ہی باہر نکلا تھا میں نے گیٹ کھول کر دیکھا تو سامنے ہی قادر جیکسن کھڑے ہوئے مجھے گھور رہے تھے۔

انھوں نے غرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”تم سمجھ رہے تھے کہ میں تمہارا پتہ کبھی نہیں پا سکوں گا۔“

”قادر! میں آپ کی بے پناہ عزت کرتا ہوں، میڈم میلسی بہت اچھی خاتون ہیں۔ لیکن آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟“

”میں تمھیں عزت، دولت اور شہرت کے عروج پر دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”شکریہ........ مجھے اس میں سے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔“

”تو پھر تم یہ بات یاد رکھو کہ تم نے اپنے گھر میں ایک عورت کو قتل کر کے دفن کیا ہوا ہے۔“

”تو پھر؟........ آپ پولیس کو لائیں گے؟ کیا کریں گے آپ میرے گھر میں؟“

”وہ سب بعد کی باتیں ہیں۔ تم سونے کو پیتل سمجھ کر ٹھکرا رہے ہو۔“

”قادر! میں جو کچھ کر رہا ہوں، میں جانتا ہوں۔ آپ کو اس سے کیا غرض ہے؟“

”مجھے غرض ہے۔ کیونکہ اس کا فائدہ مجھے بھی پہنچے گا۔“

”سوری۔ میں کچھ نہیں کر سکتا۔“

وہ کچھ لمحوں تک سوچتے رہے اور پھر غرا کر بولے۔

”ٹھیک ہے، میں ٹیڑھی اُنگلیاں استعمال کروں گا۔“

”میں نے کہا ناں، جو آپ کا دل چاہے کیجیے۔“

”میں پولیس کو بتاؤں گا کہ تم نے ایک عورت کو قتل کر کے اپنے گھر میں دبا رکھا ہے اور اس کے بعد پولیس تمہارے گھر پر چڑھ دوڑے گی۔“

”تو قادر! پولیس کو کچھ نہیں ملے گا۔ کیونکہ ترشولی کو صرف میں ہی دیکھ سکتا ہوں۔“

”ہوں........ چھوڑو اس بات کو۔ مجھے بھی کچھ علم آتے ہیں۔“

”قادر! آپ ایک بات سمجھ لیجیے کہ اگر آپ پولیس اسٹیشن پہنچے تو یوں سمجھ لیجیے کہ آپ کا ہر قدم موت کے منہ کی طرف اُٹھے گا۔“

میں نے یہ جملہ انھیں یوں ہی ڈرانے اور پولیس اسٹیشن جانے سے روکنے کے لیے کہہ دیا تھا۔ جبکہ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر وہ پولیس کو لے کر آ گئے تو پورا محلہ بھی مل کر انھیں میرے گھر کی کھدائی کرنے سے نہیں روک سکے گا۔

لیکن مجھے نہیں معلوم تھا کہ میرے منہ سے نکلنے والے یہ الفاظ کیا ہیں۔ قادر تیز تیز چل کر گلی پار کر کے سڑک پر پہنچے ہی تھے کہ اچانک ایک کار تیز رفتاری سے اُدھر سے گزری اور فٹ پاتھ پر چڑھ کر انھیں کچلتی ہوئی ایک مکان کی دیوار سے ٹکرا گئی۔ چاروں طرف سے لوگ دوڑ پڑے۔ حادثے کی جگہ میرے گھر سے زیادہ دُور نہیں تھی۔ میں حیرانی سے اُدھر دیکھتا رہا۔ قادر کے سر کے ٹکڑے اُڑ گئے تھے اور اُن کا بھیجہ ناک اور منہ کے راستے باہر نکل آیا تھا۔ وہ چشم زدن میں ختم ہو گئے تھے۔ تیز رفتار کار کے بھی پرخچے اُڑ گئے تھے۔

بعد میں پتہ چلا کہ یہ کار چوری کی تھی۔ اُس کا ڈرائیور بھی زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھا۔ اُس نے بیان دیا تھا کہ وہ اس کار کو چرا کر اڈے پر لیے جا رہا تھا کہ اچانک ہی اس کے بریک ناکارہ ہو گئے۔

ایک بات رہ رہ کر میرے ذہن میں گونج رہی تھی۔ وہ یہ کہ بریک بالکل اتفاقیہ طور پر ناکارہ نہیں ہوئے تھے۔ یہ حادثہ اس لیے ہوا تھا کہ وہ پولیس اسٹیشن نہ جانے پائیں، میرے گھر کی کھدائی نہ ہو۔ مگر وہ تھا کون، جو ترشولی کو آزاد ہوتے ہوئے نہیں دیکھنا چاہتا تھا؟ وہ کون تھا جس نے گڑھے کے بدصورت نشان کو ٹائلوں کے خوب صورت ڈیزائن میں تبدیل کر دیا تھا؟ اگر وہ میرا ہمدرد تھا تو کیوں؟

پھر میں ان باتوں کو سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک ہی میرے خیالات کی رو پڑوس کے ایک استاد پروفیسر دین نے تتر بتر کر دی، پروفیسر دین آہستہ سے کہہ رہے تھے۔

”یہ صاحب تمہارے پاس آئے تھے؟“

"جی ہاں...... یہ میری میڈم کے والد تھے۔ اور مجھ سے کچھ کہہ رہے تھے۔"

"میں نے تمہارے الفاظ سنے تھے۔ تم نے چیخ کر کہا تھا کہ وہ پولیس اسٹیشن نہیں، موت کے منہ میں جا رہے ہیں۔ وہ پولیس اسٹیشن کیوں جا رہے تھے، کچھ بتاؤ گے مجھے؟" پروفیسر دین نے کہا اور میں گنگ سا رہ گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں پروفیسر دین کے ان الفاظ کا کیا جواب دوں۔

دوسری طرف فادر جیکسن کی لاش کو اُٹھانے کا کام کیا جا رہا تھا۔ پروفیسر دین مجھ سے نجانے کیا کیا باتیں کرتے رہے۔ لیکن میں یہ سوچ رہا تھا کہ میں انہیں اُن کی بات کا کیا جواب دوں میں نے کہا۔

"بس فادر جیکسن، میلسی کے بارے میں بات کر رہے تھے۔ میلسی کا ایک راز تھا۔ اس کے لکھے ہوئے کچھ خطوط میرے پاس تھے، جو فادر جیکسن مجھ سے مانگ رہے تھے۔ میں نے اُن سے کہہ دیا کہ وہ خطوط میرے پاس نہیں ہیں۔ مگر وہ ضد کر رہے تھے۔"

"کمال کی بات ہے۔ بات میری سمجھ میں آ نہیں رہی۔ خیر آج کل حالات کچھ ایسے ہی چل رہے ہیں۔ کوئی کیا کر سکتا ہے؟"

میں گھر واپس آنے کے ارادے سے مڑا ہی تھا کہ دو افراد جلدی سے کود کر نیچے اُترے۔ یہ دونوں ہسپتال ہی کے آدمی تھے۔ پولیس والے ابھی اس جگہ کا جائزہ ہی لے رہے تھے، جہاں یہ حادثہ ہوا تھا۔ وہ لاش اُٹھا کر لے جائی جا چکی تھی۔ میں بھی زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ ایمبولینس سے آنے والے کوئی چیز تلاش کر رہے تھے۔ مجھے ایک دم پتہ چلا کہ وہ جو چیز تلاش کر رہے ہیں، وہ فادر جیکسن کا ایک ہاتھ ہے، جو حادثے کے بعد یہیں رہ گیا تھا۔

"ہم بہت عجلت میں پادری صاحب کی لاش کو یہاں سے لے گئے تھے کہ شاید انہیں بچایا جا سکے اس وقت ہم نے ان پر زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔ لیکن جب لاش کو ایمبولینس سے اُتارا گیا تو پتہ چلا کہ ان کا دایاں ہاتھ حادثے کی نذر ہو کر ان کے جسم سے علیحدہ ہو چکا ہے۔"

"مگر یہاں کوئی ہاتھ نہیں ہے۔" چاروں طرف جائزہ لیا گیا۔

میں سکتے کے عالم میں یہ بات سن رہا تھا اور مجھے بہت سی باتیں یاد آ رہی تھیں۔ ٹیکسلا کے میوزیم میں سکندر اعظم کے حکم پر ترشولی کا ایک ہاتھ کاٹا گیا تھا۔ میری بہن رخسانہ کا بھی ایک ہاتھ ہی غائب کیا گیا تھا۔ اور اب فادر جیکسن کا بھی ایک ہاتھ ہی غائب تھا۔ وہ اسے تلاش کرتے رہے۔ اور مسئلہ جوں کا توں رہا۔ ساری باتیں ختم ہو گئی تھیں اور میں اس ہاتھ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

پروفیسر دین جگی آدمی تھے۔ انہوں نے پولیس کو بھی وہ بیان دے ڈالا اور پولیس والے

میرے پاس پہنچ گئے۔ میں نے انہیں بھی وہی بے تکی کہانی سنائی تھی۔ اس پر انہوں نے مجھ سے درخواست کی کہ میں اپنا بیان دے دوں۔

میرے گھر کے لوگ تو ویسے ہی پریشان تھے، اس واقعے سے مزید پریشان ہو گئے۔ لیکن پولیس کو بیان دینے کے لیے مجھے پولیس اسٹیشن جانا پڑا تھا۔

پروفیسر دین بھی عذابِ الٰہی تھے۔ وہ خود بخود پولیس اسٹیشن پہنچ گئے تھے اور اُنہوں نے میرے بارے میں اپنا بیان دے دیا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ پولیس والوں نے میری عمر کو سامنے رکھتے ہوئے مجھ سے کوئی خاص بات نہیں پوچھی تھی۔ بہرحال چونکہ میلسی ہمارے اسکول کی میڈم تھی، مجھ سے خاص طور سے نورین نے فرمائش کی تھی کہ اُس کے فادر کی آخری رسومات میں شرکت کے لیے ہمیں ان کے گھر جانا ہوگا۔

نجانے کس طرح پروفیسر دین بھی وہاں پہنچ گئے تھے۔ میلسی بے چاری شدید غمزدہ تھی۔ اُس کا چہرہ رو رو کر سوج گیا تھا۔ اُسے اُس کا منگیتر سنبھالے ہوئے تھا۔ فادر کی آخری رسومات کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔

جب فادر جیکسن کے آخری دیدار کے لیے لوگوں کو طلب کیا گیا تو میں بھی وہاں پہنچ گیا۔ میں نے فادر جیکسن کو دیکھا۔ اُن کا چہرہ تو بھرتہ بن گیا تھا۔ میں نے خاص طور سے اُن کے کٹے ہوئے بازو والے حصے کو دیکھا۔ یہ ہاتھ کسی حادثے کا شکار نہیں ہوا تھا بلکہ جس طرح اُن کا کندھا نظر آ رہا تھا، اسی طرح میری بہن رخسانہ کا کندھا بھی بغیر بازو کے نظر آیا تھا۔ اسے بڑی مہارت اور اطمینان کے ساتھ کاٹا گیا تھا۔

مگر یہ حرکت ترشولی کی تو نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ تو میرے کمرے میں فرش کے نیچے دبی پڑی ہوئی تھی۔ پھر یہ کس نے کیا؟ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ مجھ سے ترشولی کو سمجھنے میں غلطی ہوئی ہو۔ میری بہن کا بازو کسی دوسری بدروح نے کاٹا ہو اور میں نے اپنے ذہن میں ترشولی کو اُس کا ذمہ دار قرار دیا ہو۔ پھر وہ منظر کیا حیثیت رکھتا تھا، جب کمرے کی تاریکی میں ترشولی نے ہنستے ہوئے مجھے رخسانہ کا کٹا ہوا بازو دکھایا تھا۔ ہو بھی سکتا ہے کہ ترشولی نے اس وقت اس دوسری بدروح سے یہ بازو حاصل کر کے مجھے اپنی کامیابی سے آگاہ کیا ہو۔

پھر میرے دماغ نے ایک اور پلٹا کھایا۔ ترشولی اگر اتنی نیک اور شریف تھی تو اُسے میرے ساتھ تعاون کرنا چاہیے تھا۔ کیونکہ دوسری روح ترشولی سے زیادہ طاقت ور تھی۔ میرا ذہن دوہری کیفیت کا شکار ہو گیا تھا۔ گھر والے الگ پریشان تھے۔ میں نے یہی فیصلہ کیا جس طرح بھی بن

پڑے، کم از کم اپنے والدین اور بھائی وغیرہ کو تو اپنے اعتماد میں لینا چاہیے۔ میں نے اپنی ماں کو ساری تفصیل بتا دی تھی۔ پہلے بھی اُنہیں میرے بارے میں اتنی تفصیل تو معلوم تھی کہ تاریکیوں میں میرے ساتھ کیا ہوتا ہے۔

جب میں خاموش ہوا تو کہنے لگیں۔

"کبھی کبھی دل چاہتا ہے کہ وہ منحوس عورت جو تمہیں دکھائی دیتی ہے، کہیں مل جائے تو اس کی گردن اُڑا دوں۔ آہ........ اُس نے میری پھول جیسی معصوم بچی کو چھین لیا۔ اور یقیناً فادر جیکسن بھی اُسی کا شکار ہوئے ہیں۔"

میں نے ساری باتیں اپنی ماں کو بتا دی تھیں لیکن یہ نہیں بتایا تھا کہ میں نے اپنے طور پر ترشولی کو ختم کرنے کے لیے ایک ایسا عمل کیا ہے کہ وہ سوچ بھی نہیں سکتیں۔ وہ میرے کمرے میں فرش کے نیچے دبی ہوئی ہے۔

میں ماں کے سامنے یہ بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ کوئی اور ہی بدروح تھی، جس نے فادر جیکسن کو ختم کرایا ہے۔ حالانکہ اُ کا طریقہ ترشولی سے ہی ملتا جلتا تھا۔ لیکن نمایاں فرق یہ تھا کہ ترشولی ہماری دشمن تھی، جبکہ دوسری روح میری ہمدرد تھی۔ بہرحال اتنا میں نے امی کو بتا دیا تھا۔

ہمارے گھر کوئی آیا اور بیل بجی تو امی نے اُسے اندر بلا لیا۔ یہ ایک بے انتہا بوڑھی عورت تھی۔ کمان جیسی کمر، لکڑی کے سہارے رینگتی اور کراہتی اندر آئی اور باورچی خانے کی دیوار سے کمر ٹکا کر بیٹھ گئی۔ میرے لیے یہ عورت بالکل نئی تھی۔ امی باورچی خانے میں چلی گئیں اور وہ عورت دعائیں دینے لگی۔

اچانک ہی امی کی آواز اُبھری۔ "رات کے وقت آتے ہوئے تکلیف ہوتی ہے تو دن میں آ جایا کرو، رحمت آپا! میں عصر کے بعد تمہارے لیے روٹی ڈال دیتی ہوں۔"

"اچھا بیٹی!" اُس عورت نے کہا اور پھر دعائیں دیتی ہوئی مجھ سے بولی۔ "بیٹا! تمہارا نام کیا ہے؟"

"سکندر۔"

"اللہ کرے سکندرِ اعظم جیسی تقدیر پاؤ۔ آدھی دنیا کے بجائے پوری دنیا فتح کر لو۔" عورت نے کہا اور میرے بدن کے رونگٹے ایک لمحے کے لیے کھڑے ہو گئے۔ سکندرِ اعظم ہی کے حوالے سے تو میں نے اپنی بہن کھو دی تھی۔ اور ایک ایسی بلا کو اپنے سر لگا لیا تھا، جس نے مجھے مصیبت میں ڈال دیا تھا۔ ماں نے اس عورت کے بارے میں بتایا کہ ایک بہت ہی غریب عورت ہے۔ بال بچے اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں۔ یہاں کچھ کھانے پینے کی چیزیں لینے کے لیے آ جاتی ہے۔ ہمارے گھر کے پچھواڑے میدان تھا۔ اور میدان کو پار کرنے کے بعد ایک بہت بڑا پلاٹ تھا،

جہاں اب جھونپڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ بچوں کو یہاں چھوڑ دیا جاتا تھا اور وہ گالیاں بکتے ہوئے اِدھر سے اُدھر بھاگتے پھرتے تھے۔ کچھ بچے بھیک مانگنے بھی نکل آتے تھے۔ یہ عورت اُنھی جھونپڑیوں میں رہا کرتی تھی۔

بہر حال وقت گزرتا چلا گیا۔ میں اپنے کمرے میں پہنچا تو مجھے ایک بار پھر فادر جیکسن کے ساتھ پیش آنے والا واقعہ یاد آ گیا۔ میں نے فادر جیکسن کی لاش دیکھی تھی اور میرے ذہن پر ایک عجیب سا بوجھ طاری تھا۔ یہ سب کچھ ہوا تو تھا اور میرا ذہن میری عمر کے مطابق ہی سفر کر رہا تھا۔ لیکن بہت سی باتیں ایسی بھی تھیں، جن کا تعلق بچپن ہی سے رہ جاتا ہے۔ پلنگ پر بیٹھ کر میں نے فرش کے اس حصے کو دیکھا، جس پر ٹائلوں سے شطرنج کی بساط بنی ہوئی تھی اور ترشولی اسی کے نیچے دفن تھی۔ نجانے کیوں میرے منہ سے نکل گیا۔

"کیا تم اب بھی زندہ ہو ترشولی؟" یہ بات اچانک ہی میرے منہ سے نکلی تھی۔ مگر مجھے کوئی جواب نہیں ملا۔ میں نے پھر کہا۔ "مجھے ایک بات کا جواب دو۔ کیا تم ہی نے فادر جیکسن کو کار کے نیچے کچلوایا ہے؟ اور کیا اُن کا ہاتھ بھی تمہارے ہی پاس ہے؟"

اچانک ہی مجھے کچھ وہم سا ہوا کہ کمرے میں کوئی سرسراہٹ اُبھری ہے۔ میں نے پھر کہا۔ "میری بات سن رہی ہو تو مجھے جواب دو۔" کمرے کی خاموشی بدستور تھی۔ میں نے آہستہ سے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ مگر میں جانتا ہوں کہ کوئی نہ کوئی اس کمرے میں ضرور موجود ہے۔ میرے علاوہ اگر تم ترشولی نہیں ہو تو مجھے اپنی موجودگی سے آگاہ کرو۔"

مجھے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ میز پر رکھی ہوئی کتاب دو یا تین بالشت اوپر اُٹھی اور پھر میز پر اس طرح آ گئی جیسے اُسے کسی نے میز پر احتیاط سے رکھ دیا ہو۔ میرا دل بری طرح دھڑک اُٹھا تھا۔ میں فوراً سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور میرے منہ سے پھر آواز نکلی۔

"تم جو کوئی بھی ہو، میں تمہیں مجبور تو نہیں کر سکتا لیکن درخواست کر سکتا ہوں کہ مناسب سمجھو تو میرے سوالوں کے جواب ہاں اور نہیں میں دو۔ کتاب کو ایک بار میز پر رکھا جائے گا تو میں سمجھوں گا کہ تمہارا جواب ہاں میں ہے۔ دو بار رکھا جائے گا تو اس کا مطلب نہیں ہوگا۔ بتاؤ کیا تم میری بات پوری کرو گی؟"

کچھ وقت گزرا اور ایسا لگا جو کوئی کمرے میں ہے، وہ سوچ رہا ہے۔ پھر اچانک کتاب اوپر اُٹھی اور ہلکی سی آواز کے ساتھ میز پر پہنچ گئی۔

میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ کہا۔ "کیا تم ترشولی نہیں ہو؟" کتاب میز پر دو بار رکھی گئی۔

"کیا فادر جیکسن کے قتل میں تمہارا ہاتھ ہے؟" میں نے دریافت کیا۔ جواب ہاں میں ملا۔ کیونکہ کتاب سے صرف ایک آواز پیدا کی گئی تھی۔

"کیا میری بہن کو تم نے ہی قتل کیا تھا؟" اس بار دو آوازیں ہوئیں۔

"فادر جیکسن کا ہاتھ تم نے کاٹا ہے؟" دو آوازیں۔

"ترشولی نے کاٹا ہے؟" دو آوازیں۔

"تو یہ کیا کسی تیسرے کی حرکت ہے؟" ایک آواز۔

"تم مرد ہو یا عورت؟" اس بار کوئی آواز نہیں آئی۔ کتاب جوں کی توں اپنی جگہ رکھی رہی۔

میں نے پھر سوال کیا۔ "تم مرد ہو؟" دو آوازیں ہوئیں۔

"اس کا مطلب ہے عورت ہو؟" اس بار ایک آواز ہوئی۔

"فادر جیکسن نے بتایا تھا کہ ترشولی کو کسی عورت کے جسم کی ضرورت ہے۔ کیا یہ بات ٹھیک ہے؟" اس بار ایک آواز میں جواب ملا۔

"تمہیں بھی کسی کے جسم کی ضرورت ہے؟" اس بار دو آوازیں آئیں۔

"میرے کمرے کا فرش تم نے بنایا ہے؟" ایک آواز۔

"شکریہ...... شکریہ...... بہت بہت شکریہ۔ بہت خوب صورت فرش ہے۔ کیا تم نے یہ فرش اس لیے بنایا ہے کہ ترشولی اس میں دفن ہو کر رہ جائے؟" اس بار دو آوازیں ہوئی تھیں۔

"تو پھر کس لیے بنایا ہے؟" میں نے پوچھا مگر فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوا اس سوال کا جواب ہاں یا نہیں میں نہیں دیا جا سکتا تھا۔ سوال کو تبدیل کر کے پوچھا۔

"تو کیا خوب صورتی کے لیے بنایا ہے؟" اس بار ایک آواز ہوئی۔

"کیا میں تم پر اعتماد کر سکتا ہوں؟" جواب ہاں میں ملا۔

"مجھے کوئی نقصان تو نہیں پہنچاؤ گی؟" دو آوازوں کے ساتھ نہیں کا اظہار کیا گیا۔

"آئندہ بھی میرے سوالوں کے جواب دیتی رہو گی؟" اس بار بھی جواب ہاں میں تھا۔

"شکریہ...... تم جو کوئی بھی ہو، بہت اچھی ہو۔ کیا میں تمہیں دیکھ سکتا ہوں؟" جواب نہیں میں ملا۔

"کیا کبھی نہیں دیکھ سکتا؟" اس بار خاموشی طاری ہو گئی۔

"اچھا ایک بات اور بتا دو۔ کیا تم کوئی روح ہو؟" آواز ایک بار آئی۔

"اچھی رُوح ہو؟" میں نے محسوس کیا، جیسے وہ ہنس پڑی ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی ساتھ ایک آواز ہوئی۔ دل چاہ رہا تھا کہ رات بھر اُس سے باتیں کرتا رہوں لیکن نیند بھی ضروری تھی۔

"بس آخری بات۔" "کیا تم ہر وقت میرے ساتھ ہوتی ہو؟" اس بار دو آوازیں ہوئیں۔

"میں چاہتا ہوں کہ آئندہ جب کبھی میرے پاس آؤ تو مجھے تمہارے آنے کا پتہ چل جایا کرے۔" میں نے درخواست کی اور اس بار ایک اور دلچسپ عمل ہوا۔ میری پیشانی کے بالوں کو

تھوڑا سا کھینچ کر اپنی آمد سے مطلع کر دیا گیا۔ اس مرتبہ کوئی آواز نہیں ہوئی۔ مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے ساتھ وہ بھی ہنس رہی ہو۔

"چلو آمد کا تو پتہ چل جائے گا لیکن یہ کیسے پتہ چلے گا کہ تم جا چکی ہو؟" اب میں اُس سے کافی بے تکلف ہو چکا تھا۔ میں نے اس بار کوئی آواز نہیں سنی لیکن میں نے محسوس کیا کہ وہ میرے سوال پر کھلکھلا کر ہنسی ہو۔ پھر پھول کی طرح نرم و ملائم اُنگلیوں سے میرے داہنے کان کی لو کو پکڑ کر دبایا اور چھوڑ دیا۔ یہ گویا اُس کے جانے کا سگنل تھا۔ اس سگنل کے ساتھ ہی کمرے میں سکوت طاری ہو گیا تھا۔

میں سمجھ گیا کہ وہ چلی گئی ہے۔ نجانے کیوں میرے دل پر ایک اُداسی سی طاری ہو گئی تھی۔ مجھے پتہ چل گیا تھا کہ وہ کمرے میں نہیں ہے۔ پھر بھی میں نے کہا۔

"اگر تم موجود ہو تو میز پر رکھی ہوئی کتاب سے ایک بار پھر آواز پیدا کرو، جیسے ابھی کرتی رہی ہو۔" اس بار کوئی آواز نہیں ہوئی اور کتاب اپنی جگہ یونہی پڑی رہی۔ میں نے کمرے کی روشنی گل کر دی۔ سرہانے کی طرف رکھا ہوا ٹیبل لیمپ آن کر دیا۔ اس کی روشنی میں لیٹ کر میں نے ایک کتاب اُٹھائی اور اسے پڑھنے لگا۔ بڑا عجیب سا احساس میرے دل پر تھا۔ اس میں خوشی کی ایک لہر بھی تھی اور ایک انوکھا سا، میٹھا میٹھا تاثر تھا۔ پھر میں نے خواب میں اپنے آپ کو مہیب اور خوفناک انسانوں میں گھرے ہوئے پایا۔ جن کے جسم تو انسانوں جیسے تھے لیکن چہرے اژدھوں، چمگادڑوں، چھپکلیوں اور چیونٹیوں کی طرح تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے ان جانوروں کے چہروں کو لارج کر کے ان انسانوں کے جسموں پر لگا دیا گیا ہو۔

چھپکلی جیسے چہروں والے دو انسان تو ایسے تھے، جو بار بار اپنی زبان باہر نکال کر مجھے کیڑے یا گھونگھے کی طرح ہڑپ کر جانا چاہتے تھے۔ میں ڈر کر ہر بار اُن کے ارادے کو بھانپ کر پیچھے ہٹ جاتا تھا۔ اچانک کسی طرف سے نورین نمودار ہوئی۔ اُس کا پورا بدن دہکتے ہوئے انگاروں سے بنا ہوا معلوم ہوتا تھا، لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ اُس کے جسم کی حرارت کا اثر اُس کے لباس پر نہیں ہو رہا تھا۔ نورین کو دیکھتے ہی یہ دوسری مخلوق پیچھے ہٹ گئی۔ میں نے جلدی سے دوڑ کر نورین کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ہاتھ پکڑتے ہی مجھے یوں لگا کہ جیسے میرے ہاتھوں میں تپتا ہوا لوہا آ گیا ہو۔ بے اختیار ہی میرے حلق سے چیخ نکل گئی اور اس چیخ کے ساتھ ہی میری آنکھ بھی کھل گئی۔ قریب ہی مسجد سے اذان کی آواز آ رہی تھی۔ میرا جسم پسینے سے بھیگا ہوا تھا۔ اُٹھتے ہی سب سے پہلے میں نے اپنے ہاتھ کو دیکھا جو نہ جلا تھا، نہ جھلسا تھا۔ پھر بھی اس میں آگ سی بھری تھی۔

میری حالت کافی خراب ہو گئی تھی۔ خواب کا منظر آنکھوں میں گھوم رہا تھا۔ پھر میں ہمت کر کے اُٹھا تو ابا جی مسجد جا رہے تھے اور امی نلکے پر وضو کر رہی تھیں۔ میں نے غسل کیا، نماز ادا کی۔

مکمل طور پر سکون پھر بھی نصیب نہیں ہوا۔ بہرحال اس کے بعد میں نے اپنے طور پر اپنے آپ کو سنبھالا اور آج میں پوری ہمت اور اعتماد کے ساتھ اسکول گیا تھا۔ ہمارے اسکول میں آٹھویں کلاس میں لڑکیاں بڑی ہو جاتی ہیں، لڑکے چھوٹے رہ جاتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی لڑکے اور لڑکیوں کے سیکشن الگ کر دیے جاتے ہیں۔ لڑکیوں کو لڑکوں کے سیکشن کی طرف جانے کی اجازت نہیں ہوتی۔ کوئی لڑکا اُدھر نکل جاتا تو اُس کی بھی شامت آ جاتی تھی۔

نورین سے ملنا اتنا آسان نہیں تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ نورین سے اس بارے میں بات چیت بھی کرنا چاہتا تھا۔ تیسرے پہر میں نورین کے گھر پہنچا اور اس سے کہا کہ میں نے اُس کی خاطر سائنس اور کامرس کا گروپ نظر انداز کر دیا ہے۔ بس نورین سے ملنا چاہتا تھا۔ کیونکہ گزشتہ رات والا خواب میرے ذہن پر صبح سے مسلط تھا۔ لیکن اس وقت نجانے کیوں میرے ذہن میں وہ خواب نہیں تھا۔ میں نے کسی تجربے کو کرنے کے لیے ڈرتے ڈرتے اپنا ہاتھ اس کی کلائی پر رکھا تو نورین حیرت سے میری طرف دیکھنے لگی۔

"کیا ہوا؟ کیا بات ہے؟"

"نورین! میں نے رات کو عجیب سا خواب دیکھا تھا۔" میں نے نورین کو اپنا پورا خواب سنا دیا اور نورین دنگ رہ گئی۔ اُس کا پورا چہرہ سرخ ہو گیا تھا اور آنکھیں ایک عجیب سے حجاب کے باعث نیچے جھک گئی تھیں۔

"میں اس وقت تمہیں چھو کر یہی دیکھ رہا تھا۔" میں سوچ رہا تھا کہ وہ میری اس حرکت پر ہنسے گی لیکن خلاف توقع اُس نے دھیمی آواز میں کہا۔

"پھر کیا محسوس کیا تم نے؟"

"کچھ بھی نہیں۔ بالکل عام سی بات ہے۔" میں نے پھر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اُس نے بہت آہستگی سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

"مگر تمہارے اس طرح چھونے سے میں جل بھن کر خاک ہو جاؤں گی۔"

"کیا؟" میں نے حیرت سے کہا اور وہ ایک دم چونک پڑی۔ پھر اُس نے کہا۔

"فضول چیزیں پڑھو گے تو ایسا ہی ہو گا۔"

مجھے صاف محسوس ہو گیا کہ اُس نے بات کو ٹالنے کی کوشش کی ہے۔ بہرحال وقت گزر گیا، بات آئی گئی ہو گئی۔ ہم دوسرے موضوعات پر باتیں کرنے لگے۔ میرے چھوٹے ماموں نے، جو یونیورسٹی میں پڑھتے تھے، اس لڑکی کو دیکھ کر جس کا رشتہ نورین کی امی ہمارے گھر لے کر آئی تھیں، رضامندی کا اظہار کر دیا اور نورین کی امی نے چٹ منگنی پٹ بیاہ والی بات کرنے کے لیے ایک دو دن میں ہمارے ہاں آنے کا وعدہ کیا۔

اچانک ہی نورین بولی۔ ''تمہارے کمرے کا کیا حال ہے؟''

''جس حال میں تم چھوڑ کر گئی تھیں، اسی حال میں ہے۔''

''میں آؤں گی۔ ویسے تم اسے بہت گندا رکھتے ہو۔''

''نہیں نورین! میرا کمرہ تو چمکتا رہتا ہے۔''

''اچھا، میں آ کر دیکھوں گی۔'' بہر حال میں نے یہ بات ایسے ہی کہہ دی تھی۔ ہمارے گھر کا ایک اصول تھا کہ اپنے اپنے کمروں کو خود ہی صاف کرنا پڑتا تھا۔ اُس دن میرا کمرہ صاف شفاف کر دیا گیا تھا۔ میرے ذہن میں تھا کہ نورین نے ایسا کیا تھا لیکن نجانے کیوں مجھے یہ احساس ہو رہا تھا کہ اس دن کا کام نورین کا نہیں ہے۔

بہر حال یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی، جس پر غور کیا جائے۔ اس دن بھی میں خیالات میں ڈوبا لیٹا ہوا تھا کہ کسی نے بڑے پیار سے میری پیشانی کے بالوں کو ہلکا سا جھٹکا دیا اور میں تکیے کا سہارا لے کر بیٹھ گیا۔

اس دوران مختلف اوقات میں میری ملاقات اس روح سے ہوا کرتی تھی۔ وہ مجھے بہت اچھی لگنے لگی تھی۔ نظروں کے سامنے آئے بغیر اُس نے مجھ پر بے شمار احسانات کیے تھے۔ فرش کو پختہ کر کے ترشولی کی بھیانک شکل سے نجات دلائی تھی۔ کمرے کو بھی وہ پابندی سے صاف کرتی رہتی تھی اور فادر جیکسن کو اُس نے میرے راستے سے ہٹا دیا تھا جو ترشولی کو آزاد کرنے اور مجھے تباہ کرنے پر تلا ہوا تھا۔ یہ ساری باتیں بعد میں، میں نے اُس سے کی تھیں۔ بہر حال اس وقت میں نے اُس سے کہا۔

''آج میں بہت اُداس ہوں۔ لیکن تم کیا جانو کہ اُداسی کیا ہوتی ہے۔'' کوئی جواب نہیں ملا۔

''اصل میں بہت سی چیزیں ایسی ہوتی ہیں، جن کا اظہار انسان کسی سے نہیں کر سکتا۔ اگر ہمارے پاس کچھ پیسے آ جائیں تو ہمارے حالات بہتر ہو جاتے ہیں۔''

تھوڑی سی سرسراہٹ ہوئی، جیسے وہ بولنا چاہتی ہو۔ میں نے پھر کہا۔

''ایک بات بتاؤ۔ اگر تم میری غربت دُور کر سکتی ہو تو مجھے بتاؤ۔ میں اگر تم سے کچھ مانگوں تو؟''

اچانک ہی کتاب اپنی جگہ سے ہوا میں بلند ہوئی اور آواز کے ساتھ دوبارہ اپنی جگہ پر گر گئی۔

اُس نے ہاں میں جواب دیا تھا۔

خوشی کے مارے میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔ میرے ذہن میں بھی یہ بات نہیں آئی تھی کہ اس کے ذریعے دولت بھی کمائی جا سکتی ہے۔

میرے دل میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ''تو پھر لاؤ...... مجھے پانچ ہزار روپے دو۔'' میں نے کہا۔ اور کوئی ٹھنڈی سی چیز میرے کان کی لو سے مس ہوئی۔ اور اس کے بعد مکمل طور پر خاموشی

طاری ہو گئی۔ اچانک ہی مجھے احساس ہوا کہ وہ وہاں سے چلی گئی ہے۔ میں نے جلدی سے کہا۔

''ارے، ارے...... میں تو مذاق کر رہا تھا...... میں تو...... میں تو......'' مگر ایک دم خاموشی طاری ہو گئی تھی۔ میری آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ مجھے یوں لگا، جیسے میں نے اپنی کسی بہت ہی گہری دوست کو کھو دیا ہو۔

پھر اچانک ہی کسی نے پیار سے میری پیشانی کے بالوں کو ہلکے سے جھٹکے سے کھینچا۔ میرے تکیے کے پاس ہزار ہزار کے پانچ نوٹ رکھے ہوئے تھے۔ میں نے وہ نوٹ جلدی سے اُٹھا لیے۔ پھر میں نے کہا۔

''اگر تمہیں میرے اس مطالبے سے دکھ ہوا ہے تو خدا کی قسم یہ واپس لے لو۔ مجھے تم عزیز ہو۔ پیسوں کی کوئی بات نہیں ہے۔ بتاؤ کیا تم مجھ سے ناراض ہو گئیں؟'' کتاب ایک بار اُٹھی اور رکھ دی گئی۔

''مجھے چھوڑ کر تو نہیں جاؤ گی؟'' اس بار کتاب سے دو آوازیں نکلیں اور اُس نے نفی میں جواب دیا۔

''میں شرمندہ ہوں کہ میں نے تم سے یہ پیسے مانگے۔ اچھا یہ بتاؤ کہ کیا تم پڑھ لکھ سکتی ہو؟'' جواب ہاں میں تھا۔

''ٹھیک ہے۔ بس تم یہ سمجھ لو کہ میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔ میں تمہارا دوست بن گیا ہوں۔ کاش میں بھی تمہاری طرح روح ہوتا۔ اچھا یہ بتاؤ کہ کیا تم پہلے انسان ہی تھیں؟'' اُس نے کتاب سے ایک مرتبہ آواز پیدا کی اور یوں لگا جیسے پچھلی زندگی کے تصور سے اُسے دُکھ ہوا ہو۔

''مجھے یقین ہے کہ تم بہت خوب صورت بھی ہو گی۔'' اس بار بھی جواب ہاں میں تھا۔

تھوڑی دیر تک خاموشی طاری رہی اور اس کے بعد وہ چلی گئی۔ میرے پاس اتنی بڑی رقم تھی کہ میں نے پہلے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ وہ جا چکی ہے۔ لیکن نجانے کیوں مجھے اندر ہی اندر یہ احساس ہوا کہ وہ کمرے میں موجود ہے۔ بہر حال میں گہری نیند سو گیا۔

دوسرے دن میں نے کافی خریداری کی۔ میرے پاس اتنی بڑی رقم تھی کہ میں کسی کو دکھا بھی نہیں سکتا تھا۔ میں نورین کے لیے بھی بہت سی چیزیں لایا اور یہ فیصلہ کیا کہ اُسے یہ چیزیں دے آؤں گا۔ لیکن گھر پہنچ کر ایسی گہری نیند آئی کہ شام کی تاریکی پھیل گئی۔

تب امی نے مجھے جگایا۔ وہ کہنے لگیں۔ ''کب کے تم پڑے رہے ہو۔ یہ تھوڑی سی کھانے پینے کی چیزیں ہیں، جا کر بڑی خالہ جی کو دے آنا۔ وہی جو کل آئی تھیں۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں کھانا لے کر کمرے سے نکل رہا تھا کہ کسی نے شوخی سے میرے بالوں کو چھیڑا۔ میں نے کہا۔

"میں ابھی پانچ منٹ میں کھانا دے کر واپس آ رہا ہوں۔ جاؤ میرے کمرے میں جا کر بیٹھو۔" میں سمجھ گیا تھا کہ میری دوست آ گئی ہے۔ لیکن اُس نے میری بات نہیں مانی۔ ہوا کی مخصوص رفتار سے میں نے اندازہ لگا لیا کہ وہ میرے ساتھ قدم اُٹھا رہی ہے۔ مجھے بھلا کیا اعتراض ہوتا۔ بلکہ خوشی تھی کہ میری دوست میرے ساتھ چل رہی تھی۔ میدان پار کیا ہی تھا کہ اچانک ہی رخسانہ کی ہنسی کی آواز سنائی دی اور میں رُک گیا۔

"کون تھا یہ؟" میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ میرے ساتھ چلنے والی روح بھی رک گئی۔ ہوا کی سرسراہٹ بھی رک گئی تھی۔

"تم موجود ہو؟" میں نے سوال کیا اور اُس نے میرے بالوں کی لٹ چھو کر اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔

"تم نے ہنسی کی آواز سنی تھی؟" جواب ہاں میں ملا۔

"تو کیا تم ہنس رہی تھیں؟" جواب نہیں میں ملا۔ میں نے اُسے نفی میں جواب دینے کے لیے ہدایت نہیں کی تھی۔

"کسی اور کے ہنسنے کی آواز تھی ناں؟"

"ہاں۔" ایک سرد سی لہر نے بکھرے ہوئے بال درست کر دیے۔

"تمہیں معلوم ہے کون ہنس رہا تھا؟"

"نہیں۔" جواب ملا۔

پھر میں نے ایک گہری سانس کے ساتھ قدم آگے بڑھا دیے۔ وہ بدستور میرے ساتھ ہی چل رہی تھی۔ میں اُس جھونپڑے تک پہنچ گیا، جس کو بڑی اماں یا بڑی خالہ کی جھونپڑی کہا جاتا تھا۔ چاروں طرف بدبو پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے ناک پر ہاتھ رکھ لیا۔ آنکھیں تاریکی میں دیکھنے کے قابل ہوئیں تو بڑی اماں نظر آ گئیں۔ وہ ایک جھلنگے سے پلنگ پر لیٹی ہوئی تھیں۔

"ارے بیٹے!......خیر تو ہے؟" اُس نے کہا۔ جھونپڑی میں اچھی خاصی تاریکی تھی۔ پھر بھی اُس نے مجھے اپنی آنکھوں سے پہچان لیا۔ میں نے کہا۔

"خالہ! تمہارا کھانا لے کر آیا ہوں۔"

"جیتے رہو بیٹا! میں خود تمہارے پاس آنے والی تھی۔"

میں نے کپڑے میں بندھے ہوئے برتن اُسے دیے اور وہ دعائیں دینے لگی۔

بہرحال میں وہاں سے آگے بڑھا اور میں نے کہا۔ "میں تو اس گھٹن زدہ، بدبودار تاریک جگہ میں ایک دن بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔"

سرد ہوا کے ہلکے سے جھونکے نے میرے بالوں سے شوخی کی۔ نادیدہ دوست میرے ہمراہ تھی

اور میرے تبصرے پر میری ہاں میں ہاں ملا رہی تھی۔

"کاش میں تمہارے لیے زبان خرید لاتا۔" جواب میں میرے بالوں کو چھیڑا گیا۔

"لیکن ایک بات میں تم سے کہوں، اب تم کھل کر مجھ سے بات نہیں کر سکو گی۔" میں نے اُسے متنبہ کرتے ہوئے کہا اور وہ چونک سی گئی۔ میں راستے بھر اُس کے ذوق و شوق اور تجسس میں اضافہ کے لیے جملے بولتا رہا۔ گھر قریب آیا تو مجھے ایک عجیب سی مسرت ہوئی۔ بھائی جان میرے منتظر تھے۔ وہ اپنی ایک اہم کتاب اپنے دوست احمد کے گھر چھوڑ آئے تھے اور چاہتے تھے کہ میں بھاگتا ہوا جاؤں اور اُن کی کتاب لے آؤں۔

احمد کا گھر اتنی دُور نہیں تھا، سڑک کے پار اسی گلی میں تھا۔ لیکن جب میں وہاں چلا تو سڑک میلوں دُور محسوس ہوئی۔ واپس آیا تو امی دروازے پر کھڑی تھیں۔

"کتاب مجھے دو اور تم بھاگ کر سموسے اور دال موٹھ لے آؤ۔" میں واپس پلٹا اور یہ چیزیں لے آیا تو اُنھوں نے پانوں کی فرمائش کر دی۔ میرا پارہ چڑھ گیا۔

"آپ ایک ہی بار ساری چیزیں کیوں نہیں منگوا لیتیں؟ میں بار بار نہیں جاؤں گا۔"

شاید قدرت کو میرا امتحان منظور تھا، یا میرے اضطراب میں اضافہ کیا جا رہا تھا۔ میں بری طرح ہانپتا کانپتا ہوا پان لے کر گھر پہنچا تو امی جان نے دودھ کا برتن تھما دیا۔ چائے تیار تھی لیکن باورچی خانے میں رکھی ہوئی دیگچی کا دودھ خراب ہو گیا تھا۔ بہرحال مجبوراً دودھ بھی لا کر دینا پڑا اور یہ دعا کرتا ہوا آیا کہ اب کوئی نئی چیز نہ منگوائی جائے۔ ابھی دودھ کا برتن تھما ہی رہا تھا کہ کسی نے دروازے کی گھنٹی بجا دی۔ میں باہر جانے اور گھنٹی کا جواب دینے کے لیے تیار نہیں تھا مگر یہ ناخوشگوار فرض بھی انجام دینا پڑا۔

دروازے پر وہی پولیس افسر موجود تھا، جو میرا بیان لینے کے لیے مجھے اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ اُس نے کہا۔

"بیٹے! مجھے آپ سے ایک ضروری بات معلوم کرنا تھی، اس لیے تھوڑی سی تکلیف دینے آ گیا ہوں۔"

"جی فرمائیے؟"

"میں کسی جگہ اطمینان سے بیٹھ کر بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"میرے گھر میں اس وقت تو مہمان آئے ہوئے ہیں، اگر آپ چاہیں تو کل دوپہر کو تشریف لا سکتے ہیں۔ یا پھر میں حاضر ہو جاؤں گا۔"

"نہیں، میں نے صرف دو باتیں کرنی ہیں۔ تمہارا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ چلو آؤ، کہیں باہر جا کر بیٹھتے ہیں۔"

"جناب! مجھے ہوم ورک کرنا ہے۔"

"میں نے کہا ناں، تمہارا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔"

مجبوراً مجھے اُس کے ساتھ آگے بڑھنا پڑا۔ اُس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ لیا اور چلتے ہوئے بولا۔ "تم پروفیسر دین کو تو جانتے ہو گے، تمہارے پڑوسی ہیں۔"

"جی، ہیں تو سہی۔"

"کچھ عجیب سی باتیں میرے سامنے آئی ہیں۔ میں اس بارے میں معلوم کرنا چاہتا ہوں۔"

میں ایک دم سے گھبرا سا گیا۔ اُس نے میرے کندھے کو تھپک کر کہا۔

"تمہیں کوئی سزا نہیں ملے گی۔ لیکن میں تمہیں اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ زبان سے بات نکالتے ہوئے غور کرنا چاہیے۔"

"جی؟"

"کیا نام ہے تمہارا؟"

"جی...... سکندر۔"

"ٹھیک ہے۔ سکندر! مجھے ایک بات بتاؤ۔ تمہاری بہن عجیب وغریب انداز میں قتل کر دی گئی تھی۔ اور تم نے یہ بھی بتایا تھا کہ تمہاری بہن کی لاش کا ہاتھ بھی اسی طرح غائب تھا، جس طرح فادر جیکسن کا ہاتھ غائب ہو گیا۔"

"جی ہاں۔"

"اور اس سلسلے میں تم نے کسی عورت کا نام بھی لیا تھا؟"

"جج...... جی۔" میں نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"کیا نام لیا تھا تم نے؟"

"وہ...... جناب! اُس کا نام شاید ترشولی تھا۔"

"کہاں رہتی ہے وہ؟"

"مم...... میں کیا بتا سکتا ہوں جناب؟ وہ ایک روح ہے۔ وہ کہاں رہتی ہے، یہ میں نہیں جانتا۔ لیکن آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ اب وہ ختم ہو چکی ہے۔"

"تمہیں کیسے معلوم؟" پولیس آفیسر نے چالاکی سے پوچھا اور میں ایک دم چونک پڑا۔ مجھے یہ احساس ہوا کہ میں کیا فضول بات کر گیا ہوں۔ اسے تو میں نے خود اپنے ہاتھوں سے قتل کر کے فرش کے نیچے دبا دیا ہے۔ میں نے یہ سوچا ہی تھا کہ کسی سرد چیز نے میرے کان کی لَو کو کھینچا۔

"وہ...... وہ دراصل وہ مجھے ہمیشہ تاریکی میں نظر آتی تھی۔ ہمارے گھر میں اس سلسلے میں کافی ہنگامہ ہوا ہے۔ تعویذ گنڈے کیے گئے ہیں۔ مگر اب وہ کئی ماہ سے نظر نہیں آئی۔ اس سے ظاہر

ہوتا ہے کہ وہ مر کھپ گئی ہے۔"

"تمہارے خیال میں اُسے مرے ہوئے کئی ماہ ہو گئے ہیں؟"

"جی ہاں۔"

"مگر فادر جیکسن کا ہاتھ تو ابھی حال ہی میں غائب ہوا ہے۔"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں جناب! روحوں کی باتیں روحیں ہی جانیں۔"

"یہ روحوں کی باتیں نہیں ہیں، انسانوں کی باتیں ہیں۔ ہاتھ انسانوں کے غائب ہوئے ہیں۔"

"ہو سکتا ہے، ترشولی کے علاوہ کسی اور روح کو بھی ہاتھ اُڑانے میں دلچسپی ہو۔"

"مگر میرا خیال کچھ اور ہے۔"

"کیا؟"

"کچھ دہشت پسند اپنے ارادوں کی تکمیل کے لیے اس قسم کی توہمات کو ہوائیں دے رہے ہیں۔ پولیس کو ایک اور لاش بھی ملی ہے، جسے زہر دے کر ہلاک کیا گیا ہے اور اُس کا داہنا بازو غائب ہے۔ بالکل اسی طرح، جیسے فادر جیکسن کا ہاتھ کٹا تھا۔"

"کیا کہہ سکتا ہوں جناب!"

پولیس آفیسر کئی سیکنڈ تک خاموش بیٹھا رہا، پھر بولا۔ "چلو ٹھیک ہے۔ اگر تم کبھی مجھ سے ملنا چاہو تو مجھے فون کر سکتے ہو۔ یہ نمبر لکھ لو میرا۔ تم میرے بہت اچھے دوست ہو۔ اور بہت اچھے اور ذہین لڑکے معلوم ہوتے ہو۔ میں اصل میں ان ہاتھوں کے کٹنے کا راز معلوم کرنا چاہتا ہوں اور اس کے لیے ہو سکتا ہے کہ میں پھر کبھی کسی وقت تمہیں تکلیف دوں۔"

"مجھے بھی بتایا گیا ہے کہ پولیس کی مدد کرنا فرض ہوتا ہے۔ آپ کو اگر کبھی میری ضرورت پیش آئے تو مجھے ضرور بلا لیجیے۔ یا پھر جیسے ہی آپ حکم دیں گے، میں اس کی تعمیل کروں گا۔" میں نے سمجھ داری سے کہا۔ پولیس آفیسر کا انداز بھی میرے ساتھ اچھا تھا۔ اس لیے میں نے بھی اُس کے ساتھ اچھے لہجے میں ہی بات کی تھی۔

تھوڑی دیر بعد پولیس آفیسر چلا گیا۔ میں گھر پہنچا تو امی نے کہا۔

"تم ایسا کرو، اپنے لیے کھانا خود نکال لو۔ میں ذرا بہن سے باتیں کر رہی ہوں۔"

میں نے باورچی خانے میں جا کر اپنے لیے کھانا نکالا، ٹرے میں رکھا اور کمرے میں لے گیا۔ ہوا کی وہ سرسراہٹ، جو میرے علاوہ کسی کو محسوس نہیں ہو پاتی تھی، میرے ساتھ تھی۔ میز پر کھانا لگا کر میں نے کہا۔

"بری طرح تھک گیا ہوں میں۔" میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھ سے کچھ فاصلے پر میز کے

قریب موجود ہے۔ اور وہ چیزیں جو میں نے نورین کے لیے خریدی تھیں، انہیں چھیڑ چھیڑ کر دیکھ رہی ہے۔ میں نے اچانک ہی محسوس کیا کہ اُسے یہ چیزیں اچھی لگی ہیں۔

"یہ سب اچھی ہیں ناں؟" اُس نے میرے بالوں کو چھو کر اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا۔

"میں نورین کے لیے لایا ہوں۔ تم نورین کو تو جانتی ہوگی۔ جب مجھے اتنے قریب سے دیکھا ہے تو نورین کو بھی دیکھا ہوگا۔" بالوں میں ایک بار پھر وہی مخصوص ٹھنڈک محسوس ہوئی۔

"ویسے وہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ اور تمہیں ایک راز کی بات بتاؤں، میرا خیال ہے وہ مجھ سے محبت کرنے لگی ہے۔" ہوا میں سرسراہٹ سی ہوئی۔ شاید وہ میری باتوں پر ہنس رہی تھی۔ میں نے روانی میں کہا۔ "اور سچی بات میں یہ بھی بتاؤں کہ اگر میں نے کسی لڑکی سے محبت کی تو وہ نورین ہی ہوگی۔ اُس کے اندر بہت سی خوبیاں ہیں۔ خوب صورت ہے، خوب سیرت ہے۔"

ہوا کا سرد جھونکا پیار سے میرے رخسار کو چھوتا ہوا گزر گیا۔ میں نے کہا۔ "اور میں نے یہ بات آج تک کسی کو نہیں بتائی۔ پہلی بار تمہیں بتا رہا ہوں۔ جب میں پہلی جماعت میں پڑھتا تھا، اُس زمانے میں نورین کو دیکھ کر سوچا کرتا تھا کہ اس کا پورا جسم دودھ کی بالائی کا بنا ہوا ہے۔ اور آج تک میرے خیال میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔"

نجانے میں کیا کیا بولتا رہا اور وہ سنتی رہی۔ میں نے کہا۔

"تمہارا کیا خیال ہے، میں کچھ بہک گیا ہوں۔ بس یوں سمجھ لو کہ میں نے ابھی تک نورین سے محبت نہیں کی۔ بس اتنی سی بات ہے کہ وہ مجھے اچھی لگتی ہے۔ ویسے اب تم بھی مجھے بہت زیادہ اچھی لگنے لگی ہو...... مطلب یہ نہیں ہوتا کہ جو اچھا لگے، اُس سے محبت بھی کی جائے۔" اور میں نے اسے محسوس کرنے کی کوشش کی۔ نجانے کس بات پر میں نے کہا۔

"اچھا تم ایک بات بتاؤ...... تم مجھ سے باتیں کرنے کے لیے ایک کام کرو گی؟" مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اُس نے سوالیہ انداز میں گردن ہلائی ہو۔ میں نے کہا۔

"میرے پاس تعلیمی تاشوں کی گڈی رکھی ہے۔ میں تمہیں اسے استعمال کرنے کی تفصیل بتاتا ہوں۔ کیا تم لفظ پہچان سکتی ہو؟" جواب ہاں میں ملا۔

"پھر تو ہم بڑے مزے سے بات چیت کر لیا کریں گے۔" میں نے کہا اور اپنی الماری سے تعلیمی تاش کی گڈی نکالی۔ کافی دیر تک تعلیمی تاش کا کھیل سکھایا۔

میرے ذہن میں ایک خیال تھا کہ اگر وہ اسے سمجھ لے تو میں اس سے بات کر سکتا ہوں۔ میں نے اُس سے سوال کیا۔

"تم انہیں دیکھ رہی ہو؟ انہیں استعمال کر کے ہم الفاظ بنا سکتے ہیں۔" میں نے تعلیمی تاش اُس کی طرف بڑھائے تو اُس نے وہ تاش اپنے ہاتھ میں پکڑ لیے۔ تاش کی ترتیب میز کی سطح پر جم گئی اور اس پر لکھا ہوا دیکھا۔

"سوال تم نہیں کرو گے، میں کروں گی۔"

میں خوشی سے اُچھل پڑا۔ اُسے زبان مل گئی تھی۔ نہ بولنے کے باوجود وہ بول رہی تھی۔

"پوچھو کیا پوچھنا چاہتی ہو؟"

اُس نے میز پر تاشوں کو جمایا اور لکھا۔ "میں تمہیں کیسی لگتی ہوں؟"

"بہت اچھی۔"

"اگر میں تمہیں چھوڑ کر کہیں اور چلی جاؤں تو؟"

"تو مجھے بہت رنج ہوگا۔ لیکن میں تمہیں روکنے کا کوئی ذریعہ نہیں جانتا۔"

"مجھے روکنے کی کوشش نہیں کرو گے؟"

"ضرور کروں گا۔ کیا تم رک جاؤ گی؟"

"ہاں۔ مجھے ہمیشہ اپنے پاس دیکھنا چاہتے ہو؟"

"بڑا عجیب سوال ہے۔ میں نے تمہیں ایک بار بھی نہیں دیکھا۔"

"دیکھ لو گے۔ مگر میرے سوالوں کے جواب دو۔"

"تم ترشولی کی طرح بدصورت اور ڈراؤنی تو نہیں ہو؟"

"نہیں۔ میں تمہارے خوابوں کی طرح حسین ہوں۔"

"تو میں تمہیں ضرور دیکھنا چاہوں گا۔"

"یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔"

"یہ تمہارا سوال بہت انوکھا ہے۔ تم نے یہی پوچھا تھا ناں کہ میں تمہیں ہمیشہ اپنے پاس دیکھنا چاہتا ہوں؟"

"ہاں...... یہی پوچھا تھا میں نے۔"

"کیا میں تمہیں ابھی دیکھ سکتا ہوں؟"

"نہیں۔ ابھی اس کا وقت نہیں آیا۔"

"کب آئے گا وہ وقت؟"

"اس کا انحصار تم پر ہے۔"

"مجھ پر؟"

"ہاں۔ تمہیں تھوڑی سی محنت کرنا پڑے گی۔"

"کیسی محنت؟" میرے سوال پر کچھ دیر کے لیے وہ خاموش ہو گئی، پھر اس نے لکھا۔

"تم نے یہ نہیں پوچھا کہ میں کون ہوں۔"

”بتاؤ، تم کون ہو؟“

”وعدہ کرو، کسی سے اس بات کا ذکر تو نہیں کرو گے؟“

”وعدہ کرتا ہوں۔“ کچھ دیر کے لیے کمرے میں خاموشی طاری ہو گئی۔ پھر آہستہ آہستہ تاش کے پتوں کو میز پر جنایا گیا۔

”میں رو رہی ہوں۔“

”کیوں؟“

”اچانک بہت سی باتیں یاد آ گئی ہیں۔“

”مجھے کچھ بتاؤ تو سہی۔“

”میں یہاں سے جا رہی ہوں۔“

”کہاں؟“ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”بس، یہ تو میں بتا نہیں سکتی۔“

”نہیں، میں تم سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ تم کون ہو؟ مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم۔“

تاشوں کی دونوں گڈیاں میز پر رکھ دی گئیں اور اگلے ہی لمحے ایک سرد سی لہر نے میرے کانوں کو چھوا۔

”مجھے بتاؤ تم کہاں جا رہی ہو؟“

لیکن اس کے بعد مجھے نہ تو کسی کی موجودگی کا احساس ہوا اور نہ ہی اُس نے پھر تاش کا کھیل کھیلا۔ نجانے کتنا وقت گزر گیا۔ میں ایک طرح سے نیم غشی کی سی کیفیت کا شکار ہو گیا تھا، یا شاید سو گیا تھا۔ رات گئے اس وقت آنکھ کھلی، جب کروٹ لیتے ہوئے فرش پر گر پڑا۔

دوسرا دن بڑا بے چینی کے ساتھ گزرا تھا۔ مجھے اُس کی باتیں یاد آتی رہیں۔ اسکول میں بھی دل نہیں لگا تھا۔ جیسے تیسے وقت گزارا۔ تاشوں کی گڈیاں میرے سامنے پڑی ہوئی تھیں۔ کمرا سائیں سائیں کر رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کہاں چلی گئی۔ دل کی بے چینی اور بے قراری کو اگر کہیں سکون مل سکتا تھا تو وہ نورین کا گھر تھا۔ وہ چیزیں میرے پاس رکھی ہوئی تھیں، جو میں نورین کے لیے لایا تھا۔ لیکن اس وقت نورین کے گھر جانا بے مقصد ثابت ہوا۔ وہ اپنی کسی سہیلی کے ہاں گئی ہوئی تھی۔ بہر حال میں واپس آ گیا۔

پوری رات میں اُس کا انتظار کرتا رہا۔ پھر صبح سے چند لمحے قبل کمرے میں اُس کی سرسراہٹ محسوس ہوئی۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ آ گئی ہو۔

”تم آ گئی ہو ناں؟“ تاشوں کی گڈیاں حرکت میں آئیں اور پھر اُس نے تاشوں کی زبان

میں کہا۔

”صرف دو منٹ کے لیے آئی ہوں۔“

”اپنا نام بتانے کے لیے؟“ میری نیند ہوا ہو گئی۔ لکھا تھا۔

”میں تو سمجھ رہی تھی کہ تم مجھے بُوجھ لو گے۔“

”پہیلیاں نہ بجھاؤ۔ بتاؤ کون ہو تم؟“

”مجھے بھول گئے میرے بھائی؟ میری ماں کے بیٹے! مجھے بھول گئے تم؟......اپنی بہن رخسانہ کو بھول گئے؟“

”کیا......رخسانہ؟......میری رخسانہ۔“ بے اختیار میری چیخ نکل گئی۔

”روؤ نہیں۔ میں بھی رو رہی ہوں۔“

”تم رخسانہ ہو؟“ میں نے بمشکل تمام اپنی سسکیوں کو دباتے ہوئے کہا۔

”ہاں میرے بھائی! میں تمہاری ماں جائی ہوں، تمہاری بہن۔“

میری ہچکیاں بندھ گئیں اور میں زار و قطار رونے لگا۔

”میں بھی رو رہی ہوں بھائی۔“

”نہیں، رخسانہ! تم نہ روؤ۔“

”مجھ سے ملنا چاہتے ہو بھائی جی؟“ اس نے تاش اُٹھا کر دوسرے تاش لگائے۔ ”مجھے اپنے سامنے دیکھنا چاہتے ہو؟“

”ہاں رخسانہ!......ہاں۔“ میں سسکیوں کے ساتھ چیخ پڑا۔

”مجھے اپنے سامنے دیکھنے کے لیے تمہیں تھوڑی سی قربانی دینا پڑے گی۔“

”میں ہر قربانی دینے کے لیے تیار ہوں۔“

”جلد بازی کی ضرورت نہیں۔ آج رات خوب سوچ سمجھ کر جواب دینا۔ اچھا میں چلتی ہوں۔“ اس کے ساتھ ہی میرے کان کی لو کو چھو کر وہ ہوا ہو گئی۔ میں فیصلہ کرتا رہا کہ مجھے اپنی بہن کے اس طرح رابطے پر خوش ہونا چاہیے یا غمزدہ۔ لیکن اس کا فیصلہ کرنا بہت مشکل تھا۔ صبح طور پر ناشتہ بھی نہیں کیا، اسکول بھی نہیں گیا۔ امی سے سر درد کا بہانہ کر کے اپنے کمرے میں لیٹ گیا۔

یہ حیرت اور مسرت کی بات تھی کہ جسے ہم سب رو دھو کر صبر کر چکے تھے، وہ مجھے مل گئی تھی۔ نہ صرف مل گئی تھی بلکہ سامنے آنے کے لیے بھی تیار تھی۔ آہ......کیسی انوکھی بات ہے۔ مجھے اُسے پہلے ہی پہچان لینا چاہیے تھا۔ دو مرتبہ میں نے اُس کی مخصوص ہنسی کی آواز سنی تھی۔ ترشولی سے نجات دلانے کے لیے اُس نے بڑی محنت کی تھی۔ اُس نے اپنی روحانی طاقت کو استعمال میں لا کر راتوں رات ٹائلوں سے وہ خوب صورت فرش بنایا تھا، جس کے نیچے اُس کی قاتل ترشولی کلڑوں کی

صورت میں موجود تھی۔ زندگی میں وہ میرے کمرے کی صفائی کیا کرتی تھی۔ اور مرنے کے بعد بھی وہ یہی کرتی رہی۔ آہ.......میں اُسے پہچان نہیں سکا۔ مجھے اُسے پہچاننا چاہیے تھا۔

بہرطور اگر کسی سے ان تمام باتوں کا تذکرہ کرتا تو میرا مذاق ہی اُڑایا جاتا۔ لیکن یہ سب کچھ ہوش وحواس کے عالم میں ہوا تھا۔ سب کچھ صحیح تھا۔ بہرحال میں اپنی بہن کو یاد کرتا رہا۔ میرے ذہن میں بہت سے منصوبے تھے۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ جس طرح بھی بن پڑے، میں اُسے اُس کی شکل میں لے آؤں۔ اور اب میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اُس نے مجھ سے کون سی محنت کی بات کی تھی۔

رات بھر کا جاگا ہوا تھا، پھر بھی نیند نہیں آئی۔ بستر پر پڑے پڑے کروٹیں بدلتا رہا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ مجھ سے کون سی قربانی مانگے گی۔ شام کو وہ پھر آ گئی۔ میں نے اُسے محسوس کر لیا اور کہا۔

"کچھ لکھو میری پیاری بہن! میں تم سے باتیں کرنے کے لیے بے چین ہوں۔"

تاش کی گڈیاں حرکت میں آئیں اور پھر میز پر تاش گرنا شروع ہو گئے۔

"تم لوگوں کی جدائی میرے لیے ناقابلِ برداشت ہے۔"

"ہمارا بھی یہی حال ہے رخسانہ!"

"میں تمہاری دنیا میں واپس آنا چاہتی ہوں بھائی جی!"

"ہم تمہیں ہر وقت خوش آمدید کہنے کے لیے تیار ہیں۔ تم نے قربانی دینے کے لیے کہا تھا۔ مجھے کیا قربانی دینا پڑے گی؟ بتاؤ، وہ کون سی چیز ہے، جو مجھے قربان کرنا پڑے گی؟"

"اپنی محبت۔"

"میں تمہاری محبت کو کبھی اپنے دل سے نہیں نکال سکتا رخسانہ!"

"میں اپنی محبت کی بات نہیں کر رہی ہوں۔"

"تو پھر؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"تم نے کہا تھا کہ تمہیں نورین سے محبت نہیں ہے۔ مگر میں جانتی ہوں کہ تمہیں اس سے بہت محبت ہے۔ تمہیں اسی کی محبت کی قربانی دینا پڑے گی۔"

مجھے یوں لگا جیسے اُس نے میرے دل کو ہاتھ میں لے کر بری طرح مسل دیا ہو۔ مگر میں نے اپنے دل کو سنبھالا اور بولا۔

"بس اتنی سی بات رخسانہ! نورین کیا چیز ہے، میں تمہارے لیے ساری دنیا قربان کر سکتا ہوں۔"

"شکریہ بھائی جی! مجھے تم سے یہی اُمید تھی۔"

"آج، ابھی اور اسی وقت میں نورین کی محبت سے دستبردار ہوتا ہوں۔ نہ کبھی اُس کے گھر جاؤں گا اور نہ کبھی اُس سے ملاقات کروں گا۔"

تاشوں کے حروف نے کہا۔ "میں ہنس رہی ہوں۔"

"کیوں؟"

کچھ لمحوں تک کوئی جواب نہیں ملا، پھر کہا گیا۔

"تم جانتے ہو، میں ایک روح ہوں۔"

"ہاں۔"

"مگر مجھے مجسم دیکھنے کے لیے تمہیں ایک خوب صورت بدن کا انتظام کرنا پڑے گا۔"

"کیا؟"

"ہاں بھائی جی! میرا پہلا جسم قبر کی مٹی میں مل کر مٹی ہو چکا ہے۔ تمہیں میرے لیے ایک جسم کا انتظام کرنا پڑے گا اور وہ جسم ہوگا نورین کا۔ تمہیں اُسے قتل کرنا ہوگا۔"

"کیا؟" میرے پورے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا۔ دماغ چکرانے لگا۔

"ہاں.......تم اُسے قتل کر دو گے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوگی۔"

"رخسانہ! نہیں.......ایسا مت کہو۔ خدا کے لیے ایسا مت کہو۔ میں اُسے قتل نہیں کر سکتا۔ میں تو کسی کو بھی قتل نہیں کر سکتا۔"

"نورین کے مرتے ہی میں اُس کے جسم میں داخل ہو جاؤں گی۔ تمہیں تمہاری بچھڑی ہوئی بہن مل جائے گی اور وہ وجود بھی جو تمہیں بے حد عزیز ہے، ضائع نہیں ہوگا۔ نورین کے گھر والے بھی اس خوش فہمی میں مبتلا رہیں گے کہ ان کی نورین زندہ وسلامت ہے۔"

میرے دل میں ایک عجیب سے شبے نے سر اُبھارا، کہیں یہ سب فریب تو نہیں ہے؟ ترشولی نے بھی ایک اچھا سا جسم حاصل کرنے کی تمنا کی تھی۔ میں نے کہا۔

"ایک بات بتاؤ، کیا یہ درست ہے کہ جب انسان مر جاتا ہے تو روح اور بدن کا رشتہ ختم ہو جاتا ہے لیکن روح آزاد رہتی ہے؟"

"ایسا نہ ہوتا تو میں تمہارے پاس کیسے آتی؟"

"اور اگر ہم تمہاری قبر کو پختہ کرا دیتے تو کیا تم اُس میں سے باہر نکل آتیں؟"

"باہر جانے کی ضرورت تو اسے پیش آتی ہے جو اندر جائے۔" اُس نے لکھا اور میری نظریں بے اختیار فرش پر بنی ہوئی سیاہ اور سفید ٹائلوں پر پڑیں، جن کے نیچے ترشولی دفن تھی۔ کیا وہ واقعی ترشولی تھی یا اُس کا جسم تھا جو مجھے نظر آیا کرتا تھا۔ اور اُس کی روح بھی آج آزادی سے فضا میں منڈلاتی پھر رہی ہوگی۔

"رخسانہ! تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں، تمہیں اپنی نظروں کے سامنے دیکھنے کے لیے نورین کیا، ہزاروں نورینوں کو بھی قتل کرنا پڑے تو قتل کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

"شکریہ بھائی جی!"

"مگر ایک بات بتاؤ۔"

"جی؟"

"تم خود بھی تو یہ کام سرانجام دے سکتی ہو۔"

"نہیں بھائی جی! ہم روحیں جتنی طاقتور ہوتی ہیں، اتنی بے بس بھی ہوتی ہیں۔ کسی کو خود قتل نہیں کرسکتیں۔"

"مگر قادر جیکسن کو تو تم نے قتل کرایا تھا۔"

"کرایا تھا، کیا نہیں تھا۔"

"اور اس کے علاوہ ایک اور لڑکی کا بھی کیس ہوا تھا، اُسے قتل کیا گیا تھا۔ اُس کا ہاتھ کیوں غائب ہوا؟"

"بال کی کھال مت اُتارو بھائی جی! نورین کے روپ میں آنے کے بعد میں ساری باتیں تمہیں بتا دوں گی۔"

"قادر جیکسن کا ہاتھ تم نے ہی اُڑایا تھا؟"

"یہ باتیں مت کرو۔"

"اور تمہارا ہاتھ کس نے اُڑایا تھا؟" میں نے اچانک کہا۔ میرے دماغ میں ایک عجیب سا خیال آیا تھا۔

"ترشولی نے میرا ہاتھ کاٹا تھا۔"

"سنو! تم میری بہن رخسانہ نہیں ہو۔ تم ترشولی ہو اور رخسانہ کے نام پر مجھے فریب دیتی رہی ہو۔ یہ فرش تم نے بنایا تھا تاکہ میں اُلجھتا رہوں کہ اس میں تم قید ہو۔ حالانکہ ابھی تھوڑی دیر قبل تم خود بتا چکی ہو کہ روح کو دفن نہیں کیا جاسکتا۔"

"میں تمہاری بہن ہوں بھائی جی! میں تمہاری بہن ہوں۔ مجھے غلط مت سمجھو۔"

"اب تم مجھے دھوکا نہیں دے سکتیں ترشولی!" میں نے غراتے ہوئے کہا اور اُس نے تاشوں کی گڈیوں کو میز پر پٹخ دیا۔

کافی دیر تک یہ کیفیت طاری رہی، پھر اُس نے تاش اُٹھائے اور میز پر ترتیب سے رکھنا شروع کر دیا۔

"ہاں، میں ترشولی ہوں۔ لیکن ایک بات بتائے دیتی ہوں۔ تمہیں میری بات ماننا پڑے گی۔"

"تم...... کتے کی بچی! میں تم سے نفرت کرتا ہوں۔ تم میری بہن کی قاتل ہو۔"

"بکواس مت کرو۔ میری مخالفت کرکے اپنی تباہی کو دعوت مت دو۔"

"تو یہاں سے نکل جا، دھوکے باز کتیا۔"

"ٹھیک ہے، میں یہاں سے جارہی ہوں۔ لیکن نتیجہ بھگتنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ پہلے تمہاری ماں، پھر تمہارا باپ، پھر تمہارا بھائی، پھر تمہاری محبوبہ۔ میں تم سب کو ایک ایک کرکے قتل کر دوں گی۔"

"تم کسی کو قتل نہیں کرسکتیں۔"

"اس بھول میں مت رہنا۔ میں خود کسی کو قتل نہیں کرسکتی، لیکن قتل کرا سکتی ہوں۔ جیکسن کی موت کو فراموش مت کرو۔" اُس نے ایک بار پھر تاش پھینک دیئے اور پھر اُس نے دوبارہ تاش اٹھا کر انہیں ترتیب دینا شروع کر دیا۔

"غور کرنے کے لیے پوری رات پڑی ہے۔ اچھی طرح سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا۔ میں اتنی بری نہیں ہوں جتنی سمجھ رہے ہو۔ میری بات مانو گے تو تمہیں دنیا کا امیر ترین شخص بنا دوں گی۔ سنو! کل نورین اپنی ماں کے ساتھ یہاں آنے والی ہے۔ تم اُسے بستر پر یا فرش پر گرا کر تکیے کی مدد سے اُس کی سانس روک کر اُسے ہلاک کر دو گے۔ کوئی دھار دار چیز استعمال کرکے اُس کے بدن کو خراب مت کرنا۔ میں بگڑے ہوئے جسم میں نہیں رہ سکتی۔ اگر کل شام تک مجھے اُس کا جسم نہیں ملا تو جب وہ تمہارے گھر سے چلی جائے گی تو تمہیں تمہاری ماں کی لاش ملے گی۔"

اس کے ساتھ ہی اُس نے تاش سمیٹے اور غصے سے فرش پر دے مارے۔ پھر کمرے میں قبرستان جیسا سناٹا طاری ہو گیا۔

میرا دل بڑی تیزی سے دھڑک رہا تھا اور یوں لگتا تھا، جیسے حلق سے باہر آ جائے گا۔ میز سے پلنگ تک جانا دوبھر ہو گیا۔ نورین کے بارے میں کبھی وہ بات میرے ذہن میں نہیں آئی تھی جو ترشولی نے کہی تھی۔ میرا اور اُس کا ساتھ رنگ لا کر رہا تھا۔ مجھے واقعی اُس سے محبت تھی۔ ترشولی کمبخت نے کہا تھا کہ پہلے اُسے فرش یا پلنگ پر گرانا اور پھر تکیہ اُس کے منہ پر رکھ کر اُسے سانس لینے سے محروم کر دینا۔

مجھے تو اُس کی انگلی میں پھانس لگنا تک گوارا نہیں تھا۔ میں کبھی بھی ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ چاہے دنیا بھر کی دولت سمیٹ کر میرے قدموں میں ڈال دی جاتی۔ مگر وہ جو دھمکی دے گئی تھی، اس کے لیے کیا کروں؟

کیا میں اپنی ماں کی موت گوارا کر سکتا ہوں؟ وہ کمبخت، وہ منحوس روح، جس نے میری معصوم بہن کی جان لی تھی، قادر جیکسن کو مروایا تھا، وہ یقیناً میری ماں کو بھی قبر میں پہنچا سکتی تھی۔ اُس کی دھمکی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میں رونا چاہتا تھا لیکن روتے ہوئے بھی ڈر لگ رہا تھا۔ بہرحال بہت کچھ سوچتا رہا۔ ماں کی زندگی بہت زیادہ قیمتی تھی۔ اُن کی محبت کو نورین کی محبت مغلوب نہیں کر سکتی تھی۔ رخسانہ کی موت پر صبر آ سکتا تھا تو نورین کی موت پر بھی صبر کیا جا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ مجھے معلوم تھا کہ مرنے کے بعد بھی وہ نظروں کے سامنے رہے گی۔ مجھے اُس کی روح سے تو محبت نہیں تھی، جو اُس کے نکل جانے کا دکھ ہوتا۔ بڑا سوچتا رہا تھا میں اُس کے بارے میں۔ کم بخت ترشولی میرے احساسات اور جذبات سے اچھی طرح واقف تھی۔ اُس نے کہا تھا کہ وہ مجھے دنیا کا امیر ترین شخص بنا دے گی۔

دولت پاس ہو تو انسان کیا نہیں کر سکتا۔ میں فیصلہ کرنا چاہتا تھا اور فیصلہ کرنے میں مجھے دیر بے شک لگی لیکن آخر کار میں نے فیصلہ کر لیا۔ دنیا مل جاتی ہے مگر ماں کبھی نہیں مل سکتی۔ پھر کسی بھی طرح سے سہی، نورین میری نگاہوں کے سامنے تو رہے گی۔ یہ فیصلہ آخری تھا۔ اس کے بعد مجھے نیند آ گئی۔ کچھ سکون بھی ہو گیا تھا۔ نورین کے حق میں بے شک یہ بات بہتر نہیں تھی مگر یہ فیصلہ میری ماں کے حق میں تھا۔

صبح کو ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکوں نے مجھے بیدار کر دیا۔ فرش پر رات کے بکھرے ہوئے تا[illegible] کسی گڈی کی صورت میں جمع کیے جا رہے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کمبخت میرا فیصلہ سننے کے لیے موجود ہوئی تھی۔ اُس نے دو کے بجائے کئی گڈیاں تیار کیں اور اُنہیں میز پر رکھ دیا۔ پھر ہوا [illegible] سرسراہٹ سے مجھے محسوس ہوا کہ وہ مجھے مخاطب کر رہی ہے۔

”میں جاگ رہا ہوں۔“

”کیا ارادہ ہے؟“ اُس نے لکھا۔

”میرے کچھ سوالات کے جواب دو۔“

”نہیں، مجھے صرف اپنا فیصلہ بتاؤ۔“

”کیا تم اپنے اس فیصلے میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتیں؟“

”نہیں، ہرگز نہیں۔“

”اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ نورین کے جسم پر قبضہ کرنے کے بعد تم مجھے دھوکا نہیں دو گی۔ اور مجھ سے کوئی اور ایسا کام نہیں کراؤ گی؟“

”میں کوئی ثبوت نہیں دے سکتی۔ مگر تمہیں مجھ پر بھروسہ کرنا چاہیے۔“

”تم بھروسے کے قابل نہیں ہو۔“

”تمہاری مرضی ہے۔ نہیں بھروسہ کرتے تو نہ سہی۔“

”اور تم آئندہ بھی مجھ سے جھوٹ بول سکتی ہو۔“

”ہاں، اگر ضرورت پیش آئی تو بول بھی سکتی ہوں۔“

”ٹھیک......اور کوئی سوال؟“

”تمہیں اپنی ماں زیادہ عزیز ہے یا نورین؟“

”دونوں عزیز ہیں۔“

”اپنی عزیز اشیاء سنبھال کر رکھی جاتی ہیں، ضائع نہیں کی جاتیں۔“

”اور تم کہتی ہو کہ میں نورین کو ضائع کر دوں؟“

”نورین ضائع نہیں ہو گی۔ تمہیں اتنا پیار دے گی کہ تمہیں کبھی نہیں ملا ہو گا۔ ہاں اگر میری بات نہیں مانو گے تو اپنی ماں کو ضرور کھو بیٹھو گے۔ مجھے اپنے ارادے سے آگاہ کرو۔ فضول باتیں بہت ہو گئیں۔“

”میں فیصلہ کر چکا ہوں۔ یہ بتاؤ آئندہ تمہارا کیا سلوک ہو گا؟“

”اگر فیصلہ میرے حق میں ہو گا تو تم ایک پل بھی میرے بغیر نہیں رہ سکو گے۔ اُٹھتے بیٹھتے میرا ہی نام لو گے۔“

”مجھے امید نہیں ہے، لیکن ٹھیک ہے۔ اپنی ماں کے لیے میں اپنی جان لے سکتا ہوں، اس کے مقابلے میں نورین کیا چیز ہے۔ میں نے اُسے ختم کر کے تمہارے حوالے کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“

”شاباش! تمہیں اپنے فیصلے پر کبھی ندامت نہیں ہو گی۔“

”ایک بات اور بتا دو۔ نورین کو ختم کرنے کے لیے کوئی ایسا طریقہ ہے، جس سے اُسے کم سے کم تکلیف پہنچے؟“

"اس وقت حالات کے پیش نظر سب سے بہتر طریقہ یہی ہے، جو میں نے تمہیں بتایا ہوا ہے۔"

"کوئی اور ترکیب نہیں ہے؟"

"ہے۔ تم اُسے بے ہوش کر سکتے ہو۔ ایک ایسا پاؤڈر میں تمہیں دے سکتی ہوں، جسے پلاتے ہی اُس پر بے ہوشی طاری ہو جائے گی۔ اور جب وہ مرے گی تو اُسے تکلیف نہیں ہو گی۔ یہ پاؤڈر میں تمہیں دے کر جاؤں گی۔ تمہارے میز کے دراز میں رکھا ہو گا۔"

"اب تم جاؤ۔" میں نے کہا۔

"میں جا رہی ہوں۔ بس اس بات کا خیال رکھنا کہ تکیے کی مدد سے جب تم اُس کی سانس روکنے میں کامیاب ہو جاؤ گے اور جب اُس کا جسم تڑپنا ختم کر دے گا، تب بھی کم از کم پانچ منٹ تک اُس کے منہ پر مضبوطی سے تکیہ جمائے رکھنا۔ کیا سمجھے؟ اس کے بعد جب اُس کے دل کی دھڑکنیں ختم ہو جائیں تو اُسے چھوڑ کر کمرے سے باہر نکل جانا اور دو تین منٹ تک نہ کسی کو اندر آنے دینا اور نہ خود اندر آنا۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ اس وقت میں اُس کے وجود میں داخل ہوں گی۔"

وہ چلی گئی۔ سرسراہٹ کی آوازیں ختم ہو گئیں تو میں بلک بلک کر رونے لگا۔ یہ معلوم ہونے کے بعد کہ نورین کا جسم ضائع نہیں ہو گا اور وہ میرے بالکل قریب ہو گی، میرے دل کو سکون نہیں آ رہا تھا۔ میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"میں مجبور ہوں نورین!...... دنیا کی تمام دولت اور بادشاہت بھی مل جاتی تب بھی یہ کام نہ کرتا میں۔ لیکن میری ماں کا مسئلہ ہے۔"

بہت رو دھو کر میں کمرے سے باہر نکلا تو امی باہر مصلے پر بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھیں۔

وہ دن میں نے کس طرح رو رو کر گزارا، میرا دل ہی جانتا ہے۔ وقت گزرتا رہا اور میں سوچ کی سُولی پر لٹکا رہا۔

دوسرے دن نورین کو ہمارے ہاں آنا تھا۔ چھوٹے ماموں کی منگنی کی رسم ادا ہونے والی تھی۔ کون جانتا تھا کہ اس رسم میں شرکت کرنے والے مہمانوں کے ساتھ اُچھل اُچھل کر گانے گاتی اور تالیاں بجاتی نورین کو اپنی موت کی طرف آنا ہو گا۔ وہ رسم اُس کی زندگی کی آخری رسم ہو گی اور اُسے موت کی آغوش میں چلے جانا ہو گا۔ پھر جو نورین گھر واپس جائے گی، وہ نورین نہیں ہو گی۔

صبح اس رسم کی ادائگی کے لیے انتظامات کیے گئے اور پھر تھوڑا بہت ماحول بھی تبدیل ہو گیا۔ آخر کار مقررہ وقت پر وہ آ گئے۔ مجھ سے چلا نہیں جا رہا تھا۔ قدم من من بھر کے ہو گئے تھے۔

پھر بھی جیسے تیسے اُٹھا۔ میں نورین کو آخری بار ہنستے مسکراتے دیکھنا چاہتا تھا۔ ڈھولک بج رہی تھی، لڑکیاں کاروں سے ہنستی اور گاتی اتر رہی تھیں۔ مہمانوں کو ہار پہنائے جا رہے تھے۔ لیکن میری نگاہیں نورین کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ وہ آنے والے وقت سے بالکل بے خبر تھی۔

بہر حال میں ابھی نورین کو تلاش ہی کر رہا تھا کہ امی کی آواز سنائی دی۔

"نورین کہاں ہے؟"

میری نبضیں جیسے رُک سی گئیں۔ نظریں نورین کی امی کے چہرے پر جم گئیں۔

"نورین نہیں آئی۔" اُس کی امی نے ہنس کر کہا۔ "اُس کے ابو اُسے اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔"

میرے منہ سے ایسی زوردار چیخ بلند ہوئی کہ سب ٹھٹک گئے۔ ہنسی اور گانوں کی آوازیں ڈوب گئیں۔ امی میرے پاس آئیں تو میں بے اختیار ہو گیا۔ اس وقت خدا نے میری سن لی تھی۔ میری دعا قبول کر لی تھی۔

امی مجھے پیار سے تھپک بھی رہی تھیں اور دوپٹے کے آنچل سے اپنے آنسو بھی پونچھ رہی تھیں۔ "کیا ہو گیا؟ کیا بات ہے سکندر؟" انہوں نے میرے چہرے کو اپنی جانب گھماتے ہوئے پوچھا۔ میں بول نہیں سکتا تھا۔ حلق میں کچھ اٹک کر رہ گیا تھا۔ بس ہچکیاں اُمڈ رہی تھیں۔ میری بجائے نورین کی امی نے کہا۔

"میں جانتی ہوں یہ کیوں رو رہا ہے۔ ظاہر ہے بہن یاد آ گئی ہو گی۔ مگر وہ اللہ کی امانت تھی بیٹے! اُس نے جب چاہا، اپنی امانت واپس لے لی۔ اُس کی روح کو مت تڑپاؤ۔" اسی اثناء میں چھوٹے ماموں بھی آ گئے اور مجھے چمکارتے ہوئے میرے کمرے میں لے گئے۔

"ہمت سے کام لو۔ لو پانی پیو۔"

"چھوٹے ماموں!" میں نے تکیے سے تھوڑا سا سر اُوپر اُٹھایا اور میز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اُس میز کے دراز میں ایک پڑیا پڑی ہوئی ہے۔ اُس کا سارا سفوف گلاس کے پانی میں ڈال کر مجھے دے دیں۔ اس سے مجھے سکون آ جائے گا۔"

اُنہوں نے میز کی دراز کھولی، اُس میں پڑیا موجود تھی۔ اُنہوں نے پڑیا کا سفوف گلاس میں ڈالا اور میرے پلنگ کی پٹی پر بیٹھ گئے۔ میں نے آنکھیں بند کیں، زیرِ لب کلمہ پڑھا اور گلاس منہ سے لگا لیا۔ لیکن اس سے قبل کہ پانی حلق میں جاتا، بجلی جیسا جھٹکا لگا اور گلاس فرش پر جا کر گرا اور کرچی کرچی ہو گیا۔

"ارے یہ کیا، کیا تم نے؟" چھوٹے ماموں نے حیرت سے کہا۔

میرے آنسو رک چکے تھے، ہچکیاں ٹھہر ٹھہر کر آ رہی تھیں۔ میں جانتا تھا گلاس کس نے پھینکا

ہے۔ مگر یہ بات چھوٹے ماموں کو تو نہیں بتا سکتا تھا۔ ہچکی لے کر بولا۔

”بس ہاتھ سے گر گیا تھا۔“

”کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ آج کیسی چھوٹے بچوں جیسی باتیں کر رہے ہو؟ گھر میں مہمان آئے ہوئے ہیں۔ کم از کم ان ہی کا خیال کرو۔ اچھے لڑکے بنو۔ خوشی کے موقع پر رونا دھونا اچھی بات نہیں ہے۔ چلو باہر آؤ تو ہنستے ہوئے آنا۔“

اُن کے جانے کے بعد میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ میں نے جو آنسو بہائے تھے وہ خوشی اور اظہار تشکر کے آنسو تھے۔ نورین میرے ہاتھوں مارے جانے سے بچ گئی تھی۔ ورنہ میں نے ترشولی کی چال میں آ کر نورین کو ختم کر دیا تھا۔ لیکن بچانے والے کا ہاتھ مارنے والے کے ہاتھ سے قوی ہوتا ہے۔ مجھے ترشولی جیسی ناپاک روحوں سے ڈرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میرے جسم میں نیا اور تازہ خون گردش کرنے لگا۔ بازوؤں میں طاقت محسوس ہونے لگی۔ تب ہی ایک زوردار آواز آئی اور میں سمجھ گیا کہ کون ہے۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”غصہ کس پر آ رہا ہے؟ مجھ پر یا اپنے آپ پر؟“

اُس نے تاش کی گڈی سے حروف جمائے۔

”تم نے پانی میں سفوف کیوں ملایا تھا؟“

”پاگل ہو گیا تھا۔“

”کیوں؟“

”ناقابل بیان خوشی کی وجہ سے۔“

”تمہیں نورین کے نہ آنے کی خوشی ہو رہی ہے؟“

”بے حد۔“

”تم نے اُسے آنے سے منع کیا تھا؟“

”کیسے منع کرتا؟ تم جو سائے کی طرح میرے پیچھے لگی ہوئی ہو۔“

”غلط ہوا۔ اُسے آنا چاہیے تھا۔“ وہ بولی۔

”ہاں، آنا تو چاہیے۔ ایسے خوشی کے موقعے بار بار نہیں آتے۔ مگر اللہ نے اُس کی مدد کی۔“

کچھ دیر کے لیے کمرے میں خاموشی طاری ہو گئی۔ ایسا لگ رہا تھا، جیسے اُسے کوئی جواب نہ سوجھ رہا ہو۔ کئی سیکنڈ کے بعد اُس نے لکھا۔

”میں اپنی تاریک دنیا سے باہر آنا چاہتی ہوں۔“

”تو آ جاؤ۔ تمہیں کون روک رہا ہے؟“

”مگر مجھے ایک بدن کی ضرورت ہے، سمجھے؟“ وہ خوشامد پر اُتر آئی۔

”دنیا میں جسموں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ سینکڑوں، ہزاروں لوگ روزانہ مرتے ہیں۔ جس کے جسم پر چاہو، قبضہ کر لو۔“

”تم ان باتوں کو نہیں سمجھ سکو گے۔“

”میں سمجھنا بھی نہیں چاہتا۔“

”بات کچھ اور تھی۔ تم نے مجھ پر ظلم کیا۔ مجھے میرے ہاتھ سے محروم کر دیا۔ جبکہ میں آج بھی یہی بات کہتی ہوں کہ مجھے تمہارے تاج کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ مجھ پر صرف الزام لگایا گیا تھا اور اس کے نتیجے میں مجھے ختم کر دیا گیا۔ سمجھے؟ اور اب تم اور صرف تم ہو، جو مجھے نئی زندگی دے سکتے ہو۔ اور کوئی بھی نہیں۔“

”بکواس بند کرو۔ میں تمہارے لیے کچھ بھی نہیں کرنا چاہتا۔“

”تمہیں کرنا ہو گا......ضرور کرنا ہو گا۔“ اُس نے کہا اور اس کے بعد مجھے یوں لگا، جیسے وہ چلی گئی ہو۔

میں کمرے سے باہر نکل آیا۔ اِدھر تقریب جاری تھی۔ چھوٹے ماموں شرمائے، لجائے لجائے تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ لڑکیاں اُن کے منہ میں لڈو ٹھونس رہی تھیں۔ میں اس منظر سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ اچانک میرے پیچھے سے ایک چوڑیوں بھرے ہاتھ نے میرے منہ میں لڈو ٹھونس دیا۔ میں نے جلدی سے اس ہاتھ کو پکڑ کر ہاتھ والی کا چہرہ دیکھا اور میرے منہ سے نکلا۔

”تم......؟“

”تعجب ہو رہا ہے؟“

”تم یہاں کیوں آئیں؟......تمہیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔“

”کیوں جناب!“ وہ اِٹھلا کر بولی۔ میں نے چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں، جیسے ترشولی وہیں موجود ہو گی تو میں اُسے دیکھ ہی لوں گا۔

”مم......میرا مطلب ہے کہ تم......“

”جی جناب! غالباً آپ ناراض ہو گئے ہیں۔“

”اگر میں ہو بھی گیا ہوں تو تم چلی جاؤ جلدی سے۔“

”بری بات ہے۔ کوئی اس طرح کسی کو اپنے گھر سے نکالتا ہے؟“

”اگر تم نہ گئیں تو میرے ہاتھوں تمہارا قتل ہو جائے گا۔“

نورین کا پورا چہرہ سرخ انگارے کی طرح تمتما اُٹھا۔ اُس نے اپنی بڑی بڑی مخمور آنکھوں سے میری طرف دیکھا، پھر بولی۔

”قتل تو میں پہلے ہی ہو چکی ہوں۔“ یہ کہتے ہی وہ وہاں سے ہٹ کر دوسری لڑکیوں کی طرف

چلی گئی۔ نورین پھر آ گئی تھی۔ لیکن ترشولی اُسے اس طرح قتل کرنے پر مجھے مجبور نہیں کر سکتی تھی۔ میرے اندر ایک انجانی سی قوت آ گئی تھی۔ پھر بھی میں جانتا تھا کہ ایک روح سے لڑائی مول نہیں لی جا سکتی۔ وہ ایک چوٹ کھائی ہوئی ناگن تھی۔ میں نے سوچا کہ مجھے گھر سے باہر کھسک جانا چاہیے۔ گھر سے نکل کر میں نے ایک سمت قدم اُٹھانے شروع کر دیے۔ میدان پار کر کے اُس سڑک پر پہنچ گیا، جو مسجد کی طرف جاتی تھی۔

سڑک کے ایک طرف جھونپڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ اس مقام پر، جسے کوڑا گھر کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا، بہت سے لوگ مجمع لگائے کھڑے تھے۔

''کیا ہوا؟......کیا ہو گیا؟'' کسی شخص نے دوسرے سے پوچھا۔

''ایک بڑھیا مر گئی ہے۔'' اس نے جواب دیا اور اشارہ کیا۔ لیکن اشارہ اس طرف کیا تھا جدھر وہ عمر رسیدہ عورت، جو میری ماں کے پاس آتی تھی، رہتی تھی اور جسے میری ماں بڑی عزت دیتی تھی اور اُسے عزت سے بڑی ماں کہتی تھی۔

''کب انتقال ہوا ہے؟''

''پتہ نہیں۔ ابھی معلوم ہوا ہے۔ نہ جانے بے چاری کب سے مری پڑی ہے۔''

میں آگے بڑھا، ناک پر رومال رکھا اور کوڑے کے ڈھیر سے بچتا ہوا جھونپڑی میں پہنچ گیا۔ جھونپڑی والوں میں سے کسی نے وہاں موم بتی جلا کر گھڑے کے پیندے پر رکھ دی تھی۔ میں نے بڑی ماں کو دیکھا جو اپنے جھلنگے پلنگ پر چت پڑی ہوئی تھی۔ منہ کھلا ہوا تھا، آنکھیں باہر نکل آئی تھیں۔ اتنا بھیانک منظر تھا کہ میں پردہ گرا کر کئی قدم پیچھے ہٹ گیا۔

''اس کی تدفین وغیرہ کا کیا انتظام کیا گیا ہے؟''

''بابا! رات کا وقت ہے، کیا ہو سکتا ہے؟ صبح ہو گی تو چندہ جمع کرنے نکلیں گے۔''

''تو رات بھر یہ یونہی اکیلی جھونپڑی میں پڑی رہے گی۔'' اور میرے اس سوال پر وہ اس طرح ہنس پڑے، جیسے میں نے کوئی بڑے ہی مزے کی بات کہہ دی ہو۔ ان میں سے ایک شخص نے جو ایک طرف تھا، کھانستے ہوئے کہا۔

''کسی نہ کسی کو اس کے ساتھ قبر میں بھی دفن ہونا پڑے گا۔''

وہ لوگ ہنسنے لگے اور میں انہیں ہنستا چھوڑ کر سڑک پر آ گیا۔ آگے جانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا اور میں میدان میں جا کر ایک بینچ پر بیٹھ گیا۔ کافی وقت یہاں گزارا، پھر یہاں علاقے کا چوکیدار میرے پاس آ گیا اور بولا۔

''کیا کر رہے ہو یہاں؟''

''بس ایسے ہی یہاں آ کر بیٹھ گیا ہوں۔ میرے گھر میں مہمان بھرے ہوئے ہیں۔''

''وہ سامنے والے گھر میں؟''

''ہاں۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔'' یہ کہہ کر وہ اطمینان کی سانس لیتا ہوا، لکڑی لگاتا ہوا آگے کی طرف بڑھ گیا۔

''بہر حال میں گھر میں پہنچ گیا۔ امی نے مجھے کمرے کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تو آواز دی۔

''ارے تم ادھر آؤ......کہاں چلے گئے تھے؟''

''کہیں نہیں امی! ایسے ہی بس۔''

''چلو، پہلے کھانا وغیرہ تو کھا لو۔'' امی نے میرے سامنے کھانا رکھا اور پھر خود ہی بول پڑیں ''میں نے آج کی رات کے لیے نورین کو یہیں پر روک لیا ہے۔''

''کیا؟'' میں چیخ پڑا اور امی نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔

''کیوں، کیا ہوا؟''

''کک......کچھ نہیں۔'' میں نے گردن جھکا کر کہا اور کھانا کھانے لگا۔

''چھوٹا سا گھر ہے ہمارا۔ ذرا سی تقریب بھی کرو تو ساری چیزیں اُلٹ پلٹ ہو جاتی ہیں۔ میں نے نورین کی امی سے کہا تو وہ بے چاری فوراً تیار بھی ہو گئیں۔''

''اور انہوں نے اسے چھوڑ دیا؟'' نوالہ میرے حلق میں اٹکنے لگا۔

''ہاں، ہاں......کیا بات ہے؟ تم عجیب سی باتیں کیوں کر رہے ہو؟''

''آپ نے اُسے روک کر اچھا نہیں کیا امی!''

''تم پاگل ہو گئے ہو کیا؟ نورین تو بہت خوش ہے۔ کہہ رہی تھی کہ میں دعائیں مانگ رہی تھی کہ آپ مجھے روک لیں۔ اس وقت بھی کمر پر دوپٹہ باندھے تمہارے کمرے کی صفائی کر رہی ہے۔''

میں نے بوکھلا کر اپنے سامنے کے برتن ہٹائے اور پاگلوں کی طرح اپنے کمرے کی طرف دوڑ پڑا۔ کمرے کی صفائی ہو چکی تھی۔ نورین نے وہ کتاب جو میرے سرہانے رکھی رہتی تھی، اُٹھائی تھی اور اس کا مطالعہ کر رہی تھی۔ میں اندر گیا تو وہ چونک پڑی۔

''کک......کون ہو تم؟'' میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''جی......کیا بکواس فرما رہے ہیں آپ؟''

میں فوراً ہی سنبھل گیا۔ مجھے یاد آ گیا کہ ترشولی اس وقت تک اس کے جسم پر قابض نہیں ہو سکتی، جب تک اسے ہلاک نہ کیا جائے۔ اسی وقت امی بھی وہاں پہنچ گئیں۔

"تم پاگل ہو گئے ہو کیا؟ کھانا چھوڑ کر یہاں کیوں بھاگ آئے؟"

"دیکھ لیجیے امی! ایک تو میں نے لاٹ صاحب کا کمرہ صاف کیا، اوپر سے شکریہ ادا کرنے کے بجائے آنکھیں دکھا رہے ہیں۔"

امی نے کہا۔ "کچھ کھسک گیا ہے یہ۔ اصل میں دونوں بھائی اپنے اپنے کمرے کی صفائی خود کرنے کے عادی ہیں۔"

"ہوں...... سارا کمرہ تو کباڑ خانہ بنا ہوا تھا۔ ہر طرف پھٹے ہوئے نقلی تاش بکھرے ہوئے تھے۔"

"چلو چل کر کھانا کھاؤ۔" امی نے کہا۔ میں نے ایک نگاہ نورین کو دیکھا اور نورین ہنس کر بولی۔

"امی! آپ انہیں اپنے ہاتھ سے کھانا کھلاتی ہیں؟"

کھانا کھا کر میں کمرے میں پہنچا تو وہ کمرے سے جا چکی تھی۔ بہرحال میں نے بھی ان پھٹے ہوئے تاشوں کو دیکھا اور سمجھ گیا کہ ترشولی بہت زیادہ بگڑ گئی ہے۔

صبح بہت دیر سے سو کر اُٹھا تو نورین جا چکی تھی۔ اُس کی امی فجر کے فوراً بعد لینے آ گئی تھیں۔

میں نے ناشتہ کیا، کتابیں سنبھالیں اور اسکول کے لیے روانہ ہو گیا۔ لیکن چند ہی قدم چلا تھا کہ میدان کی طرف سے ایک لڑکا ہوا میں ہاتھ ہلاتا ہوا زور زور سے چلاتا ہوا ادھر آیا۔ اُس نے کہا۔

"جھونپڑی میں مُردہ عورت زندہ ہو گئی ہے۔" وہ اس طرح چلا رہا تھا، جیسے اخبار بیچ رہا ہو۔

میں نے لپک کر اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"بڑی اماں زندہ ہو گئی ہے؟"

"ہاں...... وہ زندہ ہو گئی ہے۔" یہ کہہ کر لڑکا وہاں سے بھاگ گیا۔ مجھے حیرت ہوئی تھی۔ اور دوسری حیرت اس بات پر بھی ہوئی تھی کہ میں نے اتنی اہم خبر امی کو نہیں دی تھی۔ اور نجانے کیوں بھول گیا تھا۔ بہرحال اسکول جانے کے بجائے میں وہاں پہنچا۔ جھونپڑی میں عورتیں، بچے بھرے ہوئے تھے اور بڑی اماں پلنگ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اُس نے مجھے دیکھا اور جلدی سے بولی۔

"آ جاؤ بیٹا! ادھر آؤ۔" اُس نے کہا۔ لیکن نجانے کیوں مجھے ایک عجیب سا احساس ہوا۔ میں نے پہلے بھی بڑی اماں کی آواز سنی تھی۔ لیکن اس وقت یہ آواز بڑی کراری تھی اور اُس کا تلفظ بھی بڑا شاندار تھا۔ اُس نے کہا۔

"اسے راستہ دو...... راستہ دو...... دیکھتی نہیں ہو، میرا محبوب مجھ سے ملنے آیا ہے۔"

میں سرتاپا کانپ گیا۔ یقیناً یہ آواز ترشولی کی تھی۔ اُس نے پھر مجھ سے کہا۔

"آ جاؤ...... اندر آ جاؤ۔ تمہیں یہ بدن پسند نہیں آئے گا۔ مجھے بھی پسند نہیں ہے۔ مگر کیا

کروں، ان تاریکیوں سے نکلنے کے لیے جنہوں نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا، میں نے مجبور ہو کر اس بھدے جسم کو حاصل کر لیا ہے۔ اور اب جب تک تم اپنے کسی من پسند جسم کا انتظام نہیں کرو گے، مجھے اسی بدن میں رہنا پڑے گا۔"

وہاں پر موجود کسی شخص کو یہ معلوم نہیں تھا کہ جسے وہ بڑی اماں کہہ رہے تھے، وہ بڑی اماں نہیں تھی۔ وہ تو مر چکی تھی۔ اب یہ جسم ترشولی نے حاصل کر لیا تھا۔ ایک عورت دوسری عورت سے کہہ رہی تھی۔

"جب سے اس نے دوبارہ ہوش میں آ کر زندگی سنبھالی ہے، ایسی اُلٹی سیدھی باتیں کیے جا رہی ہے۔"

میں بڑی ماں کو دیکھ رہا تھا۔ اُس نے بڑی بے تکلفی سے کہہ دیا تھا کہ ہٹ جاؤ، میرا محبوب مجھ سے ملنے آیا ہے۔

میں نے ایک بار پھر اُس پر نگاہ دوڑائی تو وہ ہنس پڑی۔

جھونپڑی میں موجود عورتیں اور بچے حیرت سے اُسے اور مجھے دونوں کو دیکھ رہے تھے۔ میں وہیں کھڑے کھڑے صورت حال کا تجزیہ کر رہا تھا

گزشتہ رات ترشولی وہاں سے نکل آئی تھی۔ اُسے انسانی جسم کی ضرورت تھی اور اُسے آرزو تھی کہ دنیا میں آئے تو حسین اور متناسب، دلکش اور پُرکشش جسم کی مالک ہو۔ لیکن اس وقت اپنا کام نہ ہونے کی وجہ سے وہ مایوس ہو گئی ہو اور اس کے بعد اُسے ایک مُردہ جسم مل گیا ہو، چنانچہ اُس نے عارضی طور پر اسے ہی اپنے لیے پسند کر لیا ہو۔

بہرحال کچھ بھی تھا، ساری باتیں اپنی جگہ۔ میں اُس سے بے پناہ نفرت کرتا تھا۔ میں سکندر اعظم نہیں تھا اور نہ ہی مجھے کبھی اس بات پر یقین آ سکتا تھا کہ میں ماضی کا کوئی کردار بن سکتا ہوں۔ بس وہ ایک جادوئی عمل ہو گیا تھا۔ بہرحال وہ میری بہن کی قاتل تھی اور اس بات کو میں کبھی نہیں بھول سکتا تھا۔ میرا خون کھول رہا تھا۔ دل چاہ رہا تھا کہ اس منحوس کے نرخرے کو دانتوں سے چبا ڈالوں۔ بہرحال میں وہاں سے باہر نکل آیا۔

"کیا، کیا جائے۔ دیکھو کیسا عجیب واقعہ ہوا ہے۔"

"ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے۔"

غرض یہ کہ لوگ پتہ نہیں کیا کیا باتیں کر رہے تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ اب تک میں نے جو کچھ کیا ہے وہ ایک بے وقوفی کا عمل تھا۔ اپنی دانست میں، میں نے اُس کے بدن کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اُسے دفن کر دیا تھا۔ لیکن ایک بار پھر وہ ایک انسانی جسم میں آ چکی تھی۔ بڑا عجیب و غریب کھیل تھا۔ کیا کرنا چاہیے، مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میں گھر واپس آنے کے بعد بھی سوچتا رہا۔

میرا ذہن کافی خراب ہو چکا تھا۔ اب میں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ کچھ بھی ہو جائے، وہ کچھ بھی کہے لیکن میں نورین کے قتل پر آمادہ نہیں ہوں گا۔ میری بہن تو اس دنیا سے جا چکی تھی۔ میں اپنی محبت کو اس کے ہاتھوں قتل نہیں کرانا چاہتا تھا۔ پھر مجھے کیا کرنا چاہیے۔ بڑی عجیب سی کیفیت ہو گئی تھی میری۔ پھر اچانک ہی میرے ذہن میں ایک تصور اُبھرا، ایک انوکھا تصور۔ ترشولی تاریک دنیا کی مخلوق ہے۔ اُسے اسی دنیا کے ہتھیار سے قتل کیا جا سکتا ہے۔ ان ہتھیاروں کے حصول کے لیے اگر مجھے تاریک دنیا کا سفر کرنا پڑے تو مجھے اس کے لیے بھی تیار ہونا چاہیے۔ مجھے پُراسرار علوم حاصل کرنا ہے۔

اس دن کے بعد سے میری فطرت میں ایک نمایاں تبدیلی آ گئی۔ پڑھنے لکھنے سے میرا دل بالکل ہی اُچاٹ ہو گیا تھا۔ میں نے اسکول جانا چھوڑ دیا اور پبلک لائبریری کا رُخ کیا۔ اتنی بڑی لائبریری میں کوئی ایسی کتاب نہیں تھی، جو میرے مطلوبہ تقاضوں کے مطابق ہوتی۔ پھر میں نے لائبریرین سے مدد لی اور اُس نے اپنے رجسٹر کی مدد سے آدھی درجن کتابیں نکال کر میرے سامنے ڈال دیں، جن میں دست شناسی کی کتابیں تھیں، مسمریزم کی، ٹیلی پیتھی، ایک قسمت کا حال بتانے والی کتاب تھی۔ کچھ چھوٹی کتاب جنات کے بارے میں تھی۔ میں نے اس کتاب کو اپنے موضوع سے قریب تر پایا اور کافی دیر تک پڑھتا رہا۔ پھر میں نے بہت سی ایسی باتیں نوٹ کیں، جن پر عمل کر کے جنوں کو قبضے میں کیا جا سکتا تھا۔ لیکن ایک ترکیب میں نے کی کہ جنوں کو قبضے میں کرنے کا کوئی شوقین اس باب میں درج شدہ سارے طریقوں کو پھاڑ کر اپنے ساتھ لے گیا تھا اور اس کتاب کی دوسری کوئی جلد نہیں تھی۔ اس لیے لائبریرین سے بات کی تو اُس نے کہا۔

"لوگ ایسا کرتے ہیں۔"

بہرحال میں گھر واپس آ گیا۔ مجھے کھانا وغیرہ دے کر امی نے مجھے وہ کہانی سنائی، جو بڑی اماں کے سلسلے میں تھی۔

"وہ بالکل مر چکی تھی۔ سب کو پتہ چل گیا تھا۔ انہوں نے اُس کو دفنانے کا بندوبست بھی کر لیا تھا۔ مگر جب اُسے نہلانے کے لیے تختے پر لے کر جایا جا رہا تھا تو اُس نے آنکھیں کھول دیں۔"

"آپ کو یہ باتیں کس نے بتائیں؟"

"لو...... پوری کالونی میں یہ باتیں ہو رہی ہیں۔"

کسی کو کچھ نہیں معلوم تھا لیکن میں جانتا تھا کہ حقیقت کیا ہے۔ جسے بڑی اماں سمجھا جا رہا ہے، وہ بڑی اماں نہیں ہے بلکہ اس کے بدن میں کوئی اور ہی ہے۔ میں نے بہرحال اس بات کو نظرانداز کر دیا اور میرا کام جاری رہا۔ پتہ نہیں کیوں مجھے ایک دم سے پُراسرار علوم کو حاصل کرنے میں دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ میں اسکول جانے کے بجائے اِدھر اُدھر نکل جاتا تھا اور ایسی کتابوں کو

تلاش کرنے کی کوشش کرتا تھا، جن میں جنات کے بارے میں تذکرے ہوں۔ پرانی کتابوں میں مجھے کئی ایسی کتابیں ملیں، جن میں مجھے جنات کے قریب پہنچنے کے راستے پتہ چلنے لگے۔

ایک کتاب کو میں نے خاص طور سے توجہ سے دیکھا، اُس کے مصنف نے لکھا تھا کہ نظر نہ آنے والی یہ مخلوق اکثر ہمارے قریب آ جاتی ہے، ہمیں مختلف قسم کے تجربات میں ڈال دیتی ہے۔ اُس نے کہا تھا کہ اپنے کمرے یا کوٹھی کے دروازے پر ایسے پلنگ ڈالو کہ آنے جانے کا راستہ رک جائے۔ پھر اس پلنگ پر لیٹنے کی کوشش کرو۔ اُس کا دعویٰ تھا کہ نیند کی صورت میں بھیانک خواب نظر آئیں گے اور تمہیں پلنگ ہٹانے پر مجبور کیا جائے گا۔

اُس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ جن ویرانوں، بیابانوں اور خالی مکانوں میں ڈیرے ڈالتے ہیں اور انسانوں سے دُور رہنا پسند کرتے ہیں۔ انہیں یہ بھی قوت حاصل ہے کہ وہ خود کو جس قالب میں ڈھالنا چاہیں، ڈھال سکتے ہیں۔ یوں تو وہ انسان اور حیوان دونوں کا روپ دھار لیتے ہیں، لیکن انہیں سانپ کی شکل میں آنا بہت پسند ہے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ رینگتا ہوا سانپ ہر جگہ آسانی سے آ جا سکتا ہے۔

بہرحال طرح طرح کے واقعات بتائے گئے تھے اور ان واقعات میں ایک دفعہ یہ بھی بتایا گیا تھا کہ جے پور کی مہارانی درگاوتی نے اپنی سوت سے جو اُس کی موت کی ذمے دار تھی، بڑا خوف ناک انتقام لیا تھا۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سے عجیب و غریب واقعات۔ بہرحال میں اپنا کام جاری رکھے ہوئے تھا اور مجھے بڑی عجیب و غریب کیفیات سے گزرنا پڑ رہا تھا۔

پھر ایک دن پروفیسر دین مجھے ملے اور انہوں نے کہا۔ "یہ تمہاری کتابیں ہیں۔ ایک بزرگ نے یہ کہا تھا کہ کتابیں تمہیں پہنچا دی جائیں۔ انہوں نے تمہارا پتہ وغیرہ دیا تھا۔"

"مگر جناب! یہ کتابیں؟"

"بھئی تم جانو اور تمہاری مرضی۔ دیکھ لو، ہو سکتا ہے کہ ان کتابوں میں تمہیں کچھ مل جائے۔"

میں نے کتابیں لے لیں اور جب پہلے دن میں نے اس کا تجزیہ کیا تو اس کے اوپری حصے میں مجھے فادر جیکسن کا نام لکھا ہوا نظر آیا۔ یہ بڑی عجیب و غریب سی چیز تھی۔ یہ کتابیں پُراسرار علوم پر مشتمل تھیں۔ میں جانتا تھا کہ فادر جیکسن نے یہ کتابیں میرے پاس کیوں بھجوائی ہیں۔ بہرحال میں اپنا کام کر رہا تھا۔

ترشولی کی بھی پل پل کی خبریں حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بڑی ماں کی جھونپڑی کے پیچھے جو کوڑے کرکٹ کا ڈھیر لگا رہتا تھا، اُسے ہٹا دیا گیا تھا اور بڑی ماں اب زندہ انسانوں کے درمیان پوجی جا رہی تھی۔ دور دور سے مرد اور عورتیں اس سے منت اور مرادیں مانگنے آنے لگے تھے۔ جھونپڑی والوں کا کہنا تھا کہ جب سے بڑی ماں دوبارہ زندہ ہوئی ہے، بڑی باکرامت ہو گئی

ہے۔ پہلے کچھ بھی نہیں جانتی تھی لیکن اب وہ دنیا کی کئی زبانیں فرفر پڑھنے لگی تھی۔ وہ قرب و جوار کے لوگوں کو پھل، مٹھائیاں، ہری الائچیاں وغیرہ دیا کرتی تھی۔ اور اگر کوئی اُس کے پاس آ جاتا تو وہ اُس کی مدد بھی کر دیا کرتی تھی۔ بہرحال ایسے واقعات ہو چکے تھے، جو بڑی ماں کو باقاعدہ ایک بزرگ کی حیثیت دے چکے تھے۔

جھونپڑی والوں کی تو گویا چاندی ہو گئی تھی۔ بڑی ماں کے پاس ایک بڑا سا آئینہ پہنچا دیا گیا تھا اور وہاں وہ بیٹھی اپنے چہرے کو دیکھتی رہتی تھی۔ اُس کے بال تیزی سے گر رہے تھے مگر پھر بھی ماتھے پر سرخ رنگ کا ہیئر بینڈ پڑا رہتا تھا۔ یہ ہیئر بینڈ نجانے اُس کے پاس کہاں سے آیا تھا۔ بہرحال ایک بار امی اور ہماری گلی کی دوسری عورتیں بھی بڑی ماں کو دیکھنے گئیں اور ان کے پاس جا کر ان سے باتیں کرنے لگیں۔ یہ تھے وہ حالات و واقعات، جو تیزی سے گزر رہے تھے۔

ایک دن ماں میرے کمرے میں آئیں اور خاموشی سے پلنگ پر بیٹھ گئیں۔ میں اُن کا چہرہ تک رہا تھا۔ ”تمہارا کیا خیال ہے کہ تمہارے بارے میں مجھے کبھی معلومات حاصل نہیں ہو سکتیں؟“

میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ امی کو علم ہو گیا تھا کہ میں کتنے دن سے اسکول سے غیر حاضری کر رہا ہوں۔

”تمہاری پرنسپل کا پرچہ میرے نام آیا ہے اور انہوں نے تمہاری مسلسل غیر حاضری کی اطلاع دی ہے۔ تم کہاں جاتے ہو؟ گھر سے تو تم روزانہ پابندی سے اسکول کے لیے نکلتے ہو۔“

”امی! آپ کو آئندہ کوئی شکایت نہیں ہو گی۔“

”میرے سوال کا جواب دو کہ اب تک جاتے کہاں رہے ہو؟“

”مجھے کچھ کتابوں کی تلاش تھی امی!“

”ان کتابوں کی؟“ انہوں نے میز پر رکھی ہوئی کتابوں کی طرف اشارہ کیا۔

”جی۔“

”کیا ہو گیا ہے تمہیں آخر؟ پہلے تو تم پڑھائی کے چور نہیں تھے۔ اب تو تمہاری طبیعت بھی ٹھیک رہتی ہے۔ اُس بلا سے بھی تمہیں نجات مل چکی ہے۔ پھر آخر تمہیں ہو کیا گیا ہے؟“

میری آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ اب بھلا میں انہیں کیسے بتاتا کہ وہ بلا اب تک موجود ہے اور اب پہلے سے زیادہ خطرناک ہو گئی ہے۔“

”فضول باتیں نہ کرو۔ اس سے پہلے کہ میں تمہیں کوئی سخت سزا دینے پر آمادہ ہو جاؤں، اپنے آپ کو سنبھالو۔“

میں خاموش ہو گیا۔ امی چلی گئیں تو میں نے پھر ایک بار صورتِ حال پر غور کیا۔ کیا کرنا

چاہئے مجھے؟ بہن کی موت کو بھول کر تعلیم پر توجہ دوں یا ترشولی سے بچنے کی کوشش کروں، جو میری بہن کی زندگی چھیننے کے بعد اب نورین کے پیچھے پڑی ہوئی تھی۔ اُس نے نورین کو قتل کرنے پر تقریباً آمادہ ہی کر لیا تھا۔ بڑی سنگین صورتِ حال تھی۔

غرض یہ کہ وقت اسی طرح گزر رہا تھا۔ وہ تو اتفاق کی بات تھی کہ قدرت نے نورین کو بچا لیا تھا۔ لیکن بہرحال میں نے شکست تسلیم نہیں کی تھی۔ انتقام کے جذبے نے میرے دل و دماغ پر گہرا اثر ڈالا تھا۔ صحت گر گئی تھی، نظامِ ہضم بگڑ گیا تھا۔ کئی کئی وقت بھوک نہیں لگتی تھی۔ اسکول کی پڑھائی سے نفرت ہو گئی تھی۔ ادھر میرے اہلِ خانہ نے رخسانہ کو صبر کر لیا تھا لیکن نجانے کیوں مجھے صبر نہیں آ رہا تھا۔

ایک دن میں بیٹھا انہی سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا کہ اچانک مجھے ایک بات یاد آئی اور میں تیزی سے نکل کر امی کے پاس پہنچا، جو باورچی خانے میں کھانا پکا رہی تھیں۔

”مجھے ایک بات کا جواب دیں گی امی! کیا آپ نے رخسانہ کو بھلا دیا ہے؟“

امی لرز سی گئیں، پھر ہلکی سی آواز میں بولیں۔

”کیوں پوچھ رہے ہو یہ بات؟“

”مجھے ایک بات کا جواب دیجیے۔ سنا ہے کہ جب رخسانہ کو قبرستان لے جایا جا چکا تھا، وہ آپ کو نظر آئی تھی اور اُس نے رونے سے منع کیا تھا اور کہا تھا کہ اگر آپ نے اس کی یاد میں آنسو نہیں بہائے تو وہ آئندہ بھی آپ کے پاس آتی رہے گی۔ آپ ہی نے مجھے یہ بات بتائی تھی۔“

”ہاں۔“

”تو پھر کیا وہ دوبارہ آئی؟“ میں نے پوچھا اور امی جان نے دوپٹے کے پلو سے آنکھوں میں آئے ہوئے آنسو خشک کر کے آہستہ سے کہا۔

”میری بچی نے جھوٹا وعدہ نہیں کیا تھا۔“

میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ میں نے کہا۔

”اس کا مطلب ہے وہ آپ کے پاس آتی ہے۔“

امی کوشش کے باوجود اپنے منہ سے نکلنے والی سسکی کو نہیں روک سکیں۔ انہوں نے آہستہ سے کہا۔

”قریب نہیں آتی، دور کھڑی رہتی ہے۔ پاس بلاؤں تو ہٹنے لگتی ہے۔ اُسے سینے سے لگانے کے لیے دل کیسا تلملاتا اور تڑپتا رہتا ہے، میں تمہیں بتا نہیں سکتی۔“

”وہ آپ سے باتیں نہیں کرتی؟“

”کرتی ہے۔ جو پوچھتی ہوں، اس کا جواب دیتی ہے۔“

"آپ اُس سے کیا کیا پوچھتی ہیں؟"

امی اپنی مرحوم بیٹی کے تصور سے ہی خوش ہو گئی تھیں۔ اُنہوں نے معصوم سی آواز میں کہا۔

"بس یہی کہ کیسی ہو رخسانہ؟"

"اور کچھ نہیں؟" میں نے پوچھا تو وہ چونک سی پڑیں۔ اُن کا چہرہ سکڑ گیا، آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ کہنے لگیں۔

"تم نے اُسے بھگا دیا۔ نہ تم مجھ سے بولتے، نہ میں تمہاری طرف متوجہ ہوتی۔"

میری نگاہیں چاروں طرف گھوم گئیں۔ میں نے کہا۔

"تو وہ یہاں آئی تھی؟"

"بہت دن کے بعد آئی تھی۔"

"کہاں کھڑی تھی وہ؟ آپ نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟"

"تمہارے پاس ہی تو کھڑی تھی۔ تمہیں دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ ہاتھ بڑھا کر تمہارے ماتھے کے بال درست کرنا چاہتی تھی کہ تم بول پڑے۔"

نجانے کیوں میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ امی نے پھر کہا۔ "تمہیں اس کی خوشبو محسوس نہیں ہو رہی؟"

میں نے ایک دم محسوس کیا کہ ایک عجیب سی خوشبو گھر میں پھیلی ہوئی ہے۔ امی نے کہا۔ "یہ جنت کی خوشبو ہے۔"

میں بڑا متاثر ہو گیا تھا ان تمام باتوں سے۔ میں نے امی سے کہا۔

"امی! اب کے رخسانہ آئے تو اُسے یہ بتا دیں کہ میں بھی اُسے دیکھنا چاہتا ہوں۔"

امی نے میرے حسرت بھرے لہجے کو محسوس کیا اور بولیں۔

"بہت سی باتیں سوچتی ہوں کہ یہ کہوں گی، وہ کہوں گی۔ لیکن وہ نظر آتی ہے تو خیریت پوچھنے کے علاوہ کچھ بھی نہیں بول پاتی۔ اُس کی زبان قینچی کی طرح چلتی ہے تو کسی طرح رُکنے میں نہیں آتی۔ باتونی تو وہ سدا کی تھی۔ لیکن موت کے بعد بہت زیادہ بولنے لگی ہے۔ میں تمہارا پیغام پہنچا دوں گی۔"

اسی وقت دروازے کی گھنٹی بجی۔ باہر کوئی دروازے کی گھنٹی بجا رہا تھا۔

"کہیں دور مت نکل جانا۔ کھانا تیار ہے۔" امی نے کہا۔ میں نے باہر نکل کر دیکھا تو وہی پولیس افسر، جس نے اپنا نام داراب بتایا تھا، کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اس وقت وہ یونیفارم میں تھا۔ میں نے اُسے پہچان کر کہا۔

"ہیلو! کیسے ہو آپ؟"

"بس ایسے ہی ادھر سے گزر رہا تھا۔ سوچا تمہاری خیر خبر لے لوں۔ نجانے کیوں تم سے ایک محبت سی محسوس ہوتی ہے۔ کہو، کیسی گزر رہی ہے؟"

"اللہ کا شکر ہے۔ آؤ تھوڑی دیر بیٹھ کر باتیں کریں۔" اُس نے سامنے پڑی ہوئی بنچوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"کوئی خاص بات ہے، داراب صاحب؟"

"میں نے کہا ناں، کہ تم سے اچھی خاصی دوستی ہو گئی ہے۔ ویسے میں تمہیں ایک خاص بات بتاؤں، تم نے جس روح کا تذکرہ مجھ سے کیا ہے اس نے ایک اور لڑکے کو بھی قتل کر دیا ہے۔"

"آپ کا مطلب ہے، ترشولی نے؟"

"شاید۔"

"میرا خیال ہے ایسی بات نہیں ہے۔ کیونکہ وہ اب کسی کو قتل نہیں کر سکتی۔"

"کیوں؟......... ایسی کیا خاص بات ہو گئی ہے؟"

"بس، میرا یہی خیال ہے۔"

"ہمیں جس لڑکے کی لاش ملی ہے، اُس کا بازو بالکل اس طرح کاٹا گیا ہے، جس طرح تمہاری بہن رخسانہ کا بازو کٹا تھا۔ اور اس کے بعد فادر جیکسن کا۔"

"اوہ، ہو سکتا ہے......... لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ کوئی اور ہی ہو۔"

پولیس آفیسر ہنسنے لگا، پھر بولا۔

"تعجب کی بات ہے کہ تم ترشولی کی حمایت کر رہے ہو۔"

"میرے ذہن میں ایک اور بات ہے جناب! وہ یہ کہ ترشولی اب روح نہیں رہی ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"آپ یقین نہیں کریں گے لیکن اب وہ ایک بوڑھی عورت کا روپ دھار چکی ہے۔"

پولیس آفیسر ہنسنے لگا، پھر بولا۔

"تھوڑی دیر کے بعد تم کہو گے کہ وہ ماں بننے والی ہے۔"

"نہیں۔ میں یہ بات بالکل نہیں کہوں گا۔ آپ نے خود ہی اُس کا ذکر چھیڑا تھا کہ اُس نے ایک لڑکے کا قتل کر دیا ہے۔ آپ روح پر بھی یقین نہیں رکھتے اور روح ہی کو قتل کا ذمے دار قرار دیتے ہیں۔"

"بس ایسی ہی تعجب کی بات ہے کہ آج کل ایک ہی انداز کے قتل ہو رہے ہیں۔ موت کے بعد قتل ہونے والے اپنے ایک ہاتھ سے محروم ہوتے ہیں۔ ہر ممکن تلاش کے باوجود ہمیں ان ہاتھوں کا کوئی پتہ نہیں چلا۔ صرف تم ہو کہ جو کہتے ہو کہ ان ہاتھوں کو کسی روح نے اُڑا لیا ہے۔ تم اس

روح کا نام بھی بتاتے ہو، جو ترشولی ہے۔ کوئی شخص خود کو روح ظاہر کر کے یہ چکر چلا سکتا ہے۔ لیکن وہ، جو اِن باتوں سے واقف ہو۔ خیر چھوڑو، میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ ہمیں تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔"

"میں کیا مدد کر سکتا ہوں بھلا؟"

"تم روح سے ڈرتے ہو؟"

"نہیں، بالکل نہیں۔ ویسے بھی آپ روحوں کی موجودگی سے انکار کرتے ہیں۔"

"میری بات سنو۔ میں تمہیں اس قتل کا واقعہ سناتا ہوں۔ ایک سولہ سالہ لڑکا جس کا نام توفیق ہے، اپنی خالہ سے ملنے کے لیے جاتا ہے، رات کو سات آٹھ بجے کے درمیان اُس کا خالہ زاد بھائی اُس کے پاس پہنچتا ہے اور اُس لڑکے کی گمشدگی کی اطلاع دیتا ہے۔ بہرحال سامنے والی جھونپڑیوں کے پیچھے اُس کی لاش ملتی ہے جس کا بازو کٹا ہوا ہے۔ ایسا لگتا تھا، جیسے مقتول نے اپنی جان بچانے کی پوری کوشش کی ہو۔ اُس کے بائیں ہاتھ کی مٹھی میں لال رنگ کا ایک ہیئر بینڈ تھا۔

"لال رنگ کا ہیئر بینڈ۔" بڑی عجیب سی پچویشن تھی۔ لڑکے کی لاش ان جھونپڑیوں کے عقب میں ملی تھی اور انہی جھونپڑیوں میں سے ایک میں ترشولی بڑی ماں کی حیثیت سے رہتی تھی۔ اُس نے اپنی پیشانی پر لال رنگ کا ہیئر بینڈ لگانا شروع کر دیا تھا۔ میرے علاوہ کسی کو علم نہیں تھا کہ وہ ہیئر بینڈ اُس کے پاس کہاں سے آیا تھا۔ پولیس آفیسر نے چونک کر مجھے دیکھا۔

"کیوں، لال رنگ کے ہیئر بینڈ کا سن کر تم چونک کیوں گئے؟"

مجھے پورا پورا یقین ہو گیا تھا کہ اُس لڑکے کو اُس بڑی ماں نے ہی قتل کیا ہو گا۔ مگر میں پولیس آفیسر کو اصل بات بتاتے بتاتے رک گیا۔

"نہیں، میں ایسے کسی شخص کو نہیں جانتا۔"

"پھر تم سرخ رنگ کے ہیئر بینڈ کے ذکر پر کیوں چونکے تھے؟"

"تعجب ہوا تھا مجھے۔ کیونکہ میں نے آج تک کسی مرد کو سرخ رنگ کے ہیئر بینڈ میں نہیں دیکھا تھا۔"

"عورتوں کو دیکھا ہے؟"

"عورتیں تو عام طور سے اس طرح کے بینڈ استعمال کرتی ہیں۔"

"میرا خیال ہے کہ تم کچھ چھپانے کی کوشش کر رہے ہو۔ بہرحال، چھوڑو۔ اگر تم تھوڑا سا تعاون کرو تو ہم آسانی سے اس تک پہنچ سکتے ہیں۔"

"مجھے بتائیے کہ میں کیا کر سکتا ہوں؟"

"ہمیں اس روح کے بارے میں بتاؤ، جو تم سے ملنے آتی ہے۔"

"پہلے تاریکی میں نظر آتی تھی، مگر اب نہیں آتی۔"

"کہیں خاص جگہ نظر آتی تھی؟"

"جی نہیں۔ بس جہاں بھی اندھیرا ہوتا تھا۔ اور میرے علاوہ اُسے کوئی نہیں دیکھ پاتا تھا۔"

"شکل وصورت کیسی تھی اُس کی۔"

"بس، خوف ناک صورت تھی۔ کالی تھی۔ بڑے بڑے سفید دانت تھے اور کھال جگہ جگہ سے اُدھڑی ہوئی تھی۔ اس طرح خوفناک چہرہ ہوتا تھا کہ اُسے دیکھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔"

"کب سے کب تک نظر آتی رہی؟"

"بس تھوڑے عرصے پہلے تک اور میری بہن کی موت تک۔"

"تمہارا کہنا ہے کہ تمہاری بہن کو اس روح نے، جس کا نام ترشولی تھا، قتل کیا تھا۔ یہی بات ہے ناں؟ وہ چھت پر مُردہ حالت میں ملی تھی اور اُس کا ایک بازو غائب تھا۔"

"ہاں......ایسا ہی تھا۔"

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"ٹھیک۔ اس کے بعد کوئی ایسی بات ہوئی، جو تمہارے لیے حیران کن ہو؟"

"بس، ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔"

"ٹھیک ہے، اب میں تم سے ایک بار پھر یہ کہتا ہوں کہ اگر تمہیں اس سلسلے میں کوئی اور بات معلوم ہو تو قانون سے مت چھپانا، اگر تم قاتل سے آگاہ ہو۔ لیکن بہن کے قتل کا انتقام خود لینے کے باعث ہم سے چھپا رہے ہو تو تمہیں قانون کی نگاہ میں مجرم کا شریک سمجھا جائے گا۔"

"ٹھیک ہے۔ جو کچھ بھی ہو گا، وہ بعد کی بات ہے۔ فی الحال میں اس کے بارے میں کوئی اور بات نہیں کہہ سکتا۔"

"تو پھر ٹھیک ہے۔ تم اگر پولیس کی مدد کرو گے تو تمہارے ساتھ تعاون کیا جائے گا۔ ورنہ اگر ہم چاہیں تو تمہیں تھانے میں بلا کر بھی اتنی سختی کر سکتے ہیں کہ تم ہمیں اصل بات بتانے پر مجبور ہو جاؤ۔"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں؟"

بہرحال پولیس افسر تھوڑا سا بددل ہو گیا تھا اور مجھے یوں لگ رہا تھا، جیسے وہ میری باتوں سے خوش نہیں ہے۔ یہ واقعی ہو سکتا تھا کہ ترشولی نے اور بھی کوئی قتل کیا ہو۔ لیکن میں اس سلسلے میں کیا کر سکتا تھا۔ البتہ ایک خوف تھا مجھے کہ اگر پولیس نے بڑی ماں کو پکڑ لیا اور اُسے سزائے موت وغیرہ ہو گئی تو ترشولی کو ایک بار پھر آزادی مل جائے گی اور وہ آزاد ہوتے ہی دوبارہ مجھ سے نورین کے جسم کا تقاضا کرے گی۔ بہرحال اب جو ہو گا، دیکھا جائے گا۔

وہ پوری رات بھیانک تھی۔ کھانے کے بعد میں نے کئی مرتبہ سوچا کہ باہر جاؤں اور بوڑھی عورت کی خیر خبر معلوم کروں۔ لیکن لگ رہا تھا، جیسے ہمارے پورے گھر کو روحوں نے اپنے احاطے میں لے لیا ہو۔ ان کی سرسراہٹیں اور ہنسنے رونے کی آوازیں مجھے سنائی دے رہی تھیں۔ کبھی کبھی مجھے آنکھوں کے سامنے بجلی کا کوندا سا لپکتا ہوا محسوس ہوتا تھا اور اس کوندے کی روشنی میں عجیب عجیب سی خوف ناک شکلیں نظر آنے لگتی تھیں۔

ایک بار تو میں نے صرف چند گز کے فاصلے پر ایک ایسے ہیولے کو کھڑا دیکھا، جس نے دھڑ سے الگ کر کے اپنے سر کو دونوں ہاتھوں میں اُٹھا رکھا تھا اور اُس کے حلق سے ایسے قہقہے نکل رہے تھے جیسے پھوٹ پھوٹ کر رو رہا ہو۔ بہر طور آدھی رات تک ہمارے گھر میں، خاص طور پر میرے کمرے میں دھما چوکڑی مچی رہی۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو ہوش و حواس کھو بیٹھتا۔ لیکن میں اب ایسی باتوں کا عادی ہو چکا تھا۔ بارہ بجے کے بعد اس ہنگامے میں کمی ہونا شروع ہو گئی۔ شاید روحیں تھک گئی تھیں۔ خوفناک قسم کی آوازیں سرگوشیوں میں تبدیل ہو گئیں۔ میں نے کہا۔

"جنہوں نے مجھے ڈرانے اور خوف زدہ کرنے کی کوشش کی تھی، انہوں نے اچھی طرح سمجھ لیا ہوگا کہ میری لغت میں ڈر اور خوف کے الفاظ نہیں ہیں۔ اب مجھے سکون کی نیند سونے دیا جائے۔"

کمرے میں بھی گہرا سناٹا طاری ہو گیا۔ آوازیں بند ہو گئیں۔ البتہ یوں لگ رہا تھا، گویا بہت سے پرندے پھڑ پھڑاتے ہوئے کمرے کی کھڑکیوں سے باہر نکل رہے ہوں۔ پھر خالی کمرے میں ایک سفید سایہ نظر آیا۔ سفید سائے کی اصطلاح بہت سے لوگوں کو عجیب معلوم ہوگی لیکن جو چیز میری طرف بڑھ رہی تھی، وہ ایک سایہ ہی تھا۔ اُس کے اعضاء واضح نہیں تھے لیکن برف کے گالوں کی طرح سفید اور شیشے کی طرح شفاف تھے۔

میں نے اُسے اپنی جانب بڑھتے دیکھ کر خاموشی سے کروٹ بدل لی اور اس کی طرف پیٹھ کر لی۔ پھر نجانے کس طرح مجھے نیند آ گئی۔ غرض یہ کہ خواب کے عالم میں بھی ان روحوں کو ہی دیکھتا رہا۔

صبح میں نے جاگ کر ناشتہ وغیرہ کیا اور پھر امی سے بات کرنے لگا۔ امی چھوٹے ماموں کی شادی کے بارے میں تفصیلات بتا رہی تھیں۔ پھر انہوں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"تم اپنے کپڑوں کا ناپ دے آنا۔ شادی میں گنتے چنے دن رہ گئے ہیں، ابھی کوئی تیاری نہیں ہوئی ہے۔"

"ٹھیک ہے، دیکھ لیں گے۔" میں آج کل اسکول تو جا نہیں رہا تھا۔ ناشتے سے فارغ ہو کر

باہر نکلا اور یونہی اپنے ایک دوست کے گھر جانے کا فیصلہ کیا۔ لیکن میدان پار کرتے ہوئے جھونپڑیوں کے اطراف میں پولیس کی دو گاڑیاں اور درجنوں پولیس والے نظر آئے۔ میں پہلے ہی جانتا تھا کہ سرخ بینڈ کی نشانی پولیس کو زیادہ دیر تک بڑی ماں سے دور نہیں رکھ سکے گی۔

میں جھونپڑیوں کی جانب چل پڑا۔ وہاں پہنچ کر بڑی ہی عجیب قسم کی کہانی سننے کو ملی۔ جھونپڑیوں میں رہنے والے دو نوجوان، جن میں سے ایک نے بڑی اماں کے دل میں خنجر اُتار کر اُسے ختم کر دیا تھا۔ دوسرا جھونپڑیوں کی ہی ایک لڑکی کو جس کے ساتھ اُس کی شادی طے ہو چکی تھی، فرش پر گرا کر تکیے کی مدد سے سانس گھونٹ کر ختم کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ آہٹ سن کر کچھ لوگ وہاں پہنچ گئے۔ لڑکی کو بچا لیا گیا لیکن بڑی ماں کو نہیں بچایا جا سکا۔

دونوں نوجوان گرفتار ہو کر تھانے پہنچ گئے تھے۔ جبکہ ایمبولینس کے ذریعے بڑی ماں کی لاش اور سانس گھونٹے جانے والی لڑکی کو ہسپتال لے جایا گیا تھا۔ یہاں پولیس کی کارروائی جاری تھی۔ تصویریں وغیرہ اُتاری جا رہی تھیں۔ میرے لیے وہاں ٹھہرنا مشکل ہو گیا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ کیا حماقت ہو گئی ہے مجھ سے۔ ترشولی بوڑھے بدن کی قید سے آزاد ہو گئی تھی۔ اگر میں پولیس افسر کو حقیقت بتا دیتا تو ترشولی اتنی جلدی آزاد نہ ہو جاتی اور پولیس اُسے گرفتار ضرور کر لیتی۔ پولیس سے تعاون نہ کر کے میں نے اپنے پیر پر خود کلہاڑی ماری تھی۔

بہر حال میں پبلک کال بوتھ تک پہنچا اور میں نے نورین کو فون کیا۔

"کیا حال ہے نورین! آج تم ہمارے ہاں آ رہی ہو؟"

"نہیں، کیوں.......کوئی باقاعدہ بات ہے تو مجھے بتاؤ۔"

"نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

"ہے تو ضرور۔ تمہارے انداز سے پتہ چل رہا ہے۔"

"بس ایسے ہی پوچھ رہا تھا۔"

"مگر مجھے تم کچھ گھبرائے ہوئے سے لگ رہے ہو۔"

"نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ خیر اب یہ بتاؤ کوئی ایسی بات انوکھی ہوئی ہے، جو تمہاری سمجھ میں نہ آ رہی ہو؟"

"نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

"میں تمہیں ایک خاص بات بتانا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ اگر کوئی تمہیں ہمارے ہاں لے کر آنا چاہے یا تم سے کوئی اور بہانہ کرے تو تم یہاں آنا نہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ یقیناً اس کی کوئی نہ کوئی وجہ ہوگی۔"

"تفصیل بعد میں بتاؤں گا۔ اچھا خدا حافظ۔"

میں نے فون بند کر دیا۔ پسینہ آ رہا تھا۔ نجانے کیوں یہ احساس میرے دل میں جنم لے رہا تھا کہ ترشولی آزاد ہو گئی ہے۔ احتیاط اسی میں تھی کہ نورین کو اس سے دور رکھا جائے۔ وہ لڑکی زندہ بچ گئی تھی، جسے بڑی ماں ہلاک کروانے کی کوشش کر رہی تھی۔ ورنہ ترشولی نے تو اُسے اپنی طرف سے ہلاک کر ہی ڈالا تھا۔ اُس غریب کو قتل کرنے کے لیے بھی ترشولی نے گلا گھونٹے جانے والا وہی طریقہ استعمال کرنے کی کوشش کی تھی، جس پر وہ مجھ سے عمل کرانا چاہتی تھی مگر کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔

بہر حال آج کا دن بڑا پریشان کن دن تھا۔ بوڑھی ماں کی جھونپڑی ہنوز پولیس کے گھیرے میں تھی۔ مجھے داراب نظر آیا، جو مسکرا رہا تھا اور مجھے دیکھ کر میری طرف آ رہا تھا۔

"مجھے یقین تھا کہ تم اس طرف ضرور آؤ گے۔"

"خیریت؟"

"تم دیکھ نہیں رہے کتنی بڑی خیریت ہے۔ ہم سے تھوڑی سی چُوک ہو گئی۔ اگر ہم رات ہی کو اس بوڑھی عورت کو گرفتار کر لیتے تو اس کے قتل کی نوبت نہ آتی۔ تم نے آج تک یہ بات چھپائی ہے کہ ترشولی کون تھی۔"

"لیکن میں اب آپ سے کوئی بات نہیں چھپاؤں گا۔ وہ ترشولی ہی تھی اور اس بوڑھی عورت کے مرنے کے بعد اس کے جسم پر قابض ہو گئی تھی۔"

داراب ہنسنے لگا۔ اس نے کہا۔

"یقیناً تمہیں بے وقوف بنایا گیا ہے۔ جھونپڑی والے اُسے کوئی بہت ہی پہنچی ہوئی عورت سمجھتے تھے اور اُس سے اپنے کام بھی لیا کرتے تھے۔ وہ اُس سے بددعائیں بھی کرایا کرتے تھے۔"

"بددعائیں؟"

"کیسے عقیدت مند ہو؟ کیا تمہیں اتنا بھی نہیں معلوم کہ اس سے دعاؤں کی جگہ بددعائیں کرائی جاتی تھیں؟"

"نہیں، مجھے واقعی نہیں معلوم۔ جس دن وہ مر کر دوبارہ زندہ ہوئی تھی، میں اُسے ایک بار دیکھنے آیا تھا اور یہ معلوم ہونے کے بعد کہ وہ زندہ نہیں ہوئی، بلکہ ترشولی اُس کے بدن میں داخل ہو گئی ہے، خوف کی وجہ سے دوبارہ کبھی ادھر نہیں آیا۔"

"بڑی چالاک عورت تھی۔ اپنے کرتوتوں کو چھپانے کے لیے پہلے اُس نے مر کر زندہ ہونے کا ڈرامہ رچایا، پھر خود کو ایک ایسی بزرگ عورت کے روپ میں پیش کیا، جو بارش کی دعا کرتی تھی تو دھوپ نکل آتی تھی۔ دھوپ کی دعا کرتی تھی تو بادل چھا جاتے تھے۔ بڑے کفر کی باتیں کرتی تھی وہ۔ وہ کہتی تھی کہ قدرت میری ہر بات میری مرضی کے خلاف کرتی ہے۔ لوگ اُس سے بددعائیں

کرانے لگے تھے کہ ہمیں ترقی نہ ملے۔ بددعا کرو کہ بیٹی کی شادی نہ ہو۔ بددعا کرو کہ بیمار بھائی صحت یاب نہ ہو........ ویسے جہاں تک میرا خیال ہے، وہ کسی بڑے عالمی گروہ کی آلہ کار تھی۔ اس نے لڑکی کو مارنے کے لیے بڑی بڑی رقمیں دی تھیں۔ کاش چند دن پہلے ہمیں معلوم ہو جاتا تو اس سے کئی باتیں اُگلوائی جا سکتی تھیں۔"

"اچھا، مجھے ایک بات بتائیے، اگر ایسی بات تھی تو اس عورت کو قتل کرنے کی کوشش کیوں کی گئی ہے؟"

"تم بچے ہو بیٹے! بات اصل میں یہ تھی کہ لڑکی کو قتل کروا کے بوڑھی عورت اُس کے قتل کی بھی شاہد بن جاتی۔ اور اس طرح وہ اُنہیں بلیک میل کر سکتی تھی۔ انہوں نے اس صورتِ حال کو سمجھ کر ہی یہ فیصلہ کیا کہ بڑھیا کو بھی ختم کر دیا جائے۔ اب بدقسمتی ہے کہ لڑکی بچ گئی اور بڑھیا ختم ہو گئی۔"

"یہ بھی تو ممکن ہے کہ اس بوڑھی عورت نے اپنے آپ کو قتل کرایا ہو۔"

"بچوں کی سی باتیں کر رہے ہو۔ ویسے اس بوڑھی عورت کا قاتل بھی یہی سمجھ رہا ہے کہ ہمیں اس کی فضول باتوں پر یقین آ جائے گا۔"

"وہ کیا کہتا ہے؟"

"ایک ہی رٹ لگائے ہوئے ہے کہ بوڑھی ماں نے اُسے رقم دی تھی کہ ایک ہی وار اُس کے دل پر کرے گا اور اسے ختم کر دے گا۔"

"میں سمجھتا ہوں وہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔"

"بے وقوفی کی باتیں کر رہے ہو۔ اُس نے خود کو قتل کرانے کے لیے رقم دی ہو گی۔"

"ہاں........ ہاں ایسی ہی بات ہے۔"

"مگر تمہاری مرضی ہے۔ تم جو جی میں آئے کہہ سکتے ہو۔"

"میں صرف ایک بات کہنا چاہتا ہوں جناب! وہ یہ کہ وہ بوڑھی عورت نہیں تھی، بلکہ ترشولی تھی جو بالکل اتفاقیہ طور پر اُس بوڑھی عورت کے بدن میں قید ہو کر رہ گئی تھی اور قتل ہو کر ہی اُسے آزادی مل سکتی تھی۔"

"تم ابھی تک روحوں کے خبط میں مبتلا ہو۔"

"اور آپ ابھی تک اسی خوش فہمی میں ہیں کہ بوڑھی عورت کو قتل کیا گیا ہے۔"

پھر کچھ اور افسر آئے اور بات ختم ہو گئی۔ داراب نے مجھ سے کہا۔

"اب تم جاؤ۔ پھر کبھی بات چیت ہو گی۔"

میں گھر پہنچا تو گھر والے اپنی اپنی مصروفیات میں نظر آئے۔ وقت گزرتا رہا اور مجھے پڑوس کی

ایک لڑکی نے مخاطب کر کے کہا۔

''بھائی جان! آپ کیسے ہیں؟''

اُس لڑکی کا نام فضیلہ تھا اور وہ رخسانہ کی دوست تھی۔ اکثر آتی رہتی تھی۔ اور میں اُسے بھی چھوٹی بہن کا درجہ ہی دیتا تھا۔ اچانک ہی اس وقت اُسے دیکھ کر ایک خیال میرے دل میں آیا تھا۔ وہ یہ کہ اگر اس مرتبہ بھی ترشولی مجھ سے کسی خوب صورت لڑکی کے جسم کی فرمائش کرے تو کیوں نہ میں اُسے فضیلہ کو دکھا دوں۔ وہ لازمی طور پر اسے پسند کرے گی۔ فضیلہ نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

''بھائی جان! آپ نے مجھے ٹیوشن پڑھانے کا وعدہ کیا تھا ایک دن۔ وہ وعدہ اب پورا کریں۔''

میرے دل پر چوٹ سی لگی۔ وہ وعدہ رخسانہ کی زندگی میں ہی کیا گیا تھا۔ میں سوچ میں ڈوب گیا تو وہ بولی۔

''آپ مجھے پڑھا دیا کریں۔ میں بہت اچھے نمبروں سے پاس ہو جاؤں گی۔''

میں اُس معصوم، بھولی بھالی لڑکی کی صورت دیکھنے لگا۔ دل میں جو خیال آیا تھا، اس پر خود کو شرم آنے لگی۔ میں نے اُس سے کہا۔

''ٹھیک ہے، کل شام سے آ جانا۔''

میں جب اپنے کمرے میں داخل ہوا تو میں نے نورین کو دیکھا، جو آرام سے میرے بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔

''ارے، ارے......تم یہاں کہاں سے آ گئیں؟''

''آپ کو کیا......آپ نے تو اسکول آنا بھی چھوڑ دیا ہے اور نہ ہی کبھی ہمارے گھر آنے کی کوشش کی۔ نجانے کن کن چکروں میں پڑے ہوئے ہو۔''

''اچھا جناب! تو اب یہ طنزیہ باتیں ہوں گی۔ لیکن آپ کا تو آنے کا ارادہ نہیں تھا۔''

''آپ نے بلایا تو میں چلی آئی۔''

''میں نے کب بلایا تھا؟''

''مجھے پتہ ہے، آپ نے جو باتیں کی تھیں، ان کا مطلب کیا ہے۔''

''نہیں نورین! تم یقین کرو۔ ان دنوں میں جس قدر خوف زدہ ہوں، تم سوچ بھی نہیں سکتیں۔''

''کیوں؟''

''میرے گھر میں تمہاری زندگی خطرے میں ہے نورین!''

''ڈرا رہے ہیں مجھے بلاوجہ۔ آخر اب آپ کیوں نہیں چاہتے کہ میں یہاں آؤں؟ پہلے تو آپ میرے یہاں آنے کے لیے تڑپتے تھے۔''

''میں اب بھی تمہارے یہاں آنے کے لیے تڑپتا ہوں۔ مگر یہاں تمہاری زندگی خطرے میں ہے۔''

''فضول باتیں ہیں سب۔ میں نہیں مانتی۔''

''تمہیں اس بات کا علم ہے کہ میں اب ایک آسیب زدہ شخص کی حیثیت رکھتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''میں ان تمام باتوں کو نہیں مانتی۔ اب میں آپ کو ایک بات بتاؤں، آپ کی والدہ محترمہ کیا کہہ رہی تھیں۔''

''بتاؤ۔''

''کہہ رہی تھیں کہ نورین! تم مجھے اتنی پیاری لگتی ہو کہ دل چاہتا ہے......دل چاہتا ہے......یہ کہہ کر اُنہوں نے میرے ماتھے کو چوم لیا تھا اور پھر آہستہ سے کہنے لگیں۔ ''اگر زندگی نے وفا کی تو میں تمہیں اپنی بہو بناؤں گی۔''

''اوہو......اچھا......تو پھر تم نے کیا جواب دیا؟'' میں نے مسکرا کر پوچھا۔

''کچھ بھی نہیں۔ بس ایسے ہی۔'' وہ ہنسنے لگی۔ اچانک مجھے ترشولی کا خیال آیا جو فضاؤں میں منڈلانے اور نورین کا جسم حاصل کرنے کے لیے آزاد ہو چکی تھی۔ اُس نے جو کچھ کہا تھا، وہ بڑا خطرناک تھا۔ نورین میری شکل دیکھ رہی تھی۔ میں نے کہا۔

''کاش تمہاری زندگی کو کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔''

میں سوچنے لگا کہ اسے ترشولی کے بارے میں بتاؤں یا نہ بتاؤں۔ لیکن پھر میں نے خاموشی ہی اختیار کر لی تھی۔ نورین میرے ساتھ کافی باتیں کرتی رہی۔ میں خاموشی سے اُس کی باتیں سنتا رہا۔

دوسرے دن نورین چلی گئی۔ میں نے اُسے بہت سی دعائیں دی تھیں۔ پھر میں دوسرے کاموں میں مصروف ہو گیا اور اتفاق کی بات یہ ہے کہ یونہی بے خیالی کے عالم میں میدان کی جانب جا نکلا۔

مجھے جھونپڑیوں کے پاس بہت سے لوگ نظر آئے۔ پتہ چلا، بوڑھی ماں کے کفن دفن کی تیاریاں کی جا رہی ہیں۔ پولیس کے چند افراد بھی موجود تھے۔ جھونپڑی والوں نے چندہ وغیرہ کر کے بوڑھی ماں کے کفن دفن کی تیاریاں کی تھیں۔ ایک پولیس والا میرے پاس پہنچ گیا۔ اُس نے مجھے داراب کے ساتھ بات کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ سلام دعا کے بعد اُس نے کہا۔

"تمہیں پتہ چل گیا ہوگا۔ یہ بوڑھی عورت کوئی معمولی عورت نہیں تھی بلکہ کسی غیر ملکی تنظیم کے ایجنٹ کے طور پر کام کر رہی تھی۔ جھونپڑی سے لاکھوں کی تعداد میں غیر ملکی کرنسی حاصل ہوئی ہے۔ اور ایک آدھ وائرلیس سیٹ بھی۔"

"اوہو...... مگر یہ کیا بات ہے؟ وہ تو...... وہ تو......" میں کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ پھر میں نے کہا۔ "اور اُس لڑکی کا کیا حال ہے جس کا تکیے کے ذریعے سانس روکنے کی کوشش کی گئی تھی؟"

"ٹھیک ہے وہ۔ لیکن اُس نے اپنی جھونپڑی میں واپس آنے سے انکار کر دیا ہے۔ وہ کہہ رہی تھی کہ جہاں کے لوگ میری جان کے دشمن ہوں گے، میں وہاں نہیں جاؤں گی۔"

"مگر لڑکی کے ماں باپ تو یہیں رہتے ہیں۔"

"اُس کا پورا کنبہ انہی جھونپڑیوں میں رہتا ہے۔ لڑکی کہتی ہے کہ وہ وہاں نہیں جائے گی۔"

"ہوں......" تھوڑی دیر تک میں وہاں رکا اور اس کے بعد جھونپڑیوں کے درمیان گندی گلی سے ہوتا ہوا سڑک کی طرف بڑھا۔ ایک جگہ عورتیں اور لڑکیاں کھڑی باتیں کر رہی تھیں اور یہ باتیں غالباً اسی لڑکی کے بارے میں ہو رہی تھیں۔ ایک عورت کہہ رہی تھی۔

"میں نے تو اُس کی اماں سے پہلے ہی کہا تھا اِس کے ہاتھ پیلے کر دو ورنہ کچھ گل کھلا دے گی۔"

میرے قدم ہلکے ہو گئے۔ دوسری عورت نے کہا۔

"یہاں آنے سے انکار کر کے اُس نے ماں باپ کی ناک کٹوا دی ہے۔ آج کل نچلے گھروں کی لڑکیاں ہی زیادہ بگڑ رہی ہیں۔ میں نے اُسے کئی بار ایک لڑکے کے ساتھ اسکوٹر پر آتے جاتے دیکھا تھا۔"

"چلو اب کیا، کیا جائے۔ وہ جانے اور اُس کے ماں باپ جانیں۔ بس جو ہے، وہی دیکھنا ہو گا۔"

بہر طور یہ سارے کام ہو رہے تھے۔ ایک طرف امی اپنے بھائی کی شادی میں مصروف تھیں اور چونکہ نعیمی صاحب کے خاندان سے ہمارا تعلق ہو رہا تھا، اس لیے اب نورین کو بھی یہاں آنے جانے کی آزادی مل گئی تھی۔ وہ اکثر یہاں آ جاتی تھی۔

وقت گزرتا رہا، شادی کی تیاریاں تیزی سے جاری تھیں۔ کوئی بھی موقع ہوتا، ہم رخسانہ کو نہیں بھولتے تھے۔ ان دنوں تو وہ بہت ہی یاد آ رہی تھی۔ اس وقت بھی ہم اُسی کی باتیں کر رہے تھے۔ نورین بھی ہمارے گھر میں ہی موجود تھی۔ اب وہ گھر کے سارے کام کاج اسی طرح کیا کرتی تھی، جیسے گھر کی بہو ہو۔ اُس نے چائے کی پیالی لا کر ہمارے سامنے رکھی تو بھائی جان نے چونک کر پوچھا۔

"ارے، یہ نورین گھر کے کام کیوں کر رہی ہے؟"

"کیوں جناب! کیا یہ آپ کا اپنا ہی گھر ہے صرف؟" نورین نے بچوں کی طرح لڑنے والے انداز میں کہا اور میں ہنسنے لگا۔ نورین کی آمد میرے لیے خود بڑی خوشی کا باعث تھی۔

پھر نورین واپس چلی گئی۔ میرا ذہن نجانے کون کون سے خیالات میں ڈوبا رہتا تھا۔ وہ لڑکی جسے قتل کرنے کی کوشش کی گئی تھی، ہسپتال میں تھی۔ میرا دل چاہا کہ میں اس سے معلومات حاصل کروں۔ میرے دل میں اسے دیکھنے کی خواہش تھی، جو قتل ہوتے ہوتے رہ گئی تھی۔ میں ہسپتال جا پہنچا اور اس لڑکی کو تلاش کرنے لگا، جسے رانی کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ اُس کا نام کچھ اور تھا جو شاید پہلے مجھے معلوم ہوا تھا۔ لیکن یہ بھی مجھے پتہ چل گیا تھا کہ وہ رانی کے نام سے جانی جاتی ہے۔ میں نے پہلے کبھی اُسے نہیں دیکھا تھا۔ لیکن معلومات حاصل کی جا سکتی تھیں۔ اچانک ہی ایک بستر سے آواز آئی۔

"سنو! ادھر آؤ۔"

ایک سیاہی مائل سانولے رنگ کی لڑکی تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی اور اشارے سے مجھے بلا رہی تھی۔ میں اُس کے بستر کے پاس پہنچا تو وہ بولی۔

"کون ہو تم؟"

"میرا نام سکندر ہے۔"

"میں نے تمہیں بڑی اماں کی جھونپڑی پر بارہا دیکھا ہے۔"

"کیا تم رانی ہو؟" میں نے غور سے اُس کا جائزہ لیا۔ گٹھا ہوا جسم تھا، لباس معمولی نہیں تھا۔

"جھونپڑیوں کے سامنے سڑک پار کر کے میدان پڑتا ہے۔ میدان پار کرنے کے بعد بائیں جانب مکانوں کی جو قطار ہے، میں انہی میں سے ایک میں رہتا ہوں۔ اکثر میں بڑی اماں کے پاس آتا جاتا رہتا تھا۔ میں نے سنا تھا کہ تمہیں کسی نے ختم کرنے کی کوشش کی تھی۔ اب کیسی ہو؟"

"اب ٹھیک ہوں۔ ویسے میں بھی ایک دو بار تمہارے گھر آئی ہوں۔ بیٹھو۔"

"تم میرے گھر کیوں آئی تھیں؟"

"کبھی کبھی جب ہماری جھونپڑیوں میں پانی ختم ہو جاتا تھا تو میں تمہارے ہاں سے پانی بھر کر لاتی تھی۔ ایک دو بار میں نے تمہارے گھر کے چھوٹے موٹے کام بھی کیے ہیں۔ ویسے ایک بات کہوں، ہسپتال والے مجھے یہاں سے نکالنے پر تلے ہوئے ہیں، مگر میں نے کہہ دیا ہے کہ مر جاؤں گی لیکن جھونپڑیوں میں کبھی نہیں جاؤں گی۔"

"تو کیا ہسپتال ہی میں رہو گی؟"

"وہ بھی رکھنے کو تیار نہیں ہے۔ ڈاکٹر دھمکی دے کر گیا ہے کہ پولیس کے ذریعے مجھے

دارالامان بھیج دے گا۔ دارالامان کیا ہوتا ہے؟"

"میں نہیں جانتا۔"

"میں نے سنا ہے کہ وہ ایک قسم کا جیل خانہ ہوتا ہے۔ اگر میں وہاں چلی گئی تو بالکل قید ہو کر رہ جاؤں گی۔ تمہیں معلوم ہے کہ میں تھوڑی دیر پہلے کیا سوچ رہی تھی؟"

"مجھے کیا معلوم؟"

"سوچ رہی تھی کہ میں چپکے سے کہیں بھاگ جاؤں۔ کہیں نہ کہیں تو پناہ مل ہی جائے گی۔ ویسے میں تم سے ایک بات کہوں، اگر تم مجھے اپنے ساتھ گھر لے چلو تو میں تمہارا بڑا احسان مانوں گی۔"

"نہیں بابا! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"میں تمہاری امی کو جانتی ہوں۔ وہ بڑی شریف اور رحم دل خاتون ہیں۔"

"پھر بھی، کچھ بھی ہے، تم ہمارے گھر نہیں رہ سکتیں۔"

"تو پھر میں دارالامان ہی چلی جاؤں گی۔ یا پھر مجھے کوئی ترکیب بتاؤ۔"

"تم شیخ جی کو جانتی ہو، جو مسجد کے پیچھے رہتے ہیں۔ اُن کے خاندان والوں سے تمہاری دوستی ہے۔ مجھے پتہ چلا ہے کہ اُن کا ایک لڑکا تمہیں اسکوٹر پر بٹھا کر گھمانے پھرانے بھی لے جاتا ہے۔"

"اوہ......... اتنا کچھ معلوم ہو چکا ہے تمہیں میرے بارے میں۔ خیر، اب جو ہو گا، دیکھا جائے گا۔"

"میں ڈاکٹر سے کہہ دوں کہ تم اپنی جھونپڑیوں میں جانے کے لیے تیار ہو۔"

بہر حال میں وہاں سے نکلا اور اس کے بعد سیدھا وہاں سے باہر چلا آیا۔ پھر ایک دکان پر پہنچ کر میں نے سوچا کہ انسپکٹر داراب سے بات چیت کی جائے۔ میں نے کوشش کی اور تھوڑی دیر کے بعد میرا رابطہ قائم ہو گیا۔ لیکن انسپکٹر داراب مجھے نہیں مل سکا تھا۔ میں گھر پہنچا تو گھر میں ابا جی کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ وہ نماز پڑھ رہے تھے۔ انہوں نے کہا۔

"کھانا باورچی خانے میں رکھا ہے، جا کر کھا لو۔"

"امی کہاں ہیں؟"

"نورین کو چھوڑنے اُس کے گھر گئی ہیں۔"

"خیریت؟"

"ہاں......... اُس کے ابو کو دل کا دورہ پڑا ہے۔ میں نماز کے بعد وہاں جاؤں گا۔"

"اوہو......... نعیمی صاحب کو دل کا دورہ پڑا ہے؟"

"ہاں......... بڑی مشکل کی بات ہے۔" بہر حال ہم لوگ تھوڑی دیر تک بات کرتے رہے، پھر ابو نماز پڑھنے میں معروف ہو گئے۔ امی جان نے شام کے کھانے کے لیے کوئی نئی چیز تیار نہیں

کی تھی۔ میں نے جو کچھ بھی تھا، کھانا کھایا۔ کھانا کھانے کے دوران مجھے رانی یاد آ گئی۔ نجانے میں اُس سے ملنے کیوں چلا گیا تھا۔ پتہ نہیں کیا چکر چلا تھا۔ ابھی میں انہی تمام باتوں کو سوچ رہا تھا کہ اچانک مجھے ایسا لگا، جیسے کوئی بچہ میرے کندھوں کے پاس کھڑا ہنس رہا ہو۔ میں نے جلدی سے پلٹ کر دیکھا تو یوں لگا، جیسے ہنسنے والے بچے نے جلدی سے منہ پر ہاتھ رکھ کر اپنی ہنسی روکنے کی کوشش کی ہو۔

بہر حال میں نے ٹرے اُٹھا کر ایک طرف رکھ دی اور اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا باہر نکل آیا۔ ابو نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں نعیمی صاحب کو ملنے جاؤں گا؟ تو نجانے کیوں میں نے انکار کر دیا۔ بہر حال کمرے میں آ کر بیٹھا ہی تھا کہ بجلی چلی گئی۔ اندھیرے میں موم بتیوں کی تلاش میں اٹھا۔ گھٹا ٹوپ تاریکی پھیلتے ہی کمرے میں موجود مخلوق کے درمیان ہلچل سی مچ گئی تھی۔ میں اُنہیں دیکھ نہیں پا رہا تھا لیکن اُن کی حرکات و سکنات کو محسوس کر رہا تھا۔ کچھ سائے تو اِدھر سے اُدھر بھاگتے بھاگتے میرے جسم سے بھی ٹکرا رہے تھے۔ بہر حال موم بتی کا بنڈل مل گیا لیکن ماچس کہیں نہیں ملی۔ یہ سوچ کر کہ ماچس فضیلہ کے گھر سے مل جائے گی، باورچی خانے سے نکل کر میں نے باہر کا دروازہ کھولا۔ دروازہ کھولتے ہی گھر کے سارے سائے بھرّا مار کر اس طرح باہر نکلے کہ میں گرتے گرتے بچا۔

فضیلہ کے گھر کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ مجھے اُس تک پہنچنا نصیب نہیں ہوا تھا۔ میں اپنے ہی گیٹ پر کھڑا رہا اور ان نظر نہ آنے والے سایوں کو محسوس کرتا رہا، جو میرے گھر سے ہی نہیں نکلے تھے بلکہ گلی کے ہر گھر سے باہر آ رہے تھے۔ جن گھروں کے دروازے بند تھے، سائے ان کی دیواروں پر چڑھ گئے تھے اور وہ واضح طور پر سنائی نہ دینے والی آوازوں کے ساتھ اس طرح گلی میں کود رہے تھے، جیسے آندھی کے دوران آم کے درختوں سے آم گر رہے ہوں۔

سائے خوشی سے اُچھل رہے تھے اور اُچھلتے ہوئے گلی کے آخری کونے پر اس مکان کی طرف جا رہے تھے، جس میں تعویذ گنڈا کرنے والا ملا بابا اپنی بوڑھی اور موٹی بیوی کے ساتھ رہتے تھے۔ ان کے بارے میں مشہور تھا کہ ان کے قبضے میں کوئی جن ہے۔ صبح سے لے کر شام تک ان کے گھر میں مردوں اور عورتوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ جس زمانے میں مجھے ترشولی کی صورت سے ڈر لگتا تھا، اس دوران امی جان ان سے میرے لیے تعویذ بھی لے کر آئی تھیں اور اچھے خاصے پیسے بھی انہیں دیئے تھے۔ مگر اُن کے تعویذ سے مجھے کوئی فائدہ نہیں ہوا تھا۔ اور جب اُنہیں بتایا گیا تھا تو انہوں نے غصے سے آنکھیں نکال کر کہا تھا کہ کوئی بہت ہی خوفناک بلا ہے، جس پر تعویذ گنڈوں سے قابو نہیں پایا جا سکتا۔ اس بلا سے نجات کے لیے انہوں نے ہزاروں روپے طلب کیے تھے، جو ہم نہیں دے سکتے تھے۔

بہر حال اس وقت میں دیکھ رہا تھا کہ گلی کے گھروں سے سائے نکل نکل کر ان کے گھر کے سامنے ہی جمع ہو رہے تھے اور بہت سے ان کے گھر کی دیواروں پر چڑھ گئے تھے۔ سیلاب سا تھا جو سایوں کی صورت میں ان کے گھر کے اردگرد پھیل گیا تھا۔

فضیلہ کے گھر کا دروازہ بند تھا لیکن دروازے کے نیچے سے سائے رینگتے ہوئے اور دروازے کے اوپر سے کود کر باہر آ رہے تھے اور سب ہی کا رُخ ملا جی کے گھر کی طرف تھا۔ یوں لگ رہا تھا، جیسے یہاں کوئی جشن منایا جا رہا ہو۔ یہ سائے عجیب و غریب تھے۔ کسی کی گردن اور سر کا ہی پتہ نہیں تھا، کسی کا پیٹ غائب تھا، کسی کا دھڑ موجود تھا، کسی نے اپنی کٹی ہوئی ٹانگوں کو جھنڈے کی طرح ہاتھوں میں اُٹھا رکھا تھا اور نچلے دھڑ کے سہارے کودتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔

ایک سایہ تو ایسا تھا جس کی نہ گردن تھی، نہ سر، نہ دھڑ، نہ ٹانگیں تھیں۔ لیکن اُس کے سارے اعضاء اُس کے آگے آگے اُچھل اُچھل کر آگے بڑھ رہے تھے۔ پھر اچانک ہی بجلی آ گئی اور گھر روشن ہو گئے۔ اسی وقت گلی کے سامنے ایک تیز رفتار کار آ کر رُکی اور کار سے مسکراتا ہوا پولیس آفیسر داراب برآمد ہوا۔ وہ مجھ ہی سے ملنے آیا تھا۔ میں اُسے ڈرائنگ روم کے بجائے اپنے کمرے میں لے گیا۔ پھر میں نے کہا۔

”مجھے افسوس ہے کہ آپ کو یہاں آنا پڑا۔ سب سے پہلے تو یہ بتایئے کہ بڑی اماں کو قتل کرنے والے اور رانی کو مارنے والے کو جھونپڑی میں گرفتار کیا گیا تھا یا جھونپڑی سے باہر؟“

اُس نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے میری طرف دیکھا اور بولا۔

”کیوں........ یہ سوال کیوں پوچھ رہے ہو؟“

”پہلے میری بات کا جواب دیجیے۔“

”انہیں جھونپڑی کے باہر سے ہی گرفتار کیا گیا تھا۔ لڑکی کو قتل کرنے والا اس خوش فہمی میں مبتلا ہو گیا تھا کہ لڑکی ختم ہو گئی ہے۔ لیکن دوسرا بڑی اماں کے دل میں چاقو اُتار کر اُسے قتل کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔“

”پھر وہ پکڑے کیسے گئے؟“

بس دو افراد ادھر سے گزر گئے تھے، انہوں نے دوڑ کر انہیں دبوچ لیا۔ تھوڑی سی مار پیٹ ہوئی۔ مار پیٹ کے دوران اُن کی جیب سے نوٹ نکل کر زمین پر بکھر گئے۔ پھر انہوں نے بتا دیا کہ انہوں نے بوڑھی اماں کو مار دیا ہے۔ دوسری جانب وہ لڑکی رانی فرش پر گری ہوئی اُکھڑی اُکھڑی سانسیں لے رہی تھی۔ ویسے بڑی عجیب سی بات تھی۔“

”کیا؟“

”یوں لگ رہا تھا، جیسے وہ مر چکی ہو۔ لیکن اس کے بعد وہ زندہ ہو گئی تھی۔“

”آہ........ کیا واقعی؟“ میں نے اُچھل کر کہا اور داراب مجھے چونک کر دیکھنے لگا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“

”میں تمہیں ایک بات بتاؤں، رانی مر چکی ہے۔ زندہ نہیں ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”وہ مر چکی ہے۔ اسے زندہ سمجھنا بے وقوفی ہے۔ اور اب جانتے ہیں آپ کہ اس کے جسم میں کون ہے۔“

”کون ہے؟“

”ترشولی۔“

”کیا بکواس کر رہے ہو؟“ داراب کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔

”سچ کہہ رہا ہوں میں۔ جو بات میں نے آپ کو بتائی، بڑی اماں، بڑی اماں نہیں تھی، ترشولی تھی۔ وہ میری بات کا اعتبار نہیں کر رہے تھے۔ لیکن آپ یقین کیجیے کہ ترشولی کو بوڑھی اماں کا بدصورت جسم پسند تھا۔ وہ کسی دوسرے جوان اور معقول جسم میں منتقل ہونا چاہتی تھی۔ یہ بات میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ جس طرح رانی کو قتل کرایا گیا ہے، اسی طرح وہ مجھ سے نورین کو قتل کرانا چاہتی تھی۔ اُس نے مجھے دھمکی دی تھی کہ اگر میں نے اُس کی بات نہیں مانی تو وہ میری ماں کو مار ڈالے گی۔“

”نورین کون ہے؟“

”میری کلاس فیلو۔“

”بوڑھی اماں نے تم سے کہا تھا کہ نورین کو قتل کر دو۔“

”بوڑھی اماں نے نہیں، ترشولی نے کہا تھا۔ اس وقت وہ بڑی اماں نہیں بنی تھی۔“

”کیا بک رہے ہو یار! تم نے تو میرا دماغ خراب کر کے رکھ دیا ہے۔“ داراب نے کہا۔

”میری پوری بات سن لو۔ رانی اب رانی نہیں ہے، ترشولی ہے۔ مجھے پہلے ہی شک تھا، اس لیے میں اس سے ملنے ہسپتال گیا تھا۔ اس سے باتیں کرتے ہی میں سمجھ گیا تھا کہ ترشولی اس کے جسم میں آ چکی ہے۔ مگر وہ مجھ پر خود کو رانی ہی ظاہر کرتی رہی۔ کیا سمجھے؟“

”یار! یا تم خود پاگل ہو یا مجھے پاگل بنا رہے ہو۔“

”دیکھئے میں آپ سے خود کہہ رہا ہوں کہ آپ اس سے ملیے۔ اُسے شبہ بھی نہیں ہوگا کہ آپ اس سے کیوں مل رہے ہیں۔ لیکن آپ کو خود اندازہ ہو جائے گا۔“

”مم........ مم........ مگر میں بھوت پریت پر یقین نہیں رکھتا

"ویسے آپ کو ایک اور بات بتاؤں میں۔ آج رات ہماری گلی میں یا تو بہت بڑا حادثہ ہو چکا ہے یا ہونے والا ہے۔ ہمارے گھر کے آخری کونے پر ایک ملا جی رہتے ہیں جو تعویذ گنڈے اور بھوت پریت کے خلاف کام کرتے ہیں۔ آپ کو اندازہ نہیں ہوگا کہ اس وقت بے شمار بری روحیں ملا جی کے گھر کے اردگرد بھٹک رہی ہیں۔"

"خدا کی پناہ........ تمہارا دماغ واقعی خراب ہو گیا ہے۔ اس طرح کی کتابیں پڑھتے ہو جو سامنے رکھی ہوئی ہیں تو اسی طرح کے انسان بن جاؤ گے۔ میں تمہیں وارننگ دیتا ہوں کہ اپنے آپ کو بچانا چاہتے ہو تو آئندہ اس طرح کی کتابیں پڑھنا بند کر دو۔ اچھا میں چلتا ہوں۔" میں اُس کے ساتھ ساتھ گیٹ کے باہر تک چھوڑنے گیا تھا۔ گیٹ سے نکلتے ہی اُس کی نظر گلی کے سرے والے مکان پر پڑی۔

"وہ، وہاں کیا ہو رہا ہے؟"

"یہی تعویذ گنڈے کرنے والے ملا جی کا گھر ہے۔" میں نے بھی دیکھا کہ ملا جی کے گھر کے باہر لوگوں کا ہجوم اکٹھا ہے۔ ہم دونوں وہاں پہنچ گئے۔ پولیس آفیسر نے پوچھا۔

"کیا بات ہے؟ آپ لوگ یہاں کیوں کھڑے ہیں؟"

"ملا جی کے گھر میں ڈاکو گھس آئے تھے۔ میاں بیوی کو قتل کر کے گھر کی ایک ایک چیز اُٹھا کر لے گئے ہیں۔ سامنے والے گھر کے کسی شخص نے ملا جی کے گھر سے ڈھاٹے باندھے ہوئے لوگوں کو نکلتے دیکھا تو دوسرے پڑوسیوں کو آواز دی۔ ڈاکو فرار ہو گئے ہیں۔"

"اوہو........ تم لوگوں نے پولیس کو اطلاع دی؟"

"سب کو فون کر دیا ہے۔ پولیس آتی ہی ہوگی۔"

"مگر یہ واردات کتنی دیر پہلے ہوئی ہے؟"

"کوئی چھ سات منٹ پہلے۔"

"اندازاً کتنے ڈاکو تھے؟"

"گھر سے باہر تو چار ہی آئے تھے۔"

انسپکٹر داراب نے میری طرف دیکھا اور بولا۔ "تم نے کتنے سایوں کو گھر میں جاتے دیکھا تھا؟"

"وہ تو سینکڑوں تھے۔"

"کیا تمہیں معلوم تھا کہ اِس گھر میں رہنے والوں کو قتل کر دیا جائے گا؟"

"مجھے کیا پتہ؟"

"پھر تم نے یہ کیوں کہا کہ محلے کے کسی گھر میں کوئی حادثہ ہونے والا ہے یا ہو چکا ہے؟"

"میں نے آپ کو بتایا تھا، انسپکٹر داراب! کہ میں نے اتنی بڑی تعداد میں سایوں کو جمع ہوتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا تھا۔"

"اب کیا محسوس کر رہے ہو تم؟"

"اب تو یہاں بظاہر کوئی نہیں ہے۔ لیکن کچھ سائے اب بھی گھومتے پھر رہے ہیں۔ اگر تاریکی ہو جائے تو میں انہیں اور بھی آسانی سے دیکھ سکتا ہوں۔"

"تو تمہارا کیا خیال ہے، ملا اور اُس کی بیوی کو بھی ترشولی نے ہی قتل کیا ہے؟"

"میں سمجھتا ہوں کہ یہ بات نہیں کہی جا سکتی۔ بہر حال مجھے خوشی ہے کہ آپ کو بھی ترشولی کے وجود پر اعتبار آ گیا ہے۔"

"میں ابھی کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔ اچھا تو میں چلتا ہوں۔ تم سے جلد ملاقات ہوگی۔"

"اگر مناسب سمجھیں تو مجھے اپنے گھر کا پتہ بتا دیں۔" میں نے کہا۔

"گھر میں، میں بہت کم ملتا ہوں۔ اکیلا آدمی ہوں۔ بہر حال میں تمہیں بتائے دیتا ہوں۔ لیکن میں تمہیں وہاں ملوں گا نہیں۔" یہ کہتا ہوا وہ یہاں سے چلا گیا اور میں کچھ دیر کے بعد اپنے گھر واپس آ گیا۔

امی اور ابو تقریباً بارہ بجے رات کو گھر واپس آئے۔ اس وقت تک گلی سنسان ہو چکی تھی، البتہ ملا جی کے گھر کے باہر دو کانسٹیبلوں کی ڈیوٹی لگی ہوئی تھی۔ جب وہ گھر پہنچے تو میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"کیا حال ہے نعیمی صاحب کا؟"

"پاگل ہیں سارے کے سارے۔ گردے کا درد تھا، سب سمجھے کہ دل کا دورہ ہے۔ ڈاکٹر نے نیند کا انجکشن لگا دیا ہے۔"

"مائی گاڈ........ نورین تو بہت پریشان ہوگی۔"

"یہاں سے تو روتی ہوئی ہی گئی تھی، لیکن جب پتہ چلا کہ نعیمی صاحب کو دل کا دورہ نہیں پڑا ہے تو ٹھیک ہو گئی۔ مجھے آنے ہی نہیں دے رہی تھی۔ کچھ زیادہ ہی خوش تھی۔ اتنی خاطر مدارات کر رہی تھی میری کہ بتا نہیں سکتی۔ ویسے سچی بات یہ ہے کہ اب مجھے بھی وہ بہت پسند آ گئی ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ تمہارے بھائی کے لیے اس سے اچھی لڑکی چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے گی۔"

امی کے الفاظ ایک دو دھاری خنجر کی مانند تھے، جو میرے سینے کو چیرتے ہوئے اندر تک اُتر گئے تھے۔

میرے ہوش وحواس گم ہو گئے تھے۔ میں اپنے کمرے میں آ گیا۔ امی کو کیسے بتاتا کہ نورین کس طرح میرے وجود میں رہتی ہے۔ اُنہیں کیا معلوم کہ جب وہ یہ بات سنے گی تو اُس کے نازک دل پر کیا قیامت ٹوٹ پڑے گی۔ یہ بات اُس کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ بن سکتی ہے۔ بھائی جان کو تو وہ اپنا سگا بھائی کہتی تھی۔ میں بستر پر لیٹ گیا اور تکیے کو سینے سے لگا کر رونے لگا۔ روتے ہوئے میں اُس سے باتیں کیے جا رہا تھا۔

"تم نہیں جانتیں نورین! میں تمہیں کتنا چاہتا ہوں۔ میں نے دن رات تمہارے لیے کتنی دعائیں مانگی ہیں۔ ترشولی جیسی خوف ناک اور خطرناک مخلوق سے ٹکر لی ہے۔ اگر مجھے تم سے محبت نہ ہوتی تو پتہ نہیں میں کیا کیا فائدے حاصل کر سکتا تھا۔"

میں نجانے کیا کیا سوچتا ہوا سو گیا۔ صبح کو اُٹھا اور اسکول چل پڑا۔ اوپری منزل لڑکیوں کے لیے مخصوص تھی۔ کسی لڑکے کو اوپر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ مگر میں نورین کو یہ بری خبر سنانے کے لیے بے چین تھا۔ میں نے کلاس رُوم کے دروازے سے لگ کر کہا۔

"سر! دو منٹ کے لیے نورین کو باہر بھیج دیجیے۔"

پروفیسر عارف نے نورین کو اشارہ کر کے میری طرف بھیج دیا۔ وہ باہر آئی تو میں نے اُس کا ہاتھ پکڑا اور اُسے کھینچتا ہوا گیلری میں لے گیا۔

"ارے، ارے......کسی نے دیکھ لیا تو کہے گا کہ تم مجھے بھگا کر لے جا رہے ہو۔ دونوں کی شامت آ جائے گی۔"

"شامت آ چکی ہے نورین! تم اس بات پر کتنا خوش ہو گی، جب تمہیں پتہ چلے گا کہ میری امی نے تمہیں گھر کی بہو کہا ہے۔"

نورین کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔ میں نے کہا۔

"لیکن انہوں نے یہ رشتہ بھائی جان سے طے کیا ہے۔"

"کیا......؟" اُس کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

"ہاں نورین! اور اب تمہیں تھوڑی سی ہمت سے کام لینا ہو گا۔ میری امی جب تمہاری امی یا ابو کو یہ رشتہ دیں تو تم صاف صاف کہہ دینا کہ تمہیں یہ رشتہ ناپسند ہے۔"

نورین کی آنکھیں بھیگ گئیں، چہرہ سرخ ہو گیا۔ چند سیکنڈ وہ سوچتی رہی، پھر بولی۔

"میں کلاس روم میں جا رہی ہوں۔"

"نورین! ہمت مت ہارنا۔ ورنہ ہماری دنیا برباد ہو جائے گی۔ آج ہی کچھ نہ کچھ کہنا۔ تم خود اپنی مرضی سے اپنی امی یا ابو سے بات کر سکتی ہو۔ نعیمی صاحب تعلیم یافتہ آدمی ہیں، وہ تمہاری بات ضرور سنیں گے۔" نورین نے کوئی جواب نہیں دیا اور تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی اپنی کلاس میں داخل ہو گئی۔

میں سخت پریشان تھا اور یہ سوچ رہا تھا کہ دیکھیں آئندہ کیا ہو گا۔ پھر جب چھٹی ہوئی تو میرے دل کو ایک اور جھٹکا لگا۔ میرا خیال تھا کہ نورین کے چہرے پر وہ تمام آثار ہوں گے، جو کسی ناکام محبت کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ لیکن یہ دیکھ کر سخت صدمہ ہوا کہ وہ سہیلیوں کے ساتھ ہنستی ہوئی اپنی وین کی جانب جا رہی تھی۔ پھر پے در پے ایسے واقعات ہوئے، جن سے میری دنیا اندھیر ہو گئی۔

فضیلہ، بھائی جان سے پڑھنے آئی تھی۔ اُس نے آتے ہی کہا۔

"بھائی جان کہاں ہیں؟"

"وہ گئے ہوئے ہیں۔"

"کب آئیں گے؟"

"معلوم نہیں۔"

"کہو تو بیٹھ جاؤں؟"

"بیٹھو......کیا بات ہے؟"

"وہ اصل میں نورین نے......" وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

"ہاں......نورین نے کیا کہا؟......کیا کہا؟" میں نے بے تابی سے پوچھا۔

"انہوں نے کہا تھا، کسی کو بتانا نہیں۔"

"کیا نہیں بتانا؟"

"اگر میں آپ کو بتا دوں تو آپ نورین باجی کو تو نہیں بتائیں گے؟"

"نہیں بابا!......نہیں بتاؤں گا۔ اب بتاؤ کیا بات ہے؟"

"سکول میں اُنہوں نے رومال دیا تھا اور کہا تھا کہ کسی کو پتہ نہ چلنے پائے۔ چپکے سے بھائی جان کو دے دینا۔"

میرا دماغ گھوم گیا۔ میں نے کہا۔ "کہاں ہے وہ رومال؟"

اسی وقت بھائی جان اندر آ گئے اور اُن کی آواز سنتے ہی فضیلہ بھاگتی ہوئی میرے کمرے سے باہر نکل گئی۔ اُس نے ایک رومال اپنے لباس سے نکال کر بھائی جان کو تھما دیا۔ بھائی جان ہنسنے

لگے۔انہوں نے رومال کو ہونٹوں اور آنکھوں سے لگایا، پیار سے فضیلہ کے سر پر ہاتھ پھیرا اور رومال کو چومتے ہوئے باہر نکل گئے۔ میں دہشت زدہ رہ گیا تھا۔ مجھ پر یہ حقیقت آشکارا ہو چکی تھی کہ نورین نے طوطے کی طرح آنکھیں پھیر لی ہیں، مجھے ٹھکرا کر وہ بھائی جان کو پسند کرنے لگی ہے۔

بہر حال وقت کچھ اور آگے بڑھا۔ ماموں کی شادی کی تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ نورین اب باقاعدہ یہاں آتی جاتی تھی۔ اُس دن بھی وہ ہمارے گھر آئی تو اُس نے دوپٹہ کمر سے لپیٹ کر میرے بجائے بھائی جان کے سارے کمرے کی صفائی کر ڈالی۔ اُس نے یہ تمام کام کیا۔ بھائی جان نے اس بارے میں پوچھا تو امی نے بتایا کہ یہ کام نورین نے کیا ہے۔ بھائی جان نے شرماتے اور مسکراتے ہوئے نورین کو دیکھا تو وہ بولی۔

"کمرا بہت گندا ہو رہا تھا۔ آپ اس طرح کاغذ نہ پھیلایا کریں۔"

"اور اگر میں دوبارہ پھیلا دوں تو؟"

"تو......پھر......تو پھر......میں پھر صاف کر دوں گی۔"

پھر نورین، بھائی جان کی خدمت میں لگ گئی اور میں بھری بھری آنکھوں سے اُسے دیکھتا رہ گیا۔ پہلی بار احساس ہوا تھا کہ عورت واقعی بے وفا ہوتی ہے۔ یہ معلوم ہوتے ہی کہ اُس کے اور ہمارے گھر والے اُس کا اور بھائی جان کا رشتہ طے کر رہے ہیں، نورین نے مجھے فراموش کر دیا۔ اُس کی امی اور میری امی ڈرائنگ روم میں بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ بھائی جان کتابیں لے کر باہر جا چکے تھے۔ نورین، بھائی جان کے کمرے ہی میں اُن کے پلنگ پر لیٹ گئی تھی۔ مجھے جب پتہ چلا تو میں اُٹھ کر وہاں پہنچ گیا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی اُٹھ گئی۔ پشیمانی نام کی کوئی چیز اُس کے چہرے پر نہیں تھی، بلکہ وہ مسکرا رہی تھی۔ اچانک ہی اُس نے کہا۔

"جنابِ عالی! آپ کو پتہ ہے کہ میرا اور آپ کا کیا رشتہ قائم ہو گیا ہے؟"

"نورین! مجھے تم سے اس بے وفائی کی اُمید نہیں تھی۔"

وہ سنجیدہ ہو گئی۔ میرے نزدیک آئی اور پیار سے بولی۔ "تم ان باتوں کو نہیں سمجھ سکو گے۔ ابھی بچے ہو۔" یہ کہہ کر وہ باہر نکل گئی۔

بہر حال چھوٹے ماموں کی شادی تک یہ بات اچھی طرح پتہ چل گئی کہ نورین جو میری ہم عمر تھی اور میرے ساتھ پڑھتی تھی، اچانک مجھے اپنے آپ سے بہت چھوٹا سمجھنے لگی تھی۔ میرے لیے بھی اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ میں بھی خاموش ہو جاؤں۔ بہر حال امی جان کی اُس سے خوب دوستی چلی رہی۔ میں سب کچھ بھول گیا تھا۔ ترشولی کو، اپنی بہن کی موت کو...... پولیس افسر کو، بس میرے ذہن میں نورین کی بے وفائی ہی رہتی تھی۔ میں بڑی سے بڑی قربانی دے کر بھی اُسے حاصل کرنا چاہتا تھا۔ چھوٹے ماموں کے ولیمے کی رات کو شادی ہال میں جب میں نے

نورین اور بھائی جان کو ہنس ہنس کے باتیں کرتے ہوئے دیکھا تو غصے سے کھولتا ہوا گھر واپس آ گیا۔ نورین کی جدائی مجھے گوارا نہیں تھی۔

ساری دنیا کی مخالفت کے باوجود میں اُس کی محبت کو حاصل کرنا چاہتا تھا اور ایک ترکیب میری سمجھ میں آ گئی۔ اگر میں نے پہلے ہی ترشولی کی بات مان لی ہوتی تو یہ نوبت کیوں آتی۔ ترشولی مجھے چاہتی تھی اور میں نورین کو چاہتا تھا۔ نورین کے جسم میں منتقل ہو کر اُسے اُس کا پیار اور مجھے میرا پیار مل سکتا تھا۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ ترشولی اُس لڑکی کے جسم میں موجود ہے اور مجھے صرف اتنا کرنا ہے کہ میں اُس لڑکی کے پاس جاؤں اور اُس سے کہوں کہ میں نے نورین کا بدن اُس کے حوالے کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

چنانچہ دوسرے دن میں اس منصوبے کے تحت اُس لڑکی کی تلاش میں نکلا جس کا نام رانی تھا۔ اُس کی تھوڑی بہت تفصیلات مجھے معلوم ہو چکی تھیں۔ میں نے جس جگہ اُسے تلاش کرنے کی کوشش کی، وہاں کے لوگ میرے سر ہی پڑ گئے۔ ایک معمر شخص سے میں نے رانی کے بارے میں معلومات حاصل کیں تو وہ ایک دم بگڑ گیا۔

"ہمیں کیا معلوم...... بھاڑ میں گئی کمبخت ماری۔ محلے کے لیے عذاب بن گئی تھی۔ بڑی لے دے ہو رہی ہے اُس کے لیے۔ بس آوارہ لڑکی تھی، ہمیں مصیبت میں ڈال گئی۔ مگر تم کون ہو؟"

"وہ......بس...... بابا جی! میں تھوڑے ہی فاصلے پر رہتا ہوں۔ سکندر ہے میرا نام۔ رانی کے بارے میں معلومات حاصل کرنے آیا تھا۔"

"دیکھو! اگر زندگی چاہتے ہو تو اُسے تلاش مت کرو۔ پتہ نہیں اُسے کیا ہو گیا ہے۔ میرے خیال میں تو کوئی بڑا ہی چکر چلا ہے۔"

مجھے کوئی تسلی بخش جواب نہیں ملا تھا۔ مجھے اپنے دوست کی یاد آئی، جس کا نام داراب تھا۔ میں نے داراب کو تھانے فون کیا تو دوسری طرف سے جواب ملا۔

"سوری، وہ یہاں نہیں ہیں۔"

غرض یہ کہ بڑی مشکل ہو گئی۔ میں نے جگہ جگہ اُسے تلاش کیا لیکن اُس کا کوئی پتہ نہیں چل سکا۔ پھر میں رانی کے گھر چلا گیا اور میں نے اُس کے باپ سے کہا۔

"میں آپ سے ایک ضروری بات کر سکتا ہوں؟"

"کیوں، کیا بات ہے؟"

"اصل میں مجھے میری ماں نے رانی کا پتہ معلوم کرنے بھیجا ہے۔"

"اماں نے بھیجا ہے کہ تم خود اُس کمینی کا پتہ کرنے آئے ہو؟"

"نہیں، میری ماں ہی نے مجھے بھیجا ہے۔"

”ٹھیک ہے۔تو اُسے جہنم میں جا کر تلاش کر لو۔ وہ وہیں پر ملے گی۔“ رانی کے باپ نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

بہر حال میں ہر جگہ سے مایوس ہو گیا۔ اُس دن جب شام کو گھر پہنچا تو مجھے پتہ چلا کہ نعیمی صاحب نے سب کو دعوت دی ہے۔ وہ چھوٹے ماموں کے سلسلے میں یہ دعوت دے رہے تھے۔ میں نے اس تقریب میں شریک نہ ہونے کا فیصلہ کیا۔ حالانکہ میرے جسم کے روئیں روئیں میں آگ لگ رہی تھی اور ایک طرح سے اب میں نورین کا بھی دشمن ہی ہو گیا تھا۔ میرے دل میں تھا کہ جتنی جلدی ممکن ہو سکے، ترشولی سے اُس کا سودا کر لیا جائے تاکہ ایک بار پھر مجھے اُس کی محبت حاصل ہو سکے۔ میں جانتا تھا کہ نورین کے روپ میں بے شک ترشولی ہو گی۔ لیکن کچھ بھی سہی۔

بہر حال، وقت گزرتا چلا گیا اور میں سلگتا رہا۔ مجھے ہر قیمت پر رانی کا پتہ چاہئے تھا۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ ترشولی اس وقت رانی کے بدن میں ہے۔ میں نے اُس سے چار ہزار روپے لیے تھے۔ ان میں سے کوئی خاص رقم خرچ نہیں ہوئی تھی۔ چنانچہ میں کچھ رقم لے کر رانی کے باپ کے پاس پہنچا اور میں نے اُس کے سامنے ایک بڑا نوٹ لہرا کر کہا۔

”اگر تم مجھے رانی کا صحیح پتہ بتا دو، تو میں تمہیں اور بھی رقم دوں گا۔“

”بس جی، بڑی کتیا لڑکی ہے۔ نجانے کتنوں سے چکر چلایا ہے۔ جگہ جگہ اُس کے عاشقوں کی تعداد بھری ہوئی ہے۔ ایک پولیس والے سے بھی چکر چلایا اور نجانے کس کس سے چکر چلایا ہو گا۔ مگر وہ میری سگی بیٹی نہیں ہے۔“

”رانی تمہاری بیٹی نہیں ہے؟“

”نہیں......میری بیوی کی بیٹی ہے۔ اس کے پہلے شوہر سے۔“

”اب یہ بتاؤ کہ رانی ہے کہاں؟“

”اُسے ایک پولیس والا لے گیا ہے۔“

”کیا مطلب......گرفتار کر کے؟“

”نہیں۔ بلکہ اُس نے مجھے کچھ پیسے دیئے تھے اور اس کے بعد اُسے اپنے ساتھ لے گیا۔“

”کیا نام تھا اُس پولیس والے کا؟“ میں نے تعجب سے پوچھا۔

”اُس نے اپنے گھر کا پتہ بتایا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ رانی اب اُس کے پاس رہے گی۔ اگر کبھی دل کرے تو اس کے پاس آ جانا۔“

”تو گھر کا پتہ ہی بتا دو۔“

”ارے ہاں...... مجھے یاد آ گیا۔ وہ ایک کچی بستی میں رہتا ہے۔ اور اُس کے گھر کا نمبر 210 اور اُس کا نام......نام بھی مجھے یاد آ گیا......اُس کا نام داراب شاہ ہے۔ ہاں، یہی نام

ہے اُس کا۔“

میں دنگ رہ گیا تھا۔ بہر حال میں نہیں جانتا تھا کہ داراب شاہ رانی کو کیوں لے گیا ہے؟ لیکن بہر حال بوڑھے سے خاصی معلومات حاصل کرنے کے بعد میں داراب شاہ کی تلاش میں چل پڑا اور کچھ دیر کے بعد میں کچی آبادی میں پہنچ گیا۔

یہاں وہ گھر مجھے آسانی سے مل گیا تھا۔ اُس کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے صرف ایک لمحے کے لیے سوچا اور پھر کھلے دروازے سے گھر میں داخل ہو گیا۔ ایک لمحے کے اندر مجھے محسوس ہوا کہ گھر خالی پڑا ہوا ہے۔ لیکن فضا میں نہ نظر آنے والی مخلوق کے سائے تیرتے اور مسکراتے محسوس ہو رہے تھے۔

میں نے اُن کے کمروں کی تلاشی لینا شروع کر دی۔ تین چار کمرے تھے، ان ہی میں سے ایک کمرے میں مجھے ایک میز نظر آئی اور اُس میز کے پیچھے پڑی ہوئی کرسی پر داراب شاہ ٹیک لگائے ہوئے بیٹھا تھا۔ اُس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا نظر آ رہا تھا۔ میرے قدموں کی چاپ سن کر اُس نے اپنے اندر تبدیلی پیدا نہیں کی۔ میں جانتا تھا کہ وہ مجھے دیکھ کر حیرت سے اُچھل پڑے گا۔ کچھ لمحے کھڑا میں اُسے مسکراتی نگاہوں سے دیکھتا رہا اور پھر میں نے کہا۔

”جنابِ عالی! آپ کیا سمجھتے تھے، میں کوئی کچا دوست ہوں؟ دیکھیں، کیسا میں نے آپ کو تلاش کر لیا۔“ میں نے کہا اور پھر ایک قدم آگے بڑھا اور پھر اچانک میری ہنسی ڈوب گئی۔ آنکھوں کے گرد اندھیرا چھا گیا۔ نظر نہ آنے والے سائے، سنائی نہ دینے والی آواز میں بھیانک قہقہے لگانے لگے۔ میرے سامنے جو داراب بیٹھا ہوا تھا، اُس کے سینے میں ایک بہت بڑا چھرا پیوست تھا۔ چھرے کا ایک بہت ہی چھوٹا سا سرا نظر آ رہا تھا۔ کسی نے اتنی مہارت کے ساتھ چھرا گھونپا تھا کہ اُس کی نوک سینے سے گزرتی ہوئی کرسی کی پشت میں جا گھسی تھی اور سب سے خوف ناک بات یہ تھی کہ داراب کا دایاں ہاتھ بھی کندھے کے پاس سے غائب تھا۔

میرے پاؤں جیسے مفلوج ہو گئے۔ میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے داراب شاہ کو دیکھ رہا تھا کہ اچانک ہی دروازے کی جانب سے آوازیں سنائی دیں اور پھر پولیس کی وردی میں ملبوس دو افراد اندر داخل ہو گئے۔

”کون ہو تم؟“ اُن میں سے ایک نے پوچھا۔ وہ کمرے کے دروازے پر اس طرح کھڑا ہو گیا تھا کہ میں اگر بھاگنے کی کوشش بھی کرتا تو نہیں بھاگ سکتا تھا۔

”وہ......وہ......“ میں نے لرزتی ہوئی اُنگلیوں سے داراب کی طرف اشارہ کیا اور کہا۔

”کسی نے......انہیں......انہیں قتل کر دیا ہے۔“

وہ دونوں داراب شاہ کی طرف لپکے۔ اُن میں سے جو شخص کھڑا ہوا تھا، وہ داراب کی طرف

جاتے ہوئے میرے ہاتھ کو پکڑنا نہیں بھولا تھا۔ اُس نے پوری قوت کے ساتھ مجھے گھسیٹا اور جائزہ لینے لگا۔

"ہوں......تو تم نے ہمارے افسر کو قتل کر دیا۔"

میں لرز گیا۔ میں نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

"خدا کی قسم میں نے انہیں قتل نہیں کیا۔ میں بھلا انہیں کیسے قتل کر سکتا ہوں؟ میں تو ان سے ملنے آیا تھا۔"

"بکواس کرتے ہو، کتے کے بچے! مجھے بتاؤ کہ تم نے اسے کیوں قتل کیا؟"

"میری بات سنو......" میں نے کہنا چاہا۔ لیکن اگلے ہی لمحے اُن میں سے ایک نے میرے منہ پر اتنا زوردار تھپڑ مارا کہ میرے دانت ہل گئے۔

"اگر تم نے بکواس بند نہ کی اور ہمارے سوالوں کے جواب نہیں دیئے تو تمہاری لاش بھی یہیں پڑی ہوگی، سمجھے؟"

میں سسکیاں لینے لگا۔

"آواز بند کرو۔" اُس نے آنکھیں نکالیں۔ "یہ بتاؤ، تم نے داراب صاحب کو قتل کیوں کیا؟"

"جناب! میں نے قتل نہیں کیا۔ جب میں یہاں آیا تو یہ پہلے ہی قتل ہو چکے تھے۔"

"مگر تم یہاں کیوں آئے تھے؟"

"مجھے ایک ضروری پتہ معلوم کرنا تھا۔"

"کسی کو تم نے یہاں آتے جاتے دیکھا؟"

"جی نہیں۔"

"جو کچھ ہوا ہے، بالکل شروع سے بتاؤ۔ آؤ......ادھر آؤ۔" اُس نے کہا اور مجھے ایک صوفے پر بٹھا دیا۔ پھر اُس نے جیب سے ریوالور نکال لیا اور اپنے ساتھی سے مخاطب ہو کر کہا۔

"قریب کہیں فون ہو تو تھانے والوں کو اطلاع دو کہ داراب صاحب کو قتل کر دیا گیا ہے۔ وہ لوگ فوراً یہاں پہنچ جائیں۔ ہم نے بندہ پکڑ لیا ہے۔"

اُس کا ساتھی فون کرنے چلا گیا تو وہ اپنے ریوالور سے کھیلتے ہوئے بولا۔

"اب بتاؤ، کچھ چھپانے کی کوشش مت کرنا۔ ورنہ ریوالور کی ساری گولیاں تمہارے جسم میں اُتار دوں گا۔"

میری آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔ میں نے کہا۔

"صاحب! داراب صاحب تو میرے دوست تھے۔"

"بکواس کر رہے ہو۔"

"نہیں جناب! میں آپ سے سچ کہہ رہا ہوں۔ وہ مجھے اپنا دوست ہی کہتے تھے۔ ہماری دوستی کا موضوع روحیں ہوا کرتی تھیں۔"

"روحیں؟"

"جی ہاں۔ وہ روحیں جو جسم سے آزاد ہو کر اِدھر اُدھر فضاؤں میں بھٹکتی پھرتی ہیں۔"

"تم چارسو بیسی کر رہے ہو۔"

"نہیں جناب! ایسی بات نہیں ہے۔"

"دیکھو......کیوں اپنی جان کے پیچھے پڑ رہے ہو؟ سچ سچ بتاؤ۔"

"میں آپ سے سچ کہہ رہا ہوں، انہوں نے مجھے یہاں بلایا تھا۔ انہوں نے......کاش یہ بول سکیں......" میں نے داراب کی طرف دیکھا۔

"تو پھر......انہوں نے کیوں بلایا تھا تمہیں؟"

"میں نہیں جانتا......مگر جب میں یہاں پہنچا تو وہ قتل ہو چکے تھے۔ اصل میں ہمارے اور اُن کے درمیان میں ایک بہت بڑا مسئلہ چل رہا تھا۔"

"کیا مطلب؟......"

"وہ ایک لڑکی تھی، جس کا نام رانی تھا، ہمارے گھر کے قریب جھونپڑیوں میں رہتی تھی۔ اُسے ایک آدمی نے قتل کر دیا تھا۔ لیکن آپ کو یقین نہیں آئے گا کہ وہ دوبارہ جی اٹھی۔ اصل میں اس کے سارے جسم میں ترشولی......"

اسی لمحے دروازہ کھلا اور ریشمی لباس پہنے ایک لڑکی اندر داخل ہوئی۔ وہ بہت خوب صورت تھی۔ اُس نے اندر داخل ہو کر کہا۔

"کیا ہو رہا ہے یہاں؟ کون ہو تم لوگ؟"

اچانک ہی میرے منہ سے آواز نکلی۔ "رانی! میں تمہیں تلاش کرتا ہوا......"

پولیس والے نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولا۔

"تُو بیٹھ جا۔ بھائی! دکھ اور افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے......" ابھی اُس نے اتنا ہی جملہ کہا تھا کہ رانی، داراب شاہ کی طرف بڑھی اور بولی۔

"اس طرح کیوں بیٹھے ہو؟"

پھر اُس نے بھی داراب شاہ کے سینے میں چھرا دیکھ لیا اور اُس کے حلق سے ایک خوف زدہ چیخ نکلی۔

"داراب!......داراب! یہ کیا ہوا؟"

رانی بری طرح سینہ کوبی کرنے لگی۔ میں نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"کمبخت کس قدر جھوٹی اور مکار ہے۔"

بہر حال وہ روتی رہی۔ پولیس والے نے مجھ سے کہا۔

"اُدھر کونے میں کھڑے ہو جاؤ۔ اگر تم نے بھاگنے کی کوشش کی تو میں تمہیں بھون کر رکھ دوں گا۔"

میں کونے میں جا کھڑا ہوا اور وہ تڑپتی ہوئی رانی کے پاس بیٹھ گیا۔

"ہمت اور صبر سے کام لیجیے۔ آپ کو صبر کرنا ہوگا۔"

رانی اپنی جگہ سے اُٹھ گئی۔ میں اُس کے سامنے کونے میں کھڑا تھا۔ مجھے دیکھ کر اُس نے معنی خیز انداز میں اپنی ایک آنکھ بند کی، جس طرح اپنی اداکاری کی داد چاہ رہی ہو۔

"مکار! دھوکے باز!" میں نے نفرت سے کہا۔ اسی وقت وہ پلٹی اور ایک فلک شگاف چیخ بلند کی اور اپنے بال نوچنے لگی۔

"بھابی!...... بھابی!......" دوسرا پولیس والا باہر جا کر ایک گلاس پانی لے آیا اور اُسے پانی پلانے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے کہا۔

"میں بتاؤں، داراب صاحب کا قاتل کون ہے؟"

دونوں پولیس والوں نے مجھے دیکھا تو میں نے کہا۔

"انہیں اسی عورت نے قتل کیا ہے۔"

رانی نے پھر ایک زوردار چیخ ماری۔ پولیس والا بولا۔ "صبر سے کام لو بھابی!" اُس نے ایک بار پھر میری طرف دیکھا اور چڑانے والے انداز میں مسکرا دی۔

میں نے اُس کی طرف دیکھا اور اُنہیں بتانا چاہا کہ جس کو اُنہوں نے داراب کی بیوی سمجھ رکھا ہے، وہی داراب کی قاتل ہے۔ وہ ایک خوف ناک روح ہے اور اُس کا نام ترشولی ہے۔ وہ زمانہ قدیم کی ایک جادوگرنی ہے اور نجانے کیا کرنا چاہتی ہے۔ وہ قتل کرنے کا ایک مخصوص انداز استعمال کرتی ہے۔ اتنی صفائی سے بازو کاٹ دیتی ہے کہ...... ابھی میں نے اتنا ہی سوچا تھا کہ اچانک ہی باہر سے شور شرابے کی آواز سنائی دی اور بہت سے پولیس والے اندر آ گئے۔

اس کے بعد مجھے گرفتار کر لیا گیا تھا۔

پھر ایک لمبا سفر کیا گیا اور مجھے تھانے کے لاک اپ میں بند کر دیا گیا۔ لاک اپ میں دو خونخوار آدمی موجود تھے، جو مجھ سے طرح طرح کے سوالات کرتے رہے۔ ان میں سے ایک نے کہا۔ "فکر مت کر بچہ! تُو بھی عادی ہو جائے گا۔ کس جرم میں آیا ہے؟ جیب کاٹی تھی کسی کی یا......"

"انہوں نے مجھے قتل کے الزام میں گرفتار کیا ہے۔"

"ارے واہ...... مردوں والا کام کیا ہے تُو نے۔ ابے ابھی سے یہ حال ہے تو آگے چل کر خوب ترقی کرے گا، میری جان! شاباش...... سو دفعہ شاباش۔"

"مگر میں قاتل نہیں ہوں۔"

"ارے چھوڑ...... قتل کیا ہے تو مردوں کی طرح اسے مان۔ ہم بھی شروع شروع میں اپنا جرم نہیں مانتے تھے۔"

"مگر میں قاتل نہیں ہوں۔"

"چھوڑو، اب پکڑے تو قتل کے الزام میں ہی گئے ہو۔ مگر ایک بات بتاؤ، قتل کرتے ہوئے تمہیں ڈر نہیں لگا؟"

"میں نے کہا ناں، میں نے قتل کیا ہی نہیں ہے۔"

میرے ان الفاظ پر وہ شخص ہنسنے لگا۔ اُس کے دانت پیلے تھے اور ہنستا تھا تو حلق سے ایسی آواز نکلتی تھی، جیسے بالٹی سے گھڑے میں پانی اُنڈیلا جا رہا ہو۔

"بہر حال تمہیں ایک بات میں بتا دوں، اگر تم نے قتل کیا بھی ہے تو تمہیں کم از کم پھانسی کی سزا نہیں دی جائے گی۔ کیونکہ ابھی تم نابالغ ہو۔"

"آپ کو پتہ نہیں جناب! میری امی، میرے ابو، میرے بھائی...... مجھے چاہنے والے مر جائیں گے۔"

دونوں خوب ہنسنے لگے۔ اسی وقت ایک پولیس والا سلاخوں کے پاس آیا اور بولا۔

"خدا کا خوف کرو یارا تھانے میں آفیسر آئے ہوئے ہیں۔"

پھر ایک اور پولیس کانسٹیبل آیا اور دوسرے کانسٹیبل سے بولا۔

"لڑکے کو باہر نکالو۔ صاحب بلا رہے ہیں۔"

مجھے لاک اپ سے باہر نکالا گیا اور ایک بڑے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ یہاں بہت سے پولیس والے موجود تھے۔ اُن کے درمیان سرخ و سفید چہرے والا پولیس افسر بیٹھا ہوا تھا۔ اُسے دیکھ کر ہی خوف محسوس ہوتا تھا۔ پتہ چلا کہ ایس ایچ او صاحب کی آمد کا انتظار کیا جا رہا ہے۔

"لڑکے کی تلاشی لی؟" بیچ میں بیٹھے ہوئے افسر نے پوچھا۔

"نہیں جناب! ابھی تک نہیں۔"

"تلاشی لو۔ کیا نام ہے تیرا؟" اُس نے مجھ سے گرج دار آواز میں پوچھا اور میں نے روتے بسورتے اپنا نام اور پتہ بتایا اور کہا۔

"میرا کوئی قصور نہیں ہے صاحب! مجھے چھوڑ دیجیے۔ میں تو داراب صاحب سے ملنے آیا تھا۔ یہ تھوڑا ہی معلوم تھا کہ وہ قتل ہو چکے ہیں؟"

”اس کی تلاشی لو۔“ اس نے کہا۔ اس کے بعد جو میری بے عزتی ہوئی، اسے میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ میں نے احتجاج کیا، خوشامدیں کیں، ہاتھ جوڑے اُنہوں نے اپنی مرضی کے مطابق میری تلاشی لی۔ تلاشی کے دوران اُنہیں میرے لباس میں چھپے ہوئے روپے بھی مل گئے، اور کوئی چیز نہیں ملی۔ پولیس افسر نے کہا۔

”اس سالے کو مرغا بنا دو۔ اور جب تک ایس ایچ او نہ آ جائے، اس پر ترس کھانے کی ضرورت نہیں ہے۔“

ایس ایچ او سورج ڈھلنے کے بعد آیا۔ میں مرغا بنے بنے اُس کی آمد کی دعائیں مانگتا رہا اور اُن کی باتیں سنتا رہا۔ وہ کم بخت رانی کو یا دوسرے الفاظ میں ترشولی کو نازیہ بیگم کا نام دے رہے تھے۔ اور اُنہوں نے یہ کہا تھا کہ پچھلے دنوں نازیہ کی شادی داراب سے ہوئی تھی۔ پھر اُن میں سے ایک نے کہا۔

”سوال یہ ہے کہ اس لڑکے نے انہیں قتل کیوں کیا؟“

”میں نے قتل نہیں کیا ہے جناب!“ میں نے روتے ہوئے کہا۔

جواب میں میری پیٹھ پر بوٹ کی زوردار ٹوک لگی اور میں درد سے دہرا ہو کر فرش پر کئی قلابازیاں کھا گیا۔

”فوراً مرغا بن جا۔“ بوٹ مارنے والے نے گھونسہ تان کر کہا۔ روتے روتے میری آنکھیں سوج گئی تھیں۔ میں اُن کے آگے پھر بھی ہاتھ جوڑ رہا تھا، دہائیاں دے رہا تھا۔ تب اُن میں سے ایک نے میز پر پڑا ہوا ڈنڈا اُٹھا لیا اور مجھے دکھاتے ہوئے بولا۔

”اگر فضول باتیں کیں تو تمہارے ساتھ جو ہوگا، تم سوچ بھی نہیں سکتے۔“

وہ لوگ باتیں کرتے رہے اور میں اُن کی باتیں سنتا رہا۔ انہیں انسپکٹر داراب کے قتل ہونے کا اتنا افسوس نہیں تھا جتنا خوب صورت نازیہ بیگم کے بیوہ ہو جانے کا تھا۔ وہ کم بخت نہیں جانتے تھے کہ نازیہ جو نام لے رہے ہیں، وہ نہ نازیہ ہے نہ کچھ اور، وہ ترشولی ہے۔

بہرحال ایس ایچ او آ گیا اور مجھ سے میرے بارے میں معلومات حاصل کرنے لگا۔ اُس نے مجھے سیدھا کھڑا ہونے کے لیے کہا، لیکن میری کمر ایسی ٹیڑھی ہو رہی تھی کہ مجھ سے سیدھا نہیں ہوا جا رہا تھا۔ وہ لوگ مجھ سے وہی سوالات کرتے رہے۔ اس رقم کے بارے میں بھی پوچھا گیا، جو میرے لباس سے برآمد ہوئی تھی۔ میں نے وہی جواب دیا جو پہلے دے چکا تھا۔ میں نے اُنہیں بتایا کہ میرا اور داراب کا کوئی رشتہ نہیں تھا۔ فادر جیکسن کی موت کا حادثہ ہم دونوں کو قریب لایا تھا۔ وہ بھی میری طرح روحوں پر یقین نہیں رکھتا تھا۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ اُس نے جھونپڑی سے اس لڑکی کو ڈھیر ساری رقم دے کر خریدا ہے۔ لیکن وہ لڑکی اصل میں رانی نہیں تھی، بلکہ ترشولی تھی۔

میں نے تمام تفصیل بتائی اور یہ باتیں سن کر وہ لوگ ہنستے اور مسکراتے رہے۔ بہرحال یہ ساری چیزیں چل رہی تھیں اور میں ان لوگوں کو اپنے دل کی باتیں بتا رہا تھا۔

”میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتا ہوں کہ میں بے گناہ ہوں۔ اگر میں داراب صاحب کا قتل کرتا تو میرے پاس سے اُن کا کٹا ہوا بازو بھی برآمد ہوتا۔ آپ لوگ تو اُنگلیوں کے نشان سے بھی قاتل کا پتہ چلا لیتے ہیں۔ انہیں دیکھ کر معلوم کر لیجیے کہ وہ نشانات کس کے ہیں۔ ویسے میں آپ کو ایک بات بتا دوں کہ انہیں ترشولی نے ہی قتل کیا ہے، جو رانی کے روپ میں ہے۔ یا آپ جسے نازیہ بھابی کہتے ہیں....... میں نہیں جانتا کہ وہ کیوں قتل کرتی ہے۔ البتہ جس طرح وہ قتل کرتی ہے، وہ آپ کے علم میں ہے۔ میں آپ کو بتاؤں صاحب! کہ اس نے میری بہن رخسانہ کو بھی قتل کیا ہے۔ اس کا بھی بازو اسی طرح غائب کر دیا تھا۔ اسی طرح اس نے فادر جیکسن کا بازو بھی غائب کر دیا تھا۔ آپ چاہیں تو معلوم کر سکتے ہیں۔“

بہرحال وہ مجھ سے سوالات کرتے رہے۔ صبح سے شام ہو گئی تھی، میں بھوکا بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے ایس ایچ او پر نگاہ ڈالی، وہ دونوں ہاتھوں سے سر پکڑے ہوئے بیٹھا تھا۔ شاید اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میرے بیان کے کس حصے پر یقین کرے۔ میرا یہ بیان ایک محرر نے لفظ بہ لفظ لکھ لیا تھا اور اس کے بعد مجھ پر دباؤ ڈالا گیا تھا کہ میں اپنے اس بیان پر دستخط کر دوں۔ میں نے بیان پر دستخط کیے اور ان کے کہنے پر انگوٹھا بھی لگا دیا۔ ایس ایچ او نے پوچھا۔

”تمہارے گھر والوں کو پتہ ہے کہ تم کہاں ہو؟“

”نہیں جناب! ابھی تک نہیں پتہ چلا ہوگا اُنہیں۔“

ایس ایچ او دیر تک میرے چہرے کو اس طرح تکتا رہا، جیسے کچھ سوچ رہا ہو۔ اس کے بعد اُس نے کسی کے نمبر ڈائل کیے اور اس کے بعد بولا۔

”ہیلو....... ہاں جی! ہم لوگوں کی قسمت میں آرام کہاں ہے؟ اچھا یہ بتاؤ تمہارے تھانے میں کسی لڑکے کی گمشدگی کی رپورٹ تو درج نہیں کروائی گئی؟ لڑکے کا نام سکندر ہے۔ اگر کوئی رپورٹ درج کروانے آئے تو اُسے ہمارے تھانے میں بھیج دینا۔ قتل کا کیس ہے یار! تمہیں تو یہ معلوم ہوگا ہی کہ اپنے داراب صاحب قتل ہو گئے ہیں۔ لڑکا اُنہی کے فلیٹ میں گھوم رہا تھا۔“

اُس نے فون رکھ دیا اور پھر میز پر رکھی ہوئی گھنٹی کا بٹن دبایا۔ دو کانسٹیبل آئے تو اُس نے حکم دیا۔

”ایک کام کرو۔ خاموشی سے نازیہ بیگم کو نگاہوں میں رکھو۔ انہیں یہ پتہ نہیں چلنا چاہیے کہ ہم ان کی نگرانی کر رہے ہیں۔“

کانسٹیبل چلا گیا تو اُس نے کہا۔

"بھوکے ہو؟"

"جی صاحب!"

"کیا کھاؤ گے؟"

"صاحب! کیا بتاؤں؟"

"اس کے لیے کچھ کھانا وغیرہ منگواؤ۔ یہ لو پیسے۔" پھر وہ میری طرف رُخ کر کے بولا۔

"ہاں، تو تم کہتے ہو کہ داراب صاحب کی بیگم، نازیہ بیگم نہیں ہیں، بلکہ کوئی رانی نامی لڑکی ہے، جس کے جسم میں ترشولی کی روح ہے۔ یہی بات ہے ناں؟"

اچانک ہی میرے کانوں میں ایک مدھم سی آواز اُبھری۔

"اس کی بیٹی چھت سے گر گئی ہے۔ تم اسے بتاؤ، اس کا نام فریحہ ہے۔ اسے بتاؤ کہ اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی ہے۔"

میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا لیکن میں نے فوراً ہی پوچھا۔

"آپ ایک بات بتائیں گے، فریحہ کون ہے؟"

میرے ان الفاظ پر وہ چونک پڑا۔ "کیا مطلب؟"

"کیا فریحہ آپ کی بیٹی کا نام ہے؟"

"ہاں....... ہے۔" اس نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

"وہ چھت سے گر گئی ہے۔ آپ اپنے گھر فون کر کے اس کی تصدیق کر سکتے ہیں۔"

"تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے کیا؟"

"آپ پلیز ایسا کریں۔ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں، وہ کر لیجیے۔ اس کے بعد آپ کا جو دل چاہے، مجھ سے کہیں۔"

میں نے کہا اور ایس ایچ او غصے بھری نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگا۔

اچانک فون کی گھنٹی بجی اور ایس ایچ او نے ریسیور اُٹھالیا۔

"ہیلو....... ہاں، ہاں....... میں ہی بول رہا ہوں....... کیا؟" وہ زور سے چیخا اور پھر خوف زدہ نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"فریحہ کہاں ہے؟"

"ہسپتال لے گئے ہیں۔ سنو اس کی بائیں ٹانگ کی ہڈی ٹوٹی ہوگی۔"

"ہاں....... ہاں....... مجھے اچھی طرح معلوم ہے۔ میں ابھی تھوڑی دیر میں پہنچ رہا ہوں۔" اُس نے تھوڑی دیر میں فون رکھ دیا اور حیران نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگا، پھر آہستہ سے بولا۔

"میں نے تو تمہیں کوئی تکلیف نہیں پہنچائی؟"

"نہیں جناب! میں کب کہہ رہا ہوں یہ بات؟ آپ تو مجھ سے بہت اچھی طرح بات چیت کر رہے ہیں۔"

"پھر تم نے میری بیٹی کو کیوں چھت سے نیچے گرا دیا؟"

"نہیں، میں نے نہیں گرایا۔ میں تو یہاں آپ کے سامنے بیٹھا ہوں۔"

"تمہیں اس بات کا کیسے پتہ چلا کہ وہ گری ہے اور اُس کی ٹانگ ٹوٹ گئی ہے؟"

"کسی روح نے بتایا تھا۔"

"کک....... کس کی روح؟" وہ خوف زدہ لہجے میں بولا۔

"ترشولی....... یقیناً وہ ترشولی نہیں ہے، بلکہ کوئی اور ہے۔ کیونکہ ترشولی کے پاس رانی کا جسم ہے۔"

"اب کیا ہوگا؟" اُس نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

"میں نہیں جانتا کہ آپ کس بارے میں کہہ رہے ہیں؟"

"وہ میری بیٹی....... سنو، میں تمہیں ایک بات بتاؤں، تم مجھے معاف کر دو۔ جب تک تم یہاں ہو، تمہیں کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔ تم لاک اپ میں اتنے آرام سے رہو گے، جتنے آرام

سے اپنے کمرے میں رہتے ہو۔"

پھر اُس نے فون اُٹھایا اور کسی کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔ پھر اُس نے کہا۔

"سر! میری بیوی کا فون آیا تھا۔ میری بیٹی اچانک چھت سے گر گئی ہے۔ جی ہاں، ہسپتال میں ہے۔ میں وہاں جا رہا ہوں۔ او کے سر!" اُس نے فون بند کر کے گھنٹی بجائی اور ایک کانسٹیبل اندر آ گیا۔

"لاک اپ میں کتنے آدمی ہیں اس وقت؟"

"صرف دو ہیں صاحب جی!"

"اور عورتوں والے حصے میں؟"

"اس میں کوئی نہیں ہے۔ لیڈر صاحب نے اپنا بستر لگایا ہوا ہے۔"

"کوئی تکلیف تو نہیں ہے وہاں پر؟"

"نہیں صاحب!"

"نیا بستر اور نئی چادر لگوا دو اور انہیں وہاں منتقل کر دو۔"

"کن کو جی؟"

"ان صاحب کو۔" اُس نے میری طرف اشارہ کیا اور بولا۔ "انہیں تکلیف نہ ہونے پائے۔"

"سمجھ گیا جی۔" کانسٹیبل نے جواب دیا۔ اس کے بعد ایس ایچ او وہاں سے چلا گیا۔

اُس کے جانے کے کچھ دیر بعد مجھے لاک اپ کے ایک دوسرے حصے میں منتقل کر دیا گیا۔ بہت اچھی جگہ تھی۔ بستر پر لیٹ کر خیالات نے میرے ذہن پر یلغار کر دی۔ میرے ماں باپ کا کیا حال ہو گا؟ کیا سوچ رہے ہوں گے وہ میرے بارے میں؟ بے شک میرے ساتھ اچھا سلوک ہو رہا تھا، لیکن پھر بھی نہ جانے کتنا وقت گزر گیا۔ پھر اچانک برابر سے رونے پیٹنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ شاید کوئی مار دھاڑ کی آواز بھی تھی۔ لاک اپ کے باہر پہرہ دینے والا کانسٹیبل، ایس ایچ او کے کمرے سے باہر نکلا تو اس سے پتہ چلا کہ ایک نقب زن کو رنگے ہاتھوں پکڑ کر تھانے میں لایا گیا ہے اور تھانے کا عملہ باری باری اُس کی پٹائی کر رہا ہے۔ بہر طور، ایسے کھیل تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔

وقت گزرتا رہا اور میں سوچتا رہا کہ اب کیا کرنا چاہئے۔ لیکن کیا کر سکتا تھا، سوائے سونے کے۔

دوسری صبح سو کر اُٹھا تو سلاخوں سے باہر پریشان حال ابو جی بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ بہت پریشان تھے۔ میرے پاس آئے تو بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"ساری رات تمہاری امی کو غش پہ غش آتے رہے ہیں۔ گلی کے سارے گھروں میں صف ماتم بچھی ہوئی ہے۔ سب یہی سمجھ رہے تھے کہ اب تمہاری لاش ہی ملے گی۔"

میں پیتے ہوئے آنسوؤں اور بہتی ہوئی ناک کو پونچھتا جا رہا تھا۔ ابو نے کہا۔ "ہم نے جب تمہاری امی کو یہ خبر سنائی کہ تم صحیح سلامت ہو تو وہ تھوڑی سی پُرسکون ہوئی ہیں۔ بہرحال ہم لوگ کوششیں کر رہے ہیں، وکیل وغیرہ سے مشورے کئے جا رہے ہیں۔"

"ابو! میں نے کوئی قتل نہیں کیا ہے۔"

"معلوم ہے بیٹے! ہم تمہاری مشکل سے اچھی طرح واقف ہیں۔ تم نے ہمیں ترشولی کے بارے میں تفصیل بتا رکھی ہے۔"

"جی ابو! اُس نے خود ہی یہ قتل کیا ہے۔"

"لیکن تم ایک بات بتاؤ کہ تم وہاں اُس فلیٹ میں کیوں گئے تھے؟"

"رانی سے ملنے۔"

"رانی کون ہے؟"

"اصل میں وہ ترشولی ہے۔"

ابو نے چونک کر مجھے دیکھا۔

"ہاں...... اُسی نے رخسانہ کو قتل کیا تھا۔ اُسی نے قادر کو کار سے کچلا تھا۔ اور بھی کئی قتل کئے ہیں اُس نے۔ اور اب داراب صاحب کو بھی اُسی نے قتل کیا ہے۔"

"تمہاری بات پر کون یقین کرے گا؟ تم ایک ایسی ہستی پر الزام لگا رہے ہو، جسے تمہارے سوا کوئی نہیں دیکھ سکتا۔"

"دیکھ سکتا ہے ابو! کیونکہ اب وہ تاریکی میں ہی نہیں، روشنی میں بھی نظر آتی ہے۔ کیونکہ اب وہ رانی کی شکل میں ہے۔"

بہر طور ابو پریشانیوں کا اظہار کرتے رہے اور پھر بولے۔ "گھر سے کوئی چیز منگوانی ہو تو بتا دو۔ میں دوپہر کو پھر آؤں گا۔"

"ایس ایچ او صاحب کہہ رہے تھے کہ تمہارے والدین کوشش کریں گے تو تمہیں دوپہر تک چھوڑ دیا جائے گا۔"

"کوشش تو ہم پوری پوری کر رہے ہیں۔ ایک وکیل صاحب سے بھی رابطہ ہو رہا ہے۔ نعیمی صاحب بھی تمہاری خیر خیریت معلوم کرنے آئے تھے۔ سب کے سب تمہیں اس جہنم سے نکلوانے کی کوشش کریں گے۔"

"نورین کے ابو کو بھی پتہ چل گیا؟"

"چلنا ہی تھا بیٹے! اب وہ ہمارے بہت قریبی عزیز ہیں۔" ابو جی سلاخوں والے دروازے کے باہر بیٹھے رہے۔ اچانک ہی ایک شخص تیز قدموں سے چلتا ہوا ہماری طرف آیا اور سلاخوں کے باہر ہی سے اُس نے روشنی کے جھماکے کے ساتھ میری تصویر اُتار لی۔ ابو جی، ہیں....... ہیں.......ہی کرتے رہ گئے۔ اتنے میں وہ سلاخوں کے کھلے حصے میں تیز روشنی کے دو اور جھماکے کر چکا تھا۔ ابو نے اُسے پکڑ لیا۔

"تم نے یہ تصویریں کیوں اُتاری ہیں؟"

"چھوڑو بڑے صاحب۔"

"میرے سوال کا جواب دو۔"

"آپ میرا گلا تو چھوڑیئے، میں اخبار کا فوٹو گرافر ہوں۔"

"تم میرے بیٹے کی تصویریں نہیں اُتار سکتے۔"

"گلا چھوڑو بابا جی! اب تو میں تصویریں اُتار چکا ہوں۔"

"جو تصویریں تم نے اُتاری ہیں، انہیں ضائع کر دو۔"

"تمہارا دماغ تو درست ہے؟"

"میں تمہارے کیمرے کے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا۔" ابو جی نے کہا اور فرش پر رکھے ہوئے کیمرے کو ٹھوکر مارنی چاہی۔ وہ شخص ابو جی سے گتھم گتھا ہو گیا تھا۔ میں نے محافظ کانسٹیبل سے چیخ کر کہا۔

"تماشا دیکھ رہے ہو، اسے روکتے کیوں نہیں ہو؟"

کانسٹیبل بے غیرتی سے دانت نکال کر ہنسنے لگا۔ وہ دونوں فرش پر گر گئے تھے اور ایک دوسرے کو پکڑے پکڑے فرش پر قلابازیاں کھا رہے تھے۔ میں نے زور سے چیخنا شروع کر دیا۔ تقریباً ڈیڑھ درجن وردی پوش نجانے کس کس کونے سے اُدھر دوڑے چلے آئے۔ اُنہوں نے ابو جی اور فوٹو گرافر کو الگ الگ کیا۔ دو نے فوٹو گرافر کے کپڑے جھاڑے، ایک نے کیمرہ اُس کے حوالے کیا۔

"بابا جی! یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ آپ کو پتہ ہے کہ آپ نے کس پر ہاتھ اُٹھایا ہے؟"

"اس سے کہو کہ میرے بیٹے کی تصویریں ضائع کر دے۔"

"قبر سے تمہارا باپ بھی نکل کر آ جائے تو وہ بھی تصویریں ضائع نہیں کرا سکتا۔"

"آپ جایئے جناب! یہ بڑے میاں کافی سٹھیا گئے ہیں۔"

فوٹو گرافر اکڑتا ہوا چلا گیا۔ کانسٹیبل کچھ دیر وہیں کھڑے رہے۔ وہ ہنس رہے تھے۔ ابو کے ماتھے پر خراش آئی تھی، جس سے خون رس رہا تھا۔ میں نے آہستہ سے کہا۔

"آپ کو جھگڑا نہیں کرنا چاہئے تھا ابو! وہ تو ہے ہی پریس کا آدمی۔"

آہ.......تم نہیں جانتے بے وقوف لڑکے! اُس نے تمہاری تصویریں نہیں اُتاریں، تمہارے سینے میں خنجر اُتار دیا ہے۔"

بہرحال ابو چلے گئے۔ اس دوران یہاں خاصی دلچسپ باتیں ہوئی تھیں۔ کئی اور نئے ملزم آئے تھے، جنہیں مختلف قسم کے جرائم کے الزام میں گرفتار کیا گیا تھا۔ غرض یہ کہ خوب ہنگامہ آرائی ہو رہی تھی اور میرے لیے کوششیں جاری تھیں۔ گھر میں چلّے، وظیفے ہو رہے تھے اور کوشش کی جا رہی تھی کہ مجھے رہائی مل جائے۔ بھائی جان بھی کئی بار ملنے آئے تھے۔ تقریباً سب ہی ملنے آئے تھے۔ یہ سارے کام کئے جا رہے تھے اور مجھ پر نئے نئے الزام لگائے جا رہے تھے، کیونکہ میں ایک پولیس افسر کا قاتل تھا۔

بہت سے معاملے آ رہے تھے۔ پھر کئی دن کے بعد ایک دن صبح مجھے اطلاع ملی کہ مجھے لاک اپ سے رہائی مل رہی ہے۔ میں گھر پہنچا۔ گھر پر صرف امی تھیں۔ بھائی جان اپنا ایک پرچہ دینے گئے تھے، ابو آفس گئے ہوئے تھے۔ میں جب گھر میں داخل ہوا تو امی مجھے دیکھ کر گم سی ہو گئیں، پھر پاگلوں کی طرح اُٹھیں اور مجھے گلے لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ اس دوران میں نے محسوس کیا تھا کہ نظر نہ آنے والے سائے مستقل میرے ساتھ لگے ہوئے ہیں۔ اُنہوں نے ایک دن کے لیے بھی میرا ساتھ نہیں چھوڑا تھا۔ میرے دُکھ سے اُنہیں دُکھ ہوتا تھا۔ وہ ہمدرد رُوح، جس نے مجھے ایس ایچ او کی لڑکی کے چھت سے گرنے کی خبر سنائی تھی، وہ میرے لیے اجنبی تھا۔ یہاں تک کہ سارے معاملات طے ہو گئے۔ پورا محلّہ مجھ سے ملنے کے لیے آیا تھا اور میں اپنا وقت گزار رہا تھا۔

میں اسکول پہنچا تو مجھے اطلاع ملی کہ اسکول سے میرا نام کاٹ دیا گیا ہے۔ کیونکہ میں ایک جرائم پیشہ اور قاتل ہوں۔ پھر میری ملاقات اپنی اسکول ٹیچر سے ہوئی۔ یہ ایک چھوٹے قد کی مہربان خاتون تھیں۔ اُنہوں نے نجانے کیوں مجھ سے خاص طور پر ملاقات کی اور بولیں۔

"کیا واقعی تم نے کسی کو قتل کر دیا ہے؟"

"نہیں میڈم! سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔"

"تو مجھے بتاؤ، اصل بات کیا ہے؟"

میں نے اُنہیں ہر بات بتا دی۔ یہاں تک کہ نورین سے محبت والی بات بھی صاف گوئی سے کہہ ڈالی۔ اُنہوں نے مجھ پر مکمل اعتبار کیا تھا۔ پھر وہ بولیں۔

"تم نے جو کچھ بتایا ہے، وہ میرے لیے بہت اجنبی ہے۔ خاص طور سے ایک شیطانی روح ایک جسم سے دوسرے اور دوسرے جسم سے تیسرے میں منتقل ہونے کا سلسلہ تو انتہائی تعجب خیز

ہے۔ پر نجانے کیوں مجھے لگ رہا ہے کہ تم نے سچ کہا ہے۔ یہ سب کچھ ہوتا ہے۔ لیکن ان شاء اللہ تمہیں سچائی کا صلہ ملے گا، اور تم اپنی صفائی کر لو گے۔"

"میں نہیں جانتا میڈم! کہ میں اس زمانہ قدیم کی جادوگرنی کا مقابلہ کیسے کر سکتا ہوں۔"

"حق کبھی کمزور نہیں ہوتا۔ اللہ تمہاری مدد کرے گا۔"

وقت گزرتا رہا۔ میں نے اپنی تاریک دنیا کو نہیں چھوڑا۔ بہرحال مجھے اس بارے میں تھوڑی بہت معلومات حاصل ہوتی رہیں۔ نورین آج بھی میرے دل میں بہت بڑی حیثیت رکھتی تھی۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ ترشولی اس وقت بھی رانی کے جسم میں ہے اور یقیناً کسی نئے جسم میں جانے کے لیے بے چین ہو گی۔ کیونکہ پولیس کو داراب کے قتل کے سلسلے میں اُس کا نام بھی پیش کیا گیا تھا۔

غرض یہ کہ وقت گزرتا رہا۔ اُس دن بھی میں بڑے درد کے عالم میں قبرستان پہنچا تھا۔ اپنی بہن کی قبر کے پاس میں نے اُسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"بتاؤ رخسانہ! میں کیا کروں؟ سب کچھ چھین لیا گیا ہے مجھ سے۔ سب کی نگاہوں میں ایک قاتل کی حیثیت اختیار کر چکا ہوں۔ نورین کو بھی مجھ سے چھین لیا گیا ہے۔ میں تھک گیا ہوں...... بری طرح تھک گیا ہوں میں۔"

یہ کہتے کہتے میں نے نورین کی قبر پر سر رکھا اور میری آنکھوں میں غنودگی سی طاری ہو گئی۔ مجھے ایسا لگا جیسے رخسانہ میرے سر کے بالوں میں ہاتھ پھیر رہی ہو۔ میں جاگ گیا تھا لیکن آنکھیں کھولتے ہوئے ڈر رہا تھا۔ مجھے خوف تھا کہ آنکھیں کھولتے ہی وہ میری نگاہوں سے دُور ہو جائے گی۔

پھر اچانک مجھے یوں لگا کہ جیسے رخسانہ کی اُنگلیاں پتھر کی طرح سخت اور کھردری ہو گئی ہوں۔ میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ نظروں کے سامنے رخسانہ کی قبر پر پاؤں رکھے ایک انتہائی بدشکل آدمی کھڑا تھا۔ اُس کی ناک پچکی ہوئی تھی اور آنکھیں چھوٹی اور گول تھیں۔ دایاں ہاتھ غائب تھا، بائیں ہاتھ میں چھڑی تھی اور اس چھڑی کو وہ میری گردن اور چہرے پر چھو رہا تھا۔

"کون ہو تم؟"

"تم بتاؤ، تم کون ہو؟" اُس کی آواز اس طرح نکلی جیسے ناک میں بول رہا ہو۔

"میرا نام سکندر ہے۔ اور یہ قبر جس پر تم کھڑے ہو، میری بہن رخسانہ کی ہے۔"

"اوہو...... اچھا، اچھا۔" وہ قبر پر سے ہٹ گیا۔

"قبر کسی کی بھی ہو، اس پر پاؤں نہیں رکھنا چاہیے۔"

"ہاں...... ٹھیک کہتے ہو۔ ہم انسانوں کا تو احترام نہیں کرتے، ان کی قبروں کا احترام ضرور

کرتے ہیں۔"

"تم یہاں اکثر آتے جاتے رہتے ہو؟"

"ہاں...... دل گھبراتا ہے تو آ جاتا ہوں۔"

"تمہیں یہاں ڈر نہیں لگتا؟"

"ڈرنا کیا ہے؟"

"اگر کسی قبر میں سے کوئی پورا انسانی ڈھانچہ دکھائی دے تو؟"

"تو کیا فرق پڑتا ہے؟ یہ سب کچھ تو ہر انسان کی انتہا ہوتی ہے۔"

"ٹھیک۔ تم کام کے آدمی ہو۔" وہ مسکرا کر بولا۔

"تم کون ہو؟"

"میں ایک عامل ہوں۔"

"کیا مطلب؟"

"عامل، عمل پڑھنے والے کو کہتے ہیں۔ وہ روحوں کو قابو میں کرتا ہے اور ان سے اپنے کام کراتا ہے۔"

"اگر میں تم سے یہ کہوں کہ مجھے رانی سے ملوا دو تو ملوا دو گے؟"

"رانی کون ہے؟"

"رانی ایک لڑکی ہے۔ مجھے اور پولیس والوں کو اُس کی تلاش ہے۔"

"میں تمہیں اُس سے ملوا سکتا ہوں۔"

"میں اُس سے واقعی ملنا چاہتا ہوں۔"

"میری ایک بات سنو۔ یہ تو کوئی بات نہیں ہے۔ تم اگر کہو تو میں تمہیں تمہارے اسکول بھی پہنچا دوں، تمہارے سارے پرچے بھی کلیئر کرا دوں۔"

"مجھے یقین نہیں آتا۔" مجھ پر یکلخت بے اعتباری سی طاری ہو گئی۔

اُس نے وہیں پڑا ہوا مٹی کا ایک ڈھیلا اُٹھایا اور میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "میرے خیال میں تمہیں بھوک لگ رہی ہو گی۔ لو، یہ گلاب جامن کھا لو۔"

"یہ گلاب جامن ہے؟" میں نے ہنستے ہوئے مٹی کے اُس ڈھیلے کو دیکھا، مگر دوسرے ہی لمحے میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ مٹی کا ڈھیلا دیکھتے ہی دیکھتے گلاب جامن میں تبدیل ہو گیا تھا۔ میں نے اس گلاب جامن کو کھایا نہیں، بس ذرا سا چکھا اور گلاب جامن کو رخسانہ کی قبر کے پہلو میں رکھ دیا۔

"بولو...... اب یقین آیا یا نہیں؟"

"ہاں...... مجھے یقین آ گیا ہے۔ مگر بڑی عجیب بات ہے۔ ویسے میں تمہیں ایک بات بتاؤں کہ میں ایک غریب اور مشکل کا شکار آدمی ہوں۔"

"ادھر آؤ...... میرے ساتھ آؤ...... تمہیں میرا ایک کام کرنا ہوگا۔"

"جی، میں تیار ہوں۔"

عامل نے مجھے ایک عجیب کام بتایا، جس کے لیے میں آمادہ ہو گیا۔ کام خوف ناک تھا لیکن اُس نے مجھے خوب لالچ دیا تھا۔ عامل نے ایک جنرل مرچنٹ کے ہاں سے ایک بڑی ٹارچ خریدی۔ جس وقت ہم دونوں قبرستان میں پہنچے، وہاں ایک جنازہ آیا ہوا تھا۔ قبرستان کا ایک حصہ گیس کی لالٹینوں سے روشن تھا۔

"اس بدبخت کو بھی اسی وقت مرنا تھا۔" عامل نے بڑبڑا کر کہا۔

میں اس وقت اچھے موڈ میں تھا۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اس میں مرنے والے کا کیا قصور ہے؟ دن میں کسی وقت مرا ہوگا۔ اصل قصور تو ان لوگوں کا ہے، جو اسے اس وقت یہاں لے کر آئے ہیں۔"

"زیادہ بولنے کی ضرورت نہیں۔ چپ چاپ چلے چلو۔"

وہ مجھے قبرستان کے اسی درمیانی حصے میں لے گیا، جہاں آدمی سے زیادہ کھلی ہوئی قبر تھی۔ وہ حصہ تاریکی میں تھا، تاہم وہاں گیس کی لالٹینوں کی روشنی ایسی پہنچ رہی تھی، جیسے تاروں کی جھلملاہٹ میں ہوتی ہے۔ بیشتر ایسی قبریں تھیں، جن کے مکین باہر نکل آئے تھے اور اپنی قبروں کو تکیہ بنائے بیٹھے تھے۔ میرے لیے ان کے سائے اور ان سایوں کی نقل و حرکت سے پیدا ہونے والی سرسراہٹیں نئی نہیں تھیں۔ البتہ ایک بات ایسی ضرور تھی۔ جس سے مجھے تھوڑی سی حیرت ہو رہی تھی۔ سایوں کو قبرستان میں آنے والے جنازے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ سب کی نظریں میرے اور عامل کے اوپر مرکوز تھیں۔

قبر کے پاس جا کر عامل نے کہا۔ "یہیں بیٹھ جاؤ۔ ادھر کوئی آئے گا نہیں۔ تاہم احتیاط ضروری ہے۔ کسی کے آنے جانے کی آہٹ سنو تو اس طرح ہاتھ اُٹھا لینا کہ آنے والا ہمیں فاتحہ خوانی کرتے ہوئے سمجھے۔"

میں نے کہا۔ "ذرا ٹارچ تو دو۔"

"کیوں، ٹارچ کا کیا کرو گے؟"

"اس لاش کو ایک نظر دیکھوں گا، جس کی زیارت کے لیے مجھے قبر میں اُترنا ہے۔"

"احمق ہو۔" وہ بولا۔ "قبر میں اُتر کر ڈرے اور جھجکے بغیر لاش کے سر کی طرف جانا۔ ٹارچ تمہارے ہاتھ میں ہوگی۔ اگر اتنی ہمت ہو کہ اسے بجھا کر آسانی سے قبر میں نقل و حرکت کر سکو تو

ٹارچ کو بجھا دینا اور خود بھی اس کی طرف دیکھنے سے گریز کرنا۔"

میری ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہر دوڑ گئی۔ دل نے کہا، اب بھی وقت ہے، بھاگ جاؤ۔ دماغ نے کہا، بھاگو گے تو کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔ نہ پھول، نہ نورین، نہ علم، نہ دولت۔

"سر کے قریب جا کر لاش کو سر سے ننگا کر دینا۔" عامل کہہ رہا تھا۔ "پھر اس کے بالوں کو پکڑ لینا۔ ڈرنا نہیں، بال برف کی طرح ٹھنڈے ہوں گے۔ قبر کی نمی اور ٹھنڈک کے باعث ہر لاش کے بال اسی طرح ٹھنڈے ہوتے ہیں۔ پھر ان بالوں کو مضبوطی سے پکڑے پکڑے پوری طاقت سے جھٹکا دینا۔ جتنے بال ہاتھ میں آ جائیں، انہیں لے کر اوپر آ جانا۔"

"ان بالوں کا کیا کرو گے؟"

"جادو جگاؤں گا۔"

"تمہارا جادو سویا ہوا ہے؟"

"جن باتوں کو تم نہ جانتے ہو، نہ سمجھ سکتے ہو، ان کے بارے میں فضول باتیں مت پوچھو۔"

چند لمحوں کے لیے خاموشی چھا گئی۔ وہ لوگ جو جنازے کے ساتھ آئے تھے، تدفین سے فارغ ہو چکے تھے اور قبرستان سے باہر جا رہے تھے۔ گیس کی لالٹینیں غائب ہونا شروع ہو گئی تھیں اور وہاں اتنی تاریکی پھیل گئی تھی کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔

"عامل صاحب!" میں نے کہا۔ "نجانے کیوں میرا ہنسنے کو جی چاہ رہا ہے۔ برا مت ماننا، لیکن کچھ ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے چراغ الٰہ دین والی کہانی دہرائی جا رہی ہو۔ میں قبر میں اُتروں گا، لاش کے بالوں کو نوچوں گا اور جب باہر آنے لگوں گا تو تم کہو گے، پہلے بال میرے حوالے کرو۔ میں کہوں گا کہ پہلے مجھے باہر آنے دو۔ پھر تمہیں غصہ آ جائے گا اور جس طرح الٰہ دین کا فرضی چچا اُسے غار میں بند کر کے رفو چکر ہو گیا تھا، اسی طرح تم بھی مجھے قبر میں بند کر دو گے۔"

"ایسا نہیں ہوگا۔" اُس نے کہا۔ "جب تک تم قبر سے باہر نہیں نکل آؤ گے، میں تم سے بال نہیں مانگوں گا۔ بس اب تم ٹارچ سنبھالو اور قبر میں اُتر جاؤ۔ اس کی دیواروں پر پاؤں رکھنے کی جگہ بنی ہوئی ہے۔"

میں نے قبر میں جھانکا۔ اندر کی تاریکی کے مقابلے میں باہر کی تاریکی کچھ بھی نہیں تھی۔

"اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ تمہارا کام بن جائے گا تو تم مجھے دھتکارو گے نہیں، بلکہ اپنے وعدے کے مطابق میری مدد کرو گے؟"

"میری زبان۔" اُس نے کہا۔ "سب سے بڑا ثبوت میری زبان ہے۔ ہم عامل لوگوں کی زبان سے ادا ہونے والے الفاظ پتھر کی لکیر ہوتے ہیں۔ ایک بار جو کہہ دیا، مر جائیں گے لیکن اس کے خلاف نہیں کریں گے۔"

میں نے ہاتھ میں ٹارچ لیے اُترنے کی کوشش کی لیکن عامل کے سہارا دینے کے باوجود اُترنا مشکل معلوم ہونے لگا۔ اُس نے کہا۔

"لاؤ، ٹارچ مجھے دے دو۔ میں اوپر سے نیچے کی سمت روشنی ڈالتا رہوں گا۔"

لیکن میں نے ٹارچ اُسے دینے کے بجائے منہ میں دبائی۔ پاؤں کی جگہ تلاش کر کے تھوڑا سا نیچے اُترا اور قبر سے لگا کھڑا تھا۔ اُس کے پاؤں کنارے پر تھے۔ اچانک میں نے اُس کی ٹانگیں پکڑ کر کھینچ لیا۔ وہ کٹے ہوئے درخت کی طرح مجھ پر آ گرا اور میں اُسے لیے ہوئے لاش پر جا گرا۔ لاش نے گدے کا کام دیا۔ لاش نہ ہوتی تو اتنے اوپر سے نیچے گرنے کے باعث ہم دونوں کی ایک نہ ایک ہڈی ضرور اپنی جگہ سے کھسک جاتی۔ جلتی ہوئی ٹارچ منہ سے نکل گئی اور لاش کے سرہانے گر کر قبر کو روشن کرنے لگی۔ لاش سخت سرد تھی۔ اس کے باوجود اس میں اتنا گداز تھا کہ ہمیں کوئی چوٹ نہیں آئی۔ میں اُسے روندتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ قبر میں کافور کی تیز خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔

"انتہائی احمق، ناکارہ اور فضول قسم کے لڑکے ہو۔" عامل نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"غلطی آپ کی ہے۔" میں نے کہا۔ "آپ کو ٹانگیں جما کر کھڑے ہونا چاہئے تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ جن ٹانگوں کو مضبوط ستون سمجھ کر پکڑ رہا ہوں، وہ دیمک زدہ لکڑی سے بھی کہیں زیادہ بودی نکلیں گی۔۔ بے چاری لاش کئی جگہ سے چیخ گئی ہو گی۔"

"واہیات گفتگو مت کرو۔" وہ اوپر جانے کے لیے اس چھوٹے سے گڑھے کو تلاش کرتا ہوا بولا جو گورکن قبر کی دیوار میں اس لیے بنا دیتا ہے کہ اس میں پاؤں جما کر لاش کو قبر میں اُتارا جا سکے۔ بعد میں لاش کو اُتارنے والے انہی گڑھوں میں پنچے رکھے ہوئے قبر سے باہر جاتے ہیں۔

"میں باہر جا رہا ہوں۔ جب تک باہر نہ نکل جاؤں، لاش کے بالوں کو مت چھیڑنا۔"

وہ دیوار کے گڑھے میں پاؤں کے پنجے گاڑے اوپر جانے کی کوشش کر رہا تھا کہ میں نے اُس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر دوبارہ اُسے نیچے کھینچ لیا۔ وہ لاش پر گرتے گرتے بچا۔

"کیا بدتمیزی ہے؟" اُس نے میری طرف گھور کر دیکھا۔ ٹارچ کی روشنی اتنی تیز تھی کہ زمین پر ہونے کے باوجود قبر کے ہر حصے کو اس نے روشن کر دیا تھا۔ عامل اتنا غصے میں تھا کہ قبر میں نہ ہوتا تو شاید مجھ پر جھپٹ پڑتا۔ میں نے کہا۔

"تم مجھے یہاں، اس لاش کے پاس تنہا چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔"

"میرا باہر جانا ضروری ہے۔" اُس نے غصہ دبا کر مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔ "میں قبر سے باہر بیٹھ کر منتر پڑھوں گا، جادو جگاؤں گا۔ بچوں جیسی حرکتیں مت کرو۔ میں جانتا ہوں کہ تم ایک بہادر اور باہمت لڑکے ہو۔"

"جب تک میں نے لاش کا چہرہ نہیں دیکھا تھا، تب تک میں واقعی بہادر اور باہمت لڑکا تھا۔"

میں نے عامل کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "لیکن اب میری ہمت جواب دے گئی ہے۔ اس کے چہرے کا جگہ جگہ سے گوشت غائب ہے اور اس کے ناک اور منہ میں چیونٹے اور چیونٹیاں بھرے ہوئے ہیں اور اس کے دانتوں کے خلا میں سے چھپکلی جیسے کسی جانور کو جھانکتے ہوئے دیکھا تھا۔"

"میں نے پہلے ہی تمہیں چہرہ دیکھنے سے منع کیا تھا۔"

"کیا کرتا۔ ٹارچ ٹھیک اُس کے سر کے پاس گری ہے اور میرے اور تمہارے گرنے سے اس کے جسم کا نصف سے زیادہ حصے کا کفن کھل گیا ہے۔" میں نے کہا۔ "میں باہر جا رہا ہوں۔ میرے اندر اتنا حوصلہ نہیں ہے کہ میں اس کے بال پکڑوں۔"

"بنا بنایا کھیل کیوں بگاڑتے ہو؟" وہ خوشامدوں پر اُتر آیا۔ "اماوس کی یہ رات ضائع ہو جائے گی۔ میں تمہارے پاؤں پڑتا ہوں، اسے ضائع نہ جانے دو۔"

"لاش رو رہی ہے۔"

"مت دیکھو اس کی طرف۔" اس نے چیخ کر کہا۔ پھر چیتے جیسی تیزی کے ساتھ جھک کر ٹارچ اٹھائی اور بٹن دبا کر آف کر دیا اور اس سے پہلے کہ میں اس سے ٹارچ جھپٹتا، اُس نے ہاتھ گھما کر اسے قبر سے باہر اچھال دیا۔ میں نے زندگی بھر کبھی اتنی اتھاہ گہرائی اور تاریکی نہیں دیکھی تھی۔ اچانک مجھے مہیب سایوں نے چاروں اطراف سے گھیر لیا۔ میں بدحواس ہو کر اِدھر اُدھر ہاتھ چلانے اور باہر نکلنے کے لیے قبر کے اطراف اور جوانب میں قدم جمانے والے گڑھے تلاش کرنے لگا۔ دل تھا کہ ڈوبتا جا رہا تھا۔ اتنی وحشت تھی کہ میں کئی بار لاش کے جسم سے ٹکرایا۔ اُسے بھنبھوڑنے والے کئی چیونٹے میرے تلوؤں سے چمٹ گئے۔ درد اور خوف سے برا حال ہو گیا۔

میں پیروں پر جھکا ہوا تلوؤں میں لپٹے ہوئے ان چیونٹوں کو چھڑا رہا تھا، جنہوں نے آگ سے بنے ہوئے ننھے ننھے نوک دار شکنجوں سے کھال اور گوشت کو دبا رکھا تھا کہ قبر کے اوپر سے عامل کی آواز آئی۔

"تم نے ٹھیک کہا تھا۔ آج رات ایک بار پھر الہ دین کی کہانی دہرائی جائے گی۔"

"نہیں......." میں نے چیخ کر کہا اور اسی لمحے ایک اور چیونٹا میرے پیر کے انگوٹھے سے آ کر چمٹ گیا۔ میں درد سے دوہرا ہو گیا۔ چیونٹے کو چھڑانا چاہا تو وہ دو ٹکڑے ہو گیا۔ اُس کا منہ بدستور انگوٹھے سے چمٹا رہا۔

"میں تمہیں دو منٹ دیتا ہوں۔" کمبخت عامل قبر پر جھکا ہوا کہہ رہا تھا۔ "اس عرصے میں اگر تم نے بال نہیں نوچے تو میں قبر پر بلاک جما دوں گا اور اس پر مٹی ڈال دوں گا۔ تم قبر کے اندر ہی سسک سسک کر مر جاؤ گے۔"

"خدارا مجھ پر رحم کرو۔ چیونٹوں نے مجھ پر حملہ کر دیا ہے۔"

''بال نوچو اور باہر آ جاؤ۔'' اس نے کہا۔ ''ورنہ چیونٹوں ہی کا شکار ہو گے۔ کچھ دیر بعد
چھپکلیاں بھی حملہ آور ہوں گی۔ گوشت خور سانپ بھی تمہیں اپنا نوالہ بنائیں گے۔ تمہارے چیخنے
چلّانے سے کچھ نہیں ہوگا۔ میں تمہیں یہاں زندہ دفن کر کے یہاں سے میلوں دُور چلا جاؤں گا۔''
اچانک اُس نے قبر کے ایک حصے پر بلاک رکھ دیا۔ انتہائی تاریکی کے باوجود قبر کا جو حصہ کھلا
ہوا معلوم ہو رہا تھا، وہ تقریباً ایک چوتھائی بند ہو گیا۔ دوسرا بلاک رکھ دیا جاتا تو قبر مکمل طور پر بند ہو
جاتی۔

''اگلا بلاک مت رکھنا۔'' میں نے گلا پھاڑ کر چیختے ہوئے کہا۔ ''میں لاش کا سر تلاش کر رہا
ہوں اور ابھی ایک منٹ کے اندر اندر اُس کے بال لے کر آتا ہوں۔''

چیونٹے جہاں جہاں کاٹ رہے تھے، وہاں ایسا معلوم ہو رہا تھا، جیسے کسی نے چنگاریاں بھری
ہوں۔ مگر اس وقت مجھے ان چنگاریوں کی کوئی پروا نہیں تھی۔ میں قبر میں بند ہو کر سانس گھٹنے کی
تکلیف برداشت کرنا نہیں چاہتا تھا۔ موت اور زندگی کے درمیان چند سیکنڈ کا فاصلہ تھا۔ ایک لمحے
کے لیے بھی دیر کرتا تو قبر کو دوسرا بلاک رکھ کر بند کر دیا جاتا۔

بالآخر میں لاش کے بالوں کو پکڑنے میں کامیاب ہو گیا۔ بال سرد اور گیلے ہی نہیں تھے بلکہ
لجلجے بھی تھے۔ ایسا لگا جیسے میں نے بال نہ پکڑے ہوں، سویوں کے بڑے سے پیالے میں ہاتھ
ڈال کر سویوں کو اپنے ہاتھ میں لیا ہو۔ مگر کچھ سوچنے سمجھنے کا وقت نہیں تھا۔ ایک ایک پل بھاری
تھا۔ میں نے جھٹکے سے گیلی سویوں جیسے بالوں کو کھینچا۔ بالوں کا پورا گچھا مٹھی میں آ گیا۔ اسی لمحے
ایسا محسوس ہوا، گویا لاش میں حرکت ہوئی ہو۔

''میں نے بالوں کو نوچ لیا ہے۔'' میں نے ہانپتے ہوئے با آواز بلند کہا۔ ''ٹارچ کی روشنی
ڈالو تاکہ میں اوپر آ سکوں۔ جلدی کرو۔ چیونٹے میرے پورے جسم میں پھیل گئے ہیں۔''

جس وقت میں نے لاش کے بالوں کو پکڑا تھا، عامل قبر میں جھانک رہا تھا۔ اگرچہ اُسے کچھ
نظر نہیں آ رہا تھا، تاہم وہ میری حرکات و سکنات سے اندازہ لگا رہا تھا کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ اُس
کے ارادے اچھے نہیں تھے۔ میں جانتا تھا کہ اگر میں بال نوچے بغیر قبر سے اوپر جاؤں گا تو وہ
دوبارہ مجھے قبر میں دھکا دے دے گا۔ نہ صرف دھکا دے گا، بلکہ بلاک بھی رکھ دے گا اور مٹی ڈال
کر مجھے قبر کے گڑھے میں مرنے کے لیے چھوڑ جائے گا۔ لیکن جب بالوں کو نوچ کر فارغ ہوا تو
وہ جھانکنا چھوڑ کر قبر سے ہٹ گیا تھا۔ اس تصور سے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے کہ کہیں وہ بلاک
رکھنے کی تیاری تو نہیں کر رہا ہے۔

میں نے بالوں کے گچھے کو جیب میں رکھ لیا۔ جسم سے چمٹے ہوئے چیونٹوں کو علیحدہ کرنے کی
کوشش نہیں کی۔ اس کے برعکس بری طرح کانپتے ہوئے قبر کے اطراف میں اوپر جانے والے

چھوٹے چھوٹے گڑھے تلاش کرنے لگا اور ساتھ ہی ساتھ چیخ چیخ کر کہا۔

''میں نے تمہاری بات مان لی ہے۔ میں نے مٹھی بھر بال نوچ لیے ہیں۔''

کچھ چیونٹوں کے کاٹنے کی ناقابلِ برداشت تکلیف تھی، کچھ اس بات کا خوف تھا کہ کہیں
عامل بلاک رکھ کر قبر کو بند نہ کر دے۔ اور کچھ لاش سے ڈر لگ رہا تھا کہ وہ ہاتھ بڑھا کر مجھے اپنی
طرف نہ کھینچ لے۔ عالمِ وحشت میں اِدھر اُدھر پاؤں چلا رہا تھا کہ قبر کے کھلے ہوئے حصے پر ایک
سر نمودار ہوا، پھر ایک نسوانی آواز آئی۔

''قبر میں کون چیخ رہا ہے؟''

کوئی دوسرا وقت ہوتا تو حیرت اور خوشی کے باعث میری حالت غیر ہو جاتی۔ تاریک ترین
رات، وسیع و عریض قبرستان اور اس میں ایک عورت کی فرشتۂ غیبی جیسی آمد۔ جتنی حیرت کرتا اور
جتنی خوشی مناتا کم ہوتی۔ لیکن وہ وقت نہ حیرت کا تھا، نہ خوشی کا۔ میں نے پوری آواز سے چلاتے
ہوئے کہا۔

''میں ہوں۔''

''میں کون؟''

''ایک ظالم جو خود کو عامل کہتا ہے، مجھے اس قبر میں زندہ دفن کر دینا چاہتا ہے۔'' میں نے
کہا۔ ''تم مجھے نہیں جانتیں، میرا نام سکندر ہے۔ خدا کے لیے مجھے یہاں سے نکالو۔''

چند ثانیوں کے لیے ایسا معلوم ہوا جیسے ان سایوں نے، جو ہر وقت میرا احاطہ کیے رہتے
تھے، راہِ فرار اختیار کر لی ہو اور میں بالکل تنہا رہ گیا ہوں۔

''سکندر!'' اوپر سے آواز آئی۔ ''اتنی تاریکی میں تم قبر میں کیسے گئے؟'' آواز جانی پہچانی سی
تھی لیکن اس وقت آواز کی پروا کسے تھی۔

''ٹارچ لے کر آیا تھا لیکن اس عامل کے بچے نے وہ ٹارچ بھی باہر پھینک دی۔ ٹارچ اب
بھی وہیں کہیں پڑی ہوگی۔''

وہ قبر کے پاس سے ہٹ گئی۔ معاً میرے ذہن میں ایک شبے نے سر اُبھارا۔ کہیں وہ اس
عامل کی، جسے میں مسلسل برا کہتا رہا تھا، دوست یا واقف کار تو نہیں؟ ٹھیک اسی لمحے میری ٹانگوں پر
ایک چھپکلی جیسی کوئی چیز چڑھی۔ میں وحشیانہ انداز میں پیر جھٹکنے لگا۔ اور تب پوری قبر تیز روشنی میں
نہا گئی۔ وہ جو کوئی بھی تھی، ہاتھ میں ٹارچ لیے اُس کی روشنی اندر ڈال رہی تھی۔

''اب اوپر آ سکتے ہو، سکندر؟'' اُس نے پوچھا۔ ''یا کسی ایسی رسّی کا انتظام کروں، جسے پکڑ کر
تم اوپر آ سکو؟''

''میرا خیال ہے مجھے رسّی کی ضرورت نہیں پڑے گی۔'' میں نے قبر کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"میں نے ان گڑھوں کو دیکھ لیا ہے جن میں پاؤں رکھ کر میں اوپر آ سکتا ہوں۔ میں اوپر آ رہا ہوں۔"

"سنبھل کر۔ جلد بازی کی ضرورت نہیں ہے۔"

"جلد بازی اس لیے کر رہا ہوں کہ چیونٹے مجھے کاٹ رہے ہیں۔"

"ہمت سے کام لو۔ تھوڑی سی تکلیف برداشت کر لو۔ اوپر آ جاؤ گے تو تمہیں چیونٹوں سے نجات مل جائے گی۔"

میں اوپر چڑھ رہا تھا، پھسل رہا تھا۔ گڑھوں میں صحیح طور پر پاؤں نہیں جم رہا تھا۔ غالباً چیونٹوں کو بھی معلوم ہو گیا تھا کہ ان کا شکار ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے۔ اس لیے وہ مجھے زیادہ سے زیادہ کھا لینا چاہتے تھے۔ لیکن جس طرح بھی بنا، میں ہانپتا کانپتا اوپر پہنچ گیا۔

قبر کے کنارے ہاتھ میں ٹارچ لیے ہوئے وہ عظیم ہستی کھڑی ہوئی تھی، جس کی خاطر میں نے اتنے پاپڑ بیلے تھے۔

"بیٹھ جاؤ سکندر!" اُس نے ٹارچ بند کرتے ہوئے کہا۔

"رانی!" میں نے اپنے جسم سے چمٹے ہوئے چیونٹوں کو نوچتے ہوئے کہا۔ "میں تمہیں تلاش کرتا رہا ہوں۔"

"کہاں؟" اُس نے میری ہی طرح ہنستے ہوئے پوچھا۔ "قبر میں؟"

"سچ پوچھو تو میں قبر میں تمہاری ہی وجہ سے گیا تھا۔"

میں نے اُسے شروع سے پوری کہانی سنائی۔ "تمہارے سوتیلے باپ سے میں نے تمہارا پتہ حاصل کیا۔ داراب کے فلیٹ پر تم سے تو ملاقات نہیں ہوئی۔ اس کی لاش سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ تم اس وقت آئیں جب پولیس والے مجھے پکڑ چکے تھے۔ تم نے مجھے پہچاننے سے انکار کر دیا حالانکہ تم مجھے پہچان گئی تھیں۔ کیونکہ پولیس والوں کی طرف دیکھ کر تم ایڑھیاں رگڑتی تھیں اور مجھے دیکھ کر ہنستی تھیں اور منہ چڑاتی تھیں۔"

"میں تمہیں چھیڑ رہی تھی۔" اُس نے آہستہ سے کہا۔

"تم چھیڑ رہی تھیں اور مجھ پر قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ اُنہوں نے مجھے حوالات میں بند کر دیا۔ امی جان کا روتے روتے برا حال ہو گیا۔ ابا جی کا کاروبار چوپٹ ہو گیا۔ بھائی جان کے پرچے خراب ہو گئے۔ اور جب میں پولیس کے چنگل سے نکل کر آیا تو سکول سے میرا نام کٹ چکا تھا۔ پھر یہاں قبرستان میں اُس شخص سے ملاقات ہوئی، جو خود کو عامل کہتا تھا۔ اُس نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ تمہیں مجھ سے ملوا دے گا۔ اس کے علاوہ بھی اُس نے مجھ سے کئی دلفریب وعدے کیے اور شرط یہ رکھی کہ مجھے قبر میں اُتر کر لاش کے بال نوچنا ہوں گے۔ میں تیار ہو گیا۔ کیونکہ مجھے تم

سے ہر قیمت پر ملنا تھا۔ لیکن عین اس وقت جب میں قبر میں اُتر رہا تھا، ڈرنا شروع کر دیا اور اپنے ساتھ میں نے اُسے بھی اندر کھینچ لیا۔ مگر وہ ٹارچ باہر پھینک کر قبر سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ باہر آ کر اُس نے دھمکی دی کہ اگر میں نے لاش کے بال نہیں نوچے تو وہ مجھے زندہ دفن کر کے چلا جائے گا۔ میں اُس کی بات ماننے پر مجبور تھا۔ بال نوچ کر اُسے آواز دے رہا تھا کہ وہ مجھے باہر نکال لے، لیکن وہ غائب ہو گیا اور تم میری مدد کے لیے آ گئیں۔"

"غائب نہیں ہوا، اس وقت بھی یہیں موجود ہے۔" اُس نے ٹارچ جلا کر ایک طرف روشنی ڈالی۔ عامل دو قبروں کے بیچ گٹھڑی بنا پڑا تھا۔ سر تن سے جدا تھا اور اُس کے پیٹ کے نیچے دبا ہوا تھا۔ اُس کی یہ حالت دیکھ کر مجھے جھرجھری آ گئی۔

"اسے تم نے قتل کیا ہے؟"

"اس کے کرتوتوں نے اسے یہ دن دکھایا ہے۔" رانی نے کہا۔ "مجھے اپنے قابو میں کرنا چاہتا تھا۔ پہلی بار جب اُس نے مجھے اپنے قابو میں کرنے کے لیے عمل پڑھا تھا تو میں نے اسے ہاتھ اور ناک سے محروم کر کے صاف الفاظ میں بتا دیا تھا کہ اگر دوبارہ اس نے اس قسم کی کوئی حرکت کی تو اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ لیکن باز نہیں آیا اور تمہیں ورغلا کر ایک ایسی عورت کے بال حاصل کرنے کی کوشش کی جو اماوس کی رات میں پیدا ہوئی تھی اور اماوس کی رات میں مری تھی۔ تم جو بال نوچ کر لائے ہو، اگر اس کے ہاتھ لگ جاتے اور صبح ہونے سے پہلے پہلے وہ ان پر عمل کر لیتا تو میں اُس کی لونڈی بن جاتی اور اُس کے اشاروں پر اس طرح ناچتی جس طرح کسی مداری کے ہاتھوں میں کوئی بندریا ناچتی ہے۔"

میں حیرت سے اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ لیکن تاریکی اتنی زیادہ تھی کہ میں اُس کی چمکتی آنکھوں اور سفید دانتوں کے علاوہ کچھ نہیں دیکھ سکتا تھا۔

"تمہیں کیسے پتہ چلا کہ وہ تمہیں دوبارہ اپنے قبضے میں کرنے کے لیے عمل کرنے والا ہے؟"

"تمہاری دنیا میں۔" اُس نے کہا۔ "میں اکیلی نہیں ہوں۔ ایسی کون سی جگہ ہے، جہاں میرے بھائی بند نہ ہوں۔ میرے دوست، میری سہیلیاں ہیں، چاہنے والے ہیں، پجاری ہیں۔ ایسے مندر بھی ہیں جہاں میری پوجا کی جاتی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ دنیا میں جتنے دیوی دیوتا پائے جاتے ہیں، انہوں نے میری کوکھ سے جنم لیا ہے۔ متعدد شہروں میں ایسی معبد گاہیں تیار کی گئی ہیں جہاں مجھے پوجا جاتا ہے۔ ایسی عورتیں اور مرد بڑی تعداد میں میرے معتقد ہیں جن کو سکون کے علاوہ سب کچھ میسر ہے۔ مجھے ناچیز مت سمجھنا، سکندر! میں اتنی بڑی شے ہوں کہ تم صحیح طور پر اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ بہرحال میرے ایک چاہنے والے نے تمہیں اس عامل کے ساتھ دیکھا۔ وہ تمہیں بھی پہچانتا تھا اور اُسے بھی۔ تمہیں اس لیے کہ تم میرے محبوب ہو۔ ہماری دنیا میں یہ کوئی

ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ اور عامل کو اس لیے کہ وہ ایک عرصے سے مجھے اپنے قبضے میں کرنے کی فکر میں ہے۔ میرے دشمن کو میرے محبوب کے ساتھ دیکھ کر اُسے حیرت ہوئی۔ اُس نے فضاؤں میں بسنے والے ایسے مخبر تم دونوں کے پیچھے لگا دیے، جو پل پل کی خبر اُس تک پہنچاتے رہے۔ پھر جونہی اُسے معلوم ہوا کہ مجھے قابو میں کرنے کے گندے خواب دیکھنے والا قبرستان میں داخل ہوا ہے، اُس نے مجھے مطلع کیا۔ انسانی جسم میں ہونے کے باعث میں یہاں فوراً نہیں پہنچ سکی۔ کیونکہ داراب کو قتل کرنے کے جرم میں پولیس جگہ جگہ مجھے تلاش کرتی پھر رہی ہے۔ پھر بھی میں بروقت آ گئی۔ دو منٹ بھی دیر ہو جاتی تو میری زندگی ختم ہو جاتی۔"

"تم نے جو کچھ کہا ہے، اگر وہ درست ہے اور بظاہر ایسی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ تم نے جھوٹ بولا ہو۔ تو کیا عامل کے قبضے میں جانے کے بعد تمہارے بھائی بند، احباب اور عشاق و پرستان تمہیں آزاد کرانے کی کوشش نہیں کرتے؟"

"نہیں۔" اُس نے کہا۔ "رعایا بادشاہ کی تابع ہوتی ہے۔ بادشاہ کسی اور کے تابع ہو جائے تو ساری رعیت از خود اُس کے تابع ہو جاتی ہے۔"

"تم بادشاہ ہو؟"

"بادشاہ نہیں، بہت سے لوگوں کے نزدیک خدا ہوں۔" اُس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ "اور درحقیقت میری حیثیت خدا کی نہیں، خدا گر کی ہے۔ ہر دور اور ہر زمانے میں، میں نے انسانوں ہی میں سے خدا تخلیق کیے ہیں۔"

میری معلومات زیادہ وسیع نہیں تھیں۔ ایک بار کلاس میں اسلامیات کی ٹیچر نے نمرود، شداد اور فرعون جیسے خود ساختہ خداؤں کے بارے میں تفصیل سے بتایا تھا۔ رانی کا دعویٰ تھا کہ وہ خود ساختہ نہیں بلکہ ترشولی ساختہ خدا تھے۔

"جہاں تک مجھے علم ہے۔" میں نے کہا۔ "تمہارے تخلیق کیے ہوئے خداؤں کا بڑا ہی عبرت ناک اور بھیانک انجام ہوا ہے۔"

"تمہارے معاملے میں ایسا نہیں ہوگا۔"

"کیا؟" میں اُچھل پڑا۔ پھر فوراً ہی سنبھل کر بولا۔ "کیا کہہ رہی ہو؟"

"وہی جو تم سن رہے ہو۔ اگلی صدی کے لیے میں نے تمہیں خدا کی حیثیت سے اسی وقت منتخب کر لیا تھا، جب تم ماں کے پیٹ سے باہر آئے تھے۔"

"یہ نہیں ہو سکتا۔"

"خدا بننے سے پہلے ہر ایک نے یہی کہا تھا، لیکن خدا بننے کے بعد ان میں سے کوئی بھی دوبارہ انسان بننے پر تیار نہیں ہوا۔" اُس نے ہنستے ہوئے جواب دیا، پھر موضوع بدلتے ہوئے

بولی۔ "تم نے یہ تو بتا دیا کہ میری تلاش میں تمہیں کیسی کیسی جان لیوا مصیبتیں برداشت کرنا پڑی ہیں۔ مگر یہ نہیں بتایا کہ مجھے کس لیے تلاش کرتے پھر رہے تھے؟"

"اُس کی باری بھی آ جائے گی۔ اتنا اور بتا دو کہ تم لوگوں کو قتل کیوں کرتی ہو؟" میں نے پوچھا۔

اُس نے کہا۔ "کسی ملک کا بادشاہ تھا۔ اور روزانہ ناشتے میں انسان کا تلا ہوا بھیجہ کھاتا تھا۔ کچھ مؤرخوں نے اس بات کو چھپانے کے لیے بہانہ بنایا ہے کہ اُس کے کندھے پر دو سانپ اُگ آئے تھے۔ انہیں انسانی بھیجہ کھلایا جاتا تھا۔ بصورت دیگر وہ اُس کو بھنبھوڑنے لگتے تھے۔ یہ بات غلط ہے۔ دراصل میں نے ہی اُس کو انسانوں کا بھیجہ کھانے پر اُکسایا تھا۔ ایک بار جب اُس کے منہ کو ذائقہ لگ گیا تو وہ آخری دم تک اُس سے پیچھا نہیں چھڑا سکا۔ دو چار بار اس عادت کو چھوڑنے کی کوشش کی تو جان پر بن آئی۔ لب دم ہو گیا۔ مجبور ہو کر پھر انسانوں کے بھیجے کھانے لگا۔

میں نے کہا۔ "یہ واقعہ سن کر میری معلومات میں اضافہ ہوا ہے، جس کے لیے میں تمہارا ممنون ہوں۔ لیکن یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔ میں نے پوچھا تھا کہ تم بے گناہ اور بے قصور لوگوں کو کیوں قتل کرتی ہو؟"

"کیونکہ اُس بادشاہ کی طرح میں بھی انسانوں کے داہنے ہاتھ کھانے کی عادی ہوں۔ وہ انتہا پسند تھا، اس لیے روزانہ ایک بھیجہ کھاتا تھا۔ میں اعتدال پسند ہوں، روزانہ نہیں کھاتی۔ کم سے کم چوبیس گھنٹوں کا وقفہ ضرور کرتی ہوں۔ اور کبھی کبھی تو ایک ایک ہفتہ گزر جاتا ہے اور مجھے داہنے ہاتھ کی چھنگلی تک کھانے کو نہیں ملتی۔"

"کچا ہی چبا جاتی ہو؟"

"میرے ہاتھ میں پہنچتے ہی انسانی بازو پاپڑ بن جاتے ہیں۔ تم نے پاپڑ تو کھائے ہوں گے۔ بس اس طرح مزے لے لے کر ہڈیوں سمیت دو منٹ میں پورا بازو چٹ کر جاتی ہوں۔" اُس نے اطمینان سے جواب دیا۔ "بتاؤ، تمہیں میری تلاش کیوں تھی؟"

"ہماری دنیا میں تمہارا ہزاروں سال سے آنا جانا ہے۔ اس لحاظ سے تو اب تم نے لاکھوں اور کروڑوں انسانوں کے ہاتھ کھا ڈالے ہوں گے؟"

وہ ہنس پڑی۔ "میں نے کبھی حساب نہیں رکھا۔ ویسے دو چار کھرب تو ضرور ہی کھائے ہوں گے۔" اُس نے کہا۔

"فی ہفتہ ایک ہاتھ بھی شمار کیا جائے تو پچھلے ایک سال سے اسی شہر میں اب تک تم نے کم از کم پچاس ہاتھ کھائے ہوں گے۔ لیکن بغیر ہاتھ کی گنی چنی لاشیں ہی ملی ہیں۔ باقی لاشیں کہاں گئیں؟"

"تمہاری یہی ادا تو مجھے پسند ہے۔ ہر بات کی تہہ تک جانا چاہتے ہو۔" وہ بولی۔

پھر اُس نے ٹارچ کا بٹن دبا کر اُس کی روشنی اُس جگہ ڈالی جہاں عامل کی لاش تھی۔ مگر وہاں سے لاش غائب تھی۔ صرف ایک پاؤں کا پنجہ پڑا تھا۔ رانی نے فوراً ٹارچ بجھا دی۔

"ارے، عامل کہاں روپوش ہو گیا؟"

"میرے چاہنے والوں کے پیٹ میں۔" اُس نے کہا۔ "اب تو تمہاری سمجھ میں آ گیا ہو گا کہ جو لاشیں نہیں ملیں، وہ کہاں گئی ہوں گی؟"

"لیکن پھر بھی سمجھ میں نہیں آیا کہ جو لاشیں مل گئیں، وہ وہاں کیوں نہیں گئیں؟"

"وہ پھر ہنسی۔ "اس لیے نہیں گئیں کہ ان تک لوگوں کی رسائی ہو گئی تھی۔"

"گویا میں داراب کے پاس نہ پہنچتا تو اُس کی لاش تمہارے چاہنے والوں کے پیٹ میں جا چکی ہوتی؟"

"اور کسی کو پتہ بھی نہیں چلتا کہ داراب کہاں ہے؟ میں دُکھیاری رو پیٹ کر اُسے صبر کر لیتی مگر تم نے گڑبڑ کر دی۔ نہ صرف گڑبڑ کر دی بلکہ اُنہیں یہ بھی بتا دیا۔" اُس نے میرے لہجے کی نقل کرتے ہوئے کہا۔

"نازیہ، نازیہ نہیں رانی ہے۔ اور رانی، رانی نہیں بلکہ........ بلکہ........"

"بس کرو رانی!" میں نے بلبلاتے ہوئے کہا۔ اچانک مجھے رخسانہ یاد آ گئی تھی۔ ظالم نے اس معصوم کا ہاتھ ہی قطع نہیں کیا تھا بلکہ پاپڑ کی مانند اُسے کھا گئی تھی۔ ابا جی اور دوسرے لوگ اگر اُس تک نہ پہنچتے تو ہمیں اُس کی لاش بھی نہیں ملتی۔ یہ سمجھ لیا جاتا کہ اُسے کوئی بردہ فروش اغواء کر کے لے گیا ہے یا وہ پانی کے ساتھ بہتی ہوئی گٹر میں جا کر کہیں سے کہیں نکل گئی ہے۔"

"کچھ اور پوچھنا ہے؟" اُس نے کہا۔

"نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "اب میں گھر جاؤں گا۔"

"یہ بتائے بغیر کہ تم مجھے کیوں ڈھونڈ رہے تھے؟"

میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ نورین بے وفا تھی۔ اُس نے مجھے دھوکا دیا تھا۔ اور یہ سنتے ہی کہ بھائی جان سے اُس کے رشتے کی بات چل رہی ہے، وہ ان سے محبت کرنے لگی تھی۔ اور جب میں نے پچھلی محبت کا واسطہ دیا تھا تو "ابھی بچے ہو" کہہ کر اُس نے میری توہین کی تھی۔ اسلامیات کی ٹیچر بھی عورت ہونے کی وجہ سے متعصب ثابت ہوئی تھیں۔ انہوں نے نہ صرف نورین کی طرف داری کی تھی بلکہ اُس کے مقابلے میں مجھے انتہائی احمق اور بدھو بھی تصور کر لیا تھا۔ میں جس طرح بھی اپنی بے عزتی کا بدلہ لیتا، بجا تھا۔ مگر جس قسم کے انتقام کے لیے میں سوچتا رہا تھا، اب وہ کسی طور بھی موزوں معلوم نہیں ہو رہا تھا۔ نورین جان سے جاتی اور اس سے جو محبت مجھے ملتی وہ نورین کی نہیں بلکہ اس ہزاروں سال کی بوڑھی کی ہوتی، جو انسانی ہاتھوں کو پاپڑ کے طور

پر کھانے کی عادی تھی۔

رانی خود یہ تسلیم کر چکی تھی کہ ایک ہفتے سے زیادہ کسی انسان کی جان لینے اور اُس کا ہاتھ ہڑپ کیے بغیر نہیں رہ سکتی۔ نورین جیسی بھی تھی، اچھی یا بری، ایک خون آشام بھیڑیا یا خون آشام چمگادڑ تو نہیں تھی۔ رانی اُس کے جسم پر قابض ہو جاتی تو اپنی طلب بجھانے کے لیے گھر ہی کے لوگوں پر ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیتی۔ ممکن ہے اُس کا سب سے پہلا شکار بھائی جان کو بننا پڑتا جن سے ابا جی اور اماں جی ہی کی نہیں، میری بھی بڑی بڑی اُمیدیں وابستہ تھیں۔ ایسا کون سا بداطوار بھائی ہو گا، جو اپنے بڑے بھائی کو ڈاکٹر کے روپ میں دیکھنے کے بجائے خاک و خون میں آلودہ دست بریدہ لاش کی صورت میں دیکھنا پسند کرے گا؟

"تم نے بتایا نہیں سکندر؟" اُس نے میرے کندھے کو ہلاتے ہوئے کہا۔ "مجھے کیوں تلاش کر رہے تھے؟"

میں نے گہری سانس لی۔ "تم تو جانتی ہو رانی! ہم غریب لوگ ہیں۔ نہ جانے کس طرح سفید پوشی کا بھرم باقی رکھے ہوئے ہیں۔ گھر سے مجھے جیب خرچ کے لیے جو رقم ملتی ہے، وہ اتنی ناکافی ہوتی ہے کہ دانتوں سے دبا کر خرچ کرتا ہوں، تب بھی دس دن سے پہلے ہی پہلے ختم ہو جاتی ہے۔ میں تم سے مل کر ایک چھوٹی سی درخواست کرنا چاہتا تھا۔"

وہ یکلخت بالکل سنجیدہ ہو گئی۔

"مجھے اپنے خوابوں کی تکمیل ہوتی نظر آ رہی ہے۔" اُس نے کہا۔ "کیا میں یہ سمجھ لوں کہ تم اپنے آپ کو بیچنا چاہتے ہو؟"

"جو چاہو سمجھ لو۔ مجھے بہرکیف کچھ روپوں کی روزانہ ضرورت ہے۔ یا پھر دس لاکھ اکٹھے دے دو۔"

"دس لاکھ نہیں۔ دس لاکھ تو کم ہیں۔ پچیس لاکھ یکمشت دے دوں تو کیسا ہے؟"

میرے جسم پر جاڑا چڑھنے لگا۔ میں نے تو نورین کے جسم کو اُس کی ناپاک روح سے بچانے کے لیے بہانہ بنایا تھا۔ یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ مجھے پلک جھپکتے میں ایک بڑے خزانے کا مالک بنانے پر آمادہ ہو جائے گی۔"

پچیس لاکھ روپے میرے ظرف سے بہت زیادہ ہیں، رانی!" میں نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ "کیا کروں گا اتنے ڈھیر سارے روپے لے کر؟"

"اپنے ابا اماں کو دے دینا۔"

"وہ پوچھیں گے، اتنی کثیر رقم تمہارے پاس کہاں سے آئی؟ میں پہلے ہی اماں کے جمع کیے ہوئے روپوں میں سے کچھ رقم چرا کر اُن کی نظروں میں چور ٹھہر چکا ہوں۔"

"اس کی تو بہت ہی آسان ترکیب ہے۔ کہہ دینا کہ خواب میں کسی بتانے والے نے بتایا ہے کہ تمہارے کمرے کے فرش کے نیچے خزانہ چھپا ہوا ہے۔ تمہارے کہنے پر جب وہ فرش کی کھدائی کریں گے تو ایک مٹکے میں رکھی ہوئی تمہاری مطلوبہ رقم انہیں مل جائے گی۔"

ترکیب تو واقعی بہت آسان تھی۔ خدا کی دین بھی خوب ہے۔ موسیٰ علیہ السلام آگ لینے گئے اور پیمبری لے آئے۔ میں قبر میں پڑی ہوئی لاش کے مٹھی بھر بال نوچنے گیا اور بن گیا لکھ پتی۔

"شکریہ رانی!" میں نے اُس قبر سے اُٹھتے ہوئے کہا جس سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ "مٹکے میں بھر کر پچیس لاکھ روپے کمرے کے فرش کے نیچے ذرا جلدی پہنچا دینا۔ میں موقع محل دیکھ کر آج ہی ابا جی اور امی جان سے فرش کے نیچے چھپے ہوئے خزانے کا ذکر کروں گا۔ یہ بتاؤ، اب تم سے کب اور کہاں ملاقات ہوگی؟"

"اگر میں یہ کہوں کہ اگلے چار سال تک ہماری ملاقات نہیں ہو سکے گی تو تمہیں رنج ہوگا؟"

"رنج؟ میں تو خوشی سے پھولا نہیں سماؤں گا۔ بلکہ اگر یہ کہو کہ ساری زندگی ملاقات نہیں ہو سکے گی تو مجھ پر شادیٔ مرگ کی کیفیت طاری ہو جائے گی۔" میں نے دل ہی دل میں کہا پھر اُس سے مخاطب ہو کر بولا۔ "کیوں، چار سال تک ملاقات کیوں نہیں ہو سکے گی؟ میرا خیال ہے کہ میں تمہیں کچھ کچھ پسند کرنے لگا ہوں۔ تم نے مجھے قبر میں زندہ دفن ہونے سے بچایا ہے اور اتنی بڑی رقم دینے کا وعدہ کیا ہے، جو ہم ساری زندگی کوشش کریں، تب بھی جمع نہیں کر سکیں گے۔"

"کچھ اور بڑے ہوتے تو کچھ کچھ نہیں، بہت زیادہ پسند کرنے لگتے۔" اُس نے ایک طویل انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔ "یہ کمبخت جسم ہی کچھ ایسا ہے۔" پھر قدرے متانت اختیار کرتی ہوئی بولی۔ "یہاں کی پولیس مجھے ڈھونڈ رہی ہے۔ میں چاہوں تو موجودہ جسم سے چھٹکارا پا کر ان کی نظروں سے محفوظ ہو سکتی ہوں۔ لیکن یہ جسم کچھ اتنا بھا گیا ہے کہ فی الحال اس کو اپنے پاس ہی رکھنا چاہتی ہوں۔ میں ہر اُس ملک میں جاؤں گی جہاں میری پذیرائی اور قدر کی جائے گی۔ اور اُس وقت تک واپس نہیں آؤں گی، جب تک پولیس مجھے ڈھونڈتی پھر رہی ہے۔ یا میں اس سے زیادہ پُرکشش جسم حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو جاؤں گی۔ میں سمجھتی ہوں کہ اس کام کے لیے چار سال کا عرصہ کافی ہے۔ مگر تھوڑی سی دیر سویر بھی ہو سکتی ہے۔"

"ان چار سالوں میں اگر میں تم سے ملنا چاہوں تو؟" میں نے یونہی اُس کا دل رکھنے کے لیے پوچھ لیا ورنہ حقیقت یہ تھی کہ میں زندگی بھر اُس سے ملنے کی خواہش نہیں کر سکتا تھا۔

"تو صبر سے کام لینا۔" اُس نے ہنس کر کہا اور اگلے ہی لمحے سنجیدہ ہو گئی۔ "میں چاہتی ہوں کہ میری وجہ سے تم جس بے سکونی میں مبتلا ہو گئے ہو، اس سے تمہیں نجات مل جائے۔ سکون سے تعلیم حاصل کر لو اور اتنے بڑے ہو جاؤ کہ محبت کا صحیح مفہوم سمجھ سکو۔ میرے جانے کا ایک سبب یہ

بھی ہے کہ اس وقت واپس آؤں، جب مستقبل کا خدا باشعور اور باعقل ہو چکا ہو۔"

"بکواس کرتی ہو۔" میں نے دل ہی دل میں کہا۔ کیونکہ میں اس وقت بھی باعقل، باشعور تھا اور اچھی طرح جانتا تھا کہ خدا تو ایک ہی ہے جو زمان و مکان سے بے نیاز ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ ماضی میں بھی اُس کی خدائی تھی، حال میں بھی ہے اور مستقبل میں بھی رہے گی۔ اس قادر مطلق ذات کے علاوہ خدائی کے جتنے بھی دعویدار تھے یا آئندہ دعویٰ کرنے والے تھے، باطل اور فانی تھے۔

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ میں نے لاش کے نوچے ہوئے بال جو سوکھ کر لکڑی کی تیلیوں کی طرح سخت ہو گئے تھے، اُسی قبر میں جہاں سے انہیں حاصل کیا تھا، واپس پھینکا، اسکول کی کتابیں، جو رخسانہ کی قبر کے پاس بکھری پڑی تھیں، اُٹھا کر بغل میں دبائیں اور قبرستان سے باہر جانے کے لیے قدم بڑھا دیئے۔

رانی باہر تک مجھے چھوڑنے آئی۔ باہر پہنچ کر جب وہ دوبارہ قبرستان میں واپس جانے لگی تو نہ جانے کیوں میں بھول گیا کہ وہ کون ہے۔ اُسے عام سی، بے وقوف سی لڑکی سمجھ کر پوچھ بیٹھا۔

''قبرستان میں تمہیں ڈر نہیں لگے گا رانی؟''

اُس نے غور سے میری طرف دیکھا۔ باہر سڑک پر اسٹریٹ لائٹس روشن تھیں، جن کی ٹمٹماتی ہوئی روشنیوں میں اُس کی بڑی بڑی آنکھیں چمک رہی تھیں اور ان چمکتی ہوئی آنکھوں میں سرخ ڈورے دوڑ رہے تھے۔ پھر وہ مسکرائی اور بڑے ناز سے قبرستان کی طرف اشارہ کرتی ہوئی بولی۔

''یہاں کے رہنے والے مجھ سے ڈرتے ہیں۔''

اُن سایوں نے جو نظر نہیں آتے اور اُن کی سرسراہٹوں نے جو سنائی نہیں دیتیں، مجھے میرے گھر کے دروازے تک پہنچایا۔ راستے میں ایک چورنگی پر کھڑے ہوئے چند کانسٹیبلوں نے راستہ روک کر پوچھا۔

''اتنی رات گئے کہاں سے آ رہے ہو؟''

''دوست کے ہاں پڑھنے گیا تھا۔'' میں نے اُنہیں کتابیں دکھاتے ہوئے جواب دیا۔

''اتنی رات تک مت پڑھا کرو۔ ورنہ اندھے ہو جاؤ گے۔'' اُن میں سے ایک نے کہا اور جانے کی اجازت دے دی۔ اگر وہ دوست کا پتہ پوچھ لیتے تو کوئی بہانہ نہ بنا پاتا۔ اس علاقے میں کوئی میرا واقف کار نہیں تھا۔

گھر میں روشنی ہو رہی تھی۔ میں جیسے ہی اندر داخل ہوا، کسی نے میری گردن میں ہاتھ ڈالا اور پوری قوت سے میری پیٹھ پر گھونسا رسید کیا۔ میری آنکھوں کے سامنے ستارے رقص کرنے لگے۔

''کہاں گئے تھے مردود؟'' آواز ابا جی کی تھی۔ وہ بہت زیادہ غصے میں تھے۔ بھائی جان درمیان میں آ کر نہ بچاتے تو ابا جان لازمی طور پر مار مار کر میرا کچومر نکال دیتے۔

''امی جان کی حالت بہت خراب ہے۔'' بھائی جان نے کہا۔ ''کئی ڈاکٹر آ کر نا اُمیدی کا اظہار کر گئے ہیں۔ اُن کے خیال میں خدانہ کرے، امی جان صبح نہیں کر سکیں گی۔''

وقت کی نزاکت کے سبب اُنہوں نے مجھ سے اتنی رات تک غائب رہنے کا سبب دریافت نہیں کیا۔

میں کتابیں ایک طرف پھینک کر امی جان کے کمرے کی طرف بھاگا۔ اُن کی آنکھیں کھلی تھیں لیکن وہ کسی کو دیکھ نہیں سکتی تھیں۔ ہونٹ جنبش کر رہے تھے، لیکن اُن سے اتنی مدھم آواز نکل رہی تھی کہ اسے سننا تو آسان تھا مگر سمجھنا مشکل تھا۔ میں نے اُن کے ہونٹوں سے کان لگائے تو وہ ٹوٹی ہوئی آواز میں کہہ رہی تھیں۔

''میرے سکندر کی حفاظت فرما، اے میرے مالک! میں نے اپنے سکندر کو تیری پناہ میں دے دیا۔''

''میں آ گیا ہوں، امی جان!'' میں نے چیختے ہوئے کہا۔ اُن کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تو میں نے اُنہیں جھنجھوڑ ڈالا۔ ''میری طرف دیکھئے امی جان! میں گھر آ گیا ہوں۔''

پشت کی جانب سے ابو کی آواز آئی۔ ''تمہاری امی مر چکی ہیں۔''

''خدانہ کرے۔'' فضیلہ کی امی نے کہا۔

اُن کی آواز سن کر مجھے اُن کی موجودگی کا احساس ہوا۔ وہ امی جان کے سرہانے بیٹھی تھیں۔ میں نے اُن کی گود میں سر رکھ دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ ''کیا ہو گیا امی جان کو؟''

وہ میرے سر پر ہاتھ پھیرنے لگیں۔ ''یہ رونے کا نہیں، دُعا کا وقت ہے۔''

امی جان کو پہلے صرف رخسانہ نظر آیا کرتی تھی۔ اُس رات وہ اُن سب عزیزوں کو دیکھ رہی تھیں، جنہیں مرے ہوئے عرصہ ہو گیا تھا۔ کسی کو سلام کرتی تھیں، کسی کو دعائیں دیتی تھیں، کسی سے خیریت دریافت کرتی تھیں اور کسی سے منہ بسور کر کہتی تھیں۔ ''میرا سکندر، رخسانہ کو ڈھونڈنے نجانے کہاں چلا گیا ہے'' مگر وہ اپنے گرد و پیش سے بالکل بے خبر تھیں۔

میری طبیعت کچھ سنبھلی اور آنسو بہنا بند ہوئے تو میں نے فضیلہ کی امی سے پوچھا۔ ''کب سے یہ حالت ہے؟''

''صبح تک اچھی بھلی تھیں۔ معمول کا کام کرتی رہیں۔ دوپہر سے پہلے فضیلہ گھر آئی تو اُس سے یہ معلوم کر کے اسکول سے جلدی چھٹی ہو گئی ہے، کچھ پریشان سی نظر آنے لگیں۔ فضیلہ سے ہی اورین کے گھر فون کرایا۔ وہاں سے معلوم ہوا کہ تم اُن کے ہاں نہیں ہو۔ میں نے سمجھایا، لڑکا ہے۔ دوسرے لڑکوں کے ساتھ کہیں کھیل کود میں لگ گیا ہو گا۔ اسی اثناء میں تمہارا کوئی ہم جماعت آ گیا۔ انہیں یہ اطلاع دے گیا کہ اسکول سے تمہارا نام کاٹ دیا گیا ہے اور یہ کہ تم تو صبح ہی سے اسکول سے گھر چلے آئے تھے۔ اس خبر سے اُن کی پریشانی میں اضافہ ہو گیا۔ پھر تمہارا فون آیا جسے فضیلہ نے وصول کیا۔ وہ بھاگی ہوئی انہیں بہلانے آئی تو اُس نے انہیں باورچی خانے کی دہلیز پر

بالکل اسی حالت میں پڑا پایا، جس میں تم انہیں دیکھ رہے ہو۔ اب تک تین مختلف ڈاکٹروں سے ان کا معائنہ کرایا جا چکا ہے۔ سب نا اُمیدی کا اظہار کر چکے ہیں۔ ایک ڈاکٹر تو اتنا شریف تھا کہ اُس نے یہاں آنے جانے کی فیس بھی نہیں لی۔"

بھائی جان بھاگے بھاگے پھر رہے تھے۔ اُن میڈیکل اسٹورز سے، جو رات بھر کھلے رہتے تھے، دوائیں لے کر آ رہے تھے، اپنے ہاتھوں سے امی جان کو دوائیں پلا رہے تھے۔ فضیلہ کے گھر جا کر عزیزوں کو فون کر رہے تھے۔ ابا جان کی حالت نیم مُردوں جیسی تھی۔ ہاتھ میں تسبیح لیے موڑھے پر بیٹھے تھے۔ نہ ہونٹ ہل رہے تھے، نہ تسبیح کے دانے گر رہے تھے۔ کبھی کبھی سر اُٹھا کر امی جان کی طرف دیکھ لیتے تھے، پھر نفی میں سر ہلاتے ہوئے موڑھے سے پشت لگا لیتے تھے۔

اذانِ فجر کے وقت امی جان کی حالت کچھ سنبھل گئی۔ اُن کی عادت تھی کہ اذان کی آواز پر دوپٹہ سر پر لے لیتی تھیں۔ اذان کی آواز آئی اور اُن کے ہاتھ جسم پر پڑے ہوئے دوپٹے کو اپنی گرفت میں نہیں لے سکے تو اُنہوں نے ہاتھوں ہی سے اپنا سر ڈھانپ لیا۔ اذان کے بعد اُنہوں نے اُٹھنے کی بھی کوشش کی، گویا نماز کے لیے اُٹھنا چاہتی ہوں۔ پھر اُن کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے اور اُن کی گردن ایک طرف لڑھک گئی۔

فضیلہ کی امی نے اُن کی گردن سیدھی کی، ناک کے آگے ہاتھ کی پشت رکھ کے سانس کی آمد و رفت کا اندازہ لگانے کی کوشش کی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو نبض دیکھی، پھر امی جان کے سینے سے کان لگایا اور آخر میں انا للہ پڑھتے ہوئے اُن کے جسم پر پائنتی کی چادر ڈال دی۔

امی جان چلی گئیں۔ اُن کے جانے کے بعد معلوم ہوا کہ کتنا بڑا استون تھا جو گر گیا تھا۔ کتنا بڑا سہارا تھا، جو موت کے بے رحم ہاتھوں نے مجھ سے چھین لیا تھا۔ ہم نے اُنہیں رخسانہ کی بغل میں لٹا دیا، قبر پر بلاک لگا دیئے، مٹی ڈال دی، فاتحہ پڑھی اور گھر واپس آ گئے۔

کئی روز تک مجھ پر سکتہ طاری رہا۔ میں نے امی کو جان کو قتل کر دیا تھا۔ اُن کی محبت کے جواب میں، میں نے ہمیشہ اُنہیں صدمے ہی دیئے تھے۔ سخت جان تھیں کہ صدموں پر صدمے برداشت کیے جا رہی تھیں، پھر بھی میری محبت کا دم بھر رہی تھیں۔ نزع کی کیفیت طاری تھی، ڈاکٹر جواب دے چکے تھے، اس عالم میں بھی انہوں نے مجھے فراموش نہیں کیا تھا۔ مرنے سے کچھ دیر پہلے تک "میرے اللہ! میرے سکندر کو اپنی حفاظت اور پناہ میں رکھنا" کہتی رہیں۔

بھائی جان نے نجانے کس طرح باقی پرچوں کا امتحان دیا۔ پہلے کی تیاری تھی، جو اس وقت کام آئی۔ میرا نام ایک ایسے دینی مدرسے میں لکھوا دیا گیا، جہاں دین کے ساتھ دنیا کی تعلیم بھی دی جاتی تھی اور وہاں کے طلباء باقاعدہ سیکنڈری اور ہائر سیکنڈری ایجوکیشن بورڈ کے امتحانات میں شریک ہوتے تھے۔ اقامتی مدرسہ تھا۔ طلباء کو وہیں رہنا پڑتا تھا۔ صرف خاص خاص موقعوں پر

ایک یا دو دن کے لیے گھر جانے کی اجازت ملتی۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ مدرسے کی برکات تھیں یا امی جان دنیا سے جاتے وقت ساری بلاؤں کو بین بٹور کر اپنے ساتھ لے گئی تھیں، میری سابقہ کیفیات اچانک دور ہو گئی تھیں۔ نظر نہ آنے والے سائے اور سنائی نہ دینے والی آوازیں ایسی غائب ہوئی تھیں گویا ان کا کوئی وجود ہی نہ ہو۔ میں اُن کو محسوس کرنے کا عادی سا ہو گیا تھا۔ چند ہفتوں تک بڑا عجیب سا لگا۔ سناٹا پھیلتا، بجلی جاتی یا تنہا ہوتا تو ان کیفیتوں کا انتظار کرنے لگتا۔ جب کسی قسم کا احساس نہ ہوتا تو گھٹن سی طاری ہونے لگتی۔ پھر گھٹن بھی آہستہ آہستہ اختتام کو پہنچی۔ اس کے برعکس سکون اور آرام محسوس ہونے لگا۔

مدرسے میں آنے کے بعد میں نے کئی ماہ تک گھر کا رُخ نہیں کیا۔ کئی کئی روز کی چھٹیاں بھی آئیں، ساتھی طلباء اپنے اپنے گھروں کو گئے اور طرح طرح کے حلوؤں، مٹھائیوں، اچاروں اور خشک میوؤں سے بھرے مرتبان لے کر ہنستے ہوئے واپس آئے۔ میں جاتا تو کس کے پاس جاتا؟ ابو جان زبان سے کچھ نہیں کہتے تھے لیکن اُن کی آنکھوں اور اُن کے لہجے سے صاف محسوس ہوتا تھا کہ اُنہیں مجھ سے پہلے جیسی محبت نہیں رہی ہے۔

بھائی جان امتحان دے کر فارغ ہوئے تو خود ہی ملنے کے لیے مدرسے میں آئے تھے اور بتایا تھا کہ عارضی طور پر انہوں نے ایک میڈیکل اسٹور پر ملازمت کر لی ہے۔ اُن کی اے ون لانے کی ساری اُمیدیں خاک میں مل گئی تھیں۔ کہتے تھے کہ بی گریڈ آ گیا تو سمجھوں گا، میری محنت اکارت گئی۔ میں نے پوچھا۔

"بھابی کا کیا حال ہے؟"

"کس کا؟"

"نورین بھابی کا۔"

حقیقت یہ ہے کہ میں نے نورین کو بھابی کی حیثیت سے قبول کر لیا تھا اور کبھی کبھی تو تعجب کیا کرتا تھا کہ میرا دماغ کیوں خراب ہو گیا تھا۔

بھائی جان ہنس پڑے۔ "رات دن یہی دعا کرتی رہتی ہے کہ میں اے ون لے آؤں۔" اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے وہ چلے گئے۔

سالانہ امتحان سے قبل ایک جمعہ کو صبح سے شام تک کے لیے گھر گیا۔ گھر کی ویرانی دیکھ کر دل بھر آیا۔ در و دیوار سے حسرت ٹپک رہی تھی۔

مدرسے سے تو یہی سوچ کر گھر گیا تھا کہ ایک رات بھی گھر پر ہی گزاروں گا، لیکن وہاں کی اس لینے والی خاموشی اور اُداسی کو دیکھ کر ایک منٹ بھی ٹھہرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔

میرے کمرے کے فرش اور فرنیچر پر کئی انچ گرد جم رہی تھی، بستر لگا ہوا تھا، اس کی چادر کو

جھاڑا تو گرد میں نہا گیا۔ جیسے تیسے اُسے صاف کیا، پھر پلنگ پر لیٹ گیا اور اُن دنوں کو یاد کرنے لگا جب رخسانہ اور امی جان ہم سے رُوٹھ کر نہیں گئی تھیں۔ کیسی چہل پہل رہا کرتی تھی ہمارے گھر میں۔ کتنی رونق تھی۔ گھر کا ایک ایک گوشہ کتنا پیارا معلوم ہوتا تھا۔

خیالات کی رو کو فضیلہ کی آواز نے توڑ دیا۔ وہ میرے کمرے کے دروازے پر کھڑی مجھے آواز دے رہی تھی۔ خوشی کے باعث اُس کا پورا چہرہ تمتما رہا تھا۔

''اتنی خاموشی سے آگئے بھائی جی؟ ابا جی نہ بتاتے تو ہمیں معلوم بھی نہ ہوتا کہ آپ گھر آئے ہوئے ہیں۔''

''دروازے پر کیوں کھڑی ہو؟ اندر آ جاؤ'' میں نے کہا۔ ''اب ایک کرسی کو جھاڑ دو اور اس پر بیٹھ جاؤ۔''

وہ اندر آ گئی تھی اور اپنی بڑی بڑی معصوم آنکھوں سے حیرت زدہ انداز میں وہاں کے گرد و غبار کو دیکھ رہی تھی۔

''بھائی جی!'' وہ بولی۔ ''کرسی جھاڑنے کے بجائے کیوں نہ آپ کے پورے کمرے کو جھاڑو لگا دوں اور صاف کر دوں؟''

''کس لیے؟ میں تو نماز جمعہ کے بعد مدرسے واپس چلا جاؤں گا۔''

''ٹھہریں گے نہیں؟'' اس کا منہ لٹک گیا۔

''نہیں......اگلی مرتبہ آؤں گا تو دو، تین دن ٹھہرنے کی اجازت لے کر آؤں گا۔ تمہاری جیومیٹری کا کیا حال ہے؟''

اُس کا چہرہ گلاب کی طرح کھل گیا۔ ''جیومیٹری میں تو اب مجھے سو میں سے سو نمبر ملتے ہیں۔ میں ابھی آپ کو اپنی کاپی لا کر دکھاؤں گی تو آپ بھی خوش ہو جائیں گے۔''

''بیٹھ جاؤ فضیلہ!''

اُس نے ایک بار پھر اُجڑے ہوئے کمرے پر نظر دوڑائی، کرسی کی طرف بڑھی اور اُسے جھاڑ کر کھانسنے اور ہنسنے لگی۔

''بھائی جی!'' اُس نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ روز کے روز گھر آ جایا کریں اور صبح ہوتے ہی اپنے اسکول چلے جایا کریں؟''

''نہیں، یہ ممکن نہیں ہے۔ ہمارا مدرسہ اقامتی ہے۔ طالب علموں کے لیے دن رات وہاں رہنا ضروری ہے۔''

''کیوں؟ کیا وہاں رات دن پڑھائی ہوتی ہے؟''

''پڑھائی تو تمہارے اسکول جتنی ہی ہوتی ہے، البتہ پانچوں وقت کی نمازوں میں حاضری

جاتی ہے اور مغرب کے بعد درسِ قرآن میں شرکت کرنا پڑتی ہے۔''

''جمعے کو تو چھٹی ہوتی ہوگی۔ جمعہ ہی کو آ جایا کریں۔''

''آ تو گیا۔''

''میں ہر جمعے کی بات کر رہی ہوں۔''

''ہر جمعے کا وعدہ تو نہیں کرتا۔ ہاں کبھی کبھی آ جایا کروں گا۔''

''چلیے یوں ہی سہی۔'' اُس نے کہا۔ ''اب میں جاؤں؟''

''مجھ سے پوچھ کر آئی تھیں؟''

وہ ہنسنے لگی۔ ''آپ کا نام سن کر بھاگی چلی آئی تھی۔ ویسے بھائی جی! جب سے آپ گئے ہیں، ہر طرف سنسانی سی پھیل گئی ہے۔''

میں اُسے کیا بتاتا کہ سنسانی میرے جانے سے نہیں، امی جان کے جانے سے پھیلی ہے۔

''اچھا بھائی جی......!'' وہ کھڑی ہوتی ہوئی بولی۔ ''اب جمعے کی نماز کے بعد آپ سے ملاقات ہوگی۔''

فضیلہ کے جانے کے بعد میں نے غسل کیا۔ اسی دوران بھائی جان بھی آ گئے۔ اُن کا میڈیکل اسٹور جمعے کے دن بھی کھلتا تھا۔ جمعہ کی نماز کے لیے صرف تین گھنٹے کی چھٹی ہوتی تھی۔ اذان کے بعد ہم تینوں باپ بیٹا ایک ساتھ نماز پڑھنے کے لیے گئے۔ مسجد جاتے ہوئے میدان پار کر کے اُس میں سے گزرا، جہاں جھونپڑیاں ہوا کرتی تھیں، اب وہاں زور و شور سے تعمیر کا کام ہو رہا تھا۔ بنیادیں رکھ دی گئی تھیں اور کئی فٹ اونچی دیواروں کا چاروں طرف جال سا پھیل گیا تھا۔ اسے دیکھ کر رانی یاد آ گئی۔ رانی یاد آئی تو یہ بھی یاد آیا کہ رانی، رانی نہیں، ترشولی تھی۔ اور ترشولی نے، جو ترشولی نہیں تھی، رانی بن چکی تھی، قبرستان کی اس تاریک رات میں مجھے زندہ دفن ہونے سے بچایا تھا۔ مگر امی جان کی زندگی کی وہ آخری رات ثابت ہوئی تھی۔ مجھے پچیس لاکھ روپے دینے کا وعدہ کیا گیا تھا اور کہا تھا کہ وہ روپے میرے کمرے میں فرش کے نیچے ایک مٹکے میں رکھ دیے جائیں گے۔

میرے لیے نماز پڑھنا دوبھر ہو گیا۔ جیسے تیسے نماز پڑھ کر ہم لوگ مسجد سے نکلے تو میں نے ابو جان اور بھائی جان سے اُس خزانے کا ذکر کیا، جو میرے کمرے میں مدفون تھا۔

ابو چلتے چلتے رک گئے، آنکھیں نکال کر منہ سے جھاگ چھوڑتے ہوئے بولے۔ ''اُس منحوس نے ابھی تمہارا پیچھا نہیں چھوڑا؟ آخر وہ چاہتی کیا ہے؟ کتنا ستائے گی ہمیں؟......اب تو ہمارے پاس کچھ بھی نہیں رہا۔ بڑھاپے کے دو معصوم سہارے ہیں، کیا اُسے اُس وقت سکون ملے گا، جب وہ بیوی اور بیٹی کی طرح ان دونوں کو بھی مجھ سے چھین لے گی؟''

"یہ بات نہیں ہے ابو!" انہوں نے دوبارہ گھر کی طرف قدم بڑھانا شروع کیے تو میں نے دبے دبے الفاظ میں کہا۔ "دراصل میرے خواب میں کئی روز سے ایک بزرگ آ رہے ہیں اور جب بھی آتے ہیں، مجھ سے ایک ہی بات کہتے ہیں کہ تمہارے کمرے کے فرش کے نیچے پچیس لاکھ روپے دفن ہیں۔"

"اُس مکار اور جھوٹی نے تمہیں بھی مکار اور جھوٹا بنا دیا ہے۔ دینی مدرسے میں پڑھتے ہو اور تمہیں یہ بھی نہیں معلوم کہ جھوٹا خواب بیان کرنا کتنا بڑا گناہ ہے۔" انہوں نے کہا، پھر اُن کا لہجہ مدھم ہو گیا۔ پیار سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگے۔

"وہ کمینی تمہارے ہاتھ پر چاند اور سورج لا کر رکھ دے، پھر بھی اُس کی باتوں میں نہ آنا۔ ہم لوگ جہاں رہ رہے ہیں، کسی زمانے میں یہاں جنگل ہوا کرتے تھے۔ پہلے کبھی کوئی آبادی نہیں تھی۔ جس زمین پر ہمارا گھر ہے، وہ پہلی بار بنایا گیا ہے۔ مدفون خزانے ان قدیم گھروں میں ملتے ہیں، جو سینکڑوں سال پرانے ہوں۔ قدیم زمانے میں لوگ بینکوں کا انتظام نہ ہونے کے باعث اپنی جمع شدہ رقم زمین میں دفن کر دیا کرتے تھے اور اُن میں سے کچھ ایسے ہوتے تھے، جو کسی کو اس رقم کے بارے میں بتائے بغیر مر جاتے تھے۔ برسوں بعد جب تعمیر یا مرمت کے سلسلے میں کھدائی کی جاتی تو وہاں سے رقم برآمد ہو جاتی تھی۔ اس گھر کے فرش سے جسے پہلی بار ہم نے خود بنایا ہے، خود سوچو میرے بیٹے! ہمیں کیا ملے گا؟"

ابو ٹھیک کہہ رہے تھے، مگر جھوٹ میں نے بھی نہیں کہا تھا۔ رانی مجھے خدا بنانا چاہتی تھی۔ بالکل ویسا ہی خدا بنانا چاہتی تھی، جیسا اُس نے فرعون کو بنایا تھا۔ اور نمرود اور شداد کو بنایا تھا۔ اور اسی لیے میری بہترین پرورش کے لیے اُس نے میرے کمرے کے نیچے مٹکے میں دبا کر پچیس لاکھ روپے کی خطیر رقم رکھ دی تھی۔ میں خدا بننے کے لیے تیار نہیں تھا، لیکن اس رقم کو بھی ٹھکرانا نہیں چاہتا تھا۔ اگر وہ دھوکا دے رہی تھی تو اس بار اُس کا دھوکا کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔

ابو جی کو یہ بات سمجھانا مشکل تھی، اس لیے خاموش ہو گیا۔ وہ قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے تھے۔ بیٹوں سے تو محبت تھی، لیکن اُن کے شاندار مستقبل سے کوئی غرض نہیں تھی۔ اور یہ بات کہ میری تمام تر غلطیوں، لغزشوں اور کوتاہیوں کے باوجود وہ مجھ سے محبت کرتے تھے۔ یہ بات مجھے مسجد سے نکلتے وقت ہی معلوم ہوئی تھی۔ اس سے پیشتر تو اُن کے اندازِ گفتگو سے یہی سمجھتا تھا کہ امی جان کی موت کا ذمہ دار وہ مجھے گردانتے ہیں۔

کھانے کا انتظام فضیلہ کے گھر والوں نے کیا تھا۔ بھائی جان نے بتایا کہ امی جان کی موت کے کچھ ہی دنوں بعد ہر جمعہ کو پابندی سے فضیلہ کے ہاں سے کھانا آنے لگا تھا۔ کیونکہ ہفتے میں وہی ایک دن ایسا ہوتا تھا، جب بھائی جان اور ابو جان گھر پر اکٹھے ہوتے تھے۔ ورنہ عام دنوں

میں وہ دونوں اپنے اپنے کام کی جگہ پر بازار کا کھانا کھاتے تھے۔ شروع میں ابو جان نے تھوڑا سا احتجاج کیا، فضیلہ کے ابو سے خاصا جھگڑا بھی ہوا۔ لیکن بعد میں اُنھیں ہار ماننا پڑی۔

ہم لوگ جیسا کہ میں پہلے بھی بتا چکا ہوں، امی جان کی زندگی میں جمعہ کے بعد اچار، چٹنی اور لہسن کے ساتھ کھچڑی کھانے کے عادی تھے، فضیلہ کی امی ہم لوگوں کی عادت سے واقف تھیں اس لیے ہمیشہ جمعہ کی دوپہر کو کھچڑی ہی تیار کیا کرتی تھیں۔ اُس روز کھچڑی اور اس کے لوازمات کے ساتھ کھیر کا اضافہ ہو گیا، جو یقیناً میری وجہ سے کیا گیا تھا۔ میزبانی کے فرائض فضیلہ اور اُس کی خانساماں نے سرانجام دیئے۔ ہمارے ساتھ کھانے میں فضیلہ کے ابو بھی شریک تھے۔

"بھائی جان!" فضیلہ نے کھانا کھلاتے ہوئے کہا۔ "کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ رات یہیں گزاریں اور صبح اپنے سکول چلے جائیں؟"

ہونا چاہیے تھا۔ میں تو مدرسے میں کہہ آیا تھا کہ اگلی صبح کو آؤں گا۔

"کیوں......؟" میں نے پوچھا۔ "رات کو میرے ٹھہرنے سے تمہیں کیا فائدہ ہو گا؟"

"فائدہ مجھے تو نہیں، آپ کو ہو گا۔ امی بریانی تیار کر رہی ہیں۔ اور جو بریانی امی خود پکاتی ہیں، اسے کھانے والے اُنگلیاں چاٹتے رہ جاتے ہیں۔"

یہ بات مجھے معلوم تھی۔ امی جان کے بعد اگر کسی کو ذائقے دار کھانا پکانے کا فن آتا تھا تو وہ فضیلہ کی امی تھیں۔ لیکن وہ کبھی کبھار ہی پکاتی تھیں۔ امی جان کی طرح ہر وقت چولہے کے آگے نہیں بیٹھی رہتی تھیں۔

میں فضیلہ کا شکریہ ادا کر کے انکار میں سر ہلانا ہی چاہتا تھا کہ بھائی جان نے میرا عندیہ بھانپ کر زور سے میرا ہاتھ دبایا۔ میں نے گھوم کر اُن کی طرف دیکھا۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں انہوں نے کچھ کہا۔ پہلے تو میری سمجھ میں نہیں آیا، لیکن جب اُنہوں نے کہا۔ "کیا حرج ہے سکندر! ایک ہی رات کی تو بات ہے۔ رُک جاؤ، مجھے بھی تم سے کچھ ضروری گفتگو کرنا ہے۔" تو میں خوشی سے جھوم اُٹھا۔ اُنہیں مجھ سے کوئی ضروری گفتگو نہیں کرنا تھی۔ وہ میرے ساتھ مل کر کمرے کا مدفون خزانہ نکالنا چاہتے تھے۔

"آپ کے کہنے پر تو نہیں رُکوں گا۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "ہاں، فضیلہ کے کہنے پر بریانی کھانے کے لالچ میں رُک جاتا ہوں۔"

فضیلہ خوش ہو کر تالیاں بجانے لگی۔ بھائی جان اور اُس کے ابو ہنسنے لگے۔ ابو جان خاموشی سے کھانا کھاتے رہے۔ بھائی جان مدرسے میں مجھ سے ملنے کے لیے آئے تھے تو اُنہوں نے بتایا تھا کہ امی جان کی موت کے بعد ابو جان نے ہنسنا مسکرانا چھوڑ دیا۔

سب دل کھول کر ہنس چکے تو ابو جان نے درشت نظروں سے میری طرف دیکھا۔ "تم تو

عصر کے بعد جانے کے لیے کہہ رہے تھے؟" اُن کا لہجہ ایسا تھا، گویا مجھے کھڑے کھڑے وہاں سے نکال دینا چاہتے ہوں۔

میں نے اُنہیں اصل بات بتا دی۔ نہ بتاتا تو وہ عصر کے بعد ایک منٹ بھی میرے روادار نہ ہوتے۔ "آیا تو کل صبح تک کے لیے تھا۔ لیکن گھر کی ویرانی دیکھ کر ایسی وحشت طاری ہوئی کہ عصر کے بعد ہی جانے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن اب احساس ہو رہا ہے کہ گھر اتنا ویران نہیں جتنا میں سمجھ رہا تھا۔"

"اتنا ہی ویران ہے۔" ابو نے چیخ کر کہا۔ مگر اگلے ہی لمحے فضیلہ کے ابو کی طرف دیکھ کر نرم پڑ گئے۔ "معاف کرنا خان صاحب!" اُنہوں نے فضیلہ کے ابو سے کہا۔ "کبھی کبھی میرا دماغ خراب ہو جاتا ہے۔"

فضیلہ کے ابو نے اُن کے کندھوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ "میں تمہارے درد سے واقف ہوں۔ لیکن بچے تو بچے ہی ہوتے ہیں۔ یہ نہیں جانتے کہ برسوں کے دُکھ درد کا ساتھی اچانک ساتھ چھوڑ جائے تو دل ویران ہو جاتا ہے۔ اور جب دل ویران ہو جاتا ہے تو ہر طرف ویرانی چھا جاتی ہے۔"

چند لمحوں پیشتر والا ماحول تبدیل ہو گیا۔ فضیلہ سہم گئی اور ایک طرف جا کھڑی ہوئی۔ ہم دونوں بھائی بھی خاموش ہو گئے۔ کئی منٹ بعد وہاں کے سکوت کو فضیلہ کی آواز نے توڑا۔ وہ ڈری ڈری نظروں سے ابو کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

"کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے؟"

شام کی چائے بھی فضیلہ ہی کے گھر سے آئی تھی۔ چائے سے فارغ نہیں ہوا تھا کہ دروازے پر کار آ کر رُکی۔ فضیلہ نے نورین کو فون کر کے میری آمد سے مطلع کر دیا تھا اور وہ مجھ سے ملنے کا بہانہ کر کے اپنی امی کے ساتھ بھائی جان سے ملنے چلی آئی تھی۔ اس وقت تک بھائی جان میڈیکل اسٹور سے نہیں آئے تھے۔ اُس کی امی فضیلہ کی امی کے پاس چلی گئیں اور وہ مجھ سے باتیں کرتی ہوئی میرے کمرے میں چلی گئی۔ کمرے کی چمک دمک دیکھ کر اُسے تعجب تو بہت ہوا لیکن اُس نے اس کا اظہار نہیں کیا۔

"پڑھائی کیسی ہو رہی ہے؟" اُس نے پوچھا۔

"بہت شاندار۔" میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "مدرسے میں پڑھنے اور سونے کے علاوہ کوئی تیسرا کام نہیں۔"

وہ میرے پلنگ پر بیٹھ گئی۔ "بہت بڑے مولانا بن کر وہاں سے آؤ گے۔"

"ہاں، تمہارا اور بھائی جان کا نکاح بھی مجھ ہی سے پڑھوایا جائے گا۔"

اُس کا چہرہ گلنار ہو گیا، ہونٹوں کے گوشوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ "ابھی تک پہلے کی طرح شریر

ہو۔ میں سمجھ رہی تھی، مدرسے میں جا کر سنجیدہ ہو گئے ہو گے۔"

"سنجیدہ تو اب بھی ہوں۔" میں نے کہا۔ "لیکن ایسا کون سا دیور ہو گا کہ نظروں کے سامنے بھابی کو دیکھ کر اُس کی رگِ ظرافت نہ پھڑک اُٹھتی ہو۔"

"تھپڑ ماروں گی۔" وہ ہنس پڑی۔

اور تب بھائی جان آ گئے۔ میں اُن دونوں کو اپنے کمرے میں چھوڑ کر فضیلہ کے گھر نورین کی امی کو سلام کرنے چلا گیا۔

مغرب سے کچھ دیر پہلے ماں بیٹی واپس چلی گئیں۔ میں نے اور بھائی جان نے دروازے پر کھڑے ہو کر اُنہیں رخصت کیا۔ اُن کا ڈرائیور نہیں آیا تھا۔ نورین خود ڈرائیو کر رہی تھی۔ اُس کی ڈرائیونگ پر مجھے اتنی حیرت نہیں ہوئی جتنی اس بات پر کہ وہ ڈرائیونگ لائسنس کے بغیر کار چلا رہی تھی۔ وہ میری ہم عمر تھی اور میں ابھی عمر کے اس حصے میں نہیں پہنچا تھا کہ ڈرائیونگ لائسنس حاصل کر سکتا۔ اس لیے یقین سے کہہ سکتا تھا کہ اُسے بھی لائسنس نہیں ملا ہو گا۔

یہی بات میں نے بھائی جان سے کہی تو اُنہوں نے درد بھرے انداز میں کہا۔ "قانون بڑے آدمیوں کے لیے نہیں ہوتے سکندر!"

وہ مجھے اپنے کمرے میں لے گئے اور نورین کے دیئے ہوئے تحائف دکھاتے ہوئے بولے۔ "کبھی کبھی اس کے سامنے مجھے اپنی غربت، عسرت کا اتنا شدید احساس ہوتا ہے کہ دل ڈوبنے لگتا ہے۔"

"اللہ نے چاہا تو اب نہیں ہو گا۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "صرف آج رات کی بات ہے۔ اس کے بعد نورین کی طرح آپ بھی اپنی کار دوڑاتے پھریں گے۔"

رات کے کھانے کے بعد جس کی سب سے پُر ذائقہ ڈش بریانی تھی، ابو جان سونے چلے گئے۔ بھائی جان اندر سے گیٹ بند کر کے میرے کمرے میں آ گئے اور پراسرار علوم کی ان کتابوں کی ورق گردانی کرنے لگے، جو میں نے اپنے ساتھ لے جانے کے لیے رکھی تھیں۔

میں نے کہا۔ "بہت بڑی غلطی ہو گئی بھائی جان! ہم نے فرش کی کھدائی کے لیے پھاوڑے اور کدال کا تو کوئی انتظام ہی نہیں کیا۔"

اُنہوں نے ہنستے ہوئے اپنی جیب سے شکاری چاقو نکالا۔ "میں پورا انتظام کر کے آیا ہوں۔"

"اس چاقو سے کیا ہو گا؟"

"خود دیکھ لینا، یہ کیا کمال دکھائے گا۔"

تقریباً گیارہ بجے جب یقین ہو گیا کہ ابو جان گہری نیند سو گئے ہوں گے، بھائی جان اپنی جگہ سے اُٹھے۔ ہم دونوں نے میز کرسیوں کو دیوار سے لگایا۔ بھائی جان فرش کے اس حصے پر

اکڑوں بیٹھ گئے، جس پر شطرنج جیسی خوب صورت بساط بنی تھی اور شکاری چاقو سے اُسے کھرچنے لگے۔ اس وقت میری حیرت کی انتہا نہ رہی، جب ٹائلوں کا جوڑ تلاش کر کے اُنہوں نے دو ٹائلوں کے درمیان چاقو پیوست کیا اور جھٹکے سے ایک ٹائل باہر نکال ڈالی۔ اس کے بعد باقی ٹائلوں کو اُکھاڑنا کچھ بھی مشکل نہیں تھا۔ ٹائل اُکھاڑنے کے لیے وہ چاقو استعمال کر رہے تھے۔ جبکہ میرا خیال تھا کہ ان ٹائلوں کو اُنگلیوں کی مدد سے بھی اُکھاڑا جا سکتا ہے۔

کمرے کے ایک حصے میں ٹائلوں کا ڈھیر اکٹھا ہو گیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر ہم نے بچی زمین کی بھربھری مٹی کو دونوں ہاتھوں سے نکال نکال کر ایک طرف پھینکا۔ ابھی ایک فٹ مٹی نکالی ہو گی کہ اچانک ایسا معلوم ہوا، جیسے مٹی میں جان پڑ گئی ہو۔ مٹی خود بخود اُچھل اُچھل کر باہر آ رہی تھی۔ اور تب اُس میں سے انسانی جسم کے وہ اعضاء باہر آنا شروع ہو گئے جنہیں میں نے ٹکڑے ٹکڑے کر کے زمین میں دفن کیا تھا۔ بھائی جان گھبرا کر ہٹ گئے اور دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑے ہو گئے۔ اگلے ہی لمحے ہم نے ترشولی کا سر اور سیاہ فام چہرہ باہر آتے دیکھا اور بیک وقت ہم دونوں بھائیوں کے منہ سے چیخیں نکلنے لگیں۔

سارے کٹے ہوئے اعضاء آپس میں جڑتے چلے جا رہے تھے۔ پورے جسم کی تکمیل ہو رہی تھی۔ ہم دونوں چیخ رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے ان چیخوں میں ان سایوں کے قہقہے شامل ہو گئے ہوں جو عرصہ دراز سے کسی گوشے میں جا چھپے تھے۔ ہم نے بھیانک چیخوں کے ساتھ دھڑ سے سر اور کالے چہرے کو پیوست ہوتے دیکھا، اور اسی لمحے بجلی چلی گئی۔ بھائی جان نے میرا، میں نے بھائی جان کا ہاتھ پکڑ لیا اور تاریکی میں دروازے کی طرف بھاگے اور دروازے تک پہنچنے کے بجائے دیوار سے ٹکرا کر زمین پر گرے۔ ایسا محسوس ہونے لگا، جیسے اتھاہ تاریکی ہم دونوں کو نگل جائے گی۔

ہم دونوں بھائیوں کی دل دہلا دینے والی فلک شگاف چیخیں سن کر پورا محلہ جاگ اُٹھا۔ تاریکی میں جس کے ہاتھ لاٹھی لگی، وہ لاٹھی لے کر، جسے ڈنڈا یا سبزی کاٹنے والا چاقو ملا، وہ وہ لے کر اور جس کی پھکنی اور بیلن تک رسائی ہو گئی، وہ پھکنی اور بیلن لے کر ہمارے گھر کی طرف دوڑا۔ پورے علاقے میں صرف فضیلہ کے ابو کے پاس بارہ بور کی دو نالی بندوق تھی، وہ اُسے لے کر ہماری مدد کے لیے بھاگے لیکن گھبراہٹ اور عجلت میں اُسے لوڈ کرنا بھول گئے۔ گیٹ اندر سے بند تھا اس لیے سب باہر ہی رہ گئے اور وہیں سے گلے پھاڑ پھاڑ کر زمین آسمان ایک کرنے لگے۔

اس عرصے میں ابو ہانپتے کانپتے ماچس اور بغیر جلی ہوئی موم بتی لے کر میرے کمرے میں پہنچ چکے تھے اور ماچس کی تیلی کے اس سرے کو جس پر جلنے والا مصالحہ نہیں تھا، ماچس پر رگڑتے ہوئے کہہ رہے تھے۔ ”کیا ہوا؟......کیا ہوا؟“

فضیلہ کے ابو بپھرے ہوئے شیر کی طرح ”کون ہے؟......کدھر ہے؟......کہاں ہے؟“ کہتے ہوئے کمرے میں گھسے۔ اِدھر وہ کمرے میں داخل ہوئے اور اُدھر بجلی آ گئی۔

ہم دونوں بھائی ایک دوسرے سے چپٹے کھڑے تھے اور خوف سے چیخ رہے تھے۔ بجلی آئی اور ابو اور فضیلہ کے ابو کو دیکھا تو ڈھارس بندھی، سانس میں سانس آئی۔ ہم نے فرش کے اس حصے کو دیکھے بغیر جس کے ٹائلز ہٹائے گئے تھے، بیک وقت اور بیک آواز اشارہ کرتے اور لرزتے ہوئے کہا۔ ”وہ......وہ......“

”دماغ چل گیا ہے تم دونوں کا۔“ ابو نے چنگھاڑ کر کہا۔ ”تمہارے لالچ اور حرص نے پورے محلے کی نیند حرام کر دی ہے۔ جاؤ اب جا کر خود ہی محلے والوں کو سمجھاؤ۔ سب دروازے پر کھڑے ہیں۔“

ہم نے اور بھائی جان نے ڈرتے ڈرتے فرش کی طرف دیکھا۔ وہاں ڈیڑھ دو فٹ کا گڑھا بے شک تھا، لیکن بدصورت جسم کے ان ٹکڑوں کا کوئی پتہ نہیں تھا، جنہوں نے آپس میں جڑ کر ہماری جان نکال کر رکھ دی تھی۔

باہر لوگ چلا رہے تھے۔ ”خیریت ہے؟......اندر سب خیریت ہے؟“

فضیلہ کے ابو نے ابا جی کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے اپنی دو نالی بندوق میرے پلنگ سے ٹکا دی۔ ”اچھے بھلے فرش کو کیوں توڑ ڈالا؟“

”ان دونوں سے پوچھو، جو راتوں رات امیر بننا چاہتے تھے۔“ ابو نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ پھر باہر سے آنے والی آوازیں سن کر بولے۔ ”خان صاحب! پہلے باہر جا کر ان لوگوں کو سمجھاؤ جنہوں نے دروازے پر جمگھٹ لگا رکھا ہے۔ کہہ دینا، ہمارا گھر، گھر نہیں، دیوانوں کا مسکن ہے۔“

فضیلہ کے ابو کے ساتھ ہم تینوں کمرے سے باہر نکلے۔ لیکن دروازے پر جانے کی صرف ابو اور فضیلہ کے ابو نے زحمت کی تھی۔ ہم دونوں بھائی دُور برآمدے میں کھڑے رہے۔

فضیلہ کے ابو نے باہر کھڑے ہوئے لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا۔

”گھر میں کوئی اٹھائی گیرا گھس آیا تھا۔ دونوں لڑکوں نے اُسے دیکھ کر مدد کے لیے چلانا شروع کر دیا۔ آپ لوگوں کے آتے ہی کچھ لیے بغیر پچھلے دروازے سے بھاگ نکلا۔ شکر ہے، گھر کا ہر فرد اور ہر شے صحیح سلامت ہے۔“

کچھ لوگ ہنسنے لگے اور کچھ حکومت اور اس کی پالیسیوں کو برا بھلا کہنے لگے۔ کچھ مطمئن ہو کر اپنے اپنے گھروں کی طرف چل دیے۔

کسی نے پوچھا۔ ”دروازہ تو بند تھا۔ وہ حرام زادہ گھر میں کیسے داخل ہوا؟“

فضیلہ کے ابو نے سر کھجایا۔ ”ہاں......یہ بات تو ہے کہ وہ گھر میں کیسے داخل ہوا۔ میرا

خیال ہے، سرِ شام ہی آ گیا ہو گا اور باتھ روم یا کسی اور جگہ چھپ کر بیٹھ گیا ہو گا۔"
کتنا خراب زمانہ آ گیا ہے...... سکندر اور ہاشم اُسے دیکھ کر نہ چلّاتے تو پورے گھر کا صفایا ہو گیا ہوتا۔"

ابو نے بڑبڑا کر کہا۔ "گھر میں رکھا ہی کیا ہے جس کا صفایا ہوتا۔"

"یہ نہ کہو۔ ایسا کون سا گھر ہے، جہاں سے چوروں اور لٹیروں کے مطلب کی چیز نہ ملے؟ برتن بھانڈے، گھڑیاں گھڑیال، ریڈیو، ٹی وی، فریج تو سبھی گھروں میں پائے جاتے ہیں۔"

ہمارے گھر میں اللہ کا دیا سب کچھ تھا۔ بس آخری تین چیزیں نہیں تھیں۔

بھائی جان نے مجھ سے کہا۔ "سکندر! کیا تماشا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا، جیسے کسی بے انتہا بدصورت انسان کی لاش کے ٹکڑے ہوں اور اُن میں جان پڑ گئی ہو۔"

وہ ترشولی کے ٹکڑے تھے۔"

"ترشولی سے مراد وہی عورت ہے، جو کم و بیش ایک سال قبل تمہیں نظر آتی رہی ہے؟"

"جی ہاں...... اُس کا نام ترشولی ہے۔"

اُنہوں نے خوف آمیز جھرجھری لی۔ "تاریکی میں تمہیں یہی ٹکڑے دکھائی دیتے تھے؟"

"جی نہیں۔ اُس وقت تک ترشولی کے ٹکڑے نہیں ہوئے تھے۔ اُس کے ٹکڑے تو میں نے بنائے تھے۔"

"تم نے ٹکڑے کیے تھے اُس کے؟" بھائی جان نے اٹک اٹک کر حیرت سے پوچھا۔ "تمہیں اُس سے ڈر نہیں لگا تھا؟"

"ڈر پر انتقام کا جذبہ غالب آ گیا تھا۔ اُس نے ہماری رخسانہ کو قتل کیا تھا، اُس کا داہنا ہاتھ پاپڑ کی طرح چبا کر کھایا تھا۔ کچھ دیر اور ہو جاتی تو اُس کے چاہنے والے پوری رخسانہ کو کھا پی کر برابر کر ڈالتے۔"

"یہ بات تم پورے یقین سے کہہ رہے ہو؟"

"یہ بات اُس نے مجھے خود بتائی تھی۔" میں نے کہا۔ "بارش والی اس تاریک شام کو بخار کی حالت میں وہ مجھے رخسانہ کے آگے پیچھے جاتی ہوئی نظر آئی تھی۔ لیکن مجھے شبہ تھا، یقین نہیں آیا تھا۔ یقین اس وقت آیا، جب اُس نے رخسانہ کے قتل کا اعتراف کیا۔

بھائی جان کی آنکھیں خوف سے پھیلتی جا رہی تھیں۔ "مجھے تو اُس کے ذکر ہی سے ڈر لگ رہا ہے۔ خدا کی پناہ، کس قدر خوف ناک شکل تھی اُس کی۔ ایسی ڈراؤنی شکل میں نے آج تک نہیں دیکھی۔ خدا کسی کو ایسی بھیانک شکل نہ دکھائے۔ لیکن سکندر!" ایکا ایکی انہوں نے چونک کر کہا۔ "تم نے اُسے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اپنے کمرے میں دفن کر دیا تھا، پھر بھی وہ باہر نکلنے میں کامیاب

ہو گئی۔ اب وہ تم کو نہیں، مجھے بھی تنگ کیا کرے گی۔ اُس نے تمہارے ساتھ مجھے بھی دیکھ لیا ہے۔"

بہت سی باتیں ایسی تھیں، جو خود میرے لیے بھی معمہ بنی ہوئی تھیں۔ اگر رانی، رانی نہیں تھی، ترشولی تھی تو وہ پولیس کے خوف سے عیش و عشرت کے لیے ملک چھوڑ کر باہر جا چکی تھی۔ اور اگر وہ باہر جا چکی تھی تو وہ کون سی ایسی طاقت تھی، جس نے میری اور بھائی جان کی نظروں کے سامنے لاش کے ٹکڑوں کو یکجا کیا تھا؟ کیا اُس نے ایک بار پھر مجھ سے جھوٹ بولا تھا اور پچیس لاکھ روپے کا فریب دے کر ایک بار پھر اپنے اس جسم کو حاصل کرنے کی کوشش کی تھی، جس کو دیکھ کر خوف ہی محسوس نہیں ہوتا تھا بلکہ بے انتہا گھن بھی آتی تھی۔

میں بھائی جان کو اپنا ہم راز نہیں بنا سکتا تھا۔ کیونکہ جو کہانی مجھے سنانا پڑتی، اُس میں نورین کا نام بھی آتا۔ سوچ ہی رہا تھا کہ کیا کہوں، اسی دوران ابو جان اور فضیلہ کے ابو باہر کھڑے ہوئے لوگوں کو نمٹا کر واپس آ گئے۔

"ہاں لڑکو!" فضیلہ کے ابو نے ہمیں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "اب بتاؤ، وہ حرص اور لالچ والی بات کیا تھی، جس کی وجہ سے تم نے فرش اکھیڑ کر نہ صرف پورا کمرہ ستیاناس کر دیا بلکہ چیخ چیخ کر پورا محلہ سر پر اُٹھا لیا؟

بھائی جان نے کہا۔ "دراصل سکندر نے خواب میں ایک بزرگ ہستی کو دیکھا تھا اور اُنہوں نے کہا تھا کہ تمہارے کمرے کے فرش کے نیچے خزانہ مدفون ہے۔"

"سکندر جھوٹا ہے۔" ابو جان نے بگڑ کر کہا۔

"تم اپنے کمرے میں جا کر بیٹھو۔" فضیلہ کے ابو نے ابو جان سے کہا۔ پھر بھائی جان کا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگے۔ "چلو، سکندر کے کمرے میں چل کر بیٹھتے ہیں۔"

"ہم لوگ کمرے کی جانب قدم اُٹھا رہے تھے کہ اُس دیوار کی دوسری جانب، جسے فضیلہ کے ابو پھاند کر ہمارے ہاں آئے تھے، فضیلہ کا چہرہ نظر آیا۔ وہ غالباً اسٹول پر چڑھی ہمارے گھر میں جھانک رہی تھی۔

"ابو!" اُس نے کہا۔ "امی پوچھ رہی ہیں کہ بھائی جی اور ہاشم بھائی کیوں چیخ رہے تھے؟"

"کہہ دو کہ اُنہوں نے خواب دیکھا تھا۔"

"دونوں نے ایک جیسا، ایک ساتھ ڈراؤنا خواب دیکھا تھا؟" فضیلہ نے پوچھا۔

"ہاں جی!"

"یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔" فضیلہ نے کہا اور ہنستی ہوئی اسٹول سے نیچے کود گئی۔

میرے کمرے میں پہنچ کر سب سے پہلے فضیلہ کے ابو نے اپنی دو نالی بندوق کا جائزہ لیا، ایک ہاتھ سے سر پیٹتے ہوئے بولے۔ "آپ کے پڑوس میں رہ کر میں بھی بے وقوف ہوا جا رہا

ہوں۔ بغیر بھرے دونالی بندوق لے کر آ گیا ہوں۔ خدانخواستہ یہاں سچ مچ کوئی قاتل واقل ہوتا تو میری خیر نہیں تھی۔"

پھر وہ اُس گڑھے کی طرف بڑھے، جسے ہم بھائیوں نے بڑی محنت سے کھودا تھا۔

"تم دونوں اس میں خزانہ تلاش کر رہے تھے؟" انہوں نے گڑھے میں جھانکتے ہوئے کہا۔ پھر اچانک اُن کا تضحیک آمیز لہجہ بدل گیا۔ "یہ مٹکے جیسی چیز کیا ہے؟"

بھائی جان لپک کر گڑھے کے پاس پہنچے اور اس میں جھک کر بولے۔ "یہ...... یہ...... یہ تو خدا کی قسم مٹکا ہے۔"

میں اپنے پلنگ پر لمبا لمبا لیٹ گیا، پاؤں پھیلا لیے۔ مجھے ڈرنے، چیخنے اور منہ سے خوفناک آوازیں نکالنے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ پہلے بھائی میرے ساتھ چیختے تھے، اب اُن کی اور فضیلہ کے ابو کے چیخنے کی باری تھی۔

وہ دونوں چیخے، لیکن اُن کی چیخیں دبی دبی تھیں اور اُن دبی دبی چیخوں میں ڈر کے بجائے حیرت اور مسرت چھپی ہوئی تھی۔ میں نے بے اعتنائی سے اُن دونوں کی جانب کروٹ لی اور اُن پر طائرانہ نظر دوڑائی، دوسرے ہی لمحے اُچھل کر اُٹھ بیٹھا اور چھلانگ مار کر اُن کے پاس جا کھڑا ہوا۔ اُنہوں نے دبا ہوا مٹکا باہر نکال لیا تھا اور اس کے منہ میں ہاتھ ڈال کر سرخ سرخ نوٹوں کی گڈیاں نکالنے اور فرش کے صاف حصے میں پھینکنے میں مصروف ہو گئے۔

میں نے کہا۔ "اس طرح نوٹ نکالیں گے تو صبح ہو جائے گی۔ مٹکے کو اُلٹا کر کے دو چار جھٹکے دیجیے۔ منٹوں سیکنڈوں میں سارے نوٹ نکل آئیں گے۔"

بھائی جان اور فضیلہ کے ابو کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ اسے میری جانب دیکھ کر غور کرتے۔ مٹکے کو ایک طرف سے بھائی جان نے اور دوسری طرف سے فضیلہ کے ابو نے اُلٹا اور دیکھتے ہی دیکھتے کمرے میں سرخ نوٹوں کی گڈیوں کی بارش ہونے لگی۔ مٹکے کو اچھی طرح جھاڑ چکے تو اُسے سیدھا کر کے بھائی جان نے اُس میں ہاتھ ڈالا کہ کوئی گڈی اس کے پیندے میں تو چپکی نہیں رہ گئی۔ اُن کا ہاتھ باہر نکلا تو فضیلہ کے ابو نے اپنا ہاتھ مٹکے میں ڈال دیا کہ بھائی اچھی طرح مٹکے کی تلاشی نہ لے سکے ہوں۔

بھائی جان نے میز پر رکھی ہوئی میری ساری کتابیں ایک طرف پھینک دیں اور اس پر نوٹوں کی گڈیاں اس طرح جمانے لگے، جیسے کوئی بچہ لکڑی کے بلاکوں سے گھروندا بناتا ہے۔

فضیلہ کے ابو اپنے ہاتھوں کو ملتے ہوئے ہنسے۔ میں نے اس انداز کی ہنسی پہلی بار دیکھی تھی۔ آواز ہنسنے کی تھی اور منہ ایسا ہو رہا تھا، جیسے ہچکیوں سے رو رہے ہوں۔

"پچاس لاکھ سے کیا کم ہوں گے؟" اُنہوں نے حسرت، حیرت، مسرت اور محبت آمیز

میں کہا۔

میں نے کہا۔ "پچیس لاکھ ہیں۔ گن لیجیے۔ نہ ایک گڈی کم، نہ ایک زیادہ۔"

"تمہارا خواب سچا تھا۔" اُنہوں نے نوٹوں سے نظریں ہٹائے بغیر کہا۔ "خواب بھی سچا تھا اور وہ بزرگ بھی سچے تھے، جو تمہارے خواب میں آئے تھے۔"

میں خاموش کھڑا رہا۔ تائید میں سر اس لیے نہیں ہلایا کہ خواب جھوٹا تھا۔

بھائی جان نے گڈیاں جماتے ہوئے کہا۔ "خان صاحب! پچیس لاکھ ہوئے تو پانچ لاکھ آپ کے اور پندرہ لاکھ ابو کے، باقی پانچ لاکھ ہم بھائیوں کے یعنی ڈھائی لاکھ میرے اور ڈھائی لاکھ سکندر کے۔ کیوں سکندر؟"

بہت سی باتیں تھیں، جو میرے ذہن میں گڈمڈ ہو کر رہ گئی تھیں۔ رانی نے غلط بیانی سے کام نہیں لیا تھا۔ وہ دل سے ہم لوگوں کو ترقی کے زینے پر چڑھتا ہوا دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ واقعی ترشولی ہی تھی۔ لیکن اگر وہ ترشولی تھی تو ہم نے فرش کے نیچے سے اُس کے جسم کے ٹکڑے نکلتے اور جڑتے ہوئے کیوں دیکھے تھے؟ وہ دوسرے اجسام کی طرح گل سڑ کر اور مٹی میں مل کر مٹی کیوں نہیں ہوئے تھے؟ ان میں جان کہاں سے پڑ گئی تھی؟ اور روشنی ہوتے ہی ترشولی کا بدہیئت اور بدصورت جسم اچانک کدھر غائب ہو گیا؟

بھائی جان اور فضیلہ کے ابو بڑے انہماک سے رقم گن رہے تھے کہ مجھے نیند آ گئی۔ منہ اندھیرے ابو کی تیز تیز آواز سن کر آنکھ کھلی۔ وہ کہہ رہے تھے۔

"یہ نوٹ رخسانہ اور اُس کی ماں کے خون سے تیار کیے گئے ہیں۔ جس نے نوٹ دیے ہیں، اُس سے کہہ دو کہ ہمیں خون بہا نہیں چاہیے۔ اُس سے پوچھو، ان نوٹوں سے کیا میری معصوم بچی کی مسکراہٹ اور چڑیوں جیسی چہچہاہٹ خریدی جا سکتی ہے؟ یا میری وہ بیوی واپس مل سکتی ہے، جس نے دُکھ سُکھ میں، گرمی میں، سردی میں، دھوپ میں، چھاؤں میں ہمیشہ میرا ساتھ دیا تھا؟ غصہ کرتی تھی تو بھی ہم سب کے لیے اس میں پیار چھپا ہوتا تھا۔"

فضیلہ کے ابو انہیں سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ "یہ تو ایک عطیہ خداوندی ہے۔ تم اسے ٹھکرا کر کفرانِ نعمت نہیں کر سکتے۔"

بھائی جان ایک طرف سٹپٹائے ہوئے سے کھڑے تھے۔ رات بھر جاگنے کے باعث آنکھیں سوجی ہوئی تھیں اور سرخ ہو رہی تھیں۔ چہرے سے صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ ان کی حالت ایک ایسے چیتے جیسی ہے، جس سے اُس کا شکار چھیننے کی کوشش کی جا رہی ہو۔

"سکندر!" ابو نے دیکھا، میں جاگ گیا ہوں تو فضیلہ کے ابو کی جانب پشت کر کے مجھ سے مخاطب ہوئے۔ "میں نہیں جانتا کہ اتنی کثیر رقم کا علم تمہیں واقعی خواب میں ہوا تھا یا حالت بیداری

میں کسی نے تمہیں گمراہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ البتہ یہ ضرور جانتا ہوں کہ جسے مدفون خزانہ کہا جا رہا ہے، وہ مدفون خزانہ نہیں ہے۔ مدفون خزانوں میں نوٹ نہیں ہوتے۔ اور نوٹ بھی ایسے جیسے انہیں ابھی چند روز قبل ہی پرنٹ کیا گیا ہو۔ یہ نوٹ جعلی معلوم ہوتے ہیں اور کسی نے سب کو ہتھکڑیاں پہنانے کا انتظام کیا ہے۔"

"نوٹ جعلی نہیں ہیں۔" فضیلہ کے ابو نے کہا۔ "تمہیں تو معلوم ہے کہ الیکٹرونکس کا کاروبار کرنے سے پہلے میں نے تقریباً گیارہ سال تک اسٹیٹ بینک میں ملازمت کی ہے۔ اپنے تجربے کی بناء پر پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ......"

فضیلہ کے ابو رات بھر ہمارے گھر رہے اور بار بار بلاوے آنے کے باوجود اپنے گھر واپس نہیں گئے تھے اور مجھے اشارے سے ایک طرف لے گئے اور میرے ہاتھ پر سو روپے کا نوٹ رکھتے ہوئے بولے۔

"فکر نہ کرو۔ میں اس وقت تک نہیں جاؤں گا، جب تک تمہارے ابو کو قائل نہ کر لوں۔ اتنی بڑی رقم کو گنوانا حماقت نہیں، دیوانگی ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "یہ نوٹ......؟"

وہ میرا عندیہ سمجھ گئے۔ جھینپی جھینپی ہنسی ہنستے ہوئے بولے۔ "انہی گڈیوں میں سے یہ دیکھنے کے لیے نکالا تھا کہ جعلی تو نہیں ہے۔"

اس طرح میں نے کتابوں کے دو بڑے تھیلے تیار کیے۔ ایک تھیلا بھائی جان نے اُٹھایا، دوسرا میں نے کندھے پر رکھا۔ ابو نے کہا۔

"رش کا وقت ہے۔ کنڈیکٹر تمہیں بس میں نہیں گھسنے دے گا۔"

بھائی جان بولے۔ "ابھی سورج طلوع نہیں ہوا ہے۔ رش سورج نکلنے کے بعد ہوتا ہے۔ ویسے اگر کنڈیکٹر نے اعتراض کیا تو میں ایک تھیلا واپس لے آؤں گا، دوسرا تھیلا سکندر کے ساتھ چلا جائے گا۔"

ابو کو اس بات کی خبر نہ تھی کہ میری جیب میں پہلے ہی سو روپے کا نوٹ آ چکا ہے۔ اُنہوں نے اثبات میں سر ہلایا اور ایک بار پھر فضیلہ کے ابو سے نوٹوں کے اصلی یا نقلی ہونے کے موضوع پر بحث کرنے لگے۔ گھر سے باہر نکلتے ہوئے میں نے اندازہ لگا لیا کہ ان کی بحث میں پہلے جیسی شدت نہیں تھی۔ وہ کافی نرم پڑ چکے تھے۔ فضیلہ کے ابو کی کوششیں بارآور ثابت ہو رہی تھیں۔ ایک بار انہیں یقین آ جاتا کہ نوٹ جعلی نہیں ہیں، اس کے بعد راوی عیش ہی عیش لکھتا تھا۔ مفت کی رقم کسے بری لگتی ہے۔

مدرسے کے گیٹ پر میں نے بڑے فخر اور غرور کے ساتھ رکشہ ڈرائیور کی طرف سو روپے کا

نوٹ بڑھایا۔ اس نے نوٹ لینے سے انکار کر دیا کیونکہ اس کے پاس صرف دس روپے کا نوٹ تھا۔ جبکہ رکشہ کا کرایہ پچاس روپے بنتا تھا۔ میرے پاس اس کے علاوہ پیسے نہیں تھے۔

رکشہ ڈرائیور ناراض ہونے لگا کہ مجھے بیٹھنے سے پہلے ہی سو روپے کا ذکر کر دینا چاہئے تھا۔ میں اس پر بگڑنے لگا کہ اسے سواریوں کی خاطر کم از کم سو روپے کا چینج تو ہر وقت اپنے پاس رکھنا چاہئے۔ اس وقت سورج طلوع ہو چکا تھا، لیکن دکانیں بند پڑی تھیں۔ دکانداروں کی صبح کبھی آٹھ بجے سے قبل نہیں ہوتی۔ اور جو ذرا بڑے دکاندار ہوتے ہیں، وہ نو اور دس سے پہلے دکان کھولنا کسرِ شانی سمجھتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، رکشہ والے کی ادائیگی کی کیا صورت ہو۔ رکشہ والا بھی پریشان تھا کہ آمدنی کا وقت وہی تھا لیکن تکرار میں ضائع ہوئے جا رہا تھا۔

ہمارے مدرسے کے سامنے نالا تھا، جس پر کچھ لوگوں نے لکڑی کی چھت بنا کر دکانیں بنا لی تھیں۔ دکانوں کے سامنے رات دن ایک بدحال، پاگل شخص پڑا رہتا تھا۔ دکانوں کے مالکان اپنا بچا کھچا کھانا نالے میں پھینکنے کے بجائے اس کے آگے ڈال جاتے تھے۔ کھانا اتنی وافر مقدار میں ہوتا تھا کہ ہر وقت اس پاگل کا منہ چلتا رہتا تھا۔ مدرسے کے طلباء اُسے چھیڑنے کے لیے کبھی اس کے آگے پڑی ہوئی ہڈی یا روٹی کا کوئی ٹکڑا اُٹھا کر بھاگتے یا اس کی کمر پر ٹھوکر رسید کرتے تو بچوں کی طرح بلک بلک کر آنسوؤں سے رونے لگتا تھا۔ دوسرے لڑکوں کی دیکھا دیکھی دو چار بار میں نے بھی اُسے چھیڑا اور اُس کے رونے دھونے کا لطف اُٹھایا تھا۔

رکشہ والے نے رکشہ وہیں روکا تھا، جہاں وہ بیٹھا ہوا ایک ہڈی چچوڑ رہا تھا۔ میری اور رکشے والے کی بحث جاری تھی کہ اچانک اس پاگل کے رونے کی آواز آئی۔ کمبخت اس طرح روتا تھا جیسے اُس کے گلے پر چھری پھیری جا رہی ہو۔ میں نے اور رکشے والے نے بے اختیار اُس کی طرف گھوم کر دیکھا۔

رکشہ ڈرائیور کے متعلق تو کچھ نہیں کہتا کہ اُس کا کیا حال ہوا، البتہ مجھ پر حیرتوں کا ایک پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ مدرسے کے سفید ریش صدر مدرس جو ہمیں قرآن و حدیث کا درس دیا کرتے تھے، اس پاگل کے پاس کھڑے اُسے چھیڑ رہے تھے۔ انہوں نے اس کے ہاتھ کی ہڈی چھین کر مٹی میں پھینک دی تھی اور ہاتھوں میں اُس کی وہ پوٹلی اُٹھائے جس میں نجانے کیا کیا الا بلا بھری رہتی تھی فریرلڑکوں کی طرح ہوا میں اُچھال رہے تھے اور وہ پاگل دھاڑیں مار مار کر زمین پر قلابازیاں کھا رہا تھا۔

"خدا کا خوف کرو مولوی صاحب!" رکشہ والے نے بگڑتے ہوئے کہا۔ "اتنی لمبی سفید داڑھی لیے پھر رہے ہو اور حرکتیں بچوں جیسی ہیں۔ پاگل پر رحم کھانا چاہئے، نہ کہ اس کے ساتھ خود بھی پاگل بن جانا چاہئے۔"

صدر مدرس نے کہا۔ ”لاحول ولاقوۃ الا باللہ۔“ اور خاموشی سے پاگل کی پوٹلی اُس کے سامنے رکھ دی۔

پاگل نے قلابازی کھا کر مٹی میں لتھڑی ہوئی ہڈی اُٹھائی، اپنے میلے جسم پر اُسے رگڑ کر صاف کیا اور رونا دھونا چھوڑ کر ہڈی چچوڑنے اور صدر مدرس کی جانب دیکھ کر ہنسنے لگا۔

اور تب صدر مدرس کی نظر مجھ پر پڑی۔ انہوں نے گھور کر میری طرف دیکھا۔ ”یہاں کیوں کھڑے ہو؟“

میں نے اصل بات انہیں بتائی۔ گھر گیا تھا، رکشے میں بیٹھ کر مدرسے آیا۔ میرے پاس سو کا نوٹ ہے اور رکشے والے کے پاس اتنی رقم نہیں ہے کہ نوٹ کو بھنایا جا سکے۔

”میرے ساتھ آؤ۔“ وہ مجھے اپنے دفتر میں لے گئے۔ دفتر میں پہنچ کر انہوں نے وہ الماری کھولی، جس میں ایک چھوٹی سی تجوری پیوست تھی۔ تجوری کھول کر مجھے دس دس کے دس نوٹ دیئے اور کہا۔ ”رکشے والے کو کرایہ ادا کر کے سیدھے میرے پاس آؤ۔“ انہوں نے کہا۔

میں نے کہا۔ ”حضرت! دو منٹ کی دیر ہو جائے گی۔ مجھے کچھ کتابیں اپنے کمرے میں پہنچانا ہیں۔“

”ٹھیک ہے......“ وہ بولے۔ ”کمرے میں کتابیں رکھ کر آ جانا۔ کسی سے باتیں بنانا نہ شروع کر دینا۔“

رکشے والے کا کرایہ پچاس روپے بنتا تھا۔ اُسے جو زحمت ہوئی تھی، اس کے معاوضے میں، میں نے اُسے ساٹھ روپے ادا کیے۔ رکشے والے نے پوچھا۔

”سفید داڑھی والا مولوی تمہارا ماسٹر ہے؟“

”صدر مدرس ہیں۔ ہیڈ ماسٹر کہہ لو۔ بہت نیک اور شریف انسان ہیں۔ ہر شخص انہیں ادب سے بلاتا ہے اور حضرت کہتا ہے۔“

رکشے والا ہنسنے لگا۔ ”میں نے اتنا بدمعاش بڈھا آج تک نہیں دیکھا۔ پاگل کے ساتھ خود بھی پاگل بن گیا تھا۔ پتہ نہیں، تم لڑکوں کو کیسے پڑھاتا ہوگا۔“

رکشہ چلا گیا تو میں نے اپنے کمرے تک کتابوں کے تھیلوں کو پہنچایا۔ میرے کمرے کا ساتھی حافظ تلاوت کر رہا تھا۔ وہ روزانہ ایک منزل کی تلاوت کیا کرتا تھا۔ اُس نے اشارے سے پوچھا ”ناشتہ کر کے آئے ہو؟“

میں نفی میں سر ہلا کر مدرس کے دفتر چلا گیا۔ وہ میرے منتظر تھے۔

”بیٹھ جاؤ سکندر!“ انہوں نے کہا۔ میں فرش پر لگی ہوئی دری پر بیٹھ گیا تو وہ کہنے لگے ”ابھی تھوڑی دیر پہلے تم نے جو منظر دیکھا، اس پر تمہیں یقیناً حیرت ہوئی ہوگی۔“

میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”رکشے والا تو حضرت والا کی شان میں گستاخیاں تک کرنے لگا تھا۔“

”تمہاری طرح میں نے بھی اسی مدرسے میں تعلیم حاصل کی ہے۔ تقریباً پچپن سال پہلے کی بات ہے، اس وقت پاکستان نہیں بنا تھا اور یہ شہر، جس کی آج کوئی تھاہ ہی نظر نہیں آتی، اُس زمانے میں اوسط درجے کا ایک خوب صورت شہر ہوا کرتا تھا۔ مدرسے کے گیٹ کے سامنے والا نالا میری طالب علمی کے دور میں بھی ہوا کرتا تھا، مگر اس پر دکانیں بنی ہوئی تھیں۔ جن صاحب کو تم نے دکانوں کے سامنے پاگلوں جیسی حرکات کرتے اور ہڈیاں اور روکھی سوکھی روٹیاں چباتے ہوئے دیکھا ہے، وہ میرے زمانے میں بھی تھے۔ اور جیسی حرکتیں آج کرتے ہیں، ویسی ہی حرکتیں میرے لڑکپن میں بھی کیا کرتے تھے۔ اس وقت بھی وہ بلحاظِ عمر اور بلحاظِ جثہ بالکل ایسے ہی تھے جیسے آج نظر آتے ہیں۔ میں لڑکا تھا، تب بھی ایسے ہی تھے، جوان ہوا تب بھی۔ فارغ التحصیل ہو کر اسی مدرسے میں مدرس کی حیثیت سے آیا، اب بوڑھا ہو گیا ہوں، چراغِ سحری ہوں لیکن ان میں سرِ مو فرق نہیں آیا۔

حضرت چند لمحوں کے لیے اس طرح خاموش ہو گئے، جیسے اپنے گزرے ہوئے دنوں کے بارے میں سوچ رہے ہوں۔

”زمانۂ طالب علمی میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ، میں بھی ان صاحب کو اسی طرح چھیڑا کرتا تھا، جس طرح تم نے آج مجھے چھیڑتے ہوئے دیکھا۔ پھر اللہ نے مجھے توفیق دی۔ میں نے اپنے صدر مدرس کے دستِ حق پرست پر، جن کا شمار جید علماء میں ہوتا تھا، بیعت کی اور اُن کی پاکیزہ راہنمائی میں راہِ سلوک طے کی۔ حق تعالیٰ کے بے پایاں فضل و کرم اور شیخ کی خصوصی عنایات و توجہات کی بدولت ایک ایسا دن بھی آیا، جسے تصوف کی زبان میں نسبتِ باطنی کے حصول سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ میں نوجوان تھا، طبیعت میں تجسس کا مادہ تھا۔ جس بزرگ کو بھی دیکھتا، اُس کے قلب کی طرف متوجہ ہو کر یہ معلوم کرنے بیٹھ جاتا کہ ان کے کیا درجات ہیں۔ کئی ایسے لوگ ملے، انہیں لوگ بزرگ سمجھتے تھے۔ یا یوں سمجھ لو کہ وہ خود کو دوسروں پر بزرگ کی حیثیت سے تھوپا کرتے تھے۔ میں نے اُن کی طرف توجہ دی تو وہ اندر سے بالکل خالی اور کھوکھلے نکلے۔

اُنہی دنوں ایک روز میں نے اُن صاحب کی طرف، جو نالے کے پاس بیٹھے رہتے تھے، اور لغزیدہ توجہ مبذول کی تو معلوم ہوا کہ وہ تو ابدال کے درجے پر فائز ہیں۔ سکندر! تم تصور نہیں کر سکتے کہ اس وقت میرا کیا حال ہوا ہوگا۔ ایسی کون سی گستاخی تھی، جو میں نے اُن کے ساتھ نہیں کی تھی۔ میری سٹی گم ہو گئی۔ اس روز گھر جاتے ہوئے اُن کے پاس سے بڑے ادب و احترام سے گزرا۔ ادب و احترام کے ساتھ انہیں سلام کیا اور ہاتھ جوڑ کر اپنی غلطیوں کی معافی چاہی۔ مگر

انہوں نے میرا گریبان پکڑ لیا، فرمانے لگے۔

"جس طرح مجھے چھیڑتے اور تنگ کرتے تھے، اسی طرح اب بھی چھیڑو...... تنگ کرو۔
ورنہ تم نے جتنا باطنی علم حاصل کیا ہے، سب سلب کرلوں گا۔"

میں نے عرض کی۔

"حضور! پہلے اندھا تھا، ناواقفیت کی بنیاد پر گستاخیوں کا مرتکب ہوتا تھا۔ حق تعالیٰ نے ناچیز
کو بینائی عطا فرمائی ہے۔ اب آپ جیسی ہستی کی شان میں کیسے گستاخی کرسکتا ہوں؟"

لیکن وہ نہ مانے۔ انہوں نے میری باطنی دولت سلب فرمالی۔ میں بالکل کورا رہ گیا۔ بالآخر
اُن کی بات ماننا پڑی۔ وہ دن ہے اور آج کا دن، مدرسے سے آتے جاتے ہوئے جب بھی اُن
کے پاس سے گزرتا ہوں، انہیں چھیڑتا ہوا اور تنگ کرتا ہوں اور خوب رُلاتا ہوں۔"

وہ ایک بار پھر خاموش ہو گئے۔ پھر لمبی سانس لے کر بولے۔ "کچھ دیر قبل تم نے مجھے
حماقت کرتے ہوئے دیکھا ہے، یہ ہے اس کی حقیقت۔ میں ان صاحب کو ناراض نہیں کرسکتا۔ ان
کی خوشی اسی میں ہے کہ ان کے ساتھ ویسا ہی برتاؤ کیا جائے جو پاگلوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔"

مجھے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں برف سی دوڑتی محسوس ہوئی۔ میں خود بھی کئی بار ان صاحب کے
ساتھ گستاخیاں کرچکا تھا۔

"اب جاؤ۔" صدر مدرس نے اپنی جیبی گھڑی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "مدرسے کی گھنٹی بجنے
ہے اور تم نے شاید ابھی ناشتہ بھی نہیں کیا ہے۔"

"حضرت!" میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ عرض کیا۔ "میں بھی اندھا ہوں اور آپ
دستِ حق پرست پر بیعت کرنا چاہتا ہوں۔"

"میں نے تمھیں یہ قصہ اس لیے نہیں سنایا تھا۔ صرف یہ بتانا مقصود تھا کہ تم نے جو کچھ کر
دیکھا، اس کا کوئی غلط مطلب نہ نکال لینا۔ بیعت کی بات پھر کبھی ہوگی۔"

"حضرت نے مجھے بیعت نہیں کیا تو میرا دل ٹوٹ جائے گا۔" وہ بے اختیار مسکرانے۔

"تمھیں معلوم ہے کہ کسی کے ہاتھ پر بیعت کیوں کرتے ہیں؟"

"نابینائی دور کرنے کے لیے، ان چیزوں اور ان ہستیوں کو دیکھنے کے لیے، جن تک
انسان کی نظروں کی رسائی نہیں ہوسکتی۔" میں نے کہا۔ "میں عجائباتِ عالم سے باخبر ہونا چاہتا
حضرت!"

"گویا تم نے تصوف کو ایک قسم کا کھیل تماشا سمجھ رکھا ہے۔ حالانکہ تصوف کی غرض تو
کچھ اور ہی ہے۔ جاؤ، جا کر ناشتہ کرو۔ گھنٹی بجنے میں صرف پانچ منٹ رہ گئے ہیں۔"

"مجھے تصوف کی غرض و غایت بتایئے۔"

"اس مسئلے پر پھر کبھی گفتگو ہوگی۔ اپنے کمرے میں جاؤ اور اس نیت سے ناشتہ کرو کہ ناشتہ کرنے سے تمہارے اندر دینی تعلیم حاصل کرنے اور احکاماتِ خداوندی پر عمل پیرا ہونے کی طاقت آئے گی۔ یہ تصوف کا پہلا اصول ہے۔ نیت درست کرلو اور جو کام بھی کرو، اس میں رضائے الٰہی کو مقدم رکھو۔ تمہارا ہر فعل عبادت بن جائے گا۔"

میں اپنے کمرے میں گیا تو یہ عالم تھا کہ سینے میں بھونچال سا آیا ہوا تھا۔ پچیس لاکھ کے وہ نوٹ ذہن میں گردش کر رہے تھے، جنہیں اپنے کمرے کی میز پر گڈیوں کی صورت میں چھوڑ آیا تھا۔ دولت خود چل کر ہمارے گھر تک آئی تھی۔ فضیلہ کے ابو نے کسی حد تک ابو کو رضامند کر لیا تھا۔ ایک بار اُنہیں یقین ہو جاتا کہ نوٹ جعلی نہیں ہیں، پھر دنیا کی کوئی طاقت بھی ہمیں دولت مند بننے سے نہیں روک سکتی تھی۔ دوسری طرف نالے کی دکانوں والے اُس پاگل کا خیال آ رہا تھا، جو پاگل نہیں تھا، کوئی بہت ہی اُونچی چیز تھا۔

میں کہتا تھا کہ رانی، رانی نہیں ہے تو لوگ ہنس پڑتے تھے۔ لیکن حالات و واقعات نے ثابت کر دیا تھا کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو ہوتے تو کچھ اور ہیں اور نظر کچھ اور ہی آتے ہیں۔ صدر مدرس کی باتیں بھی یاد آ رہی تھیں۔ خود تو صوفی، صافی بن گئے تھے، لیکن مجھے صاف ٹال دیا تھا۔ فرمایا تھا، تمہیں تصوف کی غرض و غایت ہی نہیں معلوم۔ اپنی دانست میں اُنہوں نے مجھے جاہل اجہل سمجھ کر تصوف کے پہلے اصول کے طور پر نیت درست کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ اپنی اس بات کا کوئی علم نہیں کہ مدرسے میں آنے سے قبل میں نے اسکول میں دینیات کی مس سے ''اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے'' والی حدیث شریف نہ صرف سنی تھی بلکہ اسکول میں منعقد ہونے والے ایک تقریری مقابلے میں اسی موضوع پر ایک دھواں دھار تقریر کر کے داد بھی وصول کی تھی۔

کمرے میں اس وقت پہنچا، جب اسکول کی گھنٹی بج رہی تھی۔ حافظ حسب معمول مدرسے کے مطبخ سے اپنے ساتھ میرا ناشتہ بھی لے آیا تھا، جو تپائی پر رکھے رکھے برف کی طرح ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ میں نے جلدی جلدی لقمے حلق کے نیچے اُتارے اور کتابیں سنبھال کر مدرسے کے جماعتوں والے حصے کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہاں کا طریقۂ تعلیم اسکول سے بالکل مختلف تھا۔ اسکول میں سبق پڑھایا جاتا تھا، کمزور طلباء پر تھوڑی بہت انفرادی توجہ بھی دی جاتی تھی، پھر ہوم ورک دے کر سمجھ لیا جاتا تھا کہ وہ سبق سب کو سمجھ میں آ گیا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ چھوٹے بچوں کا ہوم ورک اُن کی ماؤں یا ٹیوٹرز کو کرنا پڑتا تھا۔ اور بڑے گائیڈ کی مدد سے یا دوستوں کی کاپیوں سے نقل کر کے ٹیچرز کی نظروں میں سرخرو ہو جاتے تھے۔ سبق مدرسے میں بھی پڑھایا جاتا تھا۔ فرق یہ تھا کہ سبق فرداً فرداً ہر طالب علم کو نئے سرے سے پڑھانا پڑتا تھا۔ یہ ایسا شاندار طریقہ تھا کہ غبی سے غبی طالب

علم بھی سبق کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیتا تھا۔

بھائی جان دو روز بعد شام کے وقت میرے پاس آئے۔ اُن کے چہرے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ کچھ بھی نہیں ہوا۔ پھر بھی میں نے بے چینی سے پوچھا۔ ''کیا ہوا؟''

''ابو کی دُور بینی اور دُور اندیشی کام آ گئی۔ ورنہ اس وقت ہم جیل میں ہوتے۔''

''کیوں؟'' مجھے پیروں تلے زمین کھسکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ ''نوٹ جعلی تھے؟''

''بالکل اصلی تھے، مگر چوری کے تھے۔'' بھائی جان نے بتایا۔ ''تقریباً تین ماہ قبل ایک سرمایہ دار نے اپنے بینک کو مطلع کیا تھا کہ اگلے روز اُسے ساٹھ لاکھ روپے نکلوانا ہیں۔ بینک منیجر نے اپنے ہیڈ آفس کو اطلاع دی۔ دوسرے دن رقم تقسیم کرنے والی گاڑی اُس بینک کے لیے ساٹھ لاکھ روپے معمول کی رقم کے علاوہ لائی۔ رقم کو گن کر والٹ میں رکھ دیا گیا اور گاڑی کے انچارج کو وصولیابی کی رسید دے دی گئی۔ دوپہر کو سرمایہ دار ساٹھ لاکھ کا چیک لے کر آیا۔ اُسے دینے کے لیے والٹ سے رقم نکالی گئی تو اُس میں سے پورے پچیس لاکھ روپے کم تھے۔ بینک میں تہلکہ مچ گیا۔ افسرانِ بالا پہنچ گئے۔ بینک کے چپے چپے کو چھان ڈالا گیا۔ بینک منیجر کو پولیس کے حوالے کر دیا گیا۔ ہر ممکن دوڑ دھوپ اور انکوائری کے باوجود گم شدہ نوٹوں کا کوئی پتہ نہیں چل سکا۔ ملک بھر کے بینکوں کو سرکلر کے ذریعے نوٹوں کے نمبروں سے آگاہ کر دیا گیا۔ لیکن نوٹ کسی بینک میں نہیں پہنچے۔ پہنچتے کیسے؟ وہ تو ہمارے گھر میں تمہارے فرش کے نیچے ایک مٹکے میں رکھے ہوئے تھے۔''

''تفصیلات کس طرح معلوم ہوئیں؟''

''فضیلہ کے ابو کے ذریعے۔ وہ تو شروع سے بضد تھے کہ اللہ نے چھپّر پھاڑ کر رقم دی ہے مگر ابو نے کہا۔ جب تک مجھے کلی اطمینان نہیں ہو جائے گا، نہ خود کسی نوٹ کو ہاتھ لگاؤں گا اور نہ کسی کو ہاتھ لگانے دوں گا۔ پھر وہ اپنے بینک سے اسٹیٹ بنک کے جاری کردہ اُن سرکلرز کی فوٹو کاپیاں گھر لے کر آئے، جن میں پچھلے ایک سال کے دوران بینکوں سے لوٹے جانے والے نوٹوں کے نمبر درج تھے۔ انہی میں ایک سرکلر ایسا بھی تھا، جس کے درج شدہ نمبروں کو تمہارے کمرے کے نوٹوں کے نمبروں سے ملایا گیا تو ایک نوٹ بھی ایسا نہ نکلا جو چوری کا نہ ہو۔ ابو نے اسی پر بس نہیں کی، یہ بھی پتہ کیا کہ نوٹ کس طرح غائب ہوئے تھے اور اس طرح ساری کہانی معلوم ہوئی جو میں تمہیں بتا چکا ہوں۔''

میری ساری آرزوؤں اور تمناؤں کا خون ہو گیا، حسرتیں پامال ہو گئیں۔ مکار ترشولی نے ہمیں مٹانے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی تھی۔

''گویا......اب ہمارے لیے......'' میں نے تھوک نگل کر کہا۔ ''پچیس لاکھ کے نوٹوں کی حیثیت ردّی سے زیادہ نہیں ہے؟''

''ابو کا خیال تھا کہ رات کے وقت ان نوٹوں کو کسی جگہ پھینک دیا جائے۔ لیکن فضیلہ کے
جو اس واقعہ سے پہلے ابو کو ملاحیا سناتے تھے، نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ ''دیکھ لیے جانے
خطرہ ہے۔ کسی نے نوٹوں کو پھینکتے یا جلاتے دیکھ لیا تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ ہر نوٹ ا
جگہ پر گرفتاری کے وارنٹ سے کم نہیں ہے۔ پس ان کے ہی مشورے پر تمہارے ہی کمرے
ان نوٹوں کو جلا کر راکھ کر دیا گیا اور راکھ کو اسی گڑھے میں دبا دیا گیا۔

''ترشولی......'' بھائی جان کے جانے کے بعد میں نے پوری قوت سے ہوا میں مُکا لہر
اور اُس کی جھونک میں کرتے کرتے بچا۔ ''ہم نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟ آخر تم ہمیں تباہ کرنے
کیوں تُل گئی ہو؟''

کوئی آواز نہیں آئی۔ کوئی سایہ نظر نہیں آیا۔ کوئی سرسراہٹ نہیں ہوئی۔

عشاء کی اذان ہو رہی تھی، اس لیے میں مدرسے کی مسجد میں نماز ادا کرنے چلا گیا۔ فرائض
کی ادائیگی کے بعد دو رکعت نماز سنت مؤکدہ ادا کر رہا تھا کہ اچانک ایک خیال نے مجھے بے چین
کر دیا۔ بینک سے غائب ہونے والے نوٹوں میں سے ایک نوٹ فضیلہ کے ابو نے اچھی طرح
جائزہ لینے کے لیے نکالا تھا اور گڈی میں واپس رکھنے کے بجائے رکشہ کے کرائے کے لیے مجھے
دے دیا تھا، جو میں نے کرایہ ادا کرنے کے لیے صدر مدرس صاحب سے بھنایا تھا۔ وہ نوٹ
نوٹ نہیں تھا بلکہ جیسا کہ بھائی جان نے ارشاد فرمایا کہ گرفتاری کا وارنٹ تھا۔ ضروری تھا کہ جس
طرح ابو جان نے چوبیس لاکھ ننانوے ہزار نو سو روپے کے نوٹوں کو جلا کر ضائع کر دیا تھا، اسی طرح
اس نوٹ کو بھی ضائع کر دیا جائے۔

مدرس صاحب کو تلاش کیا، نظر نہیں آئے تو مؤذن سے پوچھا۔

''بڑے مولوی صاحب کہاں ہیں؟''

''مغرب کی نماز کے بعد تھانے سے دو کانسٹیبل اُنہیں بلانے آئے تھے۔ تھانیدار کو کوئی
مسئلہ پوچھنا تھا۔ ابھی تک واپسی نہیں ہوئی۔ شاید وہیں تھانے کی مسجد میں نماز ادا کر رہے ہوں
گے۔''

انسان کا تخیل، رائی کو پہاڑ بنا دیتا ہے۔ لیکن مؤذن نے جو کچھ بتایا تھا، وہ بذاتِ خود
ہمالیہ سے کم نہیں تھا۔ ظاہر ہے، جو نوٹ میں نے صدر مدرس صاحب کو دیا تھا، وہ اس لیے تو نہیں
تھا کہ تجوری میں سینت کر رکھا جائے مدرسے کے چھوٹے موٹے درجنوں اخراجات تھے۔ صرف
مطبخ کا خرچ ہی بہت زیادہ تھا۔ اُنہوں نے وہ نوٹ مدرسے کی کسی مد میں خرچ کیا ہو گا اور ا
دُکاندار سے دوسرے دُکاندار تک، اور دوسرے سے تیسرے تک اور تیسرے سے کسی ا
دُکاندار تک پہنچا ہو گا، جو روزمرہ کی آمدنی بینک میں جمع کرانے کا عادی ہو گا۔ بینک میں جا

ہی نوٹ پکڑا گیا ہو گا اور جن جن ہاتھوں سے وہ نوٹ گزرا تھا، پولیس باری باری سب کو تھانے
میں بلا کر بٹھا چکی ہو گی۔ سب سے آخر میں صدر مدرس صاحب کی باری آئی تھی۔ اس لیے مغرب
کے بعد مسئلہ پوچھنے کے بہانے اُنہیں بھی وہاں طلب کر لیا گیا تھا۔

میں نے سوچا کہ اس سے پہلے کہ پولیس مجھ تک پہنچے اور دریافت کرے کہ وہ نوٹ میرے
پاس کہاں سے آیا تھا، مدرسے کو چھوڑ چھاڑ کر کسی جنگل یا دیہات کا رُخ کروں۔ پھر سوچا کہ
حالات کا مردانہ وار مقابلہ کروں اور پولیس کی آمد سے قبل تھانے پہنچ جاؤں اور اُنہیں بتا دوں کہ
وہ نوٹ مجھے میدان میں پڑا ہوا ملا تھا۔ بات جھوٹ تھی، لیکن اس کے علاوہ کوئی ایسا طریقہ نہیں تھا
جس پر عمل کر کے اپنی اور صدر مدرس کی گردن چھڑوانا ممکن ہوتا۔

مسجد سے نکل کر نالے کی دُکان کے قریب سے گزرتا ہوا تھانے کی طرف چل دیا۔ دُکانیں
مغرب کے بعد بند ہونا شروع ہو جاتی تھیں اور جوا کا دُکا کھلی رہتی تھیں، عشاء کی اذان کے ساتھ
وہ بھی بند ہو جاتی تھیں۔ اس وقت بھی ساری دُکانیں بند ہو چکی تھیں۔ نالے کا دُکانوں والا حصہ
تاریک پڑا ہوا تھا۔ میں خیالات میں گم تھا۔ اچانک کسی نے ایک زوردار چیخ کے ساتھ میری
ٹانگ پکڑ کر مجھے زمین پر گرا دیا۔ ساری پسلیاں چیخ گئیں۔ پیشانی پر گومڑ پڑ گیا۔

درد سے کراہتے ہوئے میں نے غصے کے ساتھ اُس شخص کی طرف دیکھا، جس نے میرے
گرنے کے باوجود میری ٹانگ نہیں چھوڑی تھی۔ اُس پر نظر پڑتے ہی سارا غصہ کافور ہو گیا۔ وہ
پاگل تھا، جو [illegible] نہیں تھا۔ اُس کی چمکتی ہوئی آنکھیں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں اور وہ
منہ پھاڑے اس طرح ہنس رہا تھا کہ اُس کے مسوڑے جن میں صرف ایک دانت تھا، صاف نظر آ
رہے تھے۔

''دیکھ کر نہیں چلا جاتا؟'' اُس نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

غلطی میری نہیں تھی۔ نہ میں اُس سے ٹکرایا تھا۔ خیالات میں گم ہونے کے باوجود مجھے راستے
کی اونچ نیچ کا خیال تھا۔ اُس نے جان بوجھ کر دُکان کے تختے کے نیچے سے باہر آتے ہوئے
میری ٹانگ پکڑ کر گرا دیا تھا اور بڑی ڈھٹائی کے ساتھ مجھ پر دیکھ کر نہ چلنے کا الزام لگا دیا تھا۔ صدر
مدرس نہ بتا چکے ہوتے کہ وہ پاگل، پاگل نہیں ہے تو میں یقیناً اُس کا منہ نوچ لیتا۔

''معاف کر دو بابا!'' میں نے اس طرح کہا جیسے واقعی قصور میرا ہو۔

اُس نے زور سے میری ٹانگ کو مروڑا۔ ''بچ گیا سالے! بال بال بچ گیا۔''

''ہاں بابا!'' میں نے کہا۔ ''واقعی میرا سر ٹوٹتے ٹوٹتے بچا تھا۔ ذرا سا اور آگے گرتا تو دُکان
کے نکلے ہوئے حصے سے ٹکرا کر سر کے کئی ٹکڑے ہو چکے ہوتے۔ ٹانگ تو چھوڑ دو بابا!''

''تیرے باپ نے تجھے بچا لیا۔''

"ہاں، میرے باپ!" میں نے گلوگیر آواز میں کہا۔ "تم نے مجھے بچا لیا۔"

وہ ہنستے ہنستے دوہرا ہو گیا۔ ٹانگ پھر بھی نہیں چھوڑی تھی۔

"تُو پورے کا پورا پک گیا تھا، سالے!" اس نے کہا۔ "مگر بچ گیا۔ بس تیرے پاؤں کی سب سے چھوٹی اُنگلی بچی۔" پتہ نہیں، وہ کہاں کی ہانک رہا تھا۔

"ہاں....... ہاں......." میں نے کہا۔ "یہ میری ٹانگ۔"

اچانک وہ سنجیدہ ہو گیا۔ "میری کمر میں گدگدی کرو۔"

"پہلے میری ٹانگ چھوڑو۔"

"پہلے گدگدی کرو۔"

جیسے تیسے سیدھا ہو کر میں نے اس کی کمر میں گدگدی کی۔ اس نے ایک جھٹکے سے میری ٹانگ چھوڑ دی اور سینے پر دوہتڑ مار مار کر رونے لگا۔

میں گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ "روتے کیوں ہو؟"

"ڈھیر سارے نوٹ تھے۔" وہ باقاعدہ سینہ کوبی کرنے لگا۔ "جعلی نہیں تھے....... چوری کے بھی نہیں تھے....... لیکن سالے نے سب کے سب جلا دیے۔"

"کیا؟" میں نے چیخ کر کہا۔

وہ زمین پر پچھاڑیں کھانے لگا۔ کئی راہگیر اکٹھے ہو گئے۔ ایک اکھڑ قسم کے مزدور نے آستین چڑھا کر میری طرف دیکھا۔ "فقیر کو تم نے رُلایا ہے؟"

"نہیں تو۔" میں نے کہا۔ "بابا تو خود ہی کبھی ہنسنے لگتے ہیں، کبھی رونے لگتے ہیں۔"

"ہاں، ہاں......." اُس پاگل نے، جو پاگل نہیں تھا، اپنے سر کو، سینے کو، پیٹ کو کوٹتے ہوئے کہا۔ "اسی نے مجھے رُلایا ہے۔ ایک دم اصلی نوٹ تھے۔ پہلے کہا جعلی ہیں، پھر کہا چوری کے ہیں، پھر اس سالے کے باپ نے اور اس سالے نے جو بڑا عقلمند بنا پھرتا تھا، اُس نے، جس سے بڑا گدھا آج تک کسی عورت نے پیدا نہیں کیا۔

"وہ نوٹ......." میں نے کھسیائی ہوئی آواز میں کہا۔ "وہ نوٹ چوری کے نہیں تھے بابا؟"

وہ اس بری طرح ڈکرایا، جیسے کوئی اُسے ذبح کر رہا ہو۔ "اسے مارو لوگو!....... دیکھو، یہ مجھے پھر تنگ کر رہا ہے۔"

"مانو گے نہیں؟" مزدور ہاتھ اُٹھا کر میری طرف لپکا۔

میں نے جست لگائی اور وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ ایک سیکنڈ کی بھی دیر ہو جاتی تو مزدور کا ایک ہی ہاتھ مجھے ڈھیر کر دیتا۔ دُکانوں کی پشت سے گزر کر ایک پارک کو پار کر کے میں نے ایک بڑا چکر لگایا اور واپس مدرسے کے دروازے پر پہنچ گیا۔

میں دروازے پر کھڑا سانسیں درست کر رہا تھا اور اُس طرف دیکھ رہا تھا، جہاں اس پاگل سے، جو پاگل نہیں تھا، میری مڈبھیڑ ہوئی تھی۔ وہاں اکٹھے ہونے والے راہگیر کبھی کے جا چکے تھے اور بابا بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ شاید وہ کسی دُکان کے تختوں کے نیچے جا لیٹا تھا۔ اُس کی مہمل باتیں بڑی معنی خیز تھیں۔ مجھے زمین پر گرنے سے اتنی تکلیف نہیں پہنچی تھی، جتنی تکلیف اُس کی باتوں سے ہوئی تھی۔

دھڑکتے دل کے ساتھ ایک بار پھر اُس سے ملنے کے لیے میں نے نالے پر بنی ہوئی دُکانوں کی طرف قدم بڑھائے۔ چند قدم چلا تھا کہ صدر مدرس صاحب نظر آئے۔ وہ خراماں خراماں مدرسے کی طرف چلے آ رہے تھے۔

"کہاں سے تشریف لا رہے ہیں حضرت؟" میں نے اُن کا استقبال کرتے ہوئے پوچھا۔

"پولیس اسٹیشن گیا تھا۔" انہوں نے بتایا۔ "تھانیدار کو ایک مسئلہ پوچھنا تھا۔"

"گستاخی کی معافی چاہتا ہوں حضرت! آپ تو کہا کرتے ہیں کہ جسے مسئلہ پوچھنا ہو، وہ یہاں مدرسے میں آ کر پوچھے۔ کسی کے پاس جا کر مسئلہ بتانا آپ کے نزدیک معلم اور علم دونوں کی توہین ہے۔"

وہ مسکراتے ہوئے مدرسے میں داخل ہو گئے اور اپنے دفتر کی طرف بڑھتے ہوئے بولے۔

"پولیس کا محکمہ اس شرط سے مستثنیٰ ہے۔"

"کیوں، اُن کے ساتھ یہ خصوصی رعایت کیوں ہے؟"

"کیونکہ اس محکمے میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہے، جن کے دل سیاہ پڑ چکے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ مدرسے کے طلباء تک ان کی خباثت کا اثر پہنچے۔"

"کسی کی خباثت کا طلباء تک اثر کیسے پہنچ سکتا ہے، حضرت؟"

اُنہوں نے اپنے دفتر کا تالا کھولا، اندر گئے، اپنی فرشی نشست پر بیٹھے، مجھے سامنے دری پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور بولے۔ "کسی عطر فروش کی دُکان پر گئے ہو؟"

"کئی بار گیا ہوں۔"

"اس کی دُکان کا گوشہ گوشہ اور اُس کے اپنے جسم کا ایک ایک عضو خوشبو سے مہکتا رہتا ہے۔ ایسا شخص مدرسے میں آئے تو چاہے کسی کو عطر دے نہ دے، لیکن اپنی خوشبو سے معطر تو ہو کر ہی جائے گا۔"

"بجا ارشاد فرماتے ہیں۔"

"لیکن......." انہوں نے کہا۔ "مگر کوئی کوئلہ فروش کوئلے کی سیاہ گرد میں اٹا ہوا جسم اور کپڑے لے کر آئے تو کسی کو کالک نہ دینے کے باوجود مدرسے کے کئی حصوں اور اپنے قریب

کھڑے ہونے والے لڑکوں کو اپنی سیاہی کا تھوڑا بہت حصہ ضرور دے جائے گا۔ میں سمجھتا ہوں ان دو مثالوں کے بعد مزید تشریح کی کوئی ضرورت نہیں۔ ماشاءاللہ عقل مند اور ذہین ہو۔ سمجھ گئے ہو گے کہ ہمارے بڑوں نے ہمیں اچھے لوگوں کے ساتھ بیٹھنے اور خراب لوگوں سے دُور رہنے کا مشورہ کیوں دیا ہے۔ اسی اصول پر عمل کرتے ہوئے میری ہر ممکن کوشش ہوتی ہے کہ میں اپنے طلباء کو کوئلہ فروشوں کی کالک سے بچاؤں۔"

وہ خاموش ہو گئے اور میں اُن کے سامنے بیٹھا پیروں کی اُنگلیوں سے کھیلتا رہا۔

"کچھ اور دریافت کرنا چاہتے ہو؟" اُنھوں نے پوچھا۔

"ناگوارِ خاطر نہ ہو تو اتنی بات اور بتا دیجیے کہ چند روز قبل رکشہ ڈرائیور کو کرایہ دینے کے سلسلے میں حضرت نے میرا ایک سو روپے والا نوٹ بھنایا تھا۔ معلوم یہ کرنا ہے کہ وہ نوٹ ابھی حضور کے پاس موجود ہے یا......"

"میرے خیال میں تو موجود ہے۔"

"اگر موجود ہے تو کیا ایک دن کے لیے مل سکتا ہے؟"

"وجہ دریافت نہیں کروں گا۔" اُنھوں نے ارشاد فرمایا۔ "کیونکہ تم اصل بات نہیں بتاؤ گے اور کوئی جھوٹا بہانہ بنا دو گے اور جھوٹوں پر اللہ کی لعنت آئی ہے۔ اس لیے میں نہیں چاہتا کہ تم پر لعنت پڑے۔ ہاں، وہ نوٹ میں تمھیں ایک دن کے لیے دے سکتا ہوں۔"

⊛

مین روڈ پر پہنچا تو مجھے اپنے گھر کی طرف جانے والی بس مل گئی۔ گیارہ بجے کے لگ بھگ گھر پہنچا۔ پورا گھر سائیں سائیں کر رہا تھا۔ ابا جان اور بھائی جان سو چکے تھے۔ فضیلہ کے گھر میں روشنی ہو رہی تھی۔

میں نے فضیلہ کے گھر کی گھنٹی بجا دی۔ دروازے پر فضیلہ کے ابو تشریف لائے اور وہ مجھے دیکھ کر حیرت زدہ ہو گئے۔

"آؤ...... گھر میں آ جاؤ۔"

"تنہائی میں بات کرنا چاہتا ہوں۔"

وہ مجھے اپنے کمرے میں لے گئے۔ میں نے بغیر تمہید باندھے کہا۔

"ہمارے مدرسے کے سامنے نالے پر بنی ہوئی دُکانوں کے پاس ایک پاگل پڑا رہتا ہے مگر ہمارے صدر مدرس کہتے ہیں کہ وہ پاگل نہیں ہے۔ انھوں نے اپنا ایک قصہ بھی سنایا تھا۔ وہ قصہ پھر کبھی سناؤں گا۔ بس اتنا سمجھ لیجیے کہ اس قصے کے مطابق وہ پاگل بہت ہی پہنچا ہوا شخص ہے۔"

"مجذوب ہو گا؟"

"مجھے نہیں معلوم کہ مجذوب کیا ہوتا ہے۔ اور اتنا وقت بھی نہیں کہ آپ سے مجذوب کا مطلب پوچھوں۔" میں نے کہا۔ "وہ جو کوئی بھی ہے، بڑا عجیب آدمی ہے۔ آج عشاء کے وقت اس نے مجھے پکڑ لیا۔ یہ جو میرے ماتھے پر گومڑ نظر آ رہا ہے، اُسی کا لگایا ہوا ہے۔ کہنے لگا کہ تمھارے باپ نے وہ نوٹ جلا دیے، جو نہ چوری کے تھے، نہ جعلی تھے۔"

فضیلہ کے ابو سنبھل کر بیٹھ گئے۔ "اُسے نوٹوں کے بارے میں تم نے بتایا تھا؟"

"چاہے جیسی مرضی قسم لے لیجیے، میں نے تو ایک لفظ تک نہیں کہا۔ بس وہ از خود الاپنے لگا کہ، سالے نے اچھے بھلے، ٹھیک ٹھاک نوٹ جلا کر رکھ کر دیے۔"

"اُسے کیسے معلوم ہوا کہ نوٹ جلائے گئے ہیں؟"

"مجھے کیا معلوم؟"

"پھر تو وہ یقیناً مجذوب ہی معلوم ہوتا ہے۔" اچانک وہ اُچھل کر کھڑے ہو گئے۔ "اور وہ مجذوب کہہ رہا تھا کہ وہ نوٹ چوری کے نہیں تھے؟"

"جی ہاں۔" میں نے کہا۔ "اُس کی یہی رَٹ تھی کہ جو نوٹ جعلی نہیں تھے، چوری کے بھی نہیں تھے، اُنھیں جلا کر ضائع کر دیا گیا۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ میں نے خود تمھارے ابا کے فراہم کردہ نمبروں سے ان نوٹوں کو ملایا تھا۔"

"میرا ابھی یہی خیال ہے کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ مگر وہ پاگل، جو پاگل نہیں ہے، یہ کہہ رہا تھا۔" میں نے صدر مدرس صاحب سے واپس لیا ہوا نوٹ جیب سے نکال کر فضیلہ کے ابو کی طرف بڑھایا۔ "یہ انہی نوٹوں میں سے ایک نوٹ ہے، جو آپ نے یہ دیکھنے کے لیے نکالا تھا کہ جعلی تو نہیں ہے۔ صبح کو ابو سے چوری شدہ نوٹوں کی لسٹ لے کر ایک بار اس کے نمبر کو بھی ملا کر دیکھ لیں۔ ایسا ہو تو نہیں سکتا کہ آپ، ابو، بھائی جان تینوں آدمیوں نے نمبر ملائے ہوں اور ان سے کوئی غلطی ہوئی ہو۔ لیکن وہ پاگل جو پاگل نہیں ہے......"

"بلغ کا بچہ غوطہ نہیں کھا سکتا۔" فضیلہ کے ابو نے ہاتھ مسلتے ہوئے درمیان ہی سے میری بات کاٹ دی۔ "میں نے گیارہ سال تک اسٹیٹ بینک کی ملازمت کی ہے۔ ایک میل دُور سے نوٹ دیکھ کر بتا سکتا ہوں...... مگر ٹھہرو۔"

میں خاموش بیٹھا اُن کا چہرہ تک رہا تھا۔ "ٹھہرو" کا لفظ اُنھوں نے میرے لیے استعمال نہیں کیا تھا، اپنے آپ سے مخاطب ہو کر کیا تھا اور اس کے بعد اگلے جو جملے بولے، وہ بھی خود کلامی والے تھے۔ "اگر وہ پاگل نہیں ہے، مجذوب ہے، اور یقیناً مجذوب ہی ہے۔ مجذوب نہ ہوتا تو اسے کیسے معلوم ہوتا کہ نوٹ جلائے گئے ہیں۔ ہو سکتا ہے...... ہاں، ہو سکتا ہے ہم سے غلطی ہوئی ہو۔ ہم نے...... لسٹ تو میرے پاس ہی پڑی ہے...... ابھی دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی

ہو جاتا ہے۔"

انہوں نے وحشیوں کی طرح الماری کھولی، الماری کے سارے کپڑے فرش پر بکھیر دیے، پھر میز کی درازیں کھولیں اور اس کے کپڑے چاروں طرف پھیلا دیے۔ آخر میں انہیں ایک لسٹ نظر آئی۔ لسٹ لے کر وہ کرسی پر بیٹھ گئے۔ پہلے میرے دیے ہوئے نوٹ کو دیکھا، پھر لسٹ کو دیکھا۔ پھر نوٹ کو دیکھا اور پھر لسٹ کو دیکھا۔ پھر لسٹ اور نوٹ دونوں کو پھینک پھانک کر دونوں ہاتھوں سے منہ کو دبالیا۔ یوں لگا جیسے وہ منہ سے کسی چیز کو نکلنے سے روک رہے ہوں۔ روکنے کے باوجود سینے اور حلق سے ایسی آواز نکلی گویا ایک ایک کر کے کسی کار کے چاروں ٹائر برسٹ ہو گئے ہوں۔ منہ دبا ہوا نہ ہوتا تو دُور تک ان کی چیخوں کی آوازیں سنائی دیتیں۔ اُن کی یہ حالت دیکھ کر میرے لیے یہ سمجھنا بھی مشکل نہ رہا کہ اچھے بھلے نوٹ تین عقل مندوں نے خواہ مخواہ نذرِ آتش کر دیے۔

بعد میں جب وہ دل کھول کر آہیں بھر چکے اور ٹھنڈے پانی کا ایک گلاس حلق سے نیچے اُتار چکے تو اُنہوں نے وضاحت کی کہ نوٹ مختلف سیریز میں چھاپے جاتے ہیں۔ متعدد نوٹ ایک ہی نمبر کے ہو سکتے ہیں، لیکن ان کی سیریز الگ الگ ہوتی ہے۔ ابو بینک سے گم شدہ نوٹوں کی جو فہرست لائے تھے، وہ این ایس سیریز کے تھے۔ جبکہ کمرے کے فرش کے نیچے جو نوٹ برآمد ہوئے تھے، اُن کی سیریز ایم ایس تھی۔ فضیلہ کے ابو کے علاوہ کسی اور نے سیریز پر توجہ نہیں دی تھی۔ لیکن جب نمبر ملانے بیٹھے تو ایم فہرست میں تھا جو نمبر ملاتے وقت خود بخود این بن گیا۔ نمبر بھی بار ملائے گئے، لیکن ایک طائرانہ نظر ڈالنے کے علاوہ کسی نے سیریز کے حروف کو باقاعدہ نہیں ملایا۔

"میں تمہارے ابو یا بھائی سے اس کا ذکر نہیں کروں گا۔" فضیلہ کے ابو نے کہا۔ "تم بھی کوئی ذکر مت کرنا۔ دونوں کے دل ٹوٹ جائیں گے۔ تمہارے بھائی کے دماغ پر تو بہت ہی برا اثر پڑے گا۔ اس بے چارے نے بڑے بڑے منصوبے بنائے تھے۔ اُسے جب معلوم ہو گا کہ ہم نے جو نوٹ جلا دیے ہیں، وہ چوری کے نہیں تھے تو اس کی حالت غیر ہو جائے گی۔ حالت تو میری بھی غیر ہو چکی ہے، لیکن وہ لڑکا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ گھر آئی لکشمی کے ساتھ کیے جانے والے سلوک کے باعث اپنا ذہنی توازن برقرار نہ رکھ سکے۔"

⊛

میں گلی سے نکل کر سڑک پر پہنچا۔ کھمبے کے قریب ایک رکشہ سے سواریاں اُتر رہی تھیں۔ رکشے والے نے استفہامیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے جیب کا جائزہ لیا۔ فضیلہ کے ابو نے سو روپے کا نوٹ واپس کر دیا تھا۔

میں نے مدرسے کا نام و پتہ بتاتے ہوئے رکشہ ڈرائیور سے کہا۔ "رکشہ میں تو بعد میں بیٹھوں گا، پہلے یہ بتاؤ کہ سو کے نوٹ کو بھی بھنا سکو گے؟"

اُس نے فخریہ انداز میں کُرتے کی پھولی ہوئی جیب پر ہاتھ مارا۔ "بیٹھ جاؤ۔ آج تو میں تمہیں دو سو روپے کے نوٹ کا بھی کھلا دے سکتا ہوں۔"

اِدھر میں رکشے میں بیٹھا اور اُدھر نظر نہ آنے والے سائے، وہ تمام سائے اور سنائی نہ دینے والی سرسراہٹیں جو کافی عرصہ سے محسوس نہیں ہوئی تھیں، محسوس ہونے لگیں۔ آگے پیچھے، دائیں بائیں، اوپر نیچے جس طرف بھی نظر اُٹھتی، بھانت بھانت کے مہیب چہروں کا احساس ہوتا۔ رکشہ کی رفتار کے ساتھ ساتھ ہر گلی، ہر موڑ، ہر چوراہے سے سائے نکل رہے تھے اور جوق در جوق اس جلوس میں شامل ہوتے جا رہے تھے، جو میرے مدرسے کی جانب رواں دواں تھا۔ رکشہ ڈرائیور اُن کی موجودگی سے بے خبر اُڑا چلا جا رہا تھا۔ میں بھی اُن سے بے خبر ہو کر اپنی اُس پیاری بہن کے بارے میں سوچنا چاہتا تھا، جو آج مجھے ملی تھی۔ مگر سایوں کی عجیب و غریب حرکات و سکنات کے باعث اپنے ذہن کو کسی ایک تصور پر مرکوز نہیں کر پایا تھا۔

ایکا ایکی مجھ پر دہشت طاری ہونے لگی۔ مجھے اپنے محلے کے وہ عامل کامل صاحب یاد آنے لگے، جنہیں بیوی سمیت ڈاکوؤں نے قتل کر دیا تھا۔ اُس رات بھی تو اس طرح بے شمار سایوں نے اُن کے گھر کا رُخ کیا تھا، جس طرح آج رات ہر طرف سے اُمڈ آئے تھے۔ اُس رات بھی جدھر نظر پڑتی تھی، اُدھر سے سائے نکلتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔

"رکشہ روکو۔" میں نے خوف سے چلاتے ہوئے کہا۔ "ہم موت کے منہ میں جا رہے ہیں۔"

مجھے اصل بات سمجھنے، نتیجہ اخذ کرنے اور چلانے میں کافی دیر ہو گئی۔ اس سے پہلے کہ میرا جملہ مکمل ہوتا، ایک تیز رفتار ٹرک کسی گاڑی کو اوور ٹیک کرتا ہوا سامنے سے ہمارے رکشہ سے آ ٹکرایا۔ میں کئی فٹ اُچھلا اور اُڑتا ہوا فٹ پاتھ پر جا گرا اور چوٹ کے باعث بے ہوش ہو گیا۔

اگلے روز ہسپتال میں ہوش آیا تو معلوم ہوا، رکشہ کے پرخچے اور رکشہ ڈرائیور کے چیتھڑے اڑ گئے تھے۔ میں خوش قسمت تھا کہ مرنے سے بچ گیا۔

میرے بائیں ہاتھ کی ہڈی چٹخ گئی تھی۔ چہروں اور پیٹھ پر گہری خراشیں آئی تھیں۔ سر اس لیے پاش پاش نہیں ہو سکا تھا کہ فٹ پاتھ پر گرتے وقت میں ایک راہ گیر سے ٹکرایا تھا اور اُسے اپنے ساتھ لیے ہوئے اس طرح گرا تھا کہ میرا سر اُس کے پیٹ پر تھا۔ راہ گیر کے بھی چوٹیں آئی تھیں، لیکن اتنی معمولی تھیں کہ ہسپتال میں ہلکی سی مرہم پٹی کر کے اور گلوکوز کے آمیزے کا ایک گلاس پلا کر اُسے نصف گھنٹے کے اندر اندر رخصت کر دیا گیا تھا۔

مجھے ہسپتال میں دس دن تک رکھا گیا۔ وہاں کے قانون کے مطابق مریضوں سے ملاقات کی خاطر آنے والوں کے لیے صبح اور شام کے اوقات مقرر تھے۔ ایک بورڈ بھی لگا ہوا تھا، جس پر

پابندیٔ وقت کا خیال رکھنے کے لیے کہا گیا تھا۔ لیکن نہ آنے والے پابندی کا خیال رکھتے تھے اور نہ ہسپتال والے پابندی کراتے تھے۔ جس کی وجہ سے میرے پاس آنے جانے والوں کا تانتا سا لگا رہتا تھا۔ فضیلہ صبح کے وقت اپنے ابو کے ساتھ آتی تھی اور شام کو اپنی امی کے ساتھ۔ اور جب بھی آتی تھی، اپنے ساتھ کھانے پینے کا اتنا سامان اور اتنے پھل لے کر آتی تھی کہ عیادت کے لیے آنے والے دوسرے افراد انہیں ختم کرتے تھے۔

بھائی جان دوپہر کو لنچ کے وقفے میں آتے تھے اور عموماً میرے ہی ساتھ لنچ کیا کرتے تھے۔ ابو صرف صبح کو آتے تھے، کچھ دیر بیٹھتے تھے، حال احوال پوچھتے تھے اور پھر چلے جاتے تھے۔ پے در پے اندوہناک حادثات نے اُن کی کمر توڑ دی تھی۔ اُن کی اور فضیلہ کے ابو کی عمر میں بہت معمولی سا فرق تھا لیکن فضیلہ کے ابو اتنے صحت مند، سرخ و سفید تھے کہ فضیلہ کی امی ہنوز اولادِ نرینہ کی آس لگائے بیٹھی تھیں۔ جبکہ ابو اتنے بوڑھے اور کمزور ہو چکے تھے کہ چراغِ سحری معلوم ہوتے تھے۔

دو بار نورین آئی تھی۔ ایک بار اپنی امی کے ساتھ، ایک بار اکیلی لائسنس کے بغیر کار دوڑاتی ہوئی۔ کوئی پوچھنے والا نہیں تھا۔ دونوں بار چند منٹ سے زیادہ نہیں رُکی۔ مدرسے کے طلباء کے آنے جانے کا وقت مقرر نہیں تھا۔ جس کو جب چھٹی ملتی، ہسپتال بھاگا چلا آتا تھا کہ طرح طرح کی چیزیں کھانے کو ملیں گی۔ متعدد بار ایسے طالب علم بھی آئے، جن کی میں نے کبھی صورت تک نہیں دیکھی تھی۔

دس روز بعد ہسپتال سے چھٹی ہوئی تو بھائی جان گھر لے گئے۔ فضیلہ کے گھر والوں کو ایک روز پہلے ہی میری آمد کا علم ہو گیا تھا۔ انہوں نے جس خلوص اور محبت سے میرا خیر مقدم کیا، امی جان زندہ ہوتیں تو شاید اس سے زیادہ وہ بھی نہ کرتیں۔ پڑوسیوں نے کہا کہ فضیلہ کی ماں چارہ ڈال کر فضیلہ کے لیے ابھی سے لڑکے پھانس رہی ہے۔

ابو نے سنا تو مسکرا کر کہا۔ ”فضیلہ اچھی لڑکی ہے۔“

بھائی جان نے کہا۔ ”بہترین لڑکی ہے۔ سکندر چراغ لے کر ڈھونڈے، تب بھی اُسے اتنی نفیس لڑکی نہیں ملے گی۔“

میں نے کہا۔ ”فضیلہ تو میری بہن ہے۔ جو بات رخسانہ کے متعلق نہیں سوچ سکتا، وہ فضیلہ کے متعلق کیسے سوچ سکتا ہوں؟“

فضیلہ کی امی نے کہا۔ ”بہت ہو گیا فضیلہ! اب تم سکندر سے نہیں ملو گی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ محلے میں اتنی گندی ذہنیت کے لوگ رہتے ہیں۔“

میں دو روز بھی سکون سے گھر پر نہیں رہ سکا۔ بھائی جان سے جس طرح بھی بن پڑا، میرے

کمرے کے گڑھے کو پاٹ کر ٹائلز جما دیئے۔ اس کے باوجود کمرہ انتہائی غلیظ اور گھناؤنا معلوم ہو رہا تھا۔ ابو دُکان اور بھائی جان میڈیکل اسٹور پر جانے کے لیے صبح ہی صبح گھر سے نکل جاتے تھے اور شام سے پہلے واپس نہیں آتے تھے۔ دن بھر سارا گھر سائیں سائیں کرتا رہتا تھا۔ تھوڑی بہت رونق فضیلہ کے دم قدم سے ہو جاتی تھی، مگر پڑوس والوں کی خرافات سن کر اُس کی امی نے اُسے میرے پاس آنے سے روک دیا تھا اور صرف اسی پر بس نہیں کی تھی، بلکہ وہ مراعات بھی واپس لے لی تھیں، جو اُنہوں نے امی جان کی موت کے بعد ہم لوگوں کو دے رکھی تھیں۔

فضیلہ دو بار ماں کی نظروں سے چھپ کر اسٹول رکھ کر چھوٹی دیوار پر مجھ سے باتیں کرنے کے لیے چڑھی اور دونوں بار پکڑی گئی۔ آخری بار تو میں نے اُس کی امی کی آواز بھی سنی تھی۔ وہ فضیلہ پر ناراض ہوتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

”کتنی مرتبہ کہوں، سکندر تیرا بھائی نہیں ہے۔ اگر آئندہ میں نے تجھے دیوار کے قریب کھڑے دیکھا تو تیری دونوں ٹانگیں کاٹ کر گٹر میں پھینک دوں گی۔“

ان دنوں راتوں میں اگرچہ کسی سائے کا احساس نہیں ہوتا تھا اور کوئی سرسراہٹ سنائی نہیں دیتی تھی اور تاریکیوں میں کوئی خوف ناک، مہیب صورت نہیں اُبھرتی تھی، پھر بھی میرے لیے وہ دونوں راتیں جو میں نے گھر پر گزاریں، قیامت کی راتوں سے کم نہیں تھیں۔ بستر کانٹوں کا بن چکا تھا۔ کسی بھی پہلو چین نہیں تھا۔ رخسانہ گئی، میں نے رو رُلا کر اُس پر صبر کر لیا۔ امی گئیں تو یوں لگا جیسے سب کچھ لٹ گیا ہو۔ پھر بھی صبر آ گیا۔ لیکن فضیلہ کو کیسے صبر کرتا؟ فضیلہ تو زندہ تھی اور ہر بھائی کی طرح میری دعا تھی کہ وہ ہزار سال کی عمر پائے۔ بھلا زندہ کو بھی کسی نے صبر کیا ہے۔

دو دن اور دو راتیں گھر کی دوزخ میں گزارنے کے بعد تیسرے دن صبح میں نے اعلان کر دیا کہ میری پڑھائی کا نقصان ہو رہا ہے۔ میں مدرسے جاؤں گا۔ میری کمزوری اور نقاہت کے پیشِ نظر بھائی جان مجھے مدرسے چھوڑنے گئے۔ صدر مدرس صاحب مجھ سے بہت ناراض تھے۔ اُنہیں حادثے کا علم تھا اور طلباء سے یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ میں کسی استاد کی اجازت کے بغیر کمرے کی کھڑکی سے کود کر فرار ہوا تھا۔ وہ جاننا چاہتے تھے کہ میں رات گئے کہاں گیا تھا اور کیوں گیا تھا۔

میں نے کہا۔ ”حضرت! آپ چاہیں تو مجھے مدرسے سے نکال دیں لیکن میں آپ کو اصل بات نہیں بتاؤں گا۔ زیادہ سے زیادہ اتنا عرض کر سکتا ہوں کہ کوئی جرم، کوئی گناہ کرنے نہیں گیا تھا۔ اگر آپ کو اعتبار آ جائے تو درگزر فرمایئے۔ بصورت دیگر یہ سمجھ لیجیے کہ مجھے مدرسے سے نکالا گیا تو میں اپنا منحوس چہرہ لے کر گھر واپس نہیں جاؤں گا، یہاں سے سیدھا پُل کا رُخ کروں گا اور وہاں پہنچتے ہی نیچے کود کر دنیا کو اپنے ناپاک وجود سے پاک کر دوں گا۔“

”اگر تمہارا خیال ہے کہ میں تمہاری دھمکی سے ڈر جاؤں گا تو اُسے اپنے ذہن سے نکال دو۔

خودکشی سے مصائب ختم نہیں ہوتے، بڑھ جاتے ہیں۔ جس اذیت و کرب سے خودکشی کے وقت دوچار ہونا پڑتا ہے، وہ عارضی نہیں ہوتا کہ ایک بار تکلیف اٹھالی اور ہمیشہ کے لیے چھٹکارا مل گیا۔ بلکہ قیامت تک وہی تکلیف اور وہی اذیت جھیلنا پڑے گی۔ ڈوب کر خودکشی کرنے والے کو بار بار ڈبویا جاتا رہے گا اور زہر کھا کر زندگی ختم کرنے والے کو قیامت تک زہر کھلایا جاتا رہے گا۔ اس ضمن میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ جس کی خاطر خودکشی کی جاتی ہے، اس پر بھی کوئی خاص اثر نہیں ہوتا۔ وہ ایک دن معمولی سا غم کر کے دوبارہ اپنے کاموں میں معروف ہو جاتا ہے۔ زندگی تو خدا کی امانت ہے عزیزم! امانت کی حفاظت کی جاتی ہے، اسے ضائع نہیں کیا جاتا۔''

''مجھ پر دنیا کے سارے دروازے بند ہو چکے ہیں حضرت!''

''دروازے تو ہوتے ہی اس لیے ہیں کہ کبھی بند کیے جائیں اور کبھی کھولے جائیں۔ دروازے بند ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اب انہیں کھولا جائے گا۔ خزاں تو بہار کی پیامبر ہوتی ہے۔ کیا تم نے ایسی کوئی رات دیکھی ہے، جس کی صبح نہ ہوئی ہو؟''

''مدرسے سے نکالے جانے کا تصور بڑا روح فرسا ہے۔'' میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''انسان کا ذہن بھی خوب ہے۔ خود ہی ایک بات گھڑتا ہے اور خود ہی اس پر ایمان لے آتا ہے۔'' صدر مدرس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ ''میں نے کب کہا کہ تمہیں مدرسے سے نکالا جا رہا ہے؟ طلباء تو مہمانانِ رسولؐ ہوتے ہیں۔ ان کی شان میں کس طرح گستاخی کر سکتا ہوں؟''

مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے سوکھے ہوئے دھانوں میں پانی پڑ گیا ہو۔ دل کی عجیب سی کیفیت ہو گئی۔ اس کیفیت کے سامنے مسرت و انبساط تو بہت معمولی چیزیں تھیں۔

''لیکن۔'' اچانک اُن کی آواز میں سختی آگئی۔ ''علم کی طلب میں آئے ہو تو تمہیں کم از کم چار سال تک سارے دنیاوی تعلقات کو ختم کرنا پڑے گا۔ اپنا سارا وقت تعلیم پر صرف کرو گے، اپنے گھر یا اپنے اعزہ کے پاس صرف شادی یا موت کے وقت مختصر عرصے کے لیے جا سکو گے۔ اعزہ و احباب میں سے کوئی تم سے ملنے کے لیے آئے گا تو کچھ دیر گفتگو کر کے خوش اسلوبی سے اُسے رخصت کر دو گے۔ چار سال تک کوئی اخبار بھی نہیں پڑھو گے۔ اچھا تو یہ ہے کہ نصاب کی کتابوں کے علاوہ کوئی کتاب نہ دیکھو۔ تاہم کبھی دل اُکتانے لگے تو ایسی کتابیں پڑھ سکتے ہو، جن سے تمہاری معلومات میں کچھ اضافہ ہو۔''

مدرسہ میری آخری جائے پناہ تھی۔ میں نے مدرس صاحب کو صحیح معنوں میں طالب علم بن کر دکھا دیا۔ بھائی جان اے گریڈ میں پاس ہوئے۔ نورین کے ابو نے اس خوشی میں کہ ناساعد حالات کے باوجود بھائی جان نے شاندار کامیابی حاصل کی تھی، پورے شہر کے فنکاروں کو بلا کر عظیم الشان جشن منایا۔ بذاتِ خود مجھے مدعو کرنے آئے مگر میں نہیں گیا۔

دو بار فضیلہ کے ابو امی آئے کہ جو ہوا سو ہوا، اس پر خاک ڈالو، گھر آؤ۔ فضیلہ تمہیں بہت یاد کرتی ہے۔ میں نے انہیں ٹال دیا۔ رخسانہ کی برسی ہوئی، پھر امی کی برسی ہوئی۔ دونوں مرتبہ میں نے یہ کہہ کر معذرت چاہ لی کہ آپ سال کے سال رخسانہ اور امی کو ایصالِ ثواب کرتے رہیں جبکہ میں روزانہ پابندی سے قرآن و نوافل پڑھ کر ایصالِ ثواب کرتا رہتا ہوں۔

بھائی جان کا ایم بی بی ایس میں داخلہ ہوا۔ ایک بار پھر نورین کے ابو نے جشن منایا۔ اس بار خود آنے کی بجائے انہوں نے بھائی جان اور نورین کو میرے پاس بھیجا۔ میں نے دونوں کو مبارکباد دی۔ نورین کو چھیڑا کہ اب تم تو ڈاکٹری پڑھے بغیر ہی ڈاکٹرنی بن جاؤ گی۔ آخر میں اُن دونوں سے معافی مانگ لی کہ میں گھر نہیں آسکوں گا۔

اپنے خالی اوقات میں پراسرار علوم کی ان کتابوں کو، جو آسانی سے سمجھ میں آجاتی تھیں، پڑھا کرتا تھا۔ مدرسے کے دارالمطالعہ میں ایسی کتابیں تھیں، جو میرے مطلب کی تھیں۔ تعویذ گنڈوں سے زیادہ خاص طور پر وہ کتابیں جو عملیات پر تھیں، میرے لیے بہت زیادہ پُرکشش تھیں۔ ان کتابوں میں جنوں کو، پریوں کو، روحوں کو اور ہمزاد کو قبضے میں کرنے کے عمل بتائے گئے تھے۔ لیکن اتنے مشکل تھے کہ انہیں کوئی باشعور انسان انجام نہیں دے سکتا تھا۔

خطرات بھی بہت تھے۔ کیونکہ کوئی بھی آسانی سے کسی کے قبضے میں نہیں آتا۔ اس لیے ہر ممکن کوشش ہوتی ہے کہ جو شخص اسے قبضے میں کرنے کی فکر میں ہے، اس کو عمل پورا کرنے سے قبل ہی ختم کر دیا جائے۔ میں اس بات کا چشم دید گواہ تھا۔ کیونکہ رانی نے اُس عامل کو جو اُس پر قابض ہونا چاہتا تھا، قبرستان میں پلک جھپکتے میں ختم کر دیا تھا اور دس منٹ کے اندر اندر ایک انجانی نظر نہ آنے والی مخلوق اُسے چٹ کر گئی تھی۔

کتابوں میں حصار کھینچنے اور محفوظ رہنے کے طریقے بھی تحریر تھے۔ ایک بات اور بتاؤں، میں نے جتنی بھی کتابیں پڑھیں اُن میں کہیں بھی ترشولی کا نام نظر نہیں آیا۔ حد یہ کہ ان کتابوں کی بھی، جن کی ثقیل انگلش میری عقل و فہم سے بالاتر تھی، میں نے ایک ایک سطر اس امید میں دیکھ ڈالی کہ شاید ان میں کہیں ترشولی لکھا ہوا دکھائی دے جائے۔ کم از کم یہ نام تو میں پڑھ ہی سکتا تھا۔

حیرت یہ تھی کہ فادر کو یہ نام کہاں سے معلوم ہوا تھا؟ اور اُس نے میرے ہونٹوں کی حرکات سے اندازہ لگا کر اس نام کو کس طرح بوجھ لیا تھا۔ وہ یقیناً اس بات سے بے خبر نہیں رہا ہو گا کہ صرف ترشولی کا بدصورت گندا اور بوسیدہ جسم فرش کے نیچے دفن ہے، جبکہ اُس کی روح دنیا میں اِدھر اُدھر منڈلاتی پھر رہی ہے۔ گویا وہ ترشولی کو نہیں بلکہ اُس کے جسم کو آزاد کرانے آیا تھا۔ یہ کام نہیں کر سکا تھا، لیکن ہم دونوں بھائیوں نے خزانے کے لالچ میں ضرور انجام دے ڈالا تھا۔

شاید ترشولی بھی یہی چاہتی تھی کہ اُس کے جسم کو فرش کے نیچے سے نکال لیا جائے۔ فرش کی

کھدائی کے لیے اس نے جو طریقہ سوچا تھا، وہ بلاشبہ قابلِ تعریف تھا۔ دولت کی حرص نے انہیں
فرش کھودنے پر مجبور کر دیا تھا۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ مدفون جسم کے آزاد ہونے کے بعد
ترشولی کی مراد پوری ہو جاتی تھی۔ پھر فرش کے نیچے سے نوٹوں سے بھرا ہوا مٹکا کیوں برآمد ہوا تھا؟
یہی نہیں، ایک اور بات بھی تھی جس نے مجھے پریشان کر رکھا تھا۔ اس مدرسے سے بہت کم
باہر نکلتا تھا۔ شاذ و نادر ہی ضرورت کی کوئی چیز لینے کے لیے سامنے کی کسی دکان پر جاتا تھا۔ لیکن
جب بھی باہر جاتا، سرسراہٹیں محسوس ہونے لگتیں اور چاروں اطراف میں پھیلے ہوئے سایوں کا
احساس اُجاگر ہو جاتا۔ جبکہ مدرسے میں نہ سرسراہٹیں تھیں، نہ سائے۔ یا اگر تھیں تو محسوس نہیں
ہوتی تھیں۔

میرا یہ شک صدر مدرس صاحب کے دفتر میں اس وقت دُور ہوا جب میں اُن کی خدمت میں
بیٹھا حرف و نحو سمجھ رہا تھا۔ ایک صاحب اندر آئے اور صدر مدرس کے سامنے دوزانو بیٹھ کر ایسے تعویذ
کی درخواست کی، جس کی برکت سے گھر کی تمام بلائیں دُور ہو جائیں۔ صدر مدرس صاحب کے
استفسار پر انہوں نے بلاؤں کی تشریح کی کہ گھر کے لوگوں کو بری بری شکلیں نظر آتی ہیں، کبھی کھانے
پینے کی چیزوں میں غلاظت ڈال دی جاتی ہے اور کبھی گھر میں پتھر آنا شروع ہو جاتے ہیں۔

صدر مدرس نے کہا۔ "تعویذ گنڈے تو مجھے نہیں آتے۔ لیکن ایک آسان ترکیب بتاتا
ہوں۔ اس پر عمل کرو گے تو ان شاء اللہ ساری بلاؤں سے چھٹکارا پا لو گے۔ ترکیب یہ ہے کہ اپنے
گھر میں پاس پڑوس کے بچوں اور بچیوں کو قرآن پاک کی تعلیم دینا شروع کر دو۔"

چند دن کے بعد وہ صاحب دوبارہ تشریف لائے۔ اُن کے ہاتھ میں مٹھائی کا بڑا ڈبہ
انہوں نے صدر صاحب کی خدمت میں ڈبہ پیش کرتے ہوئے عرض کیا۔ "حضرت! ساری بلائیں
دُور ہو گئیں۔"

اُن کے جانے کے بعد صدر مدرس نے ساری مٹھائی اُن بچوں میں تقسیم کرا دی، جو دن
کسی اسکول میں پڑھتے تھے اور سہ پہر کو مدرسے میں ناظرہ پڑھنے آتے تھے۔ میرا اشکال دُور ہو
گیا۔ اصل وجہ سمجھ میں آ گئی کہ مدرسے میں سرسراہٹوں اور سایوں کا گزر کیوں نہیں تھا۔

صدر مدرس کا ذکر آتا ہے تو دل چاہتا ہے کہ ان ہی کا ذکر کیے جاؤں۔ بہت عظیم انسان
لیکن اپنے آپ کو ساری مخلوق سے کم تر سمجھتے تھے۔ حد تو یہ ہے کہ ایک بار مدرسے کے صحن میں
ایک بدصورت اور بدنما، خارش زدہ کتا آ گیا۔ طلباء اُسے مارنے دوڑے تو حضرت نے فرمایا۔

"ارے......ارے......یہ کیا کر رہے ہو؟"

لڑکے رُک گئے اور حضرت کا چہرہ دیکھنے لگے۔ انہوں نے کہا۔

"مارو نہیں، کوئی ہڈی وغیرہ دے کر پیار سے باہر نکال دو۔ ہو سکتا ہے کہ خارش زدہ

نابکار سے بہتر ہو، جسے تم اپنا صدر مدرس کہتے ہو۔"

⊛

دو سال اور گزر گئے۔ میں نے انٹر کا امتحان دیا۔ اور جب رزلٹ آیا تو نہ صرف میرا اے ون
گریڈ تھا بلکہ دوسری پوزیشن بھی حصے میں آئی تھی۔ رزلٹ کا اخبار بعد میں دیکھا، ریڈیو اور
اخبارات والے انٹرویو لینے اور فوٹو اُتارنے پہلے پہنچ گئے۔

ریڈیو کا تو پتہ نہیں کہ انٹرویو نشر ہوا کہ نہیں، البتہ اگلے روز جب اخبارات میں پہلی، دوسری،
اور تیسری پوزیشن والے طلباء و طالبات کے نام، فوٹو اور انٹرویو چھپے تو ابو اور بھائی جان کے جلو
میں تقریباً پورا محلہ مجھے مبارک باد دینے کے لیے مدرسے پر ٹوٹ پڑا۔

نورین پوزیشن تو نہیں لا سکی تھی لیکن اس نے اے گریڈ حاصل کیا تھا۔ صبح کے اخبارات میں
اُس نے پوزیشن ہولڈرز کی تصاویر دیکھ کر فوراً فضیلہ کو فون کیا کہ وہ ابو اور بھائی جان کو میری اس
عظیم کامیابی پر مطلع کر دے۔ فضیلہ نے بتایا کہ بھائی جی کی کامیابی کی اطلاع تڑکے ہی پہنچ گئی
تھی۔ اس وقت تو اس کے ابو سمیت سب لوگ مدرسے گئے ہوئے ہیں۔

نورین نے پوچھا۔ "وہ لوگ سکندر کو گھر لے کر آئیں گے یا نہیں؟"

"پتہ نہیں۔" فضیلہ رو پڑی۔ "بھائی جی تو ہم سے خفا ہیں۔"

نورین نے فون رکھ دیا اور اپنی امی سے کہا۔ "میں سکندر کو مبارک باد دینے جا رہی ہوں۔"

یہ کہہ کر کار سنبھالی اور تیز رفتاری سے مدرسے کی سمت روانہ ہو گئی۔

دوسری طرف اسکول کی پرنسپل نے اخبار میں میرا نام اور فوٹو دیکھا تو فوراً فرسٹ اسسٹنٹ کو
طلب کر لیا۔

"غور سے دیکھو...... یہ لڑکا، جس کی داڑھی مونچھیں پھوٹ رہی ہیں، وہی سکندر تو نہیں، جو
ہمارے اسکول میں پڑھتا تھا؟"

فرسٹ اسسٹنٹ نے تائید کی تو انہوں نے مدرسے فون کیا کہ اصل چیز بنیاد ہوتی ہے۔
سکندر کی بنیاد ہم نے رکھی ہے، اس کی کامیابی کا سارا کریڈٹ تمہیں نہیں لینا چاہیے۔"

اُن کا فون مدرسے کے منشی نے وصول کیا تھا۔ اُس نے کہا۔ "آپ ہی بتائیں کہ موجودہ
حالات میں ہم کیا کریں؟"

"اخبار والوں کو بتا دو کہ ہمارے اسکول کی اعلیٰ تعلیم و تربیت کی بدولت سکندر نے انٹر میں
پوزیشن لی ہے۔"

میڈم نے اسی پر بس نہیں کی، شہر میں جتنے بھی روزنامے شائع ہوتے تھے، انہوں نے فرداً
فرداً ہر روزنامے کو فون کیا۔

"پوزیشن لانے والا سکندر، کے جی سے نویں جماعت تک ہمارے ہاں پڑھتا رہا ہے۔ کتنا ظلم ہے کہ ہم نے اُسے برسوں پڑھایا، لیکن خبروں میں ہمارا کوئی ذکر نہیں۔ تعریف اُس مدرسے کی ہو رہی ہے، جہاں اس نے چار سال سے بھی کم عرصے تک تعلیم حاصل کی۔"

انہوں نے ایڈیٹروں کو یہ بھی بتایا کہ اسکول کی انتظامیہ اپنے ہونہار شاگرد سکندر کو، جس نے اسکول کا نام روشن کیا ہے، بیش قیمت طلائی گھڑی اور اعلیٰ کارکردگی کی سند دینے کا فیصلہ کر چکی ہے۔ آخر میں میڈم نے ایڈیٹروں سے درخواست کی کہ اگلے روز شائع ہونے والے اخبارات میں اُن کے اسکول کی بے لوث اور بے غرض خدمات کا ضرور ذکر کیا جائے۔ کیونکہ سکندر کی تعلیم و تربیت اور ذہنی نشو و نما کو اُجاگر کرنے میں ہم نے بھرپور کردار ادا کیا ہے۔

تقریباً ایک سال قبل جب فرسٹ ایئر کا نتیجہ آیا تھا، میں نے ایک بار پھر مدرس صاحب سے بیعت ہونے کی درخواست کی تھی۔ اُس وقت تک دوسرے اساتذہ کے ذریعے مجھے تصوف کی غرض و غایت معلوم ہو چکی تھی۔ میری درخواست کے جواب میں صدر مدرس صاحب نے دریافت کیا۔ "کیوں بیعت ہونا چاہتے ہو؟ سربلندی کے لیے، دولت کے لیے یا کرامت کے لیے؟"

میں نے مختصر سا جواب دیا۔ "صرف رضائے الٰہی کے لیے۔"

میرا جواب سن کر صدر مدرس صاحب خوش ہو گئے۔ اُنہوں نے پیار سے میرے شانوں کو تھپکتے ہوئے فرمایا۔ "تم نے تصوف کا بالکل صحیح مطلب سمجھا ہے۔ انٹر پاس کر لو۔ اس کے بعد بھی اگر تمہارے دل میں تصوف کی تعلیم حاصل کرنے کی کسک رہی تو میں ہاتھ پکڑ کر تمہیں راہِ سلوک طے کراؤں گا۔"

یہی وجہ تھی کہ جب ابو جی، بھائی جان، رفیق، فضیلہ کے ابو، نورین اور پڑوس کے دیگر حضرات مجھے اپنے ساتھ گھر لے جانے کے لیے بضد ہوئے تو میں نے صاف انکار کر دیا۔

"جب تک دینی علوم سے کما حقہ واقف نہیں ہو جاؤں گا اور درسِ نظامی کی تکمیل نہیں کر لوں گا، اس وقت تک مدرسے ہی میں رہوں گا۔"

ابو نے کہا۔ "میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ تم یہاں سے کامل، اکمل ہو کر نکلو۔ ہم لوگ تمہیں ہمیشہ کے لیے نہیں، چند روز کے لیے اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہیں۔ عرصۂ دراز کے بعد اللہ نے خوشی کا دن دکھایا ہے۔ تمہارے بھائی کی، پڑوسیوں کی، اعزہ و احباب کی خواہش ہے کہ تم کچھ دن ہمارے ساتھ بھی گزار دو۔"

"مجھے نہ بھولیے ابو جی!" نورین بولی۔ "میں بھی یہی خواہش لے کر آئی ہوں۔"

"شیطان کی خالہ! تم بھی یہاں پہنچ گئیں؟"

"کیوں نہ پہنچتی؟ آخر سکندر سے میرا بھی تو کچھ رشتہ ہے۔"

ابو جی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اماں جی کی موت کے بعد میں نے انہیں پہلی مرتبہ مسکراتے ہوئے دیکھا تھا۔

"کیا رشتہ ہے؟" ابو نے شرارت آمیز لہجے میں پوچھا۔

"میرا کلاس فیلو ہے، اور......اور میرا بھائی ہے۔"

رفیق نے کہا۔ "کوئی اور رشتہ نہیں ہے؟"

نورین سرخ پڑ گئی۔ ہر شخص اُسے چھیڑنے پر تلا ہوا تھا۔ اُس نے بے بسی سے بھائی جان کی طرف دیکھا۔ بھائی جان نے لطف لیتے ہوئے کہا۔

"بتا دو نورین!"

نورین نے پینترا بدل کر کہا۔ "سکندر کے ساتھ ساتھ میں بھی اے گریڈ سے پاس ہوئی ہوں، لیکن کتنے افسوس کی بات ہے کہ مجھے کوئی مبارک باد نہیں دیتا۔"

موضوع ایک دم بدل گیا۔ سب نورین کو مبارکباد دینے لگے۔ بھائی جان نے کہا۔ "سکندر کے رول نمبر کے ساتھ میں نے اخبار میں تمہارا رول نمبر بھی دیکھا تھا۔ اور یہاں آتے ہوئے تمہیں مبارکباد کا تار بھی دے آیا ہوں، جواب تک تمہارے گھر پہنچ چکا ہوگا۔"

صدر مدرس تیز آوازیں اور فلک شگاف قہقہے سن کر اپنے آفس سے باہر آئے۔ بالکل سیدھے سادے، عام انسان تھے۔ لیکن جلال اتنا تھا کہ اُن کی صورت دیکھتے ہی سب خاموش ہو گئے۔ نورین نے سر پر دوپٹہ لے لیا اور بھائی جان کی آڑ میں کھڑی ہو گئی۔

"مولوی صاحب!" ابو نے کہا۔ "اصولی طور پر مجھے پہلے آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر شکریہ ادا کرنا چاہیے تھا کہ اس گدھے کو......" اُنہوں نے میری طرف اشارہ کیا۔ "آپ ہی نے انسان بنایا ہے۔"

بھائی جان بولے۔ "دراصل ہم لوگ چند روز کے لیے سکندر کو گھر لے جانا چاہتے ہیں۔ لیکن سکندر تو ایسا تارک الدنیا ہو گیا ہے کہ کسی طرح بھی جانے کے لیے راضی نہیں ہوتا۔"

صدر مدرس نے میری طرف دیکھا، پھر دھیمی آواز میں پیار سے کہا۔ "حقوق العباد کا پاس کرو، سکندر!"

میرے ہونٹ لرز کر رہ گئے۔ اتنے لوگوں کی موجودگی میں کس طرح ممکن تھا کہ میں انہیں اُن بلا خیز سایوں اور تباہ کن سرسراہٹوں کے بارے میں بتاتا، جنہیں اپنی تمام تر خباثتوں کے ساتھ مدرسے کے باہر میرا انتظار تھا۔

رفیق بولا۔ "انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اب تو تمہارے ماسٹر صاحب نے بھی اجازت دے دی ہے۔"

دوزخ کا تصور اتنا روح فرسا تھا کہ مدرسے کی جنت چھوڑنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ لیکن رفیق نے درست کہا تھا، انکار کی گنجائش نہیں تھی۔ صدر مدرس حقوق العباد کی پاسداری کا مشورہ دے کر اپنے کمرے میں چلے گئے تھے۔ اُن کے جاتے ہی کچھ لوگ مجھے گومگو کے عالم میں چھوڑ کر گاڑیوں کا انتظام کرنے مدرسے سے باہر نکل گئے۔ نورین شام کو ملنے کا وعدہ کر کے ٹاٹا کرتی ہوئی اپنے گھر روانہ ہو گئی۔ ابو جان اور فضیلہ کے ابو، صدر مدرس کے احسانات کا اعتراف کرنے اُن کے دفتر کی طرف چل دیئے۔ بھائی جان اور رفیق میرے ہمراہ اُس کمرے میں آ گئے، جس میں میرے ساتھی کا قیام تھا۔ وہ دونوں جیسا دیس، ویسا بھیس کے قائل تھے۔ اُنہوں نے حافظ سے فقہی مسائل پر گفتگو شروع کر دی اور میں ساتھ لے جانے والے کپڑوں اور چیزوں کو رکھنے میں مصروف ہو گیا، جن کی مجھے گھر کے چند روزہ قیام میں ضرورت پیش آ سکتی تھی۔ صدر مدرس، درس کے دوران اکثر فرمایا کرتے تھے کہ فرائض و سنن کی ادائیگی اور تلاوت کلام اللہ کے بعد ہر اچھے طالب علم کو اپنے خالی اوقات میں پابندی سے دینی کتب کا مطالعہ کرتے رہنا چاہیے۔ اس سے ایمان تر و تازہ اور قلب پاک و صاف ہو جاتا ہے۔

وہی ہوا، جس کا مجھے خطرہ تھا۔ ادھر میں نے مدرسے کی چار دیواری سے قدم نکالا اور اُدھر نظر نہ آنے والے سایوں نے مجھے اپنے احاطے میں لے لیا۔ سنائی نہ دینے والی سرسراہٹیں محسوس ہونے لگیں۔ لیکن نمایاں فرق جس کا مجھے خاص طور پر احساس ہوا، یہ تھا کہ اس مرتبہ نہ سایوں کا انداز ڈراؤنا تھا، نہ سرسراہٹیں بھیانک تھیں۔ اس کے برعکس کچھ ایسی خوشی کا اظہار کیا جا رہا تھا جیسے کسی قیدی کی جیل سے رہائی کے بعد اُس کے اعزہ و اقارب خوشیاں مناتے ہیں۔

اُن کی شکلوں میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ صورتیں ایسی ہی مسخ شدہ تھیں، ڈھانچے پہلے جیسے ٹوٹے پھوٹے اور جگہ جگہ سے پچکے ہوئے تھے۔ کسی کی آنکھیں غائب تھیں، کسی کے نصف دھڑ کا کوئی پتہ نہیں تھا، کسی کے بے گوشت چہرے پر صرف دانت ہی دانت تھے۔ لیکن اطمینان کی بات یہ تھی کہ سارے سائے بے انتہا خوش و خرم تھے۔ سرسراہٹوں کا بھی کم و بیش یہی حال تھا۔ ان میں موسیقی سی گھلی ہوئی تھی۔ یوں لگ رہا تھا، جیسے ہوا کی لہریں میرے گرد و پیش میں رقص کر رہی ہوں۔ وہ لوگ جو مجھے مدرسے سے لینے کے لیے آئے تھے، پورے ایک درجن بھی نہیں تھے لیکن وہ سائے جو جلوس کی شکل میں میرے اطراف میں منڈلا رہے تھے، اتنی بڑی تعداد میں تھے کہ اُن کو شمار کرنا ناممکن تھا۔ کم ہونے کے بجائے مسلسل اُن کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ گھر پہنچتے پہنچتے تو یہ عالم ہو گیا کہ حدِ نظر تک سائے ہی سائے تھے۔

ہم لوگ دو ٹیکسیوں کے ذریعے گھر آئے تھے۔ میں ٹیکسی سے اُترنے لگا تو بڑی احتیاط کے ساتھ قدم باہر نکالا کہ کہیں کسی کے پاؤں پر میرا پیر نہ پڑ جائے، یا کوئی ڈھانچہ میری ٹکر سے دو ٹکڑے نہ ہو جائے۔ مگر اُترنے سے پہلے ہی سارے سائے کائی کی طرح پھٹ کر میرے لیے راستہ بنا چکے تھے۔ مجھے کسی بات پر حیرت نہیں ہوتی تھی، تاہم یہ ضرور کہوں گا کہ میرے ہمراہیوں کے لیے سایوں نے کوئی راستہ نہیں بنایا تھا۔ کسی احساس کے بغیر وہ سایوں کے درمیان بڑے آرام سے چل رہے تھے۔ اُن کی راہ میں آنے والے سائے روندے اور کچلے جا رہے تھے۔ لیکن جونہی میرے ہمراہی آگے بڑھ جاتے تھے، شکستہ ہو جانے والے سائے دوبارہ مجتمع ہو کر پہلے جیسی صورت اختیار کر لیتے تھے۔ یہ بات میرے لیے بالکل نئی اور انوکھی تھی۔ لیکن جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا، حیرت انگیز نہیں تھی۔ کیونکہ سائے بہرصورت سائے ہی ہوتے ہیں۔ چاہے وہ انسانوں کے ہوں، چاہے عمارتوں کے اور چاہے ان نادیدہ ہستیوں کے، جو ہمارے اطراف و جوانب میں ہوا کی مانند بکھری ہوئی ہیں۔

گھر میں داخل ہونے سے پہلے فضیلہ اور اُس کی امی نے میرا پُرجوش استقبال کیا۔ فضیلہ نے میرے گلے میں گلاب کے پھولوں کا ہار ڈالا اور ہنس کر کہا۔ "اللہ، بھائی جی! آپ اتنے بڑے ہو گئے۔ داڑھی نکل رہی ہے آپ کی۔"

فضیلہ کی امی نے ماشاء اللہ کہا اور پیار سے میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔ پھر گلوگیر لہجے میں بولیں۔ "تمہاری بہن اور امی زندہ ہوتیں تو آج کتنا خوش ہوتیں۔"

مجھے کشاں کشاں گھر میں لے جایا گیا۔ متعدد سائے جو جلوس کی شکل میں میرے ساتھ آئے تھے، مسرت و اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے دروازے ہی سے رخصت ہو گئے۔ کچھ باہر کھڑے رہے، جبکہ معدودے چند ایسے تھے، جو گھر تک چھوڑنے آ گئے۔

پہلا دن بڑا مصروف گزرا۔ جو سنتا تھا کہ سکندر نے امتحان میں دوسری پوزیشن حاصل کی ہے اور اپنے گھر آیا ہوا ہے، مبارک باد دینے دوڑا چلا آ رہا تھا۔ مرد، عورتیں، لڑکے، لڑکیاں سبھی آ رہے تھے۔ مبارکباد بعد میں دیتے تھے، پہلے اس بات پر حیرت کا اظہار کرتے تھے کہ اچانک

جوان ہو گیا ہوں۔ ایک خاتون نے ابو سے کہا۔

”جس طرح بڑے بیٹے کی بات پکی کی ہے، اسی طرح کوئی اچھی لڑکی دیکھ کر سکندر کی بھی بات پکی کر دیں۔“

دوپہر کے کھانے کے لیے فضیلہ کے ابو اور رفیق میں تھوڑی سی جھڑپ ہوئی۔ دونوں بضد تھے کہ کھانا اُن کے گھر سے آئے گا۔ آخر میں ٹاس کیا گیا اور رفیق جیت گیا۔

کھانے سے کچھ دیر قبل آنے جانے والے لوگوں سے تھوڑی سی نجات ملی۔ میں اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گیا۔ اس کی سابقہ خوب صورتی ختم ہو چکی تھی۔ فرش کی ٹائلز دوبارہ جوڑ دی گئی تھیں لیکن کوئی ٹائل اوپر اُٹھ گئی تھی، کوئی نیچے دب گئی تھی۔ بساط والی شکل بھی بگڑ گئی تھی۔ کسی جگہ کئی سیاہ ٹائلز اور کسی جگہ کئی سفید ٹائلز جمع ہو گئی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے فرش کا وہ حصہ کوڑھ کے مرض میں مبتلا ہو گیا ہو۔

ہاتھ ملاتے ملاتے اور معانقہ کرتے کرتے اور مسکراتے مسکراتے مجھ پر اچھی خاصی تھکن سوار ہو گئی تھی۔ کچھ دیر کے لیے لیٹا تو قدرے سکون ملا۔ منٹ دو منٹ کے لیے آنکھ لگ گئی، پھر اچانک ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ دل کی عجیب سی حالت ہو گئی۔ پھٹی پھٹی نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ میں نہیں کہہ سکتا تھا کہ میں نے خواب دیکھا ہے یا عربی محاورے کے مطابق بین الیقظہ والنوم یعنی کچھ جاگتے، کچھ سوتے والی کیفیت میں کچھ نظر آیا ہے۔ ہر دو صورتوں میں، جس بھیانک شے پر نظر پڑی تھی، وہ ایسی نہیں تھی کہ اس کے بارے میں کچھ سوچا جاتا، یا کسی سے ذکر کیا جاتا۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ کمرے میں ٹھہروں گا تو وہ شے مجھ پر مسلط ہو جائے گی۔

میں اس شے سے چھٹکارہ پانے کے لیے کمرے سے نکل کر ابو کے کمرے میں چلا گیا۔ جہاں وہ دوستوں کے پاس بیٹھے اپنے دونوں بیٹوں کی تعریف میں رطب اللسان تھے۔ اسی اثناء میں رفیق کے ہاں سے کھانا آ گیا۔ مجھے اپنے مقصد میں کامیابی ہوئی۔ جس بات کو بھولنا چاہتا تھا، اسے بھول گیا تھا۔

شام کا کھانا فضیلہ کے ہاں تھا۔ ہم باپ بیٹوں کے علاوہ اُنہوں نے اپنے کچھ دوستوں کو بھی مدعو کیا تھا۔ دوستوں کے آنے میں کچھ دیر تھی۔ فضیلہ کی امی نے مجھے اندر بلا لیا۔ پھر فضیلہ سے کہا کہ وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔

”سکندر بیٹا!“ وہ میرے پاس بیٹھتے ہوئے بولیں۔ ”تم نے فضیلہ کے ابو سے کسی مجذوب کا ذکر کیا تھا، جو غیب کا حال جانتے ہیں۔“

میں سمجھ گیا، فضیلہ کے ابو بہت چھوٹے پیٹ کے تھے۔ مجھ سے کسی کو نہ بتانے کا وعدہ کرنے کے باوجود انہوں نے بیوی کو ساری باتیں بتا دی تھیں۔

”غیب کا حال تو صرف اللہ میاں جانتے ہیں۔ تاہم کبھی کبھار کچھ باتوں سے اپنے نیک بندوں کو بھی مطلع فرما دیتے ہیں۔“

”میرا بھی یہی مطلب ہے۔“ وہ بولیں۔ ”بڑی اماں کو تو جانتے ہی ہو گے۔ بہت ہی جاہل اور بے وقوف عورت تھی۔ الف کے نام لٹھ نہیں جانتی تھی۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ فرشتوں کی غلطی سے ایک رات اُس کی رُوح قبض کر لی گئی۔ رات بھر وہ فرشتوں کی مہمان رہی اور ان کے ساتھ زمینوں اور آسمانوں کی سیر کرتی رہی۔ صبح کو جب فرشتوں کو اپنی غلطی کا پتہ چلا تو وہ اُس کی رُوح کو اُس کے جسم میں لوٹا گئے .... بڑی اماں رات بھر مُردہ رہ کر زندہ ہوئی تو پہلے جیسی جاہل اور بے وقوف نہیں رہی تھی۔ رات کی رات میں اُس کی کایا پلٹ گئی۔ اُردو اور انگلش کی کتابیں بھی پڑھتی تھی اور غیب کی باتیں اس طرح فر فر بتاتی تھی، جیسے اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ رہی ہو۔ ایک مراد کے سلسلے میں، میں نے اُس سے پانچ بار ملنے کی کوشش کی۔ اُس کے پاس ہر وقت اتنے لوگ رہتے تھے کہ میں اپنی مراد کا ذکر نہیں کر سکی۔ پھر میں نے فضیلہ کے ابو کو مجبور کیا۔ کئی روز تک وہ جھونپڑیوں میں جانے کے لیے راضی نہ ہوئے۔ جب راضی ہوئے تو اس وقت جب جھونپڑیوں میں رہنے والے عقل و ایمان کے دشمن بے چاری بڑی اماں کو شہید کر چکے تھے۔ میں نے یہ سوچ کر سینے پر پتھر رکھ لیا کہ اب میری مراد کبھی پوری نہیں ہو گی۔“

اُن کی سنائی ہوئی کہانی میرے لیے نئی نہیں تھی۔ میں واحد شخص تھا، جسے معلوم تھا کہ فرشتوں سے غلطی نہیں ہوئی تھی۔ فرشتے ایسی غلطیاں کرنے لگیں تو دنیا کا نظام الٹ پلٹ ہو کر رہ جائے۔ بڑی اماں مر گئی تھی اور اُس کی موت کے بعد جو بڑی اماں زندہ ہوئی، وہ بڑی اماں نہیں تھی بلکہ تاریکیوں میں پلنے والی ایک منحوس مخلوق تھی۔

غیب داں تو وہ بھی نہیں تھی لیکن اُسے خلقِ خدا کو گمراہ کرنے کا فن آتا تھا۔ فضیلہ کے امی ابو کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ وہ دونوں اپنی مراد اُس تک نہ پہنچا سکے۔ مراد تو کیا پوری ہوتی، عقائد البتہ متزلزل اور ڈانواڈول ہو جاتے۔

”مجھے قریب قریب صبر آ گیا تھا۔“ فضیلہ کی امی نے دوبارہ کہنا شروع کیا۔ ”پھر ایک روز فضیلہ کے ابو نے اس مجذوب بزرگ کا ذکر کیا، جو تمہارے مدرسے کے سامنے والے نالے میں رہتا ہے اور اسی نالے کی مٹی اور کیچڑ کھا کر پیٹ بھرتا ہے۔“

”جی نہیں۔ نہ وہ نالے میں رہتا ہے اور نہ ہی نالے کی کیچڑ کھاتا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”نالے پر دُکانیں ہیں اور وہ دُکانوں کے سامنے پڑا رہتا ہے۔ دُکانیں بند ہو جاتی ہیں تو وہ کسی دُکان کے تختے کے نیچے جا کر لیٹ جاتا ہے۔ دُکاندار اپنا بچا کھچا کھانا اُس کے آگے رکھ دیتے ہیں۔“

”چلو، ایسا ہی ہو گا۔“ وہ بولیں۔ ”فضیلہ کے ابو نے مجھے بتایا تھا کہ وہ مجذوب بزرگ تمہارا

دوست ہے۔ اُس نے تمہیں غیب کی ایسی ایسی باتیں بتائی ہیں جو بالکل درست ثابت ہوئیں۔"

"مثلاً؟"

"مثلاً تو میں نے پوچھا نہیں۔ تم تو میری عادت سے واقف ہو۔ میں دوسروں کی باتیں نہیں کریدا کرتی۔"

میں نے سکون کی سانس لی۔ خان صاحب نے بیوی کو خزانے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا، جنہیں تین دانش مندوں نے انتہائی "دانش مندی" سے ٹھکانے لگا دیا تھا۔ دنیا میں ایک ہی شیخ چلی نہیں تھا، جس نے اس شاخ کو، جس پر وہ بیٹھا تھا، کاٹ کر خود کو زخمی کیا تھا۔ شیخ چلی تو ہر انسان میں پایا جاتا تھا۔ جو جتنا بڑا عقلمند تھا، اُس میں اتنا ہی زیادہ شیخ چلی موجود تھا۔

فضیلہ کی امی کہہ رہی تھیں۔ "میں نے فضیلہ کے ابو سے کہا کہ نالے والے فقیر کے پاس اپنی مراد لے کر جاؤ۔ فقیر فقراء کسی کے دشمن نہیں ہوتے۔ سب کو ایک ہی نظر سے دیکھتے ہیں، سب کا بھلا چاہتے ہیں۔ ہو سکتا ہے اس فقیر کی ایک ہی نگاہ میں ہماری برسوں کی مراد پوری ہو جائے۔ میرے کہنے پر وہ دو دفعہ اُس کے پاس گئے۔ پہلی بار گالیاں سن کر بھاگ آئے۔ دوسری بار اُس نے پتھر مار کر بھگا دیا۔ تیسری بار اپنی دو نالی لے کر جا رہے تھے، میں نے روک لیا کہ مرادیں گولیوں کے زور پر پوری نہیں کرائی جاتیں۔ پھر میں خود گئی۔ نالے والے فقیر نے مجھے خوب گالیاں دیں۔ میں نے کہا کہ جتنی چاہے گالیاں دے لو، جب تک میری مراد پوری نہیں ہو گی، نہیں جاؤں گی۔ اُس نے رونا شروع کر دیا۔ درجنوں لوگ جمع ہو گئے اور مجھے گھورنے لگے۔ میں نے کہا۔

"گھورتے رہو۔ نہ میں نے مارا ہے، نہ برا بھلا کہا ہے۔"

پھر اُس نے پتھر اُٹھا لیا۔ میں نے کہا۔ "سر پھاڑ دو گے، تب بھی نہیں جاؤں گی۔"

وہ ہنسنے لگا۔ اُس کے آگے روٹیوں کے ٹکڑے اور کچھ ہڈیاں پڑی ہوئی تھیں۔ اُس نے روٹی کے ٹکڑوں اور ہڈیوں میں سے کینو کی ایک گرد آلود پھانک نکال کر میری طرف اُچھال دی اور قہقہہ لگاتا ہوا بھاگ گیا۔ میں پھانک لے کر خوش خوش گھر واپس آ گئی اور سمجھ بیٹھی کہ مراد پوری ہوئی۔ لیکن دو سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے، ابھی تک کوئی مراد پوری نہیں ہوئی۔"

"میں کیا کر سکتا ہوں؟" میں نے دریافت کیا۔

"وہ فقیر تمہارا دوست ہے۔ تمہیں غیب کی باتیں بتاتا ہے۔ تم چاہو تو اُس سے پوچھ سکتے ہو کہ میری مراد پوری ہو گی یا نہیں۔"

"خان صاحب نے غلط بیانی سے کام لیا ہے۔ وہ میرا دوست نہیں ہے۔ میرا ہی نہیں، وہ کسی کا بھی دوست نہیں ہے۔ کبھی ایسا بھی نہیں ہوا کہ اُس نے غیب کی باتوں سے آگاہ کیا ہو۔ ہاں

ایک بار اُس نے دھکا دے کر مجھے زمین پر گرا دیا تھا اور میری ٹانگ پکڑ کر زور زور سے مروڑی تھی۔ اُس روز کے بعد سے آج تک میری ہمت نہیں ہوئی کہ اُس کے قریب سے گزروں۔"

"فضیلہ کے ابو نے مجھ سے قسم لے لی تھی کہ میں ان نوٹوں کے بارے میں کسی سے کوئی ذکر نہ کروں، جو تمہارے گھر سے برآمد ہوئے تھے لیکن تمہارے ابو نے اُنہیں چوری کا سمجھ کر جلا ڈالا تھا۔ پھر اس فقیر نے تمہیں بتایا تھا کہ نوٹ چوری کے نہیں تھے۔ اُس رات تم ہمارے گھر فضیلہ کے ابو سے اس بات کی تصدیق کرنے کے لیے بھی آئے تھے۔"

میں نے دوبارہ گہری سانس لی۔ خان صاحب واقعی بڑے ہلکے پیٹ کے واقع ہوئے تھے۔

"آپ قسم توڑنے کی مرتکب ہوئی ہیں۔ اب یا تو دس مسکینوں کو دونوں وقت کا کھانا کھلا کر کفارہ ادا کریں یا لگاتار تین روزے رکھ کر۔"

"تین روزوں کا کفارہ میں بہت پہلے ادا کر چکی ہوں۔"

"قسم توڑنے سے پہلے؟"

"قسم تو دوسرے ہی دن ٹوٹ گئی تھی۔ میں نے اپنی امی کو فون کر کے ساری باتیں بتا دی تھیں۔ اُنہوں نے ہی غیب کی باتیں بتانے والے فقیر کے پاس فضیلہ کے ابو کو بھیجنے کا مشورہ دیا تھا۔ کیا اب بھی اس بات کا انکار کرو گے کہ وہ غیب کی باتوں سے ناواقف ہے؟"

"جسے آپ غیب کہہ رہی ہیں، اسے کشف سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔"

"کشف ہی سہی۔ اس سے کہو، جس طرح اس نے نوٹوں کے بارے میں کشف سے بتا دیا تھا، اسی طرح ہماری مراد کے بارے میں بھی بتا دے۔"

میں عجیب سی مصیبت میں پھنس گیا تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ چاہتا تو جھوٹا بہانہ بنا کر اُن سے نجات حاصل کر سکتا تھا۔ مگر جب سے معلوم ہوا تھا کہ قرآن میں جھوٹے پر اللہ تعالیٰ کی لعنت آئی ہے، میں نے جھوٹ سے توبہ کر لی تھی۔ اچانک بجلی کے کوندے کی طرح ایک خیال ذہن میں آیا۔

"آپ نے کینو کی اس پھانک کا کیا، کیا جو اُس فقیر نے دی تھی؟"

"اچھی طرح صاف کر کے ایک دُھلے ہوئے رومال میں لپیٹ کر رکھ دی ہے۔" وہ بولیں۔ "جب بھی میں اُسے دیکھتی ہوں، نالے والے فقیر کی کرامات کی پہلی سے زیادہ قائل ہو جاتی ہوں۔ اُس کی دی ہوئی پھانک بالکل تازہ ہے۔ حالانکہ اب تک اُسے سوکھ جانا چاہیے تھا۔"

"میری مانیں تو اُسے سینت کر رکھنے کے بجائے کھا جائیں۔"

"اگر میں اسے کھا لوں تو کیا ہماری مراد پوری ہو جائے گی؟"

"ان شاء اللہ!"

اس طرح مجھے جھوٹ بھی نہیں بولنا پڑا اور اُن سے پنڈ بھی چھوٹ گیا۔

اگلے روز نورین کے گھر دعوت ہوئی

اتنی عظیم الشان دعوت نہ مجھے پہلے کبھی دی گئی تھی، نہ بعد میں کبھی نصیب ہوئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے شہر بھر کے ادیب، شاعر، اداکار، موسیقار اور نہ جانے کس کس فن کے ماہرین کو اکٹھا کرلیا گیا ہو۔ میری حیثیت ایسے نادر اور نایاب ہیرے کی سی تھی، جسے ہر مہمان کو دکھانا اور اُس سے داد لینا لازمی سمجھ لیا گیا تھا۔ مجھے متعدد تحائف بھی ملے۔

دعوت کے بعد ابا جی تو گھر چلے گئے، مجھے اور بھائی جان کو ٹھہرنا پڑا۔ کیونکہ یہ کس طرح ممکن تھا کہ اتنے بہت سے فن کار دعوت میں آئیں اور کھانے پینے کا حق ادا کیے بغیر چلے جائیں۔ پوری رات فن کار اپنے اپنے فن کا مظاہرہ کرتے رہے۔ لیکن مجھے دو بجے کے بعد ہی سے نیند آنا شروع ہوگئی تھی اور ڈھائی بجے تک بھائی جان کے کندھے سے ٹیک لگائے ایسی گہری نیند سو گیا کہ پتہ ہی نہیں چلا کہ کس کس نے گانے گائے اور کس کس نے لطیفے سنائے۔ تقریباً پانچ بجے اچانک بھائی جان نے مجھے جھنجھوڑ کر جگا دیا۔ اس وقت کوئی گویا پکا راگ سنا رہا تھا۔ پوری محفل پر ایسا سناٹا چھایا ہوا تھا، جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ میں سمجھا، بھائی جان مجھے پکے راگ سے محظوظ کرانا چاہتے ہیں، اس لیے سنبھل کر بیٹھ گیا اور آنکھیں ملنے اور راگ سننے میں معروف ہو گیا۔

بھائی جان نے دوبارہ میری کمر میں ٹھوکا رسید کیا۔ میں نے اُن کی طرف دیکھا، اُن کا چہرہ اس طرح بالکل سفید ہو رہا تھا، جیسے کسی نے ان کا سارا خون نچوڑ لیا ہو اور وہ لرزتے ہوئے ہاتھ سے اُس طرف اشارہ کر رہے تھے، جہاں خواتین بیٹھی تھیں۔ وہ مقام نیم تاریک تھا، لیکن نورین صاف نظر آ رہی تھی۔ وہ سب سے آگے بیٹھی موسیقی کے زیر و بم میں گم تھی۔

''بھائی کے بارے میں کچھ کہہ رہے ہیں؟'' میں نے سرگوشی سے پوچھا۔

بھائی جان کا اشارہ کرتا ہوا ہاتھ بے جان ہو کر رہ گیا اور منہ کان کے قریب آ گیا۔

''نہیں.......'' انہوں نے کہا۔ ''شاید تم نے اسے نہیں دیکھا۔''

''کسے؟''

''اسی کو، جس کا نام....... جس کا نام....... کیا نام بتایا تھا تم نے؟'' وہ باقاعدہ کانپ رہے تھے، جیسے سردی چڑھ رہی ہو۔

''آپ کی طبیعت خراب ہو رہی ہے۔'' میں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ ''میں بھابی سے کہہ کر آپ کے لیٹنے کا انتظام کراتا ہوں۔''

بھائی جان نے میرے کُرتے کا دامن اتنے زور سے کھینچا کہ میں گرتے گرتے بچا۔

''کیا نام تھا اُس کا....... جس کے اعضا کو ہم نے جڑتے ہوئے دیکھا تھا؟'' انہوں نے

تیز سرگوشی میں پوچھا۔ لوگ راگ میں اتنے محو تھے کہ کسی نے اُن کی سرگوشی نہیں سنی۔

''ترشولی۔''

''ہاں، ہاں....... وہی۔'' بھائی جان نے کہا۔ ''میں نے ابھی ابھی ترشولی کو دیکھا ہے۔ خدا کی پناہ! میرا دل کسی طرح ٹھکانے پر نہیں آ رہا ہے۔''

''یہاں دیکھا ہے؟''

''اُدھر۔'' اُنہوں نے دوبارہ خواتین والے حصے کی طرف اشارہ کیا۔ ''وہ....... ہوا میں تیر رہی تھی۔ عورتوں کے سروں پر۔'' بھائی جان کو جھرجھری آ گئی۔ ''عورتوں کے سروں پر ایک بڑے گدھ کی طرح اُڑتی پھر رہی تھی۔''

ایک روز پہلے میں نے بھی اپنے کمرے میں ترشولی کی مہیب جھلک دیکھی تھی، لیکن میں اُس کے تصور سے نجات حاصل کرنے کے لیے ابا جی کے کمرے میں چلا گیا تھا اور بھول بھال گیا تھا۔ اب بھائی جان کہہ رہے تھے کہ وہ انہیں یہاں نظر آئی تھی۔

''اب تو دکھائی نہیں دے رہی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں۔'' بھائی جان نے کہا۔ ''مگر میرا دل ابھی تک کانپ رہا ہے۔ اتنی بے ہودہ اور ڈراؤنی شکل میں نے آج تک نہیں دیکھی۔''

حالانکہ وہ اس وقت دیکھ چکے تھے، جب ہم نے کمرے کے فرش کی مٹی ہٹائی تھی۔

''اب دکھائی نہیں دے رہی ہے تو اُسے بھول جائیے۔ سمجھ لیجیے کہ آپ نے کچھ نہیں دیکھا۔''

''ناممکن.......'' وہ بولے۔ ''اُس ہیبت ناک عورت کو کتنی ہی کوشش کیوں نہ کروں، ہرگز نہیں بھلا سکوں گا۔''

''کوشش تو کیجیے۔'' میں نے کہا۔ اُسی وقت پکا راگ اختتام کو پہنچا۔ لوگ تعریفی انداز میں زور زور سے تالیاں بجانے لگے۔ میں بھی تالیاں بجانے میں شریک ہو گیا اور بھائی جان کو بھی مجبور کیا کہ وہ تالیاں بجائیں۔ اس کے بعد اس مقام پر، جسے اسٹیج کے طور پر استعمال کیا گیا تھا، ایک کامیڈین آیا اور مختلف اداکاروں کی آوازوں کی نقل کرتے ہوئے مکالمے سنانے لگا۔

''چوری میرا پیشہ ہے اور نماز میرا فرض....... محمد علی اس جملے کو یوں کہتے، ندیم یوں کہتے، سلطان راہی یوں کہتے، بابرا اس طرح کہتیں اور نیّر سلطانہ اس طرح ادا کرتیں.......''

اتنی بہترین نقل تھی کہ ہنستے ہنستے لوگوں کے پیٹ میں بل پڑ گئے۔

میں نے خواتین والے حصے کی طرف دیکھا، نورین اور اُس کے ساتھ بیٹھی ہوئی عورتیں لوٹ پوٹ ہوئی جا رہی تھیں۔ بھائی جان کی طرف دیکھا، پوری محفل میں وہ واحد شخص تھے، جو ہونقوں کی طرح آنکھیں پھاڑے بیٹھے تھے اور بے چینی سے پہلو پر پہلو بدل رہے تھے۔

انہوں نے مجھے اپنی طرف متوجہ دیکھا تو آہستہ سے پوچھا۔ ''اندھیرے میں تمہیں یہ کریہہ صورت نظر آیا کرتی تھی؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

''خدا کی پناہ!'' بے ساختہ اُن کے ہاتھ کانوں پر پہنچ گئے۔ ''تمہارا ہی دل گردہ تھا سکندر! جو تم برداشت کر گئے۔ اگر میں نے دو چار بار اُسے اور دیکھ لیا تو میری تعلیم کا اللہ ہی حافظ ہے۔ یہ تو بہت ہی خوف ناک اور بدصورت ہے۔''

انہوں نے کچھ اور بھی کہا، جو میں واضح طور پر نہیں سن سکا۔ اچانک مجھے رانی یاد آ گئی۔ وہ کہاں تھی؟ اور کیا کرتی پھر رہی تھی؟ کیا اُس نے اپنے اس جسم سے چھٹکارا حاصل کر لیا تھا، جسے دیکھتے ہی اچھے اچھوں کے دل ڈانواں ڈول ہونے لگتے تھے؟ اگر نہیں تو پھر ترشولی کس طرح وجود میں آئی تھی؟ ایک ہی روح بیک وقت دو جسموں میں تو قیام نہیں کر سکتی تھی۔ رانی نے خود ہی بتایا تھا کہ انسانی جسم ایک ایسے قید خانے کی طرح ہوتا ہے، جس میں چند شرائط کے ساتھ جانا تو آسان ہے لیکن نکلنا بہت مشکل ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ بڑی اماں کو قتل کیوں کراتی؟ جس طرح اُس کے جسم میں داخل ہوئی تھی، اُسی طرح اُس جسم کو حسب منشا نہ پا کر باہر نکل آتی۔

مگر رانی زندہ تھی۔ اس بات کا مجھے اُسی صبح کو تھوڑی دیر بعد نورین ہی کے گھر سے پتہ چلا تھا۔ میرے اعزاز میں دی جانے والی ضیافت میں نورین کے ابو نے ایک پارسی ڈسٹری بیوٹر کو بھی مدعو کیا تھا، جو ایک روز قبل ہی ہمارے وطن آیا تھا اور ہندو اور مسلم اسٹاروں کے تعاون سے ایک فلم پروڈیوس کرنا چاہتا تھا۔

رات کی محفل اختتام کو پہنچی تو وہ نورین کے ابو کو اپنے زیرِ غور فلم کی تفصیلات بتانے لگا۔ اُس نے اُس لڑکی کی تصاویر دکھائیں، جسے وہ ہیروئن کے طور پر متعارف کرانے والا تھا۔ ایک تصویر ہوتی تو شبہ کیا جا سکتا تھا۔ درجنوں تصاویر تھیں، اس لیے شک و شبے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ مستقبل قریب کی ہیروئن کی حیثیت سے اُس نے جس لڑکی کو منتخب کیا تھا، وہ رانی تھی۔

''آپ کی ہیروئن کا نام کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''رانی کے فلمی نام سے انٹروڈیوس کرا رہا ہوں۔'' ڈسٹری بیوٹر نے کہا۔ ''سادہ سا، سندر سا نام اُس کا اپنا تجویز کردہ ہے۔''

''بہت پیارا نام ہے۔'' نورین کے ابو تصویروں کو الٹ پلٹ کر کے دیکھتے ہوئے بولے۔ ''اس کی اسکرین بیوٹی کا تو کوئی جواب ہی نہیں ہے۔''

''اس کے اصل حُسن کے سامنے اسکرین بیوٹی تو کچھ بھی نہیں ہے۔ سلونی رنگت ہونے کے باوجود ظالم اتنی حسین ہے کہ جو دیکھ لیتا ہے، دل تھام کر رہ جاتا ہے۔''

''پھر تو مجھے بھی کسی روز آپ کی طرف آنا پڑے گا۔''

''کسی روز نہیں، فلم کے مہورت پر زبانی دعوت نامہ ابھی دے دیتا ہوں، چھپا ہوا دعوت نامہ آپ کو وقت پر بھجوا دوں گا۔''

میں نے کہا۔ ''آپ کی ہیروئن کا فلمی نام تو رانی ہے لیکن اصل نام کیا ہے؟''

''دشمن۔'' ڈسٹری بیوٹر نے بتایا۔ ''مغلوں کے شاہی خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ شہزادیوں جیسا رہن سہن ہے۔''

''باپ کا نام کیا ہے؟''

ڈسٹری بیوٹر نے غور سے میری طرف دیکھا۔ ''اگر تم پوزیشن ہولڈر نہ ہوتے تو میں تمہاری بات کا جواب ہرگز نہ دیتا۔ لیکن تمہیں اتنی باریک بینی کا تو حق پہنچتا ہے۔ جواب یہ ہے کہ فی الحال ہمارے شہزادی کسی کو اپنے والد کے نام سے آگاہ نہیں کرنا چاہتی۔ وہ سمجھتی ہے کہ اگر اُس نے والد کا نام بتا دیا تو اُس کے خاندان والے اودھم مچا دیں گے اور اُسے فلم میں کام کرنے سے روک دیں گے۔''

''رانی سے آپ کی آخری ملاقات کب ہوئی تھی؟'' میں نے پوچھا۔

''ایئرپورٹ تک مجھے چھوڑنے آئی تھی۔ اور میں کل دوپہر کو یہاں پہنچا ہوں۔'' اُس نے بتایا۔ پھر مسکرا کر بولا۔ ''کچھ اور پوچھنا ہو تو وہ بھی پوچھ لو۔ میں تھوڑی دیر بعد دوسرے شہر کے لیے اُڑ جاؤں گا۔''

''شکریہ۔'' میں نے کہا۔ ''میرے لیے اتنا ہی کافی ہے۔''

رانی زندہ تھی۔ ترشولی فرش اُکھڑتے ہی زندہ ہو گئی تھی۔ ڈسٹری بیوٹر ایک روز قبل دوپہر کو اُس سے مل کر ہی یہاں پہنچا تھا۔ جبکہ میں نے اور بھائی نے ترشولی کے اعضاء کو خود جڑتے ہوئے اور اُن میں جان پڑتے ہوئے دیکھا تھا۔ اور میں نے اُسے اپنے کمرے میں منڈلاتے ہوئے دیکھا تھا۔ اور آج رات کے آخری پہر میں وہ بھائی جان کو اس حصے کی طرف، جہاں عورتیں بیٹھی تھیں، ہوا میں تیرتی ہوئی نظر آئی تھی۔

''رانی، رانی نہیں تھی، بلکہ ترشولی تھی'' والا نظریہ دم توڑنے لگا تھا۔ مگر یہ کس طرح ممکن تھا؟ رانی نے خود اقرار کیا تھا کہ وہ ترشولی ہے۔ اور اگر وہ ترشولی تھی تو وہ دوسرے ملک میں رانی کا پرکشن جسم پہنے بیٹھی تھی۔ اور اگر وہ یہی تھی تو جسم چھوڑے بغیر یہاں کس طرح آ گئی؟...... کسی دوسرے جسم میں داخل ہونے کے لیے ضروری تھا کہ وہ رانی کے جسم سے چھٹکارا حاصل کرتی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا تھا۔ کم از کم ڈسٹری بیوٹر کے بیان سے بھی ظاہر ہوتا تھا۔ اور اُسے کیا ضرورت تھی کہ خواہ مخواہ غلط بیانی سے کام لیتا؟

رانی، رانی تھی یا رانی، رانی نہیں تھی؟.......الفاظ کا گورکھ دھندہ چل رہا تھا۔ یہ میری زندگی کا ایک ایسا معمہ تھا، جسے حل کرنے کی جتنی کوشش کی جارہی تھی، وہ اتنا ہی مشکل اور پیچیدہ ہوا جارہا تھا۔ علاوہ ازیں ہواؤں میں پرواز کرتے ہوئے وہ سائے تھے اور وہ تیز اور مدھم سرسراہٹیں تھیں، جن کا مدرسے کی چار دیواری سے باہر نکلتے ہی احساس ہونا شروع ہوگیا تھا۔ ایسی کوئی جگہ نہیں تھی، جہاں یہ نظر نہ آنے والے سائے مجھے نظر نہ آتے ہوں یا سنائی نہ دینے والی سرسراہٹیں سنائی نہ دیتی ہوں۔

اگر مجھ سے کوئی پوچھتا کہ کیا پورا شہر آسیب زدہ ہوسکتا ہے؟ تو میرا ایک ہی جواب ہوتا کہ اس ضمن میں کسی احتمال کی گنجائش نہیں ہے۔ ایسی کون سی سڑک تھی، کون سی گلی تھی اور ایسا کون سا مکان اور کمرہ تھا، جس میں آسیبی سائے نہ ہوں اور اُن کے گھومنے پھرنے اور آپس میں ہنسی مذاق کرنے یا لڑنے جھگڑنے یا کسی انسان کو مشقِ ستم بنانے کی سرسراہٹیں نہ ہوتی ہوں۔ میرا اپنا ذاتی مشاہدہ تھا کہ یوں تو نظر نہ آنے والے سائے ہر مقام پر موجود ہوتے تھے، لیکن گھنے درختوں، چھتوں، پھول دار پودوں، غسل خانوں اور بیت الخلاء میں ان کی سب سے زیادہ چہل پہل ہوتی تھی۔ رات کے اوقات میں، خصوصاً تاریک راتوں میں ایسا محسوس ہوتا تھا، گویا آسیبی سائے فواروں کی طرح زمین سے اُبل رہے ہوں یا موسلا دھار بارش کی طرح آسمان سے برس رہے ہوں۔ کبھی کبھار کسی بچے یا بچی اور لڑکے یا لڑکی کو، کہ اُن کے ذہن نسبتاً صاف ستھرے ہوتے ہیں اور نگاہیں اُجلی ہوتی ہیں، سایوں کا احساس ہو جاتا تھا تو وہ اُن کی ہیئت اور ہیبت کے باعث بہکی بہکی باتیں کرنے لگتا تھا اور اس طرح سایوں کو ایک قسم کا کھلونا مل جاتا تھا، جس سے وہ دل کھول کر اس وقت تک کھیلتے تھے، جب تک وہ مر کر ان سایوں میں شامل نہ ہو جاتا یا جھاڑ پھونک اور تعویذ گنڈوں سے اُسے صحت کاملہ و عاجلہ نصیب نہیں ہو جاتی تھی۔

اس ضمن میں سب سے زیادہ دلچسپ بات یہ تھی کہ جس طرح خوب صورت افراد، خصوصاً خوب صورت لڑکیاں ہم دنیا والوں کے لیے باعث کشش ہوتی ہیں، اسی طرح بلکہ اس سے کہیں زیادہ تاریک دنیا کی مخلوق اُنہیں پسند کرتی ہیں اور ان میں دلچسپی لیتی آئی ہیں۔ اور یہی وجہ تھی کہ بھائی جان کو نورین کے گھر کے اُس حصے میں جو خواتین کے لیے مخصوص کیا گیا تھا، ترشولی ہوا میں تیرتی پھرتی دکھائی دی تھی۔ اور اس لیے دکھائی دی تھی کہ وہ خود کو بھائی جان پر ظاہر کرنا چاہتی تھی۔ ایسا نہ ہوتا تو میری طرح اُنہیں دوسری نظر نہ آنے والی مخلوق بھی نظر نہ آتی۔ اور سنائی نہ دینے والی آوازیں بھی سنائی دیتیں۔

رہی بات یہ کہ ترشولی نے اُن پر خود کو کیوں ظاہر کیا تھا، اس کی صرف ایک ہی وجہ سمجھ میں آتی تھی کہ وہ اُس کے نجات دہندہ تھے۔ اُنہوں نے اُسے یا اُس کے جسم کے ٹکڑوں کو قبر کے

اندھیرے سے نجات دلائی تھی۔ اس کے علاوہ دوسری کوئی وجہ تھی تو میں اسے سمجھنے سے قاصر تھا۔ جو گتھیاں میری داستان پڑھنے والوں یا سننے والوں کے ذہن میں پیدا ہو رہی ہوں گی، وہ میرے ذہن میں بھی پیدا ہو رہی تھیں۔

اگلے روز دوپہر کے وقت کونسلر کی طرف سے دعوت دی گئی، جس میں ابا جی اور بھائی جان کے علاوہ علاقے کے سبھی معززین تھے۔ کونسلر نے پانچ ہزار روپے نقد اپنی جیب سے بطور انعام مجھے دیئے اور وعدہ کیا کہ بی اے میں جتنی کتابوں، کاپیوں کی ضرورت ہو گی، ان کا انتظام وہ کریں گے۔

میں چند دنوں کے لیے مدرسے سے آیا تھا، لیکن زندگی کبھی نہ ختم ہونے والی دعوتوں کی نذر ہو کر رہ گئی تھی۔ کونسلر کی دعوت کے بعد اس اسکول میں جانا پڑا، جہاں سے مجھے حوالات جانے کے جرم میں کھڑے کھڑے نکال دیا گیا تھا۔ اگرچہ قانون نے مجھے بے قصور اور بے گناہ قرار دیا تھا، لیکن اسکول نے میرے جرمِ بے جرمی کو معاف نہیں کیا تھا۔ اب اُسی اسکول کا دعویٰ تھا کہ سکندر ہمارا طالب علم ہے۔ اخبارات میں "داخلے جاری ہیں" کے عنوان سے جو اشتہارات چھپ رہے تھے، ان میں خصوصی طور پر سیکنڈ پوزیشن ہولڈر کی حیثیت سے میرا نام دے کر اپنی اعلیٰ کارکردگی کے گُن گائے جا رہے تھے۔

اسکول میں ایک سال کے اندر کئی چھوٹے بڑے جلسے ہوئے تھے، جن میں سب سے بڑا جلسہ تقسیم انعامات کے سلسلے میں میٹرک کا نتیجہ آنے کے بعد منعقد کیا جاتا تھا اور پہلی جماعت سے لے کر میٹرک تک اچھی حاضریاں رکھنے والوں، کھیل کے میدان میں نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کرنے والوں اور امتحانات میں اچھے نمبروں سے پاس ہونے والوں کو انعامات دیئے جاتے تھے اور طلباء اور طالبات کے والدین کو شرکت کے لیے خصوصی دعوت نامے بھیجے جاتے تھے۔ اس بار تقسیم انعامات کا جلسہ پچھلے سارے سالوں سے بازی لے گیا۔ اسکول کی تاریخ میں پہلے کبھی اتنا عظیم الشان جلسہ نہیں ہوا تھا۔

طلباء و طالبات کے والدین ہی نہیں، محکمہ تعلیم کے کئی بڑے بڑے افسران کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ قبل ازیں جلسے کے انعقاد کے لیے اسکول کے طلباء و طالبات سے جن کی تعداد پندرہ سو سے زیادہ تھی، بیس روپے فی کس کے حساب سے چندہ وصول کیا جاتا تھا۔ لیکن اس مرتبہ جلسے کی اہمیت کے پیش نظر تیس روپے فی کس وصول کیے گئے۔ اُردو کی ٹیچرز نے مجھے ایک چھوٹی سی تقریر لکھ کر دی، جس میں نام بنام اُن اساتذہ کی تعریف کی گئی تھی، جن سے میں نے تعلیم حاصل کی تھی۔ سونے کی گھڑی دینے کے لیے جب میرا نام پکارا گیا تو ہدایات کے بموجب گھڑی وصول کر کے میں نے وہی تقریر ڈائس پر جا کر بکستہ پڑھ دی۔

کئی دوسرے اساتذہ نے بھی انفرادی انعامات دیئے۔ جن میں ایک سر نے ضخیم ڈکشنری، ایک ٹیچر نے فریم شدہ ایک خوب صورت منظر کی بڑی سی تصویر دی۔ اور دینیات کی مس بخاری نے بخاری شریف کا اُردو ترجمہ عنایت فرمایا۔ جلسے کے اختتام سے قبل خصوصی اجازت لے کر ایک ڈگری کالج کے پروفیسر اسٹیج پر آئے۔ اپنی مختصر سی تقریر میں پہلے اُنہوں نے اسکول کے اعلیٰ تعلیمی معیار کی تعریف کی، پھر مجھے اپنے ہاں داخلہ لینے کی دعوت دیتے ہوئے پیش کش کی کہ نہ صرف سکندر کی پوری فیس معاف کر دی جائے گی، بلکہ دو سال تک اسے ڈیڑھ ہزار روپے ماہانہ اسکالرشپ بھی دیا جائے گا۔ ان طلباء نے جو میرے قریب ہی بیٹھے تھے، میری پیٹھ تھپکی اور مشورہ دیا کہ میں فوراً پروفیسر موصوف کی پیش کش قبول کر لوں۔

پروفیسر صاحب کی تقریر کے بعد مہمانوں سے کہا گیا کہ وہ اسکول کے ہال میں تشریف لے چلیں اور طلباء اور طالبات سے کہا گیا کہ وہ سکون سے اپنی جگہ پر بیٹھے رہیں۔ ابھی ایک مزاحیہ ڈرامہ دکھایا جائے گا اور ڈرامے کے دوران اُنہیں ڈنر باکس تقسیم کیے جائیں گے۔

ابا جی اور بھائی جان، اسکول کے اس یادگار جلسے میں شریک نہیں ہو سکے تھے۔ ابا جی کو کئی روز سے سہ پہر کو دکان بند کرنا پڑ رہی تھی، جبکہ دکانداری کا اصل وقت وہی ہوتا تھا۔ بھائی جان کے کالج میں پریکٹیکلز شروع ہو چکے تھے، جو دن ڈھلے تک جاری رہتے تھے۔ تاہم بھائی جان کی نمائندگی کے فرائض اُن کے دوست رفیق نے انجام دیئے، جو انٹر میں بی گریڈ سے پاس ہونے کے باعث میڈیکل کالج میں داخلہ نہیں لے سکا تھا اور ایک پرائیویٹ پولی ٹیکنیکل کالج کے الیکٹرونکس کے شعبے میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔

جلسے کے آغاز میں تلاوت کے فوراً بعد فضیلہ سے نعت پڑھوائی گئی اور اس نے اتنے اچھے لحن سے نعت پڑھی کہ سماں بندھ گیا۔ مجھے پہلی بار معلوم ہوا کہ وہ کس قدر خداداد صلاحیت کی مالک ہے۔ نورین اور فضیلہ کے والدین نے بھی جلسے میں شرکت کی تھی۔ کچھ اپنی بیٹیوں کے باعث اور کچھ میرے تعلق کے باعث۔ اُن سایوں کے علاوہ جو ہر جگہ اور ہر وقت محسوس ہوتے تھے، مجھے اماں جی اور رخسانہ کی موجودگی کا بھی احساس ہوا تھا۔ اور اس وقت جب سونے کی گھڑی دینے سے قبل پرنسپل صاحبہ نے اسٹیج پر بلا کر میرے گلے میں ہار ڈالا تھا، میں نے واضح طور پر امی جان کو ہنستے اور رخسانہ کو جوشیلے انداز میں اُچھلتے دیکھا تھا۔

مگر یہ بات ایسی نہیں تھی، جس کا ذکر کیا جاتا۔ مجھے اُن دونوں کو دیکھ کر بے انتہا مسرت ہوئی تھی۔ مگر میری مسرت اس وقت خاک میں مل گئی، جب جلسے کے اختتام پر اسکول کے گیٹ پر فادر جیکسن کھڑا نظر آیا۔ اُس کا ایک ہاتھ غائب تھا، دوسرا جھول رہا تھا۔ سر کچلا ہوا تھا اور کچلے ہوئے سر اور ناک کے راستے مغز بہہ رہا تھا۔ اُس کی بے جان، مسخ آنکھوں میں میرے لیے نفرت جھلک رہی

تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتا ہو۔ مگر اُس کی بتیسی ٹوٹ کر زبان میں پیوست ہو گئی تھی جس کی وجہ سے اُس کا بولنا ناممکن تھا۔ میں اُس کی صورت دیکھ کر گیٹ سے دُور ہی ٹھٹک کر رُک گیا۔

اسی لمحے چہکتی ہوئی فضیلہ اپنے امی، ابو کے ساتھ ادھر آ گئی۔ وہ تینوں بھی گھر جا رہے تھے۔ اور جس طرح دینیات کی ٹیچر نے حال احوال پوچھنے کے لیے مجھے روک لیا تھا، اسی طرح فضیلہ کی کلاس ٹیچر اُس کے امی ابو سے فضیلہ کی غیر معمولی صلاحیتوں کا ذکر کرنے کھڑی ہو گئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب میں گھر جانے کے لیے گیٹ کی طرف بڑھا اور جس وقت وہ تینوں گیٹ کی جانب آئے، اساتذہ، انتظام کرنے والے لڑکوں اور لڑکیوں کے علاوہ کم و بیش سبھی مہمان اور طلباء، طالبات رخصت ہو چکے تھے۔

"بھائی جی! آپ۔" فضیلہ نے کہا۔ "آپ یہاں کھڑے کیا کر رہے ہیں؟"

میں نے پلٹ کر گیٹ کی طرف دیکھا۔ فادر جیکسن کا خوف ناک ہیولا غائب ہو چکا تھا۔

"تمہارا انتظار۔" میں نے ہنسنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا اور اس کے ساتھ ہی باہر کی جانب قدم اُٹھانے لگا۔

"بالکل غلط۔" وہ بولی۔ "اگر آپ کو میرا انتظار ہوتا تو گیٹ کی طرف نہ دیکھ رہے ہوتے، آپ کی نظریں ہال کی طرف ہوتیں۔ چہرے سے تو ایسا معلوم ہو رہا ہے، جیسے آپ نے گیٹ پر کسی سانپ کو دیکھ لیا ہو اور اُس کے خوف کی وجہ سے آگے بڑھنے سے ڈر رہے ہوں۔"

فضیلہ کے ابو ہنسنے لگے۔ اُس کی امی نے کہا۔ "فضیلہ کی بات کا برا مت ماننا بیٹا! بے وقوف ہے۔ اونٹ کی اونٹ ہو گئی ہے لیکن ابھی تک بالکل باؤلی ہے۔"

"یہ دنیا اتنی جھوٹی اور مکار کیوں ہے بھائی جی؟" فضیلہ نے کہا۔ "کل تک یہی پرنسپل صاحبہ آپ کا نام تک سننے کی روادار نہیں تھیں، اسکول کی اسمبلی میں اُنہوں نے کتنا اکڑ کر اعلان کیا تھا کہ سکندر کی صحبت اچھی نہیں تھی، اس لیے ہم نے اس کا نام کاٹ دیا ہے۔ آئندہ بھی اگر کوئی لڑکا یا لڑکی اس کے نقشِ قدم پر چلتا ہوا پایا گیا تو اس کا نام کاٹ دیا جائے گا۔ اور آج کیسی باتیں بنا رہی تھیں، اور کتنے پیار سے آپ کو ہار پہنا رہی تھیں۔"

"دنیا اسی کا نام ہے بیٹا!" فضیلہ کے ابو بولے۔ "کمزور کا ساتھی کوئی نہیں ہوتا، طاقت ور کے یار بھی ہوتے ہیں۔"

"میرا دل چاہ رہا تھا کہ انہوں نے جو ہار آپ کو پہنایا ہے، آپ اسے نوچ کر پھینک دیں اور جو گھڑی دی ہے، اسے ان کے منہ پر کھینچ ماریں۔"

فضیلہ کے ابو نے اکڑ کر اپنی بیگم کی طرف دیکھا۔ "پٹھان کی بیٹی ہے۔"

''اونہہ!'' فضیلہ کی امی نے کہا۔ ''بچوں کے سامنے کیوں زبان کھلوا رہے ہو؟''

''سنو سکندر!'' فضیلہ کے ابو نے مجھے مخاطب کیا۔ ''تم خود عقل مند ہو، اپنا اچھا برا سوچ سمجھ سکتے ہو۔ اب مدرسے میں واپس نہ جانا۔ کالج کے پرنسپل کی پیشکش قبول کر لینا۔ مدرسے کی تعلیم کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو، کالج پھر بھی کالج ہی ہے۔''

''بھائی جی!'' فضیلہ پھر بولی۔ ''سنا ہے، مدرسے میں جن بھی پڑھنے آتے ہیں۔ آپ نے کسی جن کو دوست بنایا؟''

''سنا تو میں نے بھی یہی تھا۔ لیکن پورے مدرسے میں مجھے تو ایک بھی جن نہیں ملا۔''

''جو جن ہوتے ہیں، وہ کسی کو بتاتے تھوڑا ہی ہیں کہ ہم جن ہیں؟ انہیں تو خود ہی ہمیں پہچاننا ہوتا ہے۔''

پہلی گلی کے موڑ پر مڑتے ہوئے فضیلہ کی امی نے کہا۔ ''رات کے وقت جنوں کی باتیں مت کرو۔ ساری رات ڈرتی رہو گی۔''

دوسری گلی کا موڑ ہماری گلی کی طرف راہنمائی کرتا تھا۔ اس کے موڑ تک ہم سب خاموش رہے، پھر اچانک گھر کی گلی میں قدم رکھتے ہوئے فضیلہ نے عجیب سی خواہش کا اظہار کیا، کہنے لگی۔ ''میرا دل چاہتا ہے کہ کبھی وہ عورت مجھے بھی دکھائی دے، جس کا نام ترشولی ہے اور جو آپ کو اندھیرے میں نظر آتی ہے۔''

اس سے پہلے کہ اُس کی امی اُسے جھڑکتیں، اچانک ساری اسٹریٹ لائٹس بجھ گئیں اور گھروں کی لائٹیں بھی بجھ گئیں۔ رات زیادہ نہیں گزری تھی۔ گلی میں تقریباً ہر گھر میں ٹی وی تھے اور اس وقت ٹی وی پر خبرنامہ نشر ہو رہا تھا۔ گہری تاریکی میں چند ثانیوں کے لیے ترشولی ہوا میں تیرتی ہوئی نظر آئی۔ ایک سیکنڈ کے لیے وہ ہوا میں ٹھہری، فضیلہ کی جانب دیکھ کر اپنی نیلی زبان باہر نکالی، پھر جس طرح کوئی شخص ٹوپی اُتارتا ہے، اس طرح اُس نے اپنی گردن کو پکڑ کر جھٹکا دیا۔ گردن اُس کے ہاتھ میں آ کر بقیہ دھڑ سے علیحدہ ہو گئی۔ ترشولی نے اسی پر بس نہیں کی، بلکہ گردن کو دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی پر رکھ لیا۔ ہتھیلی پر رکھا ہوا چہرہ بے آواز قہقہے لگانے لگا۔ اور تب بجلی آ گئی۔

خوف سے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ خوف کا سبب ترشولی کا ہتھیلی پر رکھا ہوا مہیب چہرہ نہیں تھا، بلکہ یہ تصور تھا کہ اگر فضیلہ اس بھیانک عورت کو دیکھ رہی ہے تو اُس کے دل پر کیا گزر رہی ہو گی۔ اور یہ بات یقینی تھی کہ فضیلہ اُسے دیکھ رہی تھی۔ کیونکہ اندھیرے کے باوجود اُس کے امی ابو اپنے گھر کی سمت قدم اُٹھاتے رہے تھے، لیکن فضیلہ ٹھٹک کر رُک گئی تھی اور اُس کے ساتھ میں بھی رُکنے اور ترشولی کے بے ہودہ اور ڈراؤنے مظاہرے کو دیکھنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

بجلی آئی تو اُس کی محویت ٹوٹی۔ اُس نے میری طرف دیکھا اور دھیمی آواز میں بولی۔ ''یہی وہ عورت تھی، جو آپ کو اندھیرے میں دکھائی دیتی ہے؟''

''ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' میں نے اُس کی دلجوئی کرنے کی کوشش کی۔ ''یہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔''

''میں ڈر کب رہی ہوں، بھائی جی!'' فضیلہ نے کہا۔ ''مجھے تو اُس کے کرتب پر حیرت ہو رہی ہے۔''

وہ واقعی خوف زدہ نہیں تھی۔ خوف زدہ ہوتی تو اتنے راستے سے کھڑی ہو کر باتیں نہ کرتی۔ بھائی جان کی طرح اُس کی بھی چیخیں نکلنے لگتیں اور اُس کی چیخوں سے ڈر کر شاید میں بھی چیخنے لگتا۔ اُس نے جو کچھ دیکھا تھا، اس کے لیے تماشے سے زیادہ نہیں تھا۔ بلاشبہ فضیلہ ایک بہادر اور باہمت پٹھان کی بیٹی تھی۔

اُس کے امی ابو اپنے گھر پہنچ چکے تھے۔ ہم دونوں تیز تیز قدم اُٹھاتے ہوئے اُن سے جا ملے۔ پھر میں اُنہیں خدا حافظ کہہ کر اپنے گھر چلا گیا، جس کا دروازہ ابا جی نے میرے انتظار کے باعث اندر سے بند نہیں کیا تھا۔

ابا جی اور بھائی جان کو تحائف دکھانے، جلسے کا تھوڑا سا حال بتانے اور کالج کے پروفیسر، پروفیسر چراغ علی کی پیشکش سے مطلع کرنے کے بعد اپنے کمرے میں چلا گیا اور پلنگ پر لیٹ گیا۔ میں نے مدرسے سے گھر آ کر بہت بڑی غلطی کی تھی۔ حقوق العباد کی ادائیگی کے لیے آ تو گیا تھا لیکن دوسرے ہی دن مجھے واپس چلے جانا چاہیے تھا۔ مدرسہ میری پناہ گاہ تھا۔ مدرسے سے باہر کی دنیا میرے لیے مکڑی کے جالے کی مانند تھی۔ میں مکھی کی مانند اس میں پھنستا چلا جا رہا تھا۔

اب بھی وقت تھا، اب بھی مجھ میں اتنی قوت تھی کہ جال کے تاروں کو توڑ کر ایک ہی جست میں اپنی پناہ گاہ میں پہنچ سکتا تھا۔ کچھ دن اور مدرسے سے باہر رہنا پڑ گیا تو میری حالت مکڑی کے جالے میں پھنسے ہوئے اُس کیڑے جیسی ہو جائے گی، جس میں حرکت کرنے تک کی طاقت نہیں ہوتی۔ میں بے حس و حرکت پڑا رہا اور ٹکر ٹکر اُن مکڑیوں کو دیکھتا رہا جو اُس کے جسم کے مختلف حصوں سے خون چوسنے میں مصروف رہتی تھیں۔

میں نے زندگی میں روحانی علوم سیکھنے کی کبھی اتنی شدت سے ضرورت محسوس نہیں کی تھی، جتنی اس رات محسوس کر رہا تھا۔ سونے کے لیے لیٹا تو فیصلہ کر چکا تھا کہ صبح ہوتے ہی ابا جی اور بھائی جان سے اجازت لوں گا، فضیلہ اور اُس کے گھر والوں سے الوداعی ملاقات کروں گا اور صدر مدرس کے دستِ حق پرست پر بیعت کر لوں گا اور درسِ نظامی کی تکمیل کے لیے مدرسے روانہ ہو جاؤں گا۔ اور تب تک واپس نہ آؤں گا، جب تک اس اسلحہ سے جو ترشولی اور اس کے حواریوں سے

مقابلہ کرنے کے لیے ضروری ہے، لیس نہ ہو جاؤں گا۔ اور پھر اُس ترشولی سے اپنی معصوم بہن
رخسانہ کی موت کا بھرپور انتقام لوں گا۔ بلکہ فضیلہ اور نورین کو اور بھائی جان کو اور ساری مخلوق
اس خون آشام چڑیل سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نجات دلا سکوں گا۔

صبح ہوئی، ناشتہ کرتے ہوئے میں نے ابا جی اور بھائی جان کو اپنے ارادے سے آگاہ کیا کہ
تعلیم کی تکمیل کے لیے واپس جانا چاہتا ہوں۔ اور مزید تشریح کرتے ہوئے بتایا کہ درسِ نظامی
تعلیم کے ساتھ ساتھ بی۔اے کی تیاری بھی کر سکوں گا۔ اور تکمیل کے بعد کسی بھی یونیورسٹی
انگلش کا امتحان دے کر بی۔اے کی ڈگری بھی لے لوں گا۔ بعد ازاں مجھے ایم۔اے میں داخلہ
لینے کے لیے ایکسٹرنل اسٹوڈنٹ کی حیثیت سے ایم۔اے کا امتحان دینے کا استحقاق حاصل
جائے گا۔

ابا جی نے کہا۔ "میں قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہوں۔ میری خواہش تھی کہ تم یہیں گھر
رہتے اور میرا دم تم دونوں بھائیوں کے سامنے نکلتا۔ اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ مدرسے میں رہ کر تم زیادہ
بہتر طور پر تعلیم حاصل کر سکتے ہو تو میں تمہاری راہ کا پتھر نہیں بننا چاہتا۔ مدرسے سے مجھے کفن
دینے اور قبرستان تک چھوڑنے تو آ ہی جاؤ گے۔"

بھائی جان نے کہا۔ "میں تمہاری عادت سے واقف ہوں۔ اپنی ضد کے آگے کسی کی نہیں
چلنے دیتے۔ اگر تم مدرسے جانے کا تہیہ کر ہی چکے ہو تو چاہے ساری دنیا اِدھر کی اُدھر کیوں نہ ہو
جائے، تمہارے ارادے کو تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ پھر بھی بڑے بھائی کی حیثیت سے اتنا ضرور
کہوں گا کہ پروفیسر چراغ علی نے جو پیشکش کی تھی، اُسے ٹھکرانا کفرانِ نعمت کے مترادف ہے۔
مدرسہ تمہیں مولوی یا ملا تو ضرور بنا دے گا، لیکن اتنی دنیا نہیں دے سکے گا، جس کی فی زمانہ
اشد ضرورت ہے۔"

میں نے کہا۔ "بہت دن پہلے کی بات ہے، جب سرسیّد احمد خان نے انگلش کی ضرورت و
اہمیت کو محسوس کر کے مسلم قوم کی فلاح و بہبود کے لیے علی گڑھ میں ایک کالج قائم کیا۔ ہمارے
صدر مدرس کا ارشاد ہے، سرسیّد احمد خان کو دن رات جس طرح مسلمانوں کی بھلائی کا خیال
رہتا تھا، وہ اُن کی بخشش کے لیے کافی ہے۔ صدر مدرس صاحب کا ارشاد میں نے اس لیے نقل کیا
ہے، تاکہ آپ کو یہ پتہ چل جائے کہ ہر دور اور ہر زمانے میں مسلمانوں کے ہر طبقہ فکر نے سرسیّد
احمد خان کے جذبے کو سراہا ہے۔ اب آگے سنیے۔

جس وقت علی گڑھ میں کالج کا قیام ہو رہا تھا، انہی دنوں حضرت مولانا قاسم نانوتوی نے
سوچا کہ ملک میں کچھ ایسے لوگ بھی ہونا ضروری ہیں، جو عام افراد کو اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ
وسلم کے احکامات سے آگاہ کرتے رہیں۔ دیوبند میں مدرسہ دارالعلوم کی بنیاد رکھی۔ مدرسے کے

قیام کے بعد انہیں ہمہ وقت یہ فکر ستانے لگی کہ علی گڑھ کے سند یافتہ بڑے بڑے عہدے حاصل
کریں گے، دیوبند کے مولویوں اور ملاؤں کو کون پوچھے گا؟ ایک رات تو اسی فکر میں رو رو کر گزار
دی۔ لیکن صبح جب فجر کی نماز کے لیے مسجد میں تشریف لائے تو ہشاش بشاش تھے۔
خدام کو بتایا کہ مجھے یقین دلایا گیا ہے کہ دینی تعلیم حاصل کرنے والے کسی بھی طور دنیاوی
تعلیم حاصل کرنے والوں سے کم نہیں رہیں گے۔ آپ خود ہی موازنہ کر کے دیکھ لیجیے۔ آپ کو ایک
بھی عالم دین ایسا نظر نہیں آئے گا، جو پریشان اور بے روزگار ہو۔ جبکہ بے شمار بی۔اے اور
ایم۔اے روزگار کی تلاش میں دفتروں کے چکر لگاتے پھر رہے ہیں۔ دین کی خدمت کرنے
والوں کو اللہ تعالیٰ مرغ کھلاتا ہے، دنیا کو اپنانے والے کو دال بھی مشکل سے نصیب ہوتی ہے۔"

"اس بات کی تصدیق تو میں بھی کرتا ہوں۔" ابا جی بولے۔ "ہماری جامع مسجد کی امامت
کے لیے سند یافتہ پیش امام کی ضرورت تھی۔ رہائش مفت، بجلی مفت، پانی مفت اور تنخواہ پانچ ہزار
روپے ماہانہ۔ ہمارے اس بڑے اور مردم خیز شہر میں اخبارات میں اشتہار چھپوائے گئے، بڑے
بڑے دارالعلوم سے رابطہ کیا گیا، تب کہیں چھ ماہ کے بعد ایک عالم دین پیش امام نصیب ہوا۔ پانچ
ہزار تو محض تنخواہ تھی، کم از کم اتنا ہی فضل ربی بھی ہے، جو ہدیہ کی صورت میں علاقے کے کھاتے
پیتے لوگ پیش کرتے ہیں۔ یہ فضل ربی وہ نہیں، جسے دنیادار رشوت کے طور پر وصول کرتے ہیں۔
رشوت میں کوئی نہ کوئی غرض شامل ہوتی ہے۔ جبکہ ہدیہ دینے والے کو صرف رضائے الٰہی مقصود
ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رشوت کا لینا دینا حرام اور ہدیہ کا لینا دینا نہ صرف جائز بلکہ باعث اجر و
ثواب ہے۔"

"کچھ بھی ہو، میں تو بس اتنا جانتا ہوں کہ ہمارا دور سائنس اور کمپیوٹر کا دور ہے۔"

"لیکن دین کا دور، ہر دور کا دور ہے۔" میرے بجائے ابا جی نے جواب دیا۔ "کیونکہ دین
قیامت تک کے لیے آیا ہے، تمہارے دنیاوی دور بدلتے رہے ہیں، بدلتے رہیں گے۔ مگر دین کا
دور قیامت تک ایک ہی رہے گا۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئے۔ "تم نے انتہائی مناسب اور
صائب فیصلہ کیا ہے سکندر! اگر پہلے میرے دل میں کوئی اشکال تھا تو اب وہ بھی نہیں رہا۔ کتابوں
میں آیا ہے کہ روزِ محشر حافظ قرآن کے والدین کو تاج پہنائے جائیں گے۔ اور وہ اس شان کے
ساتھ آئیں گے کہ لوگ انگشت بدنداں ہو کر پوچھیں گے کہ وہ کون ہیں اور انہیں یہ رتبات اور
درجات کس بنا پر حاصل ہوئے ہیں؟......حفظ قرآن دین کا صرف ایک ہی شعبہ ہے۔ اس شعبے
کے عامل کے والدین کا اتنا بڑا رتبہ ہو گا تو عالم دین تو نائب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے، دین
کے ہر شعبے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے والدین کے جو رتبات اور درجات ہوں گے، اس کا تو صحیح
طور پر تصور نہیں کیا جا سکتا۔ مجھے لالچی کہہ لو، خود غرض کہہ لو، لیکن سچ تو یہ ہے کہ آخرت میں تمہی

میرا اور اپنی امی جان کا سرمایہ ہو گے۔"

بھائی جان منہ بنا کر اُٹھے اور ہاتھ دھونے کے لیے چلے گئے تو ابا جی نے دھیمی آواز میں کہا
"خان صاحب! آپ کی بیگم اور بیٹی کے ہم پر بڑے احسانات ہیں۔"

"جی ہاں۔" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ "اور ان تینوں نے صحیح معنوں میں پڑوسی ہونے
حق ادا کیا ہے۔ کبھی محسوس ہی نہیں ہونے دیا کہ وہ ہمارے نہیں ہیں۔"

"تمہاری غیر معمولی کامیابی نے اچھے اچھوں کے زہد کو توڑ دیا ہے۔" ابا جی نے اپنے سا
لہجے میں کہا۔

میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا۔ کیا انہوں نے موضوع تبدیل کر دیا تھا یا ہنوز فضیلہ اور اُ
کے امی ابو کی بات کر رہے تھے؟ میں خاموشی سے اُن کے چہرے کو تکنے لگا۔

"تمہیں یاد ہوگا، سکندر!" ابا جی نے اپنی بات جاری رکھی۔ "اب سے چند سال قبل پڑو
کی کسی عورت نے فضیلہ کی امی سے کچھ اس قسم کی بات کی تھی، جس کا مطلب یہ تھا کہ انہوں
تمہیں اپنی بیٹی کے لیے پسند کر لیا ہے، تو وہ اُس عورت سے ناراض ہو گئی تھیں اور انہوں
فضیلہ کو سختی سے ہمارے گھر آنے سے منع کر دیا تھا۔ خود بھی ہم لوگوں سے کھنچی کھنچی رہنے لگی تھیں
چند ماہ بعد اُن کی خفگی دُور ہو گئی اور انہوں نے فضیلہ کو ہمارے گھر آنے کی اجازت دے دی۔
سکتا ہے، انہیں اس بات کا احساس ہو گیا ہو کہ پڑوس کی عورت نے جو بات کہی تھی، اس سے ہ
کوئی تعلق نہیں تھا۔ ہمیں اپنے غموں اور دکھوں ہی سے فرصت نہیں تھی کہ ان باتوں کی طرف جو
از وقت تھیں، دھیان دیتے۔ تمہارا نتیجہ آنے کے بعد سے اب تک کئی عزیز اور کئی واقف کار
لڑکیوں کے رشتوں کے سلسلے میں بالواسطہ اور بلاواسطہ کہہ چکے ہیں۔ اس بات کا علم فضیلہ کے ا
بھی ہے اور امی کو بھی۔ اور ان کی طرف سے کہا جا رہا ہے کہ تمہاری امی جان نے فضیلہ کو پیدا
کے فوراً بعد تمہارے لیے مانگ لیا تھا۔"

میرے پورے جسم میں سوئیاں سی چبھنے لگیں۔ فضیلہ تو میری بہن تھی۔ رخسانہ کی طر
مقدس۔ میں تو ایسی بات کا تصور بھی گناہ سمجھتا تھا۔

"فضیلہ بڑی ہو رہی ہے۔" ابا جی کہہ رہے تھے۔ "اُس کے والدین کی تشویش بجا
رہی اُن کی یہ بات کہ تمہاری امی جان نے فضیلہ کو تمہارے لیے مانگ لیا تھا، اس لیے غلط
مرحومہ نے مجھ سے کبھی کسی بات کو مخفی نہیں رکھا تھا اور اُنہی کی طرح میں نے بھی کبھی ایسا کام
کیا، جس سے ان کے اعتماد کو، جو مجھ پر تھا، ٹھیس پہنچے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ تمہاری امی
نے، اللہ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، فضیلہ کی امی سے تمہارے اور اُس کے ر
کے سلسلے میں کوئی گفتگو نہیں کی تھی، میں نے اس بات کی تردید نہیں کی ہے۔ کیونکہ......"

وہ چند لمحوں کے لیے رُکے اور چہرے کے اُتار چڑھاؤ سے میرے تاثرات کا اندازہ لگانے کی کوشش کرنے لگے، پھر مسکراتے ہوئے اپنا جملہ پورا کیا۔ "کیونکہ فضیلہ مجھے نورین سے زیادہ اچھی لگتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم بھی اسے پسند کرتے ہو۔"

"جی ہاں۔ میں اُسے پسند کرتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "لیکن ایک بہن کی حیثیت سے۔ اس سے آگے بڑھ کر میں نے کوئی بات سوچی نہ آئندہ کبھی سوچنا چاہتا ہوں۔"

"کردار کی یہ بلندی تمہیں مدرسے کی تربیت سے حاصل ہوئی ہے۔ ہر نوجوان تمہاری طرح لڑکیوں کے بارے میں یہی خیال رکھنے لگے تو ہمارے معاشرے کی بہت سی برائیاں از خود دُور ہو سکتی ہیں۔"

"شکر ہے، میں آپ کو اپنا مطمع نظر سمجھانے میں کامیاب ہو گیا۔"

اسی وقت فضیلہ نے دیوار کی دوسری جانب سے سر نکال کر آواز دی۔

"بھائی جان کہاں ہیں؟ اُن کا فون آیا ہے۔"

بھائی جان کپڑے بدل رہے تھے۔ گلے میں قمیض ڈالتے ہوئے تیزی سے باہر لپکے۔ "کس کا فون ہے؟"

فضیلہ زور سے ہنسی۔ "آپ کے پاس تو بس ایک ہی فون آتا ہے۔ بس اُسی کا ہے۔"

بھائی جان جلدی جلدی قمیض ڈالتے ہوئے دروازے کی طرف لپکے۔ "آ رہا ہوں۔"

"بھائی جی!" فضیلہ نے مجھے مخاطب کیا۔ "کیا آج آپ واقعی جا رہے ہیں؟"

"ہاں بہنا!" میں نے بے ساختہ کہا۔ "عجیب سی چاشنی تھی اس لفظ میں۔ مجھے اپنے سینے میں ٹھنڈک اُترتی محسوس ہوئی۔

"واپس کب آئیں گے؟"

"دو یا تین سال بعد۔" میں نے مسکرا کر جواب دیا۔ "بشرط زندگی۔"

"ارے نہیں بھائی جی! ایسا غضب نہ کریں۔ کیا آپ کے مدرسے میں چھٹیاں نہیں ہوتیں؟" فضیلہ نے کہا۔

"ہوتی ہیں۔ لیکن ہم لوگ تمہاری طرح ان چھٹیوں کو کھیل تفریح میں ضائع نہیں کرتے۔ میں نے سیکنڈ پوزیشن یونہی تھوڑی حاصل کی ہے؟"

"چھٹیوں میں تو آپ کو آنا ہی پڑے گا۔"

بڑی عجیب لڑکی تھی۔ خواہ مخواہ ضد کیے جا رہی تھی۔ اگر اُسے معلوم ہو جاتا کہ کچھ دیر پہلے ابا جی کس قسم کی باتیں کر رہے تھے اور اُس کے امی ابو کیا سوچنے لگے تھے، تو یقیناً اُسے بھی ویسے ہی صدمے سے دوچار ہونا پڑتا، جیسا مجھے ہوا تھا۔

’’ٹھیک ہے۔ جب چھٹیاں ہوں گی، اُس وقت دیکھا جائے گا۔‘‘

’’شکریہ بھائی جی! آپ نے ایک بات تو مان لی۔ اب دوسری بات بھی مان لیجیے۔‘‘

’’مانا تو کچھ بھی نہیں۔ ویسے دوسری بات بتاؤ۔‘‘

’’پہلے بہنا کہیے۔‘‘

’’یہ لفظ کسی کی فرمائش پر نہیں، خود بخود دل کی گہرائیوں سے نکلتا ہے، بہنا!‘‘

فضیلہ خوب ہنسی۔ میں نے اُسے بہنا کہنے سے انکار بھی کر دیا تھا اور زبان سے اس لفظ کو ادا بھی کر رہا تھا۔

’’دوسری بات یہ ہے بھائی جی!‘‘ اُس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ’’آج مدرسے نہ جایئے۔ کل جمعہ ہے۔ جمعہ کے دن آپ کو مدرسے میں کھچڑی کوئی نہیں کھلائے گا۔ کل گرم گرم کھچڑی کھایئے اور پرسوں چٹخارے بھرتے ہوئے مدرسے چلے جایئے۔‘‘

’’مجبوری ہے فضیلہ!‘‘ میں نے کہا۔ ’’میرا مدرسے جانا بہت ضروری ہے۔‘‘

’’کوئی ضروری نہیں ہے۔‘‘ فضیلہ کے بجائے بھائی جان نے جواب دیا۔ وہ اُس کے ہاں سے نورین سے گفتگو کر کے واپس آ گئے تھے اور میرے پیچھے خاموش کھڑے ہم دونوں کی باتوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

میں نے پلٹ کر اُن کی طرف دیکھا۔ بھائی جان نے کہا۔ ’’نورین کے ابو نے پکنک کا انتظام کیا ہے۔ پرسوں سے پہلے تم مدرسے نہیں جا سکتے۔‘‘

’’بھائی جان زندہ باد!‘‘ فضیلہ خوش ہو کر تالیاں بجانے لگی۔

’’یہ آپ کا حکم ہے؟‘‘ میں نے بھائی جان سے پوچھا۔

’’تم کیا سمجھ رہے ہو، کیا میں مذاق کر رہا ہوں؟‘‘

’’آپ کہتے ہیں تو نہیں جاؤں گا۔‘‘

’’بس بھائی جی! دیکھ لی آپ کی محبت۔‘‘ فضیلہ بولی۔ خوشی سے اُس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ ’’میں نے کہا تو صاف انکار کر دیا، اور بھائی جان نے کہا تو فوراً ان کی بات مان لی۔‘‘

’’وہ میرے بڑے بھائی ہیں۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’اُن کے حکم کو کس طرح ٹال سکتا ہوں؟‘‘

’’سچ بتایئے، میری جگہ اگر رخسانہ ہوتی اور آپ کو ایک روز رُکنے کو کہتی تو کیا آپ اُسے بھی اسی بے دردی سے منع کر دیتے؟‘‘

بڑا انوکھا سوال تھا۔ میں نے اپنے دل کو ٹٹولا۔

’’ہاں، اُسے بھی انکار کر دیتا۔ اور اگر زیادہ ضد کرتی تو اُس کے سر پر ایک چپت بھی رسید کر دیتا۔‘‘

’’میں بھی تو ضد کر رہی تھی۔ میرے سر پر چپت رسید کیوں نہیں کی؟‘‘

بہت ہی سیدھی سادی، عام فہم سی بات تھی۔ مگر جب میں نے اس کی گہرائی محسوس کی تو تھوڑا سا کانپ گیا۔ میں رخسانہ کے سر پر چپت رسید کر سکتا تھا تو اس کے سر پر کیوں نہیں رسید کر سکتا تھا؟ کیوں......کیوں......کیوں......؟‘‘

’’کیونکہ......‘‘ میں نے بات بناتے ہوئے کہا۔ ’’کیونکہ تمہارا سر بہت دور ہے۔ جس طرح چپت کھانے کے لیے تمہیں اسٹول پر کھڑا ہونا پڑا ہے، اسی طرح چپت رسید کرنے کے لیے مجھے بھی اسٹول کا انتظام کرنا پڑے گا۔‘‘

’’اگر میں آپ کے گھر آ جاؤں، تو؟‘‘

میرا سر جھنجھنا گیا۔ ’’تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے، فضیلہ؟‘‘

دوسری جانب سے اس کی امی کی آواز سنائی دی۔ ’’فضیلہ! کیا آج اسکول نہیں جانا ہے؟‘‘

’’نہیں۔‘‘ اُس نے ماں سے مخاطب ہو کر کہا۔ ’’اتنی جلدی بھول گئیں، کل کی تقریب کی وجہ سے پرنسپل نے آج کی چھٹی کا اعلان کیا تھا۔‘‘ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔ ’’آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔‘‘

’’کون سا سوال؟‘‘

’’یہی کہ اگر میں آپ کے گھر آ جاؤں، تو آپ چپت لگائیں گے یا نہیں؟‘‘

’’نہیں۔‘‘

’’کیوں......کیا میں آپ کی بہن نہیں ہوں؟‘‘

میں ’نہیں‘ کہتے کہتے رُک گیا۔ نا سمجھی میں فضیلہ نے میری دُکھتی ہوئی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ ابا جی دُکان پر اور بھائی جان، کالج چلے گئے۔ میں اپنے کمرے میں لیٹا دوپہر تک فضیلہ کے بارے میں سوچتا رہا۔ وہ رخسانہ نہیں تھی، لیکن میں نے اُسے رخسانہ کا درجہ دے رکھا تھا۔ رخسانہ کو مار سکتا تھا تو پھر فضیلہ کو کیوں نہیں مار سکتا تھا؟ رخسانہ کی گود میں سر رکھ کر لیٹ سکتا تھا، مگر فضیلہ کی گود میں سر رکھ کر نہیں لیٹ سکتا تھا۔ خود رخسانہ میرے گلے میں پیار سے بانہیں ڈال سکتی تھی، لیکن فضیلہ ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ اگر بہن وہ تھی اور بہن یہ تھی تو دونوں میں تفاوت کیوں تھا؟......کیا میں اپنے آپ سے جھوٹ بولتا رہا تھا؟ خود کو دھوکا دیتا رہا تھا؟......اگر ایسا تھا تو یہ کردار کی بلندی تو نہیں تھی، حد درجہ کی پستی تھی۔

دوپہر کا کھانا فضیلہ لے کر آئی تو میری جرأت نہ ہو سکی کہ میں اُس سے آنکھیں چار کر سکوں۔ میرے دل میں چور تھا، زبان جھوٹی تھی جو بہنا، بہنا کہتے نہیں تھکتی تھی۔ مگر ذہن ناپاک و پلید تھا۔ میں فضیلہ میں ہونے والی تبدیلیوں کو محسوس کرتا رہا تھا۔ رخسانہ زندہ ہوتی تو کیا مجھے

اُس میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا احساس ہوتا؟ اگر احساس ہو بھی جاتا تو کیا میں اُس کی طرف
اس طرح دیکھ سکتا تھا، جس طرح فضیلہ کو دیکھا کرتا تھا؟

"کیا بات ہے بھائی جی؟ آج آپ بہت خاموش ہیں۔" فضیلہ نے کہا۔ میں اُسے
جواب دیتا۔ دماغ میں زلزلہ سا آیا ہوا تھا۔ اتھل پتھل سی مچی ہوئی تھی۔ دماغ کا ایک حصہ کہہ
تھا، فضیلہ تمہاری بہن ہے اور دوسرا کہہ رہا تھا نہیں، فضیلہ تمہاری بہن نہیں ہے۔

"شاید مدرسہ یاد آرہا ہے۔"

"سر میں درد ہو رہا ہے۔" میں نے کہا۔ "کھانا میز پر رکھ دو۔ ظہر کی نماز کے بعد بھوک
گی تو کھالوں گا۔ اس وقت بھوک نہیں ہے۔"

وہ میز پر کھانا رکھ کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ "سر دبا دوں؟"

"نہیں......" میں کانپ کر رہ گیا۔ وہ رخسانہ نہیں تھی۔ اُس کا لمس میرے لیے نا
برداشت تھا۔ "اب اتنا درد بھی نہیں ہو رہا کہ سر دبوانے بیٹھ جاؤں۔ دراصل دماغ کچھ بوجھل
ہو رہا ہے۔"

"کیوں؟......کیا رات بھر جاگتے رہے تھے؟"

کیسی عجیب چم چیچڑ لڑکی تھی۔ کسی طرح جا ہی نہیں رہی تھی۔

"ترشولی کی منحوس صورت دیکھ لیتا ہوں تو اکثر دماغ خراب ہو جاتا ہے۔ شام تک ٹھیک
جاؤں گا۔"

"ترشولی کون ہے؟" وہ ہنس پڑی۔ "ایسا عجیب و غریب نام تو میں نے آج ہی سنا ہے"

"گزشتہ رات سکول سے گھر واپسی پر جب اچانک بجلی چلی گئی تھی تو تمہیں وہ بھیانک
تاریکی میں نظر آئی تھی۔ اُسی کا نام ترشولی ہے۔"

"اچھا، تو اُن محترمہ کی وجہ سے آپ کا دماغ خراب ہو رہا ہے۔" فضیلہ نے کہا۔ "مگر
جی! وہ تو ایک کرتب باز عورت تھی۔ اُس نے بڑے مزے کا کھیل دکھایا تھا۔"

"وہ عورت نہیں تھی، روح تھی۔ اُس نے کھیل نہیں دکھایا تھا، تمہیں ڈرانے کی کوشش کی

"مگر میں تو اُس سے بالکل نہیں ڈری۔"

"اس لیے نہیں ڈریں کہ تم اُس کے کرتوتوں سے ناواقف ہو۔"

"کرتوتوں سے آپ کا کیا مطلب ہے؟"

"کچھ بھی مطلب کیوں نہ ہو۔ اب تم جاؤ۔ مجھے کچھ دیر آرام کرنے دو۔"

"شام کو اُس کے کرتوت بتائیں گے؟"

"ہرگز نہیں۔ میں تمہیں خوف زدہ نہیں کرنا چاہتا۔"

"ایک بات کہوں بھائی جی!" وہ بولی۔ "مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں کبھی خوفزدہ ہوئی ہوں۔
میری بڑی خواہش ہے کہ کبھی تو کسی سے ڈر لگے۔ لیکن یہ خواہش پوری ہی نہیں ہوتی۔ مجھے معلوم
ہی نہیں، ڈر کسے کہتے ہیں۔"

"ترشولی ایک دو بار اور نظر آ گئی تو معلوم ہو جائے گا۔"

"نظر کیسے آئے گی؟"

"مجھے نہیں معلوم۔" میں نے کہا۔

وہ کھڑی ہو گئی۔ "ناراض کیوں ہوتے ہو؟ جا رہی ہوں۔" مگر وہ گئی نہیں، پیر کے انگوٹھے
سے فرش کو اس طرح کریدنے لگی، جیسے اُسے اکھیڑ ہی ڈالے گی۔

"اب کھڑی کیوں ہو؟"

اُس نے میری طرف مسکرا کر دیکھا اور بولی۔ "مجھے بہنا کہیے۔"

"نہیں کہوں گا۔" میں نے کہا اور تیز قدموں سے باتھ روم کی طرف بڑھ گیا۔ واپس آیا تو وہ
جا چکی تھی۔

شام کو جب بھائی جان بھی موجود تھے، ابا جی نے مجھ سے پوچھا۔

"خان صاحب کو کیا جواب دوں؟"

"کس بات کا؟"

بھائی جان نے ابا جی کی طرف دیکھا۔ "شاید آپ نے سکندر کو پوری بات نہیں بتائی؟"

"کیسے بتاتا؟ وہ شریر دیوار پر آ کھڑی ہوئی اور سکندر سے باتیں کرنے لگی۔ میں نے کچھ دیر
انتظار کیا لیکن جب ان دونوں کی باتیں کسی طرح ختم ہونے میں نہیں آئیں تو میں دُکان پر چلا گیا۔"

"جب سکندر کو اصل بات کا علم ہی نہیں تو ہاں یا نہ کیسے کر سکتا ہے؟" بھائی جان نے کہا۔
"سنو سکندر! میں تمہیں بتاتا ہوں۔ فضیلہ کی پیدائش پر امی جان نے اُسے تمہارے لیے مانگ لیا
تھا۔ مگر اُنہوں نے کسی وجہ سے کسی کو یہ بات نہیں بتائی۔"

ابا جی نے گہری سانس لی۔ وہ کہنا چاہتے تھے کہ یہ جھوٹ ہے۔ مگر کچھ سوچ کر خاموش رہنے
ہی میں مصلحت سمجھی۔ بھائی جان کہتے رہے۔ "امی جان رضائے الٰہی سے قبر میں چلی گئیں اور
اپنے ساتھ اس راز کو بھی لے گئیں کہ تم اور فضیلہ ایک دوسرے کے منگیتر ہو۔ اب تم نے پوزیشن
حاصل کی تو کئی لوگوں نے یہ سوچ کر کہ تمہارا مستقبل بہت شاندار ہے، مختلف افراد کے ذریعے اپنی
لڑکیوں کے رشتے کے بارے میں ابا جی سے کہلوایا۔ اس بات کا علم فضیلہ کے امی اور ابو کو ہوا۔
پرسوں انہوں نے ابا جی کو اپنے ہاں بلایا اور کہا کہ سکندر کا رشتہ کہیں اور کرنے کی غلطی مت کر
بیٹھنا۔ پھر اُنہوں نے ہمیں امی جان مرحومہ کی خواہش سے آگاہ کیا۔ میں نے اور ابا جی نے یک

بان ہو کر کہا۔ گو کہ ہمیں کوئی علم نہیں، اندرونِ خانہ کیسی کھچڑی پکتی رہی ہے، مگر فضیلہ ہمیں پسند ہے۔ اب کل صبح سے فضیلہ کے ابو بضد ہیں اور ظاہر ہے اُن کی ضد میں فضیلہ کی امی کی ضد کا عمل دخل ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ کل جمعہ کے روز چھوٹی موٹی منگنی کی رسم ادا کر لی جائے۔ تا کہ تم پر دوسروں کی للچائی ہوئی نظریں پڑنا بند ہو جائیں۔"

میں نے کہا۔ "گویا پکنک کے بہانے آپ نے مجھے اس لیے روکا ہے؟"

"پکنک کا پروگرام بھی ہے۔" بھائی جان بولے۔ "صبح کو منگنی، دوپہر کو نمازِ جمعہ کے بعد پکنک۔"

"اور اگر میں منگنی کرنے سے انکار کر دوں، تو؟"

"تو پھر تمہیں اس کی وجہ بتانا پڑے گی اور ہمیں مطمئن نہ کر سکے تو تمہیں ہمارے فیصلے پر عمل کرنا پڑے گا۔"

"ایک نہیں، کئی وجوہات ہیں۔" میں نے کہا۔ "سب سے پہلی بات یہ کہ میں پڑھنا اور کم از کم بی۔اے کرنا چاہتا ہوں۔"

"میں بھی ایم۔بی۔بی۔ایس کر رہا ہوں۔ پھر بھی میں نے امی جان اور ابا جی کی خواہش پر سر جھکا دیا۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ منگنی، پڑھائی پر اثر انداز نہیں ہوتی۔"

"دوسری وجہ یہ کہ ترشولی کا وجود باقی ہے۔ مجھے اُس سے اپنی معصوم بہن کا انتقام لینا ہے۔ جب تک میں رخسانہ کی موت کا بدلہ نہیں لے لوں گا، مجھے سکون نہیں ملے گا۔"

"جن غیر مرئی قوتوں پر ہمارا بس نہیں چل سکتا، ان سے اُلجھنا اور انہیں چھیڑنا مناسب نہیں ہے۔" بھائی جان نے کہا۔ "یوں بھی ہم ان کی وجہ سے اپنی خوشیوں اور مسرتوں سے دستبردار نہیں ہو سکتے۔"

"اور مجھے اس وقت تک سچی خوشی حاصل نہیں ہو گی، جب تک میرے انتقام کی آگ نہیں بجھے گی۔"

"اور کیا تمہیں یقین ہے کہ اُس سے انتقام لے کر اپنی آگ بجھا سکو گے؟ کیا تم اندھیرے کو یا سائے کو یا ہوا کو پکڑ سکتے ہو؟ جس سے لڑنے کے منصوبے بنا رہے ہو، کیا وہ انہی میں سے ایک نہیں ہے؟"

"وہ ہوا ہو یا سایہ ہو یا اندھیرا ہو، میرا خیال ہے کہ مدرسے میں روحانی علوم کی تربیت حاصل کر کے میرے لیے اُسے پکڑنا آسان ہو جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے پروفیسر چ[illegible] علی کی پیشکش ٹھکرا دی ہے اور مدرسے کو ترجیح دی ہے۔"

"یہ بات پورے یقین سے کہہ رہے ہو؟"

"جی ہاں......اتنے یقین سے، جتنا مجھے اپنے وجود کا یقین ہے۔"

"یقین ہے تو اس ترشولی کو اپنی راہ کا پتھر کیوں بنا رہے ہو؟ تاریکی کو گرفتار کر سکتے ہو تو روشنی سے گریز کیوں کر رہے ہو؟"

"اس کی وجہ یہ ہے کہ میں فضیلہ کو اپنی بہن سمجھتا ہوں۔"

بھائی جان نے کچھ کہنا چاہا، مگر ابا جی نے ہاتھ اُٹھا کر انہیں روک دیا۔ "ٹھہرو۔ اس بات کا جواب میں دوں گا۔ ہمارے، تمہارے اور سارے جن و انس کے آقا، سرورِ کونین حضور پُر نور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حضرت زید رضی اللہ عنہ کو اپنا منہ بولا بیٹا بنایا تھا۔ تم نے دینی تعلیم حاصل کی ہے، مجھ سے زیادہ تمہاری معلومات ہیں۔ غلط بات کہوں تو فوراً ٹوک دینا۔ کیا یہ درست نہیں کہ حضرت زید رضی اللہ عنہ کو سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اپنے بیٹے کی طرح چاہتے تھے؟ اور کیا صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین کو یہ علم نہیں تھا کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حضرت زید رضی اللہ عنہ کو اپنا منہ بولا بیٹا بنایا ہوا تھا؟"

"جی ہاں......ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حضرت زید رضی اللہ عنہ کو اپنا بیٹا بنایا ہوا تھا اور حضرت زید رضی اللہ عنہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو والد کی طرح ہی چاہتے تھے۔"

"پھر تمہیں یہ بھی معلوم ہو گا کہ حضرت زید رضی اللہ عنہ کی شادی جحش کی بیٹی حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے ہوئی تھی۔ لیکن حضرت زید رضی اللہ عنہ اور حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے درمیان ذہنی ہم آہنگی نہیں ہو سکی۔ جب اچھی طرح نہ بنی تو نوبت یہاں تک پہنچی کہ دونوں میں علیحدگی ہو گئی۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں؟"

"بالکل درست فرما رہے ہیں۔ درحقیقت ایسا ہی ہوا تھا۔"

"آگے جو کچھ کہنے والا ہوں، اسے غور سے سنو۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ہر فعل اور ہر قول میں اُمت کے لیے کوئی نہ کوئی ہدایت ضرور موجود ہے۔ وقت آ گیا تھا کہ منہ بولے رشتوں کے بارے میں اُمت کی صحیح رہنمائی کی جائے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ بے ایمان لوگ طعنے دیں گے کہ بیٹے کی مطلقہ بیوی سے شادی کر لی، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے عدت کے بعد حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو پیغام دیا۔ حضرت زینب رضی اللہ عنہا بھی اوّل اوّل گھبرائیں کہ لوگ کیا کہیں گے۔ حالانکہ دل سے وہ بھی یہی چاہتی تھیں۔ اُنہوں نے فرمایا۔ "میں اپنے پروردگار سے کہہ لوں۔ اللہ کو جو منظور ہو گا، وہ آپ ہی اس کا سامان کر دے گا۔"

یہ کہہ کر وہ مصلّے پر پہنچ کر نماز میں لگ گئیں۔ نماز کے بعد دعا کی۔ ادھر یہ دُعا مانگ رہی تھیں، اُدھر اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر آیت نازل کر دی کہ ہم نے آپ کا نکاح حضرت زینبؓ سے کر دیا۔ اس طرح اسلام نے جہلائے عرب و عجم کے وہ بت

بھی پاش پاش کر دیے، جو اُنہوں نے منہ بولے رشتوں کے بارے میں ڈھال رکھے تھے۔ بعد میں اُم المومنین حضرت زینب رضی اللہ عنہا دوسری اُمہات المومنین اور دیگر خواتین کو فخر سے کہا کرتی تھیں کہ تمہارا نکاح تمہارے ماں باپ نے کیا ہے، جبکہ میرا نکاح اللہ تعالیٰ نے کیا ہے۔ اس واقعہ سے کیا تمہیں سبق نہیں ملتا؟ کیا اب بھی تم یہی کہو گے کہ فضیلہ تمہاری بہن ہے؟ حالانکہ اچھی طرح جانتے ہو کہ شریعت میں منہ بولے رشتوں کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔"

"اوہ......." میں نے ابا جی کا مطلب سمجھ کر کہا۔

"تم ہاتھ میں تسبیح لے کر دن رات کہتے رہو، فضیلہ تو میری بہن ہے، فضیلہ تو میری بہن ہے۔ لیکن شریعت کے نزدیک وہ نامحرم ہے اور تمہارا اُس کے ساتھ رشتہ جائز ہے۔"

"مگر......."

"مجھے بات پوری کر لینے دو۔" ابا جی خاصے جوش میں آ گئے تھے۔ "اگر تم نے ہاتھ میں قرآن لے کر قسم کھائی ہو کہ ساری زندگی فضیلہ کو سگی بہن سمجھتے رہو گے، تو علماء کہیں گے، باپ کا حکم مانو، قسم توڑ دو اور اس کا کفارہ ادا کرو اور فضیلہ سے شادی کر لو۔ اب بتاؤ، کیا کہنا چاہتے ہو؟"

نہ اعتراض کی گنجائش تھی، نہ اصرار کی۔ جس رشتے کو اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جائز قرار دیا تھا، میں اسے کس طرح ناجائز کہہ سکتا تھا؟

اگلے روز دوپہر سے پہلے گنے چنے افراد کی موجودگی میں میری اور فضیلہ کی رسمِ منگنی ادا کر دی گئی۔ پھر میں نے فضیلہ کو اور فضیلہ نے مجھے انگوٹھی پہنائی۔ تھوڑی دیر بعد میں نے اپنی انگوٹھی بھی اُتار کر اُسے پہنا دی اور مہمانوں کی طرف منہ کر کے مسکراتے ہوئے کہا۔ "سونا تو عورتوں کے لیے بنا ہے۔ مردوں کے لیے اسے پہننا حرام ہے۔"

اس مختصر سی تقریب میں نورین بھی موجود تھی۔ اُس نے بے ساختہ ہنستے ہوئے بھائی جان کی طرف دیکھا، جن کے ہاتھ میں اُس کی پہنائی ہوئی ہیرے کے نگ والی انگوٹھی جگمگا رہی تھی۔

"آپ نے سنا، مولانا سکندر کیا فرما رہے ہیں؟"

بھائی جان کچھ جھینپ سے گئے اور انگوٹھی اُتارنے لگے۔

"نہیں، نہیں.......آپ پہنے رہیں۔" نورین نے جلدی سے کہا۔ "مولانا کہہ رہے ہیں کہ سونا صرف مردوں کے لیے حرام ہے۔"

نورین کا مذاق اتنا بھرپور تھا کہ جتنے بھی لوگ موجود تھے، سب کے منہ سے قہقہے بلند ہونے لگے۔ بھائی جان بھی ان قہقہوں میں برابر کے شریک تھے۔ لیکن اُن کی پیشانی عرق آلود تھی۔ وہ کوئی ایسا جملہ سوچ رہے تھے، جس سے اپنی خفت مٹا سکیں لیکن سوچ نہیں پا رہے تھے۔

اس وقت جب قہقہوں کا سیلاب آیا ہوا تھا، میرے قریب بیٹھی ہوئی فضیلہ نے آہستہ سے

میرا ہاتھ دبایا۔ میں نے اُس کی طرف دیکھا تو اُس نے اشارے سے مجھے کان اپنے ہونٹوں کے قریب لانے کے لیے کہا۔ یہ دیکھ کر کہ سب ہنسنے میں مصروف ہیں اور کوئی ہماری طرف متوجہ نہیں، میں اُس کے چہرے پر جھک گیا۔

اُس نے سرگوشی میں کہا۔ "مجھے بہنا کہیے۔"

ایسا لگا، جیسے کسی بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ شرارت اور شوخی میں فضیلہ، نورین سے کچھ کم نہیں تھی۔ میں جلدی سے سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور فضیلہ ہی کے زرق برق دوپٹے سے ماتھے پر آیا ہوا پسینہ خشک کرنے لگا۔

میں خوش تھا۔ ابا جی کے چھوٹے سے وعظ نے ذہن پر جمی ہوئی ساری دُھول دھو ڈالی تھی۔ اتنا خوش تھا کہ جمعہ کی نماز کے لیے جب ہم لوگ مسجد میں گئے تو میں نے تحیۃ المسجد کے علاوہ دو رکعت شکرانہ بھی ادا کر لی۔ میں فضیلہ کو اُسی دن سے بہت چاہنے لگا تھا، جب وہ پہلی بار مجھ سے بخاری پڑھنے آئی تھی، لیکن زبان سے اُسے بہن کہہ چکا تھا اس لیے دل کو بھی مجبور کرتا تھا کہ اُسے بہن سمجھے۔ سارا فیضان دینِ متین کا تھا۔ ورنہ اپنے طور پر میں نے فضیلہ کو کھونے اور خدا کی حلال کردہ نعمت کو حرام سمجھ کر ارتکابِ کفر کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

نماز سے واپس آ کر بھائی جان اور نورین کا فضیلہ کی امی سے بڑا زبردست، زوردار قسم کا جھگڑا ہوا۔ وہ دونوں بضد تھے کہ ہمارے ساتھ پکنک پر فضیلہ بھی جائے گی اور فضیلہ کی امی بے بس ہوئی جا رہی تھیں اور کہہ رہی تھیں کہ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ دنیا والے کیا کہیں گے؟ بھائی جان نے اپنی اور نورین کی مثال پیش کی۔ دنیا والے جب اُنہیں کچھ نہیں کہتے تھے تو فضیلہ کو بھی نہیں کہیں گے۔ وہ کہہ رہی تھیں۔

"ہمارے خاندان میں ایسا نہیں ہوتا۔"

نورین کہنے لگی۔ "ہمارے خاندان میں بھی ایسا نہیں ہوتا تھا، مگر اب ہونے لگا ہے۔ پہل کر دیں، پھر آپ کے خاندان میں بھی ہونے لگے گا۔"

بڑی دلچسپ لڑائی تھی۔ قہقہوں پر قہقہے لگ رہے تھے۔ مگر فضیلہ کی امی پیچھے ہٹنے پر تیار تھیں، نہ نورین اور بھائی جان۔ نورین نے کہا۔

"فضیلہ ہماری ہو چکی ہے۔ ہمارا جہاں دل چاہے گا، اسے لے جائیں گے۔"

"انگوٹھی پہننے یا پہنانے سے کچھ نہیں ہوتا۔" فضیلہ کی امی نے کہا۔ "منگنی تو کچے دھاگے کی طرح ہوتی ہے۔ جب تک نکاح نہیں ہوتا، فضیلہ ہماری ہے اور ہماری ہی رہے گی۔ جہاں ہمارا دل چاہے گا، اُسے بھیجیں گے اور جہاں دل نہیں چاہے گا، نہیں بھیجیں گے۔"

"امی نہیں۔ فضیلہ صرف اس وقت تک آپ کی تھی، جب تک سکندر نے اُسے انگوٹھی نہیں

پہنائی تھی۔ منگنی نصف نکاح ہوتی ہے۔ جس انصاف پسند سے پوچھیں گے، ہماری تائید کرے [illegible]

انصاف طلب کرنے کے لیے فضیلہ کے ابو کو آگے لایا گیا۔ وہ دنیا کے پہلے جج تھے، جن [illegible] مقدمے کی کارروائی سے پہلے حلف لیا گیا۔

"خدا کو حاضر ناظر جان کر کہیے، جو فیصلہ کریں گے، اس میں بیوی سے مرعوب ہو کر انصاف [illegible] کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑیں گے۔"

"مسئلہ تو بتاؤ۔"

"جی نہیں۔" نورین نے کہا۔ "آپ کے لہجے سے جانبداری کا اظہار ہو رہا ہے۔ مسئلہ [illegible] میں بتایا جائے گا، پہلے آپ خدا کو حاضر و ناظر جان کر صحیح فیصلہ کرنے کا وعدہ کریں گے۔"

"ٹھیک ہے بابا۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔"

"خدا کو حاضر ناظر جان کر؟"

"ہاں بابا......... ہاں!"

"اب بتایئے، سکندر سے فضیلہ کی منگنی کر کے کیا آپ نے یہ اقرار نہیں کیا کہ فضیلہ [illegible] چکی ہے؟"

فضیلہ کی امی جلدی سے بولیں۔ "لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ........"

"پلیز، آپ خاموش رہیے۔" نورین بولی۔ "فی الحال عدالت میں مقدمہ پیش [illegible] ہے۔ آپ کو صفائی کا پورا پورا موقع دیا جائے گا۔ خان صاحب! کیا یہ درست نہیں ہے [illegible] ہماری ہو گئی ہے؟"

فضیلہ کے ابو نے بے چارگی سے بیوی کی طرف دیکھا۔ "میرا خیال ہے کہ فضیلہ [illegible] ہے، اتنی تمہاری بھی ہے۔"

"جواب سیاست دانوں والا ہے، لیکن چلے گا۔" نورین نے کہا۔ "گویا آپ کو اقرار [illegible] فضیلہ ہماری بھی ہے۔"

"کیوں، تمہیں کوئی شک ہے؟" فضیلہ کے ابو نے پوچھا۔

"شک مجھے نہیں، آپ کی بیگم کو ہے۔"

"میں نے کب کہا، فضیلہ تمہاری نہیں ہے؟" فضیلہ کی امی بولیں۔ "میں تو صرف [illegible] تھی........"

"درمیان میں بول کر مقدمے کو خراب مت کیجیے۔ آپ کی باری بھی آئے گی۔" [illegible] نے سمجھایا۔ نورین نے کہا۔

"انکل! آپ اور آپ کی بیگم یعنی آنٹی، ہمارے اور فضیلہ کے مابین ہونے [illegible]

جھٹلانا چاہیں، تب بھی نہیں جھٹلا سکتے۔ ابھی آپ نے خود اعتراف کیا ہے کہ فضیلہ جتنی آپ کی ہے، اتنی ہماری بھی ہے۔ اگر یہ بات سچ ہے اور [illegible] زیادتی نہیں ہے کہ آپ اور آپ کی بیگم جب چاہیں، جہاں چاہیں اپنی فضیلہ کو لے جا سکتے ہیں، لیکن ہم اپنی فضیلہ کو ذرا سی پکنک پر بھی نہیں لے جا سکتے۔"

فضیلہ کے ابو نے زوردار قہقہہ لگایا۔ "اچھا، تو یہ بات ہے۔" پھر بیوی کی طرف دیکھ کر تھوڑا سا سہم گئے، دبی آواز میں بولے۔ "دراصل ہمارے معاشرے میں......"

"معاشرے کو چھوڑیئے۔ آپ خدا کو حاضر و ناظر جان کر صحیح فیصلہ کرنے کا وعدہ کر چکے ہیں۔ بتایئے کہ کیا اس فضیلہ پر جو بقول آپ کے، ہماری بھی ہے، ہمارا اتنا بھی حق نہیں بنتا کہ اسے اپنے ساتھ سمندر کی سیر پر لے جائیں؟"

خان صاحب گہری سوچ میں ڈوب گئے۔

"فیصلہ کیجیے انکل!" بھائی جان نے اُن کا کندھا ہلایا۔

"کیا کروں بیگم؟" انھوں نے بیوی سے پوچھا۔

"یہ سراسر اقربا پروری اور بد دیانتی ہے۔"

"یہ فیصلہ کیا کریں گے؟ میں کرتی ہوں فیصلہ۔" فضیلہ کی امی نے کہا۔ "تم لوگ۔ اس شرط پر فضیلہ کو اپنے ساتھ لے جا سکتے ہو کہ سکندر میاں اور فضیلہ کو ایک دوسرے سے دُور رکھو گے۔ شادی سے پہلے مجھے لڑکی لڑکیوں کا ملنا جلنا......"

"ہمیں آپ کی شرط منظور ہے۔" نورین نے قہقہہ لگا کر اُن کا جملہ درمیان ہی سے منقطع کرتے ہوئے کہا۔ "ہم وعدہ کرتے ہیں کہ سکندر اور فضیلہ کو اتنا دُور رکھیں گے کہ دُوربین لگائے بغیر وہ ایک دوسرے کو نہیں دیکھ سکیں گے۔ اور یہ بھی وعدہ کرتے ہیں کہ اگر ان دونوں نے دُوربین استعمال کرنے کی کوشش کی تو دُوربین کو توڑ دیا جائے گا۔"

فضیلہ کے ابو نے پوچھا۔ "اب میں جاؤں؟"

"ایسا جج ہمارے کسی کام کا نہیں جو بیوی کے اشاروں پر فیصلہ کرتا ہو۔" نورین نے جواب دیا۔ "آپ جا سکتے ہیں۔"

پھر وہ اُس کمرے میں گھس گئی، جہاں فضیلہ شرمائی لجائی بیٹھی چپکے چپکے مسکرا رہی تھی۔ اُس نے چٹا چٹ فضیلہ کو کئی پیار کیے۔ اُسے وہی جوڑا دوبارہ پہنایا، جو اُس نے منگنی کے وقت پہنا تھا۔ یہ کہتے ہوئے کہ قندھاری اناروں جیسے گالوں اور ہرنی جیسی بڑی بڑی سرمگیں آنکھوں اور جاپانی گڑیا جیسے مرمریں سراپا والی کو میک اپ کی کیا ضرورت ہے، ہلکا سا میک اپ کر دیا اور سمٹی سمٹائی فضیلہ کے پہلو میں گدگدی کرتی ہوئی اُسے باہر لے آئی۔

فضیلہ کو پچھلی نشست پر بٹھایا گیا۔ اس کے برابر نورین بیٹھی۔ مجھے اگلی نشست پر بیٹھنے کے لیے کہا گیا۔ بھائی جان نے اسٹیئرنگ وہیل سنبھال لیا۔ مجھے پہلی بار پتہ چلا کہ نورین نے انہیں بھی ڈرائیونگ کے رموز ونکات سے واقف کرا دیا ہے۔

"خبردار جو تم دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھنے کی کوشش کی۔" نورین نے فضیلہ کے قریب بیٹھتے ہوئے گرج دار آواز میں کہا اور انکھیوں سے فضیلہ کی امی کی طرف دیکھا، جو بیٹی کو دروازے تک چھوڑنے آئی تھیں۔ اُن کے ہونٹوں پر عجیب سی ملکوتی مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی۔

بھائی جان نے کار اسٹارٹ کی۔

"نورین باجی!" فضیلہ نے کسمساتے ہوئے کہا۔ "تھوڑا سا ادھر ہٹ جایئے۔ مجھے امی کو دیکھنے دیجیے۔"

"ہمت تمہارے کی۔" نورین نے اُس کی کمر میں چٹکی لے کر کہا۔ "دیکھنے کی چیز تو سکندر ہے۔ اسے دیکھو۔ امی کو کیا دیکھنا۔ انہیں تو ہر وقت دیکھتی رہتی ہو۔"

مگر اُس نے نشست کی پشت سے ٹیک لگالی۔ اُس کی امی مسکرا رہی تھیں اور الوداعی انداز میں ہاتھ ہلا رہی تھیں۔ فضیلہ نے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے ہاتھ ہلایا اور اتنی دھیمی آواز میں کہ ہم لوگ بھی نہ سن سکے "خدا حافظ" کہا۔ دوسرے لمحے کار دروازے سے آگے بڑھ کر سڑک پر جانے کے لئے مڑ گئی۔

سڑک پر پہنچ کر چند گز کا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ اچانک بھائی جان نے کار کو سڑک کے کنارے روکا اور مجھ سے کہا۔ "نیچے اُترو!"

"جی؟" میں استفہامیہ نظروں سے اُن کی طرف دیکھنے لگا۔

اسی اثناء میں پچھلی نشست سے نورین اُتر کر آگئی اور میری جانب کا دروازہ کھول کر بولی۔

"فضیلہ کے پاس جا کر بیٹھو۔ وہ تمہیں یاد کر رہی ہے۔"

"مگر تم تو وعدہ کر کے آئی تھیں۔"

"وعدے تو دل کی مانند ہوتے ہیں، جو توڑنے کے لئے کیے جاتے ہیں۔" نورین نے شاعرانہ انداز میں کہا اور پھر آنکھیں نکال کر بولی۔ "پیچھے بیٹھ رہے ہو یا بلاؤں فضیلہ کے ابو کو؟"

میں نے اُترتے ہوئے کہا۔ "فضیلہ کے ابو کو کیوں بلاؤ گی؟"

"یہ دکھانے کے لیے کہ ہونہار داماد ابھی سے آپ کی ناز پروردہ سے اتنی بے رُخی برت رہے ہیں تو آگے چل کر کیا ہوگا؟" نورین نے جواب دیا۔ "خوش ہو جاؤ کہ اب نہیں بلاؤں گی۔ کیونکہ اب تم بے رخی سے پیش نہیں آرہے ہو۔"

میں پچھلی نشست پر جا بیٹھا اور دروازہ بند کر کے فضیلہ کا دایاں ہاتھ، جس میں دو انگوٹھیاں

تھیں، اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ اُس کا جسم ہولے ہولے لرز رہا تھا۔ ہونٹوں کے گوشوں پر مسکراہٹ رقص کر رہی تھی اور بڑی بڑی آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔

"خوش ہو فضیلہ؟" میں نے سرگوشی میں پوچھا۔

اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ رخسار، جنہیں نورین قندھاری انار کہتی تھی، اتنے سرخ ہو گئے، گویا انہیں چھوتے ہی خون ٹپک پڑے گا۔

"جواب دو فضیلہ!" میں نے دوبارہ سرگوشی کی۔

اُس کے ہونٹوں میں جنبش ہوئی۔ میٹرک میں ہمیں میر صاحب کی وہ غزل پڑھائی گئی تھی جس میں اُنہوں نے محبوب کے ہونٹوں کو گلاب کی پنکھڑی سے تشبیہ دی تھی۔ مگر میرا مشاہدہ ان سے بالکل مختلف تھا۔ فضیلہ کے ہونٹ میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں، سنگترے کی پھانکوں جیسے تھے۔ گہرے گلابی اور رس سے بھرے۔

"تم خوش نہیں ہو؟" میں نے نفسیاتی حربہ استعمال کیا۔

اُس نے اپنی گود میں رکھا ہوا دوسرا ہاتھ اُٹھا کر پوری قوت سے میرے دوسرے ہاتھ کو پکڑ لیا جس نے اُس کا انگوٹھیوں والا ہاتھ تھام رکھا تھا۔

"جتنی خوشی مجھے آج ملی ہے، اتنی پہلے کبھی نہیں ملی۔" اُس نے کہا۔ "اتنی خوش ہوں کہ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

"بھلا خوشی سے بھی کوئی ڈرتا ہے؟"

اُس نے اپنے سر کو اثبات میں سر ہلایا کہ ریشم جیسے سنہرے بال اُس کے چہرے پر بکھر گئے۔

"جو یہ سمجھتا ہے کہ خوشی چھن نہ جائے، وہ ڈرتا ہے۔"

میں نے اُس کے بکھرے بکھرے بالوں کو سنوارتے ہوئے کہا۔ "ہماری خوشی کو کوئی نہیں چھین سکتا۔"

فضیلہ نے ایک بار پھر میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

"ایک بات تو بتاؤ۔" میں نے شرارت سے اُس کی آنکھوں میں جھانکا۔ "تم تو کہہ رہی تھیں کہ تمہیں کبھی ڈر ہی نہیں لگا۔"

"کبھی اتنی ڈھیر ساری خوشی بھی تو نہیں ملی۔"

"بے وقوف کہیں کی۔" میں نے اُس کے رخسار پر ہلکی سی چپت رسید کی۔ چپت رسید کرنے کا تو ایک بہانہ تھا، دراصل دیکھنا یہ چاہتا تھا کہ رخسار کا خون چھلک کر جلد تک تو نہیں پہنچ گیا ہے۔

فضیلہ نے ایک نظر نورین اور بھائی جان پر ڈالی۔ دونوں ہماری طرف متوجہ نہیں تھے۔ آپس میں ہنس ہنس کر گفتگو کر رہے تھے۔ میں اُس کے بالوں سے کھیلنے لگا۔ اتنا ملائم تو ریشم بھی نہیں تھا۔

اُس نے آنکھیں بند کرلیں۔ "دل چاہتا ہے، کار یوں ہی دوڑتی رہے، آپ یوں ہی بیٹھے رہیں، میرا سر آپ کے سینے پر رکھا رہے اور میں چپکے سے مر جاؤں۔"

میں اُس کے چہرے پر جھک گیا۔ "انتظار کس بات کا ہے؟ مر جاؤ۔ مگر یہ یاد رکھنا کہ پھر بھی میں تمہارا پیچھا نہیں چھوڑوں گا۔ جہاں جاؤ گی، دوڑتا ہوا وہیں پہنچ جاؤں گا۔"

"نہیں......." اُس نے گھبرا کر میرے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ "نہیں، آپ نہیں مریں گے۔ آپ میرا پیچھا نہیں کریں گے۔ آپ......آپ زندہ رہیں گے۔"

"میں زندہ رہوں گا تو تم بھی زندہ رہو گی۔" میں نے کہا۔ "تم نہیں ہو گی تو میں بھی زندہ نہیں رہوں گا۔ میں نے طویل عرصے تک اپنے احساسات و جذبات کو کچلا ہے۔ ایک آتش فشاں کی طرح اندر ہی اندر سلگتا رہا ہوں۔ لیکن جونہی معلوم ہوا کہ تم میری ہو سکتی ہو تو میری محبت کے آتش فشاں کا لاوا اُبل پڑا۔ میرے پاس وہ الفاظ نہیں ہیں، جن کے ذریعے تمہیں بتا سکوں کہ مجھے تم سے کتنی محبت ہے۔ یقین کرنا فضیلہ! میرے جسم کا رُواں رُواں تمہارا والہ و شیدا ہے۔"

وہ ہنسنے لگی۔ سر جھٹک کر اپنے بال درست کرتے ہوئے بولی۔ "میری زندگی کی ایک رات بھی ایسی نہیں گزری، جب آپ کا تصور کیے بغیر مجھے نیند آئی ہو۔ کبھی کبھی تو سوچا کرتی تھی کہ جو سوچتی ہوں، جو خواب دیکھتی ہوں، جو تصور کرتی ہوں، اس کی حیثیت واہمے سے زیادہ نہیں ہے۔ اپنے آپ پر غصہ بھی آتا تھا کہ جو بات ناممکن ہے، اسے اپنے دل میں کیوں بسائے ہوئے ہوں۔ آپ کو تو یاد بھی نہیں ہو گا، ایک بار آپ نے کہا تھا اور کسی آیت کا حوالہ بھی دیا تھا کہ بے چین دل اور مضطرب اور اضطراری کیفیت میں جو دعا مانگی جاتی ہے، وہ ضرور قبول ہوتی ہے۔ جب دعا مانگی تھی، اللہ سے آپ کو مانگی تھی۔ اور اس طرح مانگی تھی کہ اپنے آپے میں نہیں رہتی تھی۔ دعا مانگ کر فارغ ہوتی تو عجیب سا سکون محسوس ہوتا۔ یوں لگتا تھا، جیسے کوئی کہہ رہا ہو، اللہ کے لیے تو کچھ بھی ناممکن نہیں ہے۔"

"ہاں فضیلہ! اُس کے لیے کچھ بھی ناممکن نہیں ہے۔"

"کل رات۔" اُس نے کہا۔ "جب مجھے پختہ یقین ہو چکا تھا کہ میری دعاؤں کو شرفِ قبولیت حاصل ہو چکا ہے، خوشی کے باعث سانس تک لینا مشکل ہو رہا تھا۔ اُس وقت ایک عجیب سا خیال میرے دماغ میں آیا۔ میں نے سوچا کہ نکاح کا دن آنے سے پہلے اگر میں مر گئی تو اللہ میاں سے یہ درخواست کروں گی کہ جب تک آپ تنہا ہیں، اُداس ہیں اور پریشان ہیں، اس وقت تک کے لیے وہ مجھے آپ کے پاس بھیج دیں۔"

میں نے دیکھا، اس کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو تیر رہے تھے۔

"پگلی!" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ ہونٹوں نے اُس کے سارے آنسوؤں کو اپنے اندر سمو لیا۔

بار بار یہ بتانا اچھا معلوم نہیں ہوتا کہ ان روح پرور لمحات میں بھی نظر نہ آنے والے سائے میرے ساتھ لگے ہوئے تھے اور سنائی نہ دینے والی سرسراہٹیں اس وقت بھی محسوس ہو رہی تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جہاں میں تھا، وہاں ہوا کی طرح سائے بھی تھے اور سرسراہٹیں بھی۔ جس طرح ہوا محسوس نہیں ہوتی لیکن ہوتی ہر جگہ ہے، کم و بیش میرے ساتھ سایوں اور سرسراہٹوں کا بھی یہی معاملہ تھا۔ پہلے صرف ترشولی نظر آتی تھی، پھر سائے نظر آنے لگے اور سرسراہٹیں محسوس ہونے لگیں۔ پہلے ان کا احساس تاریکی اور تنہائی میں ہوتا تھا اور کبھی کبھی ہوتا تھا۔ پھر ہر وقت ہونے لگا اور مسلسل ہونے لگا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ تاریکی اور تنہائی میں سائے زیادہ واضح ہو جاتے اور سرسراہٹیں چلنے پھرنے کی آوازوں میں، سرگوشیوں میں، ہنسنے میں اور کبھی کبھار رونے میں تبدیل ہو جاتیں۔

کار سمندر کی طرف دوڑ رہی تھی۔ سایوں کی ایک بڑی تعداد اس کے ساتھ دائیں بائیں، اوپر اور پیچھے پرواز کر رہی تھی۔ کار ہلکی ہوتی یا کسی سرخ سگنل پر رُکتی تو کئی سائے اس سے یا دوسری گاڑیوں سے ٹکرا جاتے۔ اُن کے نامکمل جسم ٹوٹ کر اِدھر اُدھر بکھر جاتے۔ جنہیں وہ جلدی جلدی اکٹھا کر کے پہلے جیسی ہیئت اختیار کر لیتے۔ کبھی کبھی یوں بھی ہوتا کہ کسی کی ٹانگ کسی کے ہاتھ لگ جاتی، کسی کا ہاتھ کوئی اور لے بھاگتا۔ اور ان میں بلیوں جیسی غراہٹوں کے ساتھ چھینا جھپٹی ہونے لگتی۔

فضیلہ کا حیات بخش قرب مجھے حاصل تھا۔ زندگی کے ان بیش قیمت لمحات کو دوسری طرف متوجہ ہو کر ضائع کرنا اچھا نہیں تھا۔ پھر بھی سایوں اور سرسراہٹوں پر توجہ دیے بغیر نظر پڑ ہی جاتی تھی۔ یہ بات میں نے خاص طور پر محسوس کی کہ سائے انتہائی سنجیدگی اور متانت کے ساتھ ہمارے ہمراہ چل رہے تھے اور اُن کی ہر ممکن کوشش تھی کہ ان کے کسی عمل سے ہم دونوں ڈسٹرب نہ ہونے پائیں۔

فضیلہ نے گفتگو کا موضوع بدل دیا تھا۔ میری آنکھیں اس کے مقناطیسی سراپے پر جمی تھیں۔ حالت ایک ایسے مسافر جیسی تھی، جو بھوکا پیاسا، لق و دق صحرا میں بھٹکتا پھر رہا تھا کہ اچانک ایک گلستان میں پہنچ گیا تھا۔ جہاں نہ کڑی دھوپ تھی، نہ کوئی صعوبت اور پریشانی۔ سکون ہی سکون، آرام ہی آرام اور لہو کو گرمانے والا تصور تھا۔ دنیا کی حسین ترین، جیتی جاگتی مورتی میری اپنی تھی۔

وہ کہہ رہی تھی۔ "نورین باجی بہت اچھی ہیں، لیکن شریر بہت ہیں۔ بھائی جان بھی بہت اچھے ہیں، مگر ہر وقت سنجیدہ رہتے ہیں۔ بہت کم بولتے ہیں۔ لیکن نورین باجی کو دیکھتے ہی ان کی سنجیدگی ختم ہو جاتی ہے۔ ویسے ایک بات ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو جتنا چاہتے ہیں، اتنا ہی آپس میں لڑتے بھی ہیں۔ نورین باجی رُوٹھ جائیں تو بھائی جان کو اور بھائی جان رُوٹھ جائیں تو

نورین باجی کو اس وقت تک چین نہیں آتا، جب تک وہ ایک دوسرے کو منا نہ لیں۔"

میں نے کہا۔ "تم رُوٹھو گی تو میری دنیا بھی اندھیر ہو جائے گی۔ مجھے بھی اس وقت تک چین نہیں آئے گا، جب تک تمھیں منا نہیں لوں گا۔"

اُس نے بھولپن سے میری طرف دیکھا۔ "مجھے تو رُوٹھنا ہی نہیں آتا۔"

"آ جائے گا۔" میں نے ہنس کر نورین کی طرف اشارہ کیا، جو بھائی جان سے کسی مسئلے پر بحث کر رہی تھی۔ "اللہ اسے اور اس کے سہاگ کو سلامت رکھے۔ یہ تمھیں رُوٹھنا سکھا دے گی۔"

"نہیں۔" فضیلہ نے کہا۔ "میں سیکھ ہی نہیں سکتی۔ چاہے اِدھر کی دنیا اُدھر ہو جائے، آپ سے رُوٹھنے کا تو تصور بھی میرے ذہن میں نہیں آ سکتا۔"

پھر اچانک وہ ہنسنے لگی۔ اور ہنستے ہوئے دوبارہ میرے سینے پر سر رکھ دیا۔ میں نے اُس کا سر کھینچ کر اپنے قریب کیا اور اُس کے کان میں ایک ایسا لفظ کہا، جو ایک منگیتر ہی سے کہا جا سکتا تھا۔ وہ سرخ پڑ گئی اور اگلے ہی لمحے میرے سینے پر پیار بھرا گھونسہ مار کر آنکھیں بند کر لیں۔

محویت اس وقت ٹوٹی جب نورین کی آواز آئی۔ "اُٹھو سونے والو! کہ میں آ گئی ہوں۔"

فضیلہ گڑبڑا کر سیدھی ہو گئی اور اپنے کپڑے درست کرنے لگی۔ میں نے ہنستے ہوئے کار کا دروازہ کھولا اور بھائی جان کی طرف دیکھتا ہوا، جو میری طرف پشت کیے کھڑے تھے، نیچے اُتر گیا۔ نورین نے کہا۔

"پانچ منٹ ہو گئے ہمیں یہاں آئے ہوئے۔ لیکن تم دونوں اتنی گہری نیند سو رہے تھے کہ یوں لگ رہا تھا جیسے صورِ اسرافیل ہی سن کر بیدار ہو گے۔ تمہارے بھائی جان نے مجھ سے کہا دونوں کو تم ہی جگا دو، تم صورِ اسرافیل سے کم تو نہیں ہو۔"

"بس ذرا آنکھ لگ گئی تھی۔" میں نے کچھ شرما کر اور کچھ مسکرا کر کہا۔

"شکر ہے، تم نے اعتراف کر لیا۔" نورین نے کہا۔ پھر گھوم کر فضیلہ سے مخاطب ہوئی۔

"کیوں فضیلہ! کیا تمہاری بھی آنکھ لگ گئی تھی؟"

فضیلہ بدن کو سمیٹتی ہوئی، لباس کو درست کرتی ہوئی اُتر رہی تھی، نورین کے سوال پر گھبرا گئی گرتے گرتے بچی۔

"کتنی شرم کی بات ہے فضیلہ!" نورین نے اُسے سہارا دیتے ہوئے کہا۔ "منع کر دیا تھا سکندر سے بات مت کرنا، نہ اُس کی طرف دیکھنا۔ لیکن بڑوں کی ساری نصیحتوں کو بالائے طاق رکھ کر اس کے شانے پر سر رکھے سو رہی تھیں۔"

"نورین باجی! آپ بہت بری ہیں۔" فضیلہ نے کپکپاتی آواز میں کہا اور بے اختیار نورین کے گلے میں بانہیں ڈال کر اس سے چمٹ گئی۔

نورین کہاں چپ رہنے والی تھی۔ پیار سے فضیلہ کی پیٹھ کو تھپکتی ہوئی بولی۔ "بڑوں سے تمہارا یہ سلوک ہے تو خدا جانے اچھوں کے ساتھ کیسا ہو گا؟"

اور تب بھائی جان گھومے۔ اُنھوں نے ہماری طرف منہ کیا اور نورین سے مخاطب ہو کر بولے۔ "کیا ارادہ ہے؟ ساری باتیں یہیں کر لو گی؟"

"مردوں کی یہی عادت مجھے زہر لگتی ہے۔ کسی کو دو باتیں کرتے دیکھ ہی نہیں سکتے۔"

"دو نہیں، سمندر کے قریب پہنچ کر دس باتیں کر لینا۔ فضیلہ کہیں بھاگی نہیں جا رہی۔"

"بڑا مان ہے بھائی پر۔" نورین نے کہا۔ "اس کے تیور اچھے نہیں ہیں۔ فضیلہ کو تحفظ فراہم نہیں کیا گیا تو خدا کی قسم اسے بھگا لے جائے گا۔ اور فضیلہ سیدھی سادی لڑکی ہے، اس کے ساتھ بھاگ جائے گی۔ لوک لاج کا خیال نہیں کرے گی۔"

"اچھا، تم تحفظ فراہم کرو۔ میں چلتا ہوں۔"

نورین نے فضیلہ کو چھوڑ چھاڑ کر بھائی جان کا بازو پکڑ لیا۔ "اکیلے نہ جانا، ہمیں چھوڑ کر تم۔" اُس نے کنکنا کر بھائی جان سے کہا۔

اور اس طرح ہمارا مختصر سا قافلہ سمندر کے کنارے کی طرف رواں دواں ہوا۔ آگے آگے نورین اور بھائی جان، اُن کے پیچھے میں اور فضیلہ۔

"بھائی جان اور نورین باجی کے سامنے آپ کے ساتھ چلتے ہوئے بڑی شرم آ رہی ہے۔" فضیلہ نے آہستہ سے کہا۔

"فضیلہ! آج ہم نے اپنی زندگی کے جس سفر کا آغاز کیا ہے، یہ اب کبھی ختم نہیں ہو گا۔ کب تک شرماؤ گی اور کس کس سے شرماؤ گی؟ مجھے اور تمھیں تو آخری سانس تک اسی طرح ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ چلنا ہے۔"

اس جگہ سے جہاں بھائی جان نے کار کو پارک کیا تھا، سمندر کا کنارہ تقریباً نصف میل دُور تھا۔ وہاں پہنچتے پہنچتے دس منٹ لگ گئے۔ کنارے پر پہنچے بھی نہ پائے تھے کہ بے شمار لڑکے اور لڑکیاں ہماری طرف دوڑے۔

"اتنی دیر لگا دی۔" کسی نے کہا۔ "ہم سب تو مایوس ہو چکے تھے۔"

معلوم ہوا کہ پکنک پر ہم چار افراد ہی نہیں، رفیق سمیت بھائی جان کے بھی اہم دوست اور نورین کی بھی اہم سہیلیاں وہاں موجود تھیں۔ وہ لوگ صبح کے آئے ہوئے تھے اور دوپہر کے بعد سے ہماری آمد کے منتظر تھے۔ اُنھیں میری اور فضیلہ کی منگنی کا علم تھا۔ باری باری سب نے مجھے اور فضیلہ کو مبارکباد دی۔

شرم کی وجہ سے فضیلہ کے منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ بیر بہوٹی بنی ہوئی تھی۔ اُس کی

آنکھیں تاہم تھوڑی دیر بعد بھیگ جاتی تھیں۔ یہ اندازہ لگانا کچھ بھی مشکل نہیں تھا کہ وہ بے انتہا خوش ہے۔ رہ گیا میں تو میری زندگی میں تو عرصہ دراز کے بعد ایک خوشی کا دن آیا تھا۔ مجھ پر ایسی قنوطیت سی سوار ہو کر رہ گئی تھی کہ سیکنڈ پوزیشن حاصل کرنے کے باوجود خوش نہیں ہوا تھا۔ دوسرے مسکراتے تو مسکرا دیتا تھا۔ ہنستے تو ہنس دیتا تھا۔ لیکن وہ چیز، جسے مسرت کہتے ہیں، آج ہی ملی تھی۔ اور جیسا کہ فضیلہ نے کہا تھا کہ اتنی ڈھیر ساری خوشی ملی ہے کہ ہر موئے بدن سے چھلکی پڑ رہی ہے۔

دریاں بچھی ہوئی تھیں۔ ہمیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ ہم سے پہلے آنے والے کئی کئی بار کھا چکے تھے، پھر بھی وافر مقدار میں کھانا موجود تھا۔ موسم کا شاید ہی کوئی پھل ہو، جو اس دسترخوان پر نہ ہو۔ پیٹ تو ہم چاروں کے بھی خوب بھرے ہوئے تھے، پھر بھی اُن لوگوں کے ساتھ جو ایک بار پھر کھانے کے لیے ڈٹ گئے تھے، کھانے پینے کا لطف آیا۔ نورین کی ایک سہیلی حلیم لے کر آئی تھی۔ دوسری چیزیں بھی کچھ کم مزیدار نہیں تھیں لیکن حلیم کی تو بات ہی کچھ اور تھی۔

"سکندر!" کھانے سے فارغ ہو کر جب ہم پانی سے ہاتھ دھو رہے تھے، بھائی جان کے دوست رفیق نے چٹانوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "دوپہر کے وقت مجھے پیٹ میں تھوڑی گرانی محسوس ہوئی تو ٹہلتا ہوا اُدھر چلا گیا۔ وہاں ایک چھت کے نیچے ایک سادھو دھونی رمائے بیٹھا ہے۔ داڑھی مونچھیں اتنی بڑی ہیں کہ اُس کا آدھا چہرہ ان کی لپیٹ میں آ گیا ہے۔ ہونٹ تو دکھائی ہی نہیں دیتے۔ میری آہٹ پر اُس نے آنکھیں کھولیں تو یقین کرنا سکندر! بلی جیسی اتنی خونخوار آنکھیں تھیں کہ میں لرز کر رہ گیا۔ دل چاہا کہ وہاں سے بھاگوں، کہ اُس نے مجھے مخاطب کیا۔ کہنے لگا۔

"لڑکے! تمہارا نام سکندر ہے؟"

میں نے کہا۔ "نہیں، میرا نام سکندر نہیں ہے۔" اُس وقت میرا دھیان تمہاری طرف نہیں گیا تھا۔ میں یہ سمجھا کہ کوئی اور سکندر ہے، جس کا وہ انتظار کر رہا ہے۔ مگر نہیں، میرا خیال ہے وہ تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔"

"میرا؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں، تمہارا۔" رفیق نے بتایا۔ "جانتے ہو، میرا جواب سن کر اُس نے کیا کہا؟ کہنے لگا۔ "سکندر منگنی کرا رہا ہے اور سمجھ رہا ہے کہ اپنی جھولی میں خوشیاں بھر رہا ہے۔ اور بھول گیا ہے کہ اُس کی خوشیاں ادھوری ہیں۔ وہ بھول گیا ہے کہ اُس کی خوشیوں کی قاتل [illegible] منڈلا رہی ہے۔ اور جب تک وہ آزاد ہے، سکندر کی ہر خوشی ناپائیدار اور عارضی ہے۔"

"یہ بات اُس سادھو نے کہی تھی، میرا نام لے کر؟"

"ہاں ۔۔۔ اور اُس نے یہ بھی کہا تھا کہ سکندر کو بتا دو، اگر وہ اپنی خوشیوں کو باقی رکھنا چاہتا ہے تو اس سے پہلے کہ سورج دیوتا کا رتھ آنکھوں سے اوجھل ہو، مجھ سے آ کر ملے۔ آج پورے سنسار میں میرے علاوہ کوئی نہیں، جو اُسے اس کے دشمن سے بچا سکے، جو اُس کی خوشیوں کا دشمن ہے۔" پھر رفیق نے مجھ سے پوچھا۔ "تم جانتے ہو، سورج دیوتا کا رتھ کیا ہوتا ہے؟"

"سورج دیوتا کا رتھ بذاتِ خود سورج ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔ "کچھ مذاہب کے پیروکاروں کا عقیدہ ہے کہ ان کا سورج دیوتا صبح سویرے رتھ پر سوار ہو کر مشرق سے مغرب تک کا سفر کرتا ہے اور رات کو آرام کرنے کے لیے لیٹ جاتا ہے۔"

"سائنس تو اس عقیدے کو تسلیم نہیں کرتی۔"

"سائنس ہی نہیں، عقل بھی تسلیم نہیں کرتی۔ لیکن ہمیں بلا ضرورت دوسروں کے عقائد پر بات کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ ہمارے صوفی درویش کہتے ہیں کہ شیطان کو بھی برا مت کہو۔ اس وقت کو بھی اللہ کی یاد میں، اس کے ذکر میں گزار دو۔"

"سادھو کے پاس نہیں جاؤ گے؟" رفیق نے پوچھا۔ "اُس نے باقاعدہ نام لے کر کہا تھا کہ سنسار میں کوئی نہیں، جو اُس کے سوا تمہیں تمہاری خوشیوں کے دشمن سے بچا سکے۔"

"تم کہتے ہو تو ہو آؤں گا۔ ویسے مجھے بتایا گیا ہے کہ جب تک اپنے دین پر مکمل عبور حاصل نہ ہو جائے، اس وقت تک کسی دوسرے مذہب والے سے چھیڑ چھاڑ نہیں کرنا چاہیے۔"

"چھیڑ چھاڑ کرنے تھوڑی جاؤ گے؟" رفیق نے کہا۔ "ہو سکتا ہے، اس سے تھوڑا فائدہ ہی حاصل ہو جائے۔"

میں نے چند لمحوں تک غور کیا۔ رفیق نے جو کچھ سادھو کے بارے میں بتایا تھا، اُسے آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اُسے میرا نام معلوم تھا۔ وہ میری منگنی سے واقف تھا۔ اُس نے کہا تھا کہ جب تک میری خوشیوں کا دشمن آزاد ہے، اُس وقت تک مجھے پائیدار خوشی حاصل نہیں ہو سکتی۔ اور اُس نے دعویٰ کیا تھا کہ اُس کے علاوہ پوری دنیا میں ایسا کوئی شخص نہیں، جو مجھے میری دشمن سے بچا سکے۔ اُس نے ترشولی کا نام نہیں لیا تھا۔ مگر لازمی طور پر اُس کا اشارہ اُسی کی طرف تھا۔ اُس کے لیے فضیلہ کے والدین کو ورغلانا اور اُن کو سبز باغ دکھا کر کہیں دوسری جگہ رشتہ کرنے پر اکسانا یا منگنی تڑوانا اُس کے بائیں ہاتھ کا کام تھا۔ میں دائمی مریض تھا۔ میرے مرض کا نام ترشولی تھا۔ اگر اُس کے علاج سے میرا مرض ٹھیک ہو سکتا تھا تو لازمی طور پر مجھے اُس کے پاس جانا چاہیے تھا۔ رفیق ٹھیک ہی تو کہہ رہا تھا۔ میں چھیڑ چھاڑ کرنے تھوڑا ہی جا رہا تھا۔ مجھے تو اپنا علاج کرانا تھا۔ ایسے رستے ہوئے ناسور سے نجات حاصل کرنی تھی، جس نے زندگی کو [illegible] جہنم بنا ڈالا تھا۔ ہاں، ہو سکتا تھا کہ ایک لاعلاج مریض کو اس کے علاج سے فائدہ پہنچ جائے۔

"تم بھی چلو گے؟" میں نے رفیق سے پوچھا۔

اُس نے کانوں کو ہاتھ لگا لیے۔ "میں اس ڈراؤنے کے پاس ہرگز نہیں جاؤں گا۔ اُسے دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا، جیسے دل ڈوب جائے گا۔ ایک بات تو میں نے تمہیں بتائی ہی نہیں۔ یقین کرنا سکندر! جب تک اس نے مجھے آنے کی اجازت نہیں دی، میں اس کے سامنے سے نہیں ہٹ سکا۔ میرے قدم من من بھر کے ہو گئے تھے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہوا تھا، بلکہ سچ کہہ رہا ہوں، میرے پیروں کو زمین نے پکڑ لیا تھا۔"

اسی وقت پیچھے سے کئی لوگوں کے ہنسنے کی آواز آئی، پھر نورین کی آواز سنائی دی۔ وہ با آواز بلند کہہ رہی تھی۔

"فضیلہ کا مذاق مت اُڑاؤ۔ وہ کسی مسٹر کی نہیں، مولانا سکندر کی منگیتر ہے۔"

جس دری پر کچھ دیر پہلے ہم لوگ کھا پی رہے تھے، اس کے ایک کونے کو جائے نماز بنائے ہوئے فضیلہ ہنسنے والوں سے بے نیاز ہو کر عصر کی نماز ادا کر رہی تھی۔ مذاق اُڑانے والوں پر مجھے اتنا غصہ نہیں آیا، جتنا پیار فضیلہ پر آیا۔ میں بھول گیا تھا کہ نمازِ عصر ادا کرنی ہے۔ مگر وہ شیاطین کے نرغے میں گھری ہونے کے باوجود نہیں بھول سکی تھی۔

میں پانی کے پاس ہی بیٹھا ہوا تھا۔ دل ہی دل میں اللہ سے غفلت کی معافی چاہی اور بسم اللہ پڑھ کر وضو کیا۔ جتنی دیر میں فضیلہ نماز سے فارغ ہوئی، اتنی دیر میں، میں بھی وضو سے نمٹ گیا۔ اِدھر وہ دری سے ہٹی اور اُدھر میں اُس کی جگہ کھڑا ہو گیا۔ مگر جس طرح فضیلہ کا مذاق اُڑایا تھا، میرا مذاق اُڑانے کی کسی میں ہمت نہیں ہوئی تھی۔ بھائی جان اور اُن کے دوست، نورین اور اُس کی سہیلیاں پانی میں چلے گئے۔ لڑکے لڑکیوں پر اور لڑکیاں لڑکوں پر پانی پھینکنے کا کھیل کھیلنے لگے۔ سب دل کھول کر قہقہے لگا رہے تھے اور گلے پھاڑ پھاڑ کر چیخیں بلند کر رہے تھے۔ صرف فضیلہ ا[illegible] تھی، جو سب سے الگ تھلگ ریت پر بیٹھی تھی اور ان لوگوں کو دور ہی سے دیکھ کر ہنس رہی تھی۔

میں ان چٹانوں کی طرف جانے کے ارادے سے اُٹھ کھڑا ہوا، جہاں وہ صاحب استدراج میرے انتظار میں دھونی رمائے بیٹھا تھا۔

"کہاں جا رہے ہو؟" فضیلہ نے پوچھا۔

"کہیں دور نہیں جا رہا ہوں۔ غروبِ آفتاب سے پہلے واپس آ جاؤں گا۔"

فضیلہ کچھ اور پوچھنا چاہتی تھی۔ وہ شاید میری ہم رکاب ہونا چاہتی تھی۔ مگر اس وقت نو[illegible] اور اُس کی سہیلیاں پانی سے نکل کر وہاں پہنچ گئیں۔ نورین نے فضیلہ کا ہاتھ پکڑا۔

"چلو آؤ، جھولا جھولیں۔"

جس کٹی ہوئی چٹان کی رفیق نے نشاندہی کی تھی، وہ اتنی قریب نہیں تھی، جتنا میں نے

تھا۔ راستہ بھی اچھا خاصا دُشوار گزار تھا۔ پتہ نہیں رفیق وہاں کیسے پہنچ گیا تھا۔ ہو سکتا ہے، اس کے عمل میں استدراج کا بھی عمل ہو۔ وہ رفیق کی معرفت مجھے بلانا چاہتا ہو۔

چٹان کے نیچے اس وقت پہنچا جب تقریباً ایک چوتھائی سورج پہاڑیوں کے نیچے جا چکا تھا۔ وہاں لنگوٹ نما دھوتی پہنے، مضبوط و توانا جسم والا سادھو آنکھیں بند کیے چار زانو بیٹھا ہوا تھا۔ اُس کا ایک ہاتھ دو شاخہ لکڑی پر تھا۔ ہاتھ میں موٹے دانوں والی مالا تھی۔ دانے آواز کے ساتھ گر رہے تھے۔ ماتھے پر قشقے کے گہرے نشان تھے۔ گلے میں جنیو پڑا تھا۔

رفیق نے کہا تھا، اُس کی آنکھیں بیل جیسی ہیں۔ لیکن جب اُس نے آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھا، میں نے محسوس کیا اُس کی آنکھوں کے آگے بیل کی آنکھیں تو کچھ بھی نہیں تھیں۔

"تم سکندر ہو بچہ؟" اُس نے مجھے گھورتے ہوئے پوچھا۔ اُس کی آنکھوں کا اثر تھا، یا کوئی اور بات تھی، میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ زمین نے میرے پاؤں پکڑ لیے ہیں۔

"ہاں مہاراج!" میں نے جواب دیا۔ میرا ہی نام سکندر ہے۔"

"ہمارا سندیسہ تو تمہیں مل گیا ہو گا۔ یہاں آنے میں اتنی دیر کیوں لگا دی؟"

"تھوڑی مصروفیت ہو گئی تھی۔" میں نے کہا۔ "تم نے رفیق سے کہا تھا کہ مجھے اس عورت سے نجات پانے کی ترکیب بتاؤ گے، جو میری خوشیوں کی دشمن ہے؟"

"ہاں، کہا تو تھا۔ لیکن تم نے سوچ بچار میں بڑی دیر لگا دی۔"

"مہاراج!" میں نے زمین سے چپکے ہوئے پاؤں چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا۔ "دیر سے آنے کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ جو بتانا چاہتے تھے، اب بتا دو۔ اگر مجھے اس عورت سے نجات مل گئی تو میں ساری زندگی تمہارا احسان مند رہوں گا۔"

"سورج دیوتا کا رتھ پہاڑوں کے پیچھے چلا گیا؟"

"ہاں مہاراج! سورج غروب ہو گیا ہے۔"

"اب کچھ نہیں ہو سکتا بچہ! اب کچھ نہیں ہو سکتا۔" اُس نے اظہارِ افسوس کرتے ہوئے کہا۔

"کیوں نہیں ہو سکتا؟ تم نے مجھے مذاق کرنے کے لیے بلایا تھا؟"

"ہم نے تمہیں سورج دیوتا کا رتھ جانے سے پہلے بلایا تھا۔ ہمیں نہیں، اپنے آپ کو دوش دو۔ اندھیرے میں اُس عورت پر ہمارا کوئی وش نہیں چلتا۔"

"ترکیب تو بتا سکتے ہو۔"

"نہیں مورکھ!" وہ بولا۔

"تمہارے کسی طلسم کی وجہ سے زمین نے میرے پاؤں پکڑ رکھے ہیں۔ اس کا اثر ختم کرو، تاکہ میں واپس جاؤں۔"

اُس نے بھیانک سا قہقہہ لگایا۔ "جلدی کیا ہے؟ رونے کے لیے ساری عمر پڑی ہے۔"

پھر اُس کا لہجہ بدل گیا۔ "سنو بچہ! ندی کے بیچ ایک جزیرہ ہے۔ جزیرے پر ایک مندر ہے۔ مندر کا نام راج کنڈل ہے۔ ہم ہر منگل وار کو صبح سے شام تک وہیں ہوتے ہیں۔ اگر اُس عورت کو جس کا نام زبان پر لانا ہمارے لیے مہا پاپ ہے، سمہ جاؤ اور اپنی خوشیوں کی قاتل سے بدلہ لینا چاہو تو ہمارے پاس چلے آنا۔ ہم نے تمہارے دوست سے بھی کہا تھا اور اب تم سے بھی کہہ رہے ہیں کہ صرف ہمیں ہی اُس کو ختم کرنے کی قوت حاصل ہے۔ جاؤ۔" اُس نے گرج کر کہا۔ "اپنی اسی دنیا میں واپس لوٹ جاؤ، جہاں دُکھ درد بے چینی سے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔"

"مہاراج!" میں نے پیروں کو جنبش دیتے ہوئے کہا۔ "میں تمہارے پاس بڑی آس لے کر آیا تھا۔ یہ نہیں معلوم تھا کہ تم اتنی بے دردی سے میری اُمیدوں کو خاک میں ملا دو گے۔"

"زندہ بچ گئے تو راج کنڈل میں بھی آس لے کر آؤ گے۔ اور اُس وقت نراش نہیں رہو گے۔"

میں نے دل ہی دل میں اُسے برا بھلا کہا اور واپس ہو گیا۔ اچھی خاصی گہری تاریکی ہو گئی تھی۔ سادھو سے جو گفتگو ہوئی تھی، اس سے زیادہ ان لوگوں کا خیال ستا رہا تھا، جو سمندر کے کنارے بیٹھے ہوئے مجھے گالیاں دے رہے ہوں گے۔ فضیلہ کے دل پر کیا بیت رہی ہو گی۔ میں اُس سے غروبِ آفتاب سے پہلے واپسی کا وعدہ کر کے آیا تھا۔ سادھو کی باتوں نے میری مغرب کی نماز بھی قضا کروا دی تھی۔ یہ میں نہیں جانتا تھا کہ یہ تو نمازیں قضا ہونے کی ابتداء تھی۔

اچانک میں نے بھاگنا شروع کر دیا۔ میرے کانوں میں چیخوں کی آوازیں آ رہی تھیں اور اُس جگہ، جہاں ہم لوگ پکنک کے لئے جمع ہوئے تھے، بے شمار لوگ تیزی سے اُدھر جاتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔

سب سے پہلے مجھے نورین نظر آئی۔ وہ دری پر نیم بے ہوش پڑی تھی اور بے تحاشا چیخ رہی تھی۔ اُس کا دایاں کندھا زخمی تھا اور اس سے خون رس رس کر دری پر پھیل رہا تھا۔

"کیا ہوا؟...... کیا ہوا؟"

بھائی جان کے کسی دوست نے میرے بازو کو پکڑ کر کہا۔ "فضیلہ کی طرف توجہ دو۔ وہ دم توڑ رہی ہے۔"

میں دوبارہ بھاگا۔ فضیلہ پانی کے قریب پڑی تھی۔ اس کا دایاں ہاتھ غائب تھا۔ اُکھڑی اُکھڑی سانسیں لے رہی تھی۔

"جلدی کرو۔" میں نے فضیلہ کو دیکھتے ہی کہا۔ "ایمبولینس منگواؤ۔ نہیں...... ایمبولینس آنے میں دیر لگے گی، خدا کے لئے کسی کار کا انتظام کرو۔"

اسی اثناء میں کئی کاریں وہاں آ چکی تھیں۔ بھائی جان، نورین کو اسی کی کار میں ڈال کر روانہ ہو گئے تھے۔ میں اور کئی دوسرے لوگ فضیلہ کو اٹھا کر دوسری کار تک لے گئے۔ اُسے پچھلی نشست پر لٹا دیا گیا۔ میں اُس کے پاس ہی کار کے فرش پر اُس کے لہولہان جسم کو سنبھال کر بیٹھ گیا۔ دو افراد کار کے اگلے حصے میں بیٹھ گئے۔ کار فراٹے بھرنے لگی۔ اگلی نشست پر بیٹھے ہوئے دونوں افراد حادثہ پر تبصرہ کرنے لگے۔

"کوئی خوفناک بلا تھی۔"

"نہیں، مگرمچھ تھا۔"

"یہاں مگرمچھ کہاں؟ وہ بلا دوسری لڑکی کو کھینچتی ہوئی سمندر میں لے جا رہی تھی، لیکن اس کی زندگی تھی، وہ بچ گئی۔ پیچھے پڑی ہوئی لڑکی نے اُسے چھڑا لیا اور خود اُس بلا کا نشانہ بن گئی۔"

میں فضیلہ کے چہرے پر جھکا ہوا تھا۔ اُس کے رخساروں کا خون حقیقت میں جھلک کر باہر آ

گیا تھا۔ میرے منہ سے نجانے کیسے کیسے عجیب جملے ادا ہو رہے تھے۔

”تمہیں تو رُوٹھنا نہیں آتا فضیلہ!...... مجھ سے رُوٹھنا نہیں...... تم مر گئی تو میں بھی زندہ نہیں رہوں گا، فضیلہ!“

وہ ٹوٹی ٹوٹی ہچکیاں لے رہی تھی۔ میں کہہ رہا تھا۔

”فضیلہ!...... فضیلہ!...... مرنا نہیں، فضیلہ!“

اچانک اُس نے آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھا۔ آنکھوں سے کئی آنسو ٹپک پڑے اور اس کے ساتھ ہی اُس نے آخری ہچکی لی اور اُس کا سر ڈھلک گیا۔

میں اُس سے لپٹ گیا۔ ”اپنا وعدہ مت بھولنا فضیلہ! اللہ میاں سے اجازت لے کر میرے پاس آجانا فضیلہ!...... فضیلہ......!“

پھر اچانک میرے منہ سے قہقہے بلند ہونے لگے۔

لوگ کہتے ہیں، جس وقت فضیلہ کی لاش کو ہسپتال کے گیٹ پر کار سے نکالا گیا، میں پاگل ہو چکا تھا اور فلک شگاف قہقہے لگاتا ہوا، ہر شخص کو جو میرے قریب آنے کی کوشش کر رہا تھا، بری طرح مار رہا تھا اور بھنبھوڑ رہا تھا۔

کہنے والے مجھ سے کہتے ہیں کہ تم کم و بیش تین ماہ تک پاگل رہے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ تین ماہ کا وہ عرصہ، جو میں نے ایک پرائیویٹ ذہنی ہسپتال میں گزارا، میری زندگی کا سب سے پُرسکون اور آرام دہ زمانہ تھا۔ ایک دن بھی ایسا نہیں، جب فضیلہ کی معیت حاصل نہ ہوئی ہو۔ وہ میرے پاس تھی اور ہر وقت ہنستی ہنساتی رہتی تھی۔ کبھی کبھی تو اس کی معصوم شوخیوں اور شرارتوں پر بے ساختہ قہقہے نکل جاتے تھے۔ چند ثانیوں کے لیے نظروں سے اوجھل ہوتی تو میں رو پڑتا۔ پھر بھی نہ آتی تو کلیجہ خون ہونے لگتا، ہچکیاں بندھ جاتیں۔ رو رو کر برا حال کر لیتا۔ تب وہ اچانک آ کر پیچھے سے میرے گلے میں بانہیں ڈال لیتی۔ میں دوبارہ ہنسنے لگتا۔ فضیلہ میری گود میں ریشم جیسے سنہرے بالوں کا معطر سر رکھ کر آنکھیں بند کر لیتی اور کہتی۔

”جی چاہتا ہے، یونہی آپ کی گود میں سر رکھے رہوں اور چپکے سے موت آجائے۔“

یہ جملہ وہ چھیڑنے کے لئے کہتی تھی۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ مجھے غصہ آجاتا ہے۔ میں بھی جانتا تھا کہ وہ چھیڑ رہی ہے، پھر بھی میرے منہ سے جھاگ نکلنے لگتے تھے۔ ہاتھ میں جو چیز بھی آتی تھی اُسے فرش پر پٹخ دیتا تھا اور چیخ چیخ کر کہتا تھا۔ ”مر کر تو دیکھو۔ تمہارے ٹکڑے ٹکڑے کر کے تمہیں جان سے نہ مار دوں تو میرا نام سکندر نہیں۔“

وہ ہنس پڑتی تھی، گود سے سر اُٹھا کر میری ناک مروڑ دیتی تھی اور گلاب کی پنکھڑیوں جیسے نازک ہونٹوں سے کہتی تھی۔

”آپ ناراض ہوتے ہیں تو بہت، بہت، بہت پیارے لگتے ہیں۔“

ہم دونوں دن رات باتیں کرتے تھے۔ فضیلہ خود سوتی تھی، نہ مجھے سونے دیتی تھی۔ باتیں تھیں کہ کسی طرح ختم ہی نہیں ہوتی تھیں۔ بار بار کے کہے ہوئے جملے بار بار ادا کیے جاتے تھے اور ہر بار نئے معلوم ہوتے تھے۔ باتوں کے دوران کبھی کبھی غنودگی سی طاری ہونے لگتی تو وہ نرم و ملائم ہاتھوں سے میرے سینے پر گھونسے مار مار کر مجھے سونے سے باز رکھتی۔ غصہ کرنا تو اُسے آتا ہی نہیں تھا۔ لیکن میری ذرا سی غفلت، بے توجہی یا لاپروائی سے اس کی بڑی بڑی شربتیں آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو ٹپکنے لگتے تھے۔ میں ان آنسوؤں کو ہونٹوں میں جذب کر لیتا تھا۔ وہ روتی ہوئی میرے سینے سے چمٹ جاتی تھی اور اکثر کہا کرتی تھی کہ آپ غافل ہو گئے تو میری حفاظت کون کرے گا؟ کیا آپ بھول گئے کہ ہمارے پیار کی دشمن ابھی زندہ ہے اور ہم دونوں کو، میرے منہ میں خاک، ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے الگ کرنا چاہتی ہے۔“

ہاں، یہ بات مجھے اچھی طرح یاد تھی۔ ترشولی شب و روز ہمارے اردگرد منڈلاتی رہتی تھی۔ کبھی اکیلی، سفید کوٹ پہنے اور کبھی سفید کوٹوں والی، دوسری ارواح کے ساتھ۔ اُسے خوش فہمی تھی کہ بھیس بدل کر مجھے بے وقوف بنانے میں کامیاب ہو جائے گی۔ میں کئی بار اُس کے فریب کا شکار ہوتے ہوتے بچا، لیکن ہر بار فضیلہ نے بروقت مجھے آگاہ کر دیا۔

”ہوشیار اور خبردار رہیے۔ دشمن کی میٹھی میٹھی باتوں میں نہ آئیے۔ مجھے آپ سے جدا کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔“

میں فضیلہ کے جسم پر جھک کر، سفید کوٹ پہن کر آنے والی ترشولی پر بھیڑیے کی طرح غرانے لگتا اور تب ترشولی اور اس کے ساتھ سفید کوٹوں میں آنے والی ارواح مجھ پر ٹوٹ کر فضیلہ کو چھیننے کی کوشش کرنے لگتیں۔ لیکن فضیلہ تک اُن کی رسائی نہ ہو پاتی۔ کیونکہ اُسے میں اپنے جسم میں اس طرح ڈھانپ لیتا تھا۔ ترشولی اور دوسری ارواح چڑھ کر میرے سر کو اوپر اُٹھاتیں اور زبردستی میرا منہ کھولتیں اور اس میں کڑوا کسیلا زہر اُنڈیل دیتیں۔ اور جب تک وہ زہر حلق سے نیچے نہ اتر جاتا، وہ بال پکڑے میرا سر اُوپر ہی اُٹھائے رکھتیں۔ میں مر جاتا، لیکن مرنے کے بعد بھی فضیلہ سے دستبردار نہ ہوتا۔ غصے میں آ کر ترشولی سفید پوش روحوں کو حکم دیتی کہ سکندر کو زندہ کر کے اس کے پہلو سے فضیلہ کو الگ کر دیا جائے۔ روحیں میرے کولہے میں پیکاری جیسی بڑی سی سوئی بے دردی سے گھونپ دیتیں مگر میں مسلسل چلاتا رہتا کہ کتنی ہی کوشش کیوں نہ کرو، نہ میں زندہ ہوں گا، نہ فضیلہ تک تمہارے گندے ہاتھ پہنچنے دوں گا۔ بالآخر مایوس ہو کر ترشولی اور دوسری ساری ارواح ہٹ جاتیں۔ اُن کی شکست فاش پر میرے منہ سے فاتحانہ قہقہے نکلنے لگتے۔ فضیلہ میرے جسم کے نیچے اس وقت تک سہمی سہمی دبکی پڑی رہتی، جب تک سفید پوش، منحوس چہرے نظروں سے

گیا تھا۔ میرے منہ سے نجانے کیسے کیسے عجیب جملے ادا ہو رہے تھے۔

”تمہیں تو رُوٹھنا نہیں آتا فضیلہ!....... مجھ سے رُوٹھنا نہیں....... تم مر گئی تو میں بھی زندہ نہیں رہوں گا، فضیلہ!“

وہ ٹوٹی ٹوٹی ہچکیاں لے رہی تھی۔ میں کہہ رہا تھا۔

”فضیلہ!....... فضیلہ!....... مرنا نہیں، فضیلہ!“

اچانک اُس نے آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھا۔ آنکھوں سے کئی آنسو ٹپک پڑے اور اس کے ساتھ ہی اس نے آخری ہچکی لی اور اُس کا سر ڈھلک گیا۔

میں اُس سے لپٹ گیا۔ ”اپنا وعدہ مت بھولنا فضیلہ! اللہ میاں سے اجازت لے کر میرے پاس آجانا فضیلہ!....... فضیلہ.......!“

پھر اچانک میرے منہ سے قہقہے بلند ہونے لگے۔

لوگ کہتے ہیں، جس وقت فضیلہ کی لاش کو ہسپتال کے گیٹ پر کار سے نکالا گیا، میں پاگل ہو چکا تھا اور فلک شگاف قہقہے لگاتا ہوا، ہر شخص کو جو میرے قریب آنے کی کوشش کر رہا تھا، بری طرح مار رہا تھا اور بھنبھوڑ رہا تھا۔

کہنے والے مجھ سے کہتے ہیں کہ تم کم و بیش تین ماہ تک پاگل رہے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ تین ماہ کا وہ عرصہ، جو میں نے ایک پرائیویٹ ذہنی ہسپتال میں گزارا، میری زندگی کا سب سے پُرسکون اور آرام دہ زمانہ تھا۔ ایک دن بھی ایسا نہیں، جب فضیلہ کی معیت حاصل نہ ہوئی ہو۔ وہ میرے پاس تھی اور ہر وقت ہنستی ہنساتی رہتی تھی۔ کبھی کبھی تو اُس کی معصوم شوخیوں اور شرارتوں پر بے ساختہ قہقہے نکل جاتے تھے۔ چند ثانیوں کے لیے نظروں سے اوجھل ہوتی تو میں رو پڑتا۔ پھر بھی نہ آتی تو کلیجہ خون ہونے لگتا، ہچکیاں بندھ جاتیں۔ رو رو کر برا حال کر لیتا۔ تب وہ اچانک آ کر پیچھے سے میرے گلے میں بانہیں ڈال لیتی۔ میں دوبارہ ہنسنے لگتا۔ فضیلہ میری گود میں ریشم جیسے سنہرے بالوں کا معطر سر رکھ کر آنکھیں بند کر لیتی اور کہتی۔

”جی چاہتا ہے، یونہی آپ کی گود میں سر رکھے رہوں اور چپکے سے موت آجائے۔“

یہ جملہ وہ چھیڑنے کے لیے کہتی تھی۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ مجھے غصہ آجاتا ہے۔ میں بھی جانتا تھا کہ وہ چھیڑ رہی ہے، پھر بھی میرے منہ سے جھاگ نکلنے لگتے تھے۔ ہاتھ میں جو چیز بھی آتی تھی اُسے فرش پر پٹخ دیتا تھا اور چیخ چیخ کر کہتا تھا۔ ”مر کر تو دیکھو۔ تمہارے ٹکڑے ٹکڑے کر کے تمہیں جان سے نہ مار دوں تو میرا نام سکندر نہیں۔“

وہ ہنس پڑتی تھی، گود سے سر اُٹھا کر میری ناک مروڑ دیتی تھی اور گلاب کی پنکھڑیوں جیسے نازک ہونٹوں سے کہتی تھی۔

”آپ ناراض ہوتے ہیں تو بہت، بہت، بہت پیارے لگتے ہیں۔“

ہم دونوں دن رات باتیں کرتے تھے۔ فضیلہ خود سوتی تھی، نہ مجھے سونے دیتی تھی۔ باتیں تھیں کہ کسی طرح ختم ہی نہیں ہوتی تھیں۔ بار بار کے کہے ہوئے جملے بار بار ادا کیے جاتے تھے اور ہر بار نئے معلوم ہوتے تھے۔ باتوں کے دوران کبھی کبھی غنودگی سی طاری ہونے لگتی تو وہ نرم و ملائم ہاتھوں سے میرے سینے پر گھونسے مار مار کر مجھے سونے سے باز رکھتی۔ غصہ کرتا تو اُسے آتا ہی نہیں تھا۔ لیکن میری ذرا سی غفلت، بے توجہی یا لاپروائی سے اُس کی بڑی بڑی شربتیں آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو ٹپکنے لگتے تھے۔ میں ان آنسوؤں کو ہونٹوں میں جذب کر لیتا تھا۔ وہ روتی ہوئی میرے سینے سے چمٹ جاتی تھی اور اکثر کہا کرتی تھی کہ آپ غافل ہو گئے تو میری حفاظت کون کرے گا؟ کیا آپ بھول گئے کہ ہمارے پیار کی دشمن ابھی زندہ ہے اور ہم دونوں کو، میرے منہ میں خاک، ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے الگ کرنا چاہتی ہے۔“

ہاں، یہ بات مجھے اچھی طرح یاد تھی۔ ترشولی شب و روز ہمارے ارد گرد منڈلاتی رہتی تھی۔ کبھی اکیلی، سفید کوٹ پہنے اور کبھی سفید کوٹوں والی، دوسری ارواح کے ساتھ۔ اُسے خوش فہمی تھی کہ بھیس بدل کر مجھے بے وقوف بنانے میں کامیاب ہو جائے گی۔ میں کئی بار اس کے فریب کا شکار ہوتے ہوتے بچا، لیکن ہر بار فضیلہ نے بروقت مجھے آگاہ کر دیا۔

”ہوشیار اور خبردار رہیے۔ دشمن کی میٹھی میٹھی باتوں میں نہ آئیے۔ مجھے آپ سے جدا کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔“

میں فضیلہ کے جسم پر جھک کر، سفید کوٹ پہن کر آنے والی ترشولی پر بھیڑیے کی طرح غرانے لگتا اور تب ترشولی اور اس کے ساتھ سفید کوٹوں میں آنے والی ارواح مجھ پر ٹوٹ کر فضیلہ کو چھیننے کی کوشش کرنے لگتیں۔ لیکن فضیلہ تک اُن کی رسائی نہ ہو پاتی۔ کیونکہ اُسے میں اپنے جسم میں اِسی طرح ڈھانپ لیتا تھا۔ ترشولی اور دوسری ارواح چڑھ کر میرے سر کو اوپر اُٹھاتیں اور زبردستی میرا منہ کھولتیں اور اس میں کڑوا کسیلا زہر اُنڈیل دیتیں۔ اور جب تک وہ زہر حلق سے نیچے نہ اتر جاتا، وہ بال پکڑے میرا سر اُوپر ہی اُٹھائے رکھتیں۔ میں مر جاتا، لیکن مرنے کے بعد بھی فضیلہ سے دستبردار نہ ہوتا۔ غصے میں آ کر ترشولی سفید پوش روحوں کو حکم دیتی کہ سکندر کو زندہ کر کے اس کے پہلو سے فضیلہ کو الگ کر دیا جائے۔ روحیں میرے کولہے میں پچکاری جیسی بڑی سی سُوئی بے دردی سے گھونپ دیتیں مگر میں مسلسل چلاتا رہتا کہ کتنی ہی کوشش کیوں نہ کرو، نہ میں زندہ ہوں گا، نہ فضیلہ تک تمہارے گندے ہاتھ پہنچنے دوں گا۔ بالآخر مایوس ہو کر ترشولی اور دوسری ساری ارواح ہٹ جاتیں۔ اُن کی شکست فاش پر میرے منہ سے فاتحانہ قہقہے نکلنے لگتے۔ فضیلہ میرے جسم کے نیچے اُس وقت تک سہمی سہمی دبکی پڑی رہتی، جب تک سفید پوش، منحوس چہرے نظروں سے

ذورت ہو جاتے۔ پھر وہ چپنے لگتی اور میری کمر کے گرد اپنے بازو حمائل کر لیتی۔ میں اُس کے بالوں
پر، گردن پر، پیٹھ پر پیار سے ہاتھ پھیرنے لگتا۔

"ظلم و ستم کی سیاہ رات کا طلسم بہت جلدی ٹوٹ جائے گا، فضیلہ!" میرے ہونٹ دھیمی دھیمی
آواز میں اُسے سمجھاتے۔ "مسرتوں کا سورج طلوع ہوتے ہی ہم دونوں اپنے خواب محل میں منتقل
ہو جائیں گے اور اُس کے دروازوں کو اندر سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند کر لیں گے۔"

ترشولی کو بھانت بھانت کے بھیس بدلنے اور اداکاری کرنے میں کمال حاصل تھا۔ وہ روز
سویرے ہی سویرے بڑی ڈھٹائی کے ساتھ، آندھی آئے یا طوفان، بلاناغہ ابا جی کا بھیس بدل کر
ابا جی کی نقل اُتارتی ہوئی آتی اور کبھی کبھی میرے ساتھ دوسری روحوں کو بھی بھائی جان اور دوسروں
کے روپ میں لے آتی۔

بھائی جان کے روپ میں آنے والی روح دو یا تین مرتبہ ایک اور روح کو فضیلہ بنا کر لائی
فضیلہ کے ابو کا بھیس کوئی بھی روح صحیح طور پر نہیں بدل سکی۔ قد و قامت اور آواز و لہجہ تو اُنہی کا
لیکن چہرے پر بڑی سی کھچڑی داڑھی پہن لی تھی۔ حالانکہ فضیلہ کے ابو پابندی سے شیو بناتے
اور رعب داب کے لیے مونچھیں رکھتے تھے۔ چھ سات بار فضیلہ کی امی کا روپ دھارا۔ فضیلہ
طرف تو ایک بار بھی دھیان نہیں دیا۔ بس مجھ سے پرے کھڑی روتی رہی۔ دال نہیں گلی تو
اور فضیلہ کو اپنے اپنے حال میں کہیں چھوڑ کر جس طرح روتی ہوئی آئی تھی، اُسی طرح روتی
چلی گئی۔

میں کبھی رو کر، کبھی قہقہہ لگا کر، کبھی منہ چڑا کر اور کبھی ترشولی اور دوسری ارواح پر حملہ کر
کی کوشش کر کے سب سے ایک ہی بات کہتا تھا۔ "میرے اور فضیلہ کے درمیان مت آؤ۔
خبیثو! تم کتنے ہی جتن کیوں نہ کر ڈالو، مجھ کو فضیلہ سے اور فضیلہ کو مجھ سے جدا نہیں کر سکو گے۔"
پھر گھوم کر پہلو میں بیٹھی ہوئی فضیلہ سے مخاطب ہو کر پوچھتا تھا۔ "کیوں فضیلہ! غلط
کہہ رہا ہوں؟"

فضیلہ جواب دینے کے بجائے میرا ہاتھ تھام لیتی، پھر سینے پر سر رکھ لیتی، پھر میری
لپٹ جاتی۔ اور میں وہاں موجود ترشولی اور اُس کی کمینہ صفت ذریت کو نظر انداز کر کے فضیلہ
خواب محل کی باتیں کرنے لگتا۔ جہاں سیاہ رات کا طلسم ٹوٹتے ہی ہم دونوں کو ہمیشہ کے لیے
ہو جانا تھا۔

پھر ایک ایسا وقت آیا کہ ترشولی کے دن اور رات کے کئی کئی حملوں کے باعث میری
کرنے لگی اور قوت مزاحمت کم ہو گئی۔ ترشولی سفید کوٹ پہنے مرد کے بھیس میں آتی اور کہتی
"تو بکھر رہا، یہ دوا پی لو۔" اور میں اُسے جھڑکنے کے بجائے اور یہ جانتے کے باوجود

کے نام پر زہر دیا جا رہا ہے، پوری خوراک پی لیتا۔ وہ کہتی۔ "انجکشن لگوا لو۔" میں اتنا تھک چکا تھا
کہ خم ٹھونک کر مقابلہ کرنے کے بجائے اپنا کولہا اُس کے سامنے کر دیتا۔

فضیلہ کو بہت جلدی میرے ضعف کا اندازہ ہو گیا۔ اُس کی محبت میں تو کمی نہیں آئی، تاہم وہ
سمجھ گئی کہ میں اُس کا دفاع نہیں کر سکوں گا۔ وہ صرف اُس وقت میرے پاس آنے لگی، جب میں
تنہا ہوتا تھا اور مجھ پر غنودگی طاری ہوا کرتی تھی۔ جتنی دیر تنہائی اور غنودگی باقی رہتی، مجھے فضیلہ کا
قرب حاصل رہتا۔ اِدھر غنودگی ٹوٹتی اور اُدھر وہ ہوا ہو جاتی۔ لاکھ آوازیں دیتا، سر پٹکتا لیکن فضیلہ
پلٹ کر نہ آتی۔

نتیجہ یہ ہوا کہ فضیلہ کا قرب حاصل کرنے کی خاطر مجھے غنودگی اچھی لگنے لگی۔ آنکھیں بند کیے
فضیلہ سے راز و نیاز کی باتیں کرتا رہتا۔ آہستہ آہستہ غنودگی، نیند میں تبدیل ہونے لگتی۔ فضیلہ سے
ملاقات کے اوقات بدل گئے۔ سو جاتا تو فضیلہ آ جاتی۔ جاگتا تو غائب ہو جاتی۔ کوئی جگا دیتا تو دل
چاہتا کہ جگانے والے کے دو ٹکڑے کر دوں۔

نیند کی دنیا خوب صورت بھی تھی اور مہیب بھی۔ خوب صورت اس لیے کہ فضیلہ سے اسی دنیا
میں ملاقات ہوتی تھی اور مہیب اس لیے کہ ترشولی نے یہاں بھی میرا پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔ کبھی وہ
مجھے فضیلہ سے چھین کر آسمان پر اُڑا لے جاتی اور اچانک زمین پر پھینک دیتی تھی، کبھی فضیلہ کو
میرے بازوؤں سے اُچک لیتی اور لمبے نوکیلے ناخنوں اور بڑے بڑے دھار دار دانتوں سے اُس
معصوم کے برخ و سفید جسم کو کتوں کی مانند نوچنے اور بھنبھوڑنے میں مصروف ہو جاتی تھی۔ ضعف
اور کمزوری کے باوجود، میں فضیلہ کو بچانا چاہتا تھا لیکن زمین مجھے جکڑ لیتی تھی۔ بیل سے بھی زیادہ
خوف ناک آنکھوں، لمبی لمبی جٹاؤں اور بدنما داڑھی والے سادھو کا قشقہ لگا چہرہ نظروں کے سامنے
اُبھرتا تھا۔ میں رو رو کر کہتا تھا۔

"مجھ پر دیا کرو راجا جی!" اور تب روتے روتے، چیختے چیختے میری آنکھ کھل جاتی تھی۔ آنکھ
کھلتی تو میں اپنے آپ کو حوالات جیسی کوٹھڑی میں سر تا پا پسینے میں شرابور پاتا۔ میں نے ان نئے
لوگوں کو بھی پہچاننا شروع کر دیا تھا، جو سفید کوٹ پہن کر میرے پاس آتے تھے۔ اُنہوں نے
ترشولی اور اُس کی دوست روحوں کو مار بھگایا تھا اور خود اُن کی جگہ لے لی تھی۔ دراصل وہ سادھو
کے بھیجے ہوئے آدمی تھے اور جنتر منتر کے ذریعے میری کھوئی ہوئی قوت کو بحال کرنے کے لیے
آتے تھے۔ چند روز بعد نہ ترشولی رہی، نہ سادھو کے آدمی۔ میں آنے والوں کو اس حد تک پہچاننے
لگا کہ اُن میں ایک ڈاکٹر تھا اور باقی میل نرس تھے۔ لیکن میں نے ظاہر نہیں کیا کہ اُنہیں پہچان گیا
ہوں۔ ڈر سا محسوس ہوتا تھا کہ میرے اظہار سے وہ مجھے چھوڑ کر نہ بھاگ جائیں اور میں ایک بار
پھر ترشولی کے رحم و کرم پر نہ رہ جاؤں۔

ایک صبح آنکھ کھلی تو میں نے دروازے پر کھڑے اُترے اُترے چہرے والے اُس بوڑھے کو پہچان لیا، جو خاموشی سے میری طرف دیکھے جا رہا تھا۔ پہلے بھی شکل نظر آتی تھی تو میں آنکھیں نکال کر اور گھونسہ تان تان کر کہتا تھا۔

"کسی بھی روپ میں آؤ تر شولی! تم مجھے دھوکا نہیں دے سکتیں۔"

شاید وہ بوڑھا مجھ سے یہی جملہ سننے کی توقع کر رہا تھا اور اسی وجہ سے اُس میں میرے قریب آنے کی جرأت نہیں تھی۔ لیکن اُس کی توقع کے برعکس میں نے آہستہ سے کہا۔ "ابا جی!"

ابا جی گرتے گرتے بچے۔ اُنہوں نے لڑکھڑاتے ہوئے دروازے کی چوکھٹ پکڑ لی اور ایک ایسے گم راہ بچے کی طرح جیسے اِدھر اُدھر بھٹکتے بھٹکتے اچانک منزل نظر آ گئی ہو، ناقابلِ برداشت خوشی کے باعث روتے ہوئے بولے۔ "سکندر!......میرے بیٹے!"

میں نے کہا۔ "وہاں کیوں کھڑے ہیں ابا جی! یہاں آیئے، میرے پاس۔"

میرے پاس آنے کے بجائے ابا جان دھاڑیں مارتے ہوئے باہر کی طرف بھاگے۔ وہ بری طرح چلّا رہے تھے۔ "سکندر نے مجھے پہچان لیا ہے۔ خدا کی قسم، اس نے مجھے پہچان لیا ہے۔ ڈاکٹر کو بلاؤ۔ جلدی کرو۔ جلدی......بہت جلدی۔"

مجھے چکر سے آ رہے تھے۔ اس کے باوجود میں نے پلنگ سے اُٹھ کر ابا جی تک جانے کی کوشش کی لیکن ہاتھ پاؤں نائلون کی ایسی ڈھیلی ڈھالی رسّی سے بندھے تھے کہ میں بستر پر کروٹ بدل کر لیٹ سکتا تھا اور اُٹھ کر بیٹھ سکتا تھا، لیکن پلنگ سے اُٹھ کر دروازے تک نہیں جا سکتا تھا۔

اسی دوران ابا جی خوشی سے آنسو بہاتے ہوئے میرے پلنگ تک آ ئے۔ اُن کے عقب میں سفید کوٹوں والے دو مرد نرس بھی تھے۔

"سکندر!" ابا جی نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا۔ "اُنہیں بتاؤ، میں کون ہوں؟"

میں حیرتوں کے سمندر میں غرق تھا۔ حیرت ہو رہی تھی کہ ابا جی کیوں رو رہے ہیں؟ حیرت ہو رہی تھی کہ مجھے حوالات میں کیوں بند کیا گیا تھا؟ حیرت ہو رہی تھی کہ دونوں میل نرس عجیب نظروں سے کیوں دیکھ رہے تھے؟ حیرت سے ایک ایک چہرے اور در و دیوار کو دیکھ رہا تھا۔

"میں کون ہوں، بیٹا؟" ابا جی میرا ہاتھ پکڑے ہوئے میری منت کر رہے تھے۔ "شاباش بیٹا!......بتاؤ، میں کون ہوں؟......میں کون ہوں، بتاؤ؟"

میں نے ہاتھ بڑھا کر اُن کے گرم گرم آنسوؤں کو پونچھ ڈالا۔

"دیکھا تم نے......؟" ابا جی، سفید پوش مرد نرسوں کی طرف دیکھ کر تقریباً چلّا ئے۔ "دیکھا......دیکھا؟"

"کیوں رو رہے ہیں، ابا جی؟" میں نے پوچھا۔ اُن کا چہرہ دُھندلا پڑنے لگا تھا۔

ابا جی فلک شگاف چیخ کے ساتھ میری پالکی پر گر گئے۔ دونوں میل نرس نے ابا جی کو، جو چھوٹے چھوٹے بچوں کی طرح ہچکیوں اور سسکیوں سے رو رہے تھے، سہارا دے کر اُٹھایا۔ اُن میں سے ایک نے ابا جی کو مبارک باد دی۔

ابا جی مبارک باد دینے والے نرس سے لپٹ گئے اور دھاڑیں مارنے لگے۔

اسی اثناء میں بیگ لیے ہوئے ایک اور سفید پوش تیز قدموں سے اندر آ گیا۔

"ڈاکٹر صاحب!" ابا جی نے بیک وقت روتے اور ہنستے ہوئے کہا۔ "سکندر نے مجھے پہچان لیا ہے۔"

ڈاکٹر نے ابا جی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تسلی دی اور مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ "یہ کون ہیں، سکندر؟"

"میرے ابا جی ہیں۔" میں نے کہا۔ "انہیں منع کیجیے۔ ان کے رونے سے مجھے تکلیف ہو رہی ہے۔"

ابا جی نے دانت نکال دیے۔ "میں تو ہنس رہا ہوں بیٹا!" اور دونوں ہاتھوں سے اپنا سینہ پکڑ لیا۔

"بھلا میں کون ہوں؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔

ابا جی کی حالت غیر نہ ہوتی تو میں یقیناً اس الو کے سوال پر ہنس پڑتا۔ کمرے میں موجود ساری آنکھیں مجھ پر جمی تھیں۔ ابا جی بھی سینہ پکڑے ہوئے، ہونقوں کی طرح دانت نکالے، پُراُمید نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔

"آپ ڈاکٹر ہیں۔"

ابا جی نے زوردار سسکاری بھری اور جلدی سے اپنا چہرہ دوسری طرف گھما لیا۔

"شاباش!" ڈاکٹر نے کہا۔ "کچھ اندازہ ہے کہ تم اس وقت کہاں ہو؟"

"یا تو ہسپتال میں ہوں یا حوالات میں؟"

ابا جی نے میری طرف دیکھا اور مجھے اپنی طرف متوجہ پا کر ایک بار پھر دانت نکال دیے۔

"ہسپتال میں ہو۔" ڈاکٹر نے جواب دیا۔ "تمہاری طبیعت خراب ہے۔"

"ہسپتال میں ہوں تو میرے ہاتھ پاؤں کیوں باندھے گئے ہیں؟"

ڈاکٹر نے غصے سے دوسرے سفید پوشوں کی طرف دیکھا۔ "تم سے برابر والے کمرے کے مریض کے ہاتھ پاؤں باندھنے کے لئے کہا گیا تھا اور تم نے باندھ دیا سکندر کو۔"

"غلطی ہو گئی جناب!"

"فوراً کھولو۔ اور دیکھو، آئندہ ایسی غلطی ہوئی تو مجھ سے برا کوئی نہ ہو گا۔"

ابا جی نے بے چینی سے ہتھیلیوں کو مسلتے ہوئے کہا۔ "کاش! کوئی ہاشم کو اطلاع کر دیتا۔"

"کیسی اطلاع؟" میں نے پوچھا۔

"تمہاری صحت یابی کی بیٹا!........ تمہاری صحت یابی کی۔"

"ابا جی!" میں نے کہا۔ "آپ فضیلہ کو فون کر دیں۔ وہ دیوار کی دوسری جانب، اسٹول پر چڑھ کر بھائی جان تک آپ کا پیغام پہنچا دے گی۔"

"ہاں بیٹا! ہاں۔"

اچانک مجھے بھیانک خواب یاد آ گیا۔ فضیلہ کار کی پچھلی نشست پر اپنے ہی خون میں نہائی ہوئی پڑی تھی۔ میں فرش پر بیٹھا تھا۔ وہ ٹوٹی ٹوٹی سانسیں لے رہی تھیں اور میں ہذیانی کیفیت میں اُسے سنبھالے ہوئے نہ جانے کیا کیا بکواس کر رہا تھا۔

"میرا دماغ!" میں نے سر کو پکڑ کر کہا۔ "میرا دماغ پھٹا جا رہا ہے، ڈاکٹر صاحب! آنکھوں میں اندھیرا چھا رہا ہے۔ مجھے........ مجھے کوئی یاد آ رہا ہے۔"

میرے ہاتھ کھولے جا چکے تھے، پاؤں کھولے جا رہے تھے کہ ڈاکٹر کے اشارے پر ایک مرد نرس نے میرے کندھے پکڑ لئے۔ دوسرا میری گردن کے پچھلے حصے کو سہلانے لگا۔

"سب ٹھیک ہے سکندر........!" ڈاکٹر نے اپنے بیگ سے انجکشن نکال کر کہا۔ "کچھ سوچو نہیں۔ اپنے ابا جی کی طرف دیکھو۔ یہ تمہیں گھر لے جانے کے لئے آئے ہیں۔ تم صحت یاب ہو چکے ہو۔"

"میں ابا جی کی طرف نہیں دیکھ سکتا۔" میں نے مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "میری بینائی جا رہی ہے۔ اگر میں نابینا ہو گیا تو ساری زندگی اسے نہیں دیکھ سکوں گا۔"

اسی دوران میرے کولہے میں انجکشن لگا دیا گیا۔ میری آنکھوں کے گرد چھایا ہوا اندھیرا چھٹنے لگا۔

"میں دیکھ سکتا ہوں، ڈاکٹر صاحب!" میں نے خوش ہو کر کہا۔

ڈاکٹر نے کسی مخصوص بام کی شیشی نکال کر ایک دوسرے نرس کو دی۔ وہ میری پیشانی، کنپٹیوں، بھنوؤں اور گردن کے پچھلے حصے میں مالش کرنے لگا۔

"سکندر!" ڈاکٹر نے کہا۔ "تمہاری پسندیدہ فلم کون سی ہے؟"

"میں فلم نہیں دیکھتا۔"

"اچھا، کوئی مزے دار لطیفہ سناؤ۔"

"مجھے کوئی لطیفہ یاد نہیں۔" میں نے بلبلا کر کہا۔ "فضیلہ کہاں ہے؟"

"فضیلہ اپنے گھر ہے۔" ابا جی نے کہا۔ "اور تمہاری صحت کے لیے دعا کر رہی ہے۔"

ڈاکٹر نے کہا۔ "تمہارا پسندیدہ مضمون کون سا ہے، سکندر؟"

"اسلامیات۔" میں نے کہا۔ "مجھے نیند آ رہی ہے۔"

"اسلامیات کے علاوہ دوسرے پسندیدہ مضامین کون کون سے ہیں؟"

"میٹرک اور انٹر میں، میں نے جیومیٹری نہیں پڑھی۔ لیکن مجھے جیومیٹری بہت پسند ہے۔"

میری نظروں میں فضیلہ گھومنے لگی۔ وہ مجھ سے جیومیٹری پڑھنے آتی تھی۔ میں بار بار اُس کے خون چھلکتے ہوئے رخساروں پر اور بڑی بڑی سُرمگیں آنکھوں اور ترشے ہوئے ریشم جیسے سنہرے بالوں کی طرف دیکھتا تھا اور بار بار اپنی بے ہودگی پر خود کو برا بھلا کہتا تھا۔ تہیہ کر لیا تھا کہ اب نہیں دیکھوں گا۔ لیکن نظریں کسی طرح مانتی ہی نہیں تھیں۔

ڈاکٹر کی آواز میرے کانوں میں آ رہی تھی۔ شاید وہ میری جیومیٹری کو پسند کرنے کا سبب پوچھ رہا تھا۔ لیکن میں جواب دینے سے قاصر تھا۔ فضیلہ کا چہرہ میری آنکھوں کا احاطہ کر چکا تھا اور میں اُس کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے نیند کی وادی کی طرف رواں دواں تھا۔

دن چڑھے آنکھ کھلی۔ کمرے میں کئی کرسیاں ڈال دی گئی تھیں۔ دو کرسیوں پر ابا جی اور بھائی جان بیٹھے تھے اور آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے۔ دماغ کی تکلیف کافی حد تک کم ہو چکی تھی، چکر باقی تھے۔ لیکن اتنے تیز نہیں تھے کہ پہلے کی طرح ہر چیز رقص کرتی ہوئی معلوم ہو۔ میں نے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔ ابا جی اور بھائی جان کو میری بیداری کا علم نہ ہو سکا۔

ڈاکٹر نے سوچنے کو منع کیا تھا، سوچوں پر پہرہ تو نہیں لگایا جا سکتا تھا۔ میرے ذہن میں ایسی تصویریں اُبھر رہی تھیں، جو پہلے سے زیادہ صاف اور واضح تھیں۔ فضیلہ سے میری منگنی ہوئی تھی۔ زرق برق پٹھانی لباس میں وہ کتنی حسین اور پیاری معلوم ہو رہی تھی۔ پہلے ہی چاند کا ٹکڑا تھی، لیکن اُس روز تو یوں لگ رہا تھا کہ گویا ساری دنیا کا حُسن اُس میں سمایا ہو۔ ہم لوگ اُسے پکنک پر لے گئے تھے۔ کار میں بیٹھ کر اُس نے کتنی لجاجت کے ساتھ نورین سے کہا تھا۔

"مجھے امی کو دیکھنے دیجیے۔"

پھر کتنے پیار سے اپنی امی کو خدا حافظ کہا تھا۔ کیا اُس کی کسی حس نے اُسے بتا دیا تھا کہ وہ زندگی کے آخری سفر پر جا رہی ہے، آج کے بعد وہ اپنی ماں کو کبھی نہیں دیکھ سکے گی؟........ اس کا دعویٰ تھا کہ وہ ڈر یا خوف، کسی چیز سے واقف نہیں ہے۔ وہ جو ساری زندگی نہیں ڈری تھی، خوشیاں اُسے ڈرا رہی تھیں۔ بے خبر تھی کہ موت کے ساتھ ساتھ چل رہی ہے۔ مگر غیر شعوری طور پر اتنی باخبر تھی کہ تھوڑی دیر بعد موت کا ذکر چھیڑ دیتی۔ کبھی میرے بازوؤں میں مرنے کی تمنا کرتی تھی اور کبھی اس عزم کا اظہار کرتی تھی کہ موت آ گئی تو میں اللہ میاں سے کہوں گی کہ جب تک آپ تنہا اور اُداس ہیں، اُس وقت تک کے لیے وہ مجھے آپ کے پاس واپس بھیج دیں۔ اُس کی

پہلی تمنا پوری ہو گئی تھی۔ جس وقت اُس نے آخری ہچکی لی تھی، میرا ایک ہاتھ اُس کے جسم کو سنبھالے ہوئے تھا اور دوسرا ہاتھ اُس کے چہرے کے خون کو صاف کر رہا تھا اور ہونٹوں سمیت میرا نصف سے زیادہ چہرہ فضیلہ کے خون سے اتنا لت پت ہو چکا تھا کہ حلق تک اس کا اثر محسوس ہو رہا تھا۔ دوسری تمنا خوابوں کی حد تک پوری ہوئی تھی۔ لیکن مجھے یقین تھا کہ بارگاہِ الٰہی میں اُس کی معصوم ضد ضرور سنی جائے گی۔ اگر ضد پوری نہ ہوئی اور فضیلہ واپس نہ آئی تو میں کیا کروں گا؟ اس کے بغیر پہاڑ جیسی زندگی کیسے گزرے گی؟

میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ دماغ میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ اگلے ہولناک مناظر کی تاب لا سکتا۔ اس مرتبہ بھائی جان نے دیکھ لیا کہ میں جاگ گیا ہوں۔ وہ کرسی سے اُٹھ کر پلنگ پر آ کر بیٹھ گئے اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ لیا۔ ابا جی اپنی کرسی میرے سرہانے تک اُٹھا لائے اور بیٹھ کر میری طرف دیکھنے لگے۔

"سکندر!" بھائی جان نے آہستہ سے میرے کندھے کو دبایا۔ اُن کی آنکھیں کہہ رہی تھیں۔

"مجھے پہچانا، یا نہیں؟"

میرے دماغ میں پٹاخے سے پھٹنے لگے۔ وہ دونوں فضیلہ کو دفنا کر آئے تھے۔ رخسانہ کی موت پر بھی یہی ہوا تھا۔ مجھے ہسپتال میں چھوڑ کر انہوں نے اسے دفنا دیا تھا۔ اور اب فضیلہ کی موت پر ایک بار پھر اسی کہانی کو دہرایا گیا تھا۔

میں نے خشک آنکھوں سے بھائی جان کی طرف دیکھا۔ "میں کب سے یہاں ہوں؟"

بھائی جان نے مجھے جواب دینے کے بجائے گھوم کر آنکھوں ہی آنکھوں میں ابا جی سے پوچھا کہ بتاؤں یا نہ بتاؤں؟

ابا جی کا ہڈیوں بھرا ہاتھ میرے بالوں میں کنگھی کرنے لگا۔

"مجھے ہسپتال میں آئے ہوئے کتنے دن ہو چکے ہیں؟"

اچانک ابا جی نے فیصلہ کر لیا کہ جھوٹ بولنا ٹھیک نہیں ہے، صحیح بات بتا دینا چاہیے۔

"پرسوں پورے تین مہینے ہو جائیں گے۔"

"تین مہینے......؟" میں چیخ پڑا۔

ابا جی نے معصومیت سے اس طرح سر ہلایا، جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔

بھائی جان بولے۔ "خدا کا شکر ہے کہ اتنی جلدی تم نے ہمیں پہچاننا شروع کر دیا۔"

"اتنی جلدی؟" میرے منہ سے آہ نکل گئی۔ "اب تک تو اُس بدنصیب کی ہڈیاں بھی گل گئی ہوں گی۔"

اُن دونوں کی سمجھ میں نہیں آیا کہ میرا اشارہ کس کی طرف ہے۔

"اُسے کہاں دفن کیا ہے؟" میں نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔ "امی جی اور رخسانہ کے پاس یا دلدار خان صاحب کی ہدیرے میں؟"

قبرستان میں تقریباً ایک ہزار گز کے قطعہ زمین کو فضیلہ کے ابو ہدیرہ کہا کرتے تھے۔ اس کے اطراف میں مختصر سی چار دیواری تھی۔ وہاں صرف بازوزئی خاندان ہی کے افراد دفن کیے جاتے تھے۔ ایک بار میں نے لفظ ہدیرے کو لغت میں بھی تلاش کیا تھا، مگر یہ لفظ نہیں تھا۔ شاید پشتو کا لفظ تھا اور جس لغت میں، میں نے اُسے ڈھونڈا تھا، اُس کے مرتبین ناواقف تھے کہ اب یہ لفظ اُردو میں بھی مستعمل ہے۔

اچانک بھائی جان ہنس پڑے اور اُن کے ساتھ ابا جی کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ پھیل گئی۔

بھائی جان نے کہا۔ "فضیلہ کے بارے میں پوچھ رہے ہو؟"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"ہم نے نہ اُسے ماں جی اور رخسانہ کے پاس دفن کیا ہے اور نہ ہدیرے میں۔"

"پھر کہاں دفن کیا ہے؟"

بھائی جان مسلسل ہنس رہے تھے۔ کہنے لگے۔ "فضیلہ کو آبزرویشن کے لیے محفوظ کر لیا گیا تھا۔ آبزرویشن کا مطلب سمجھتے ہو؟"

دل چاہا کہ اُن کا منہ نوچ لوں۔ میری جان پر بنی ہوئی تھی اور انہیں اس وقت بھی مذاق کی سوجھی ہوئی تھی۔ پھر خیال آیا، شاید وہ درست کہہ رہے ہوں۔ ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ جس طرح ہماری سائنس ٹیچر کو اسکول کی لیبارٹری میں سانپوں، بچھوؤں، چھپکلیوں، گلہریوں، چوہوں کو الگ الگ جار میں، اسپرٹ میں ڈبو کر رکھنے کا خبط تھا، اسی طرح بھائی جان نے بھی فضیلہ کو بڑے سے جار میں تجربات و مشاہدات کے لیے محفوظ کر لیا ہو۔"

"سچ سچ بتائیے۔" میں نے چیخ کر کہا۔

"ہاشم تمہیں اصل بات بتانے سے گریز کر رہا ہے۔" ابا جی نے کہا۔ "تمہارے ڈاکٹر کا مشورہ ہے کہ تم سے ایسی کوئی بات نہ کی جائے، جو تمہارے لئے ناقابلِ برداشت ہو۔"

"میرے لیے بھائی جان کا مذاق ناقابلِ برداشت ہے۔"

بھائی جان بول اُٹھے۔ "میں مذاق نہیں کر رہا ہوں، تمہیں ایک بہت بڑی خبر سننے کے لیے تیار کر رہا ہوں۔"

"کیا کوئی خبر ایسی ہو سکتی ہے، جو فضیلہ کی موت سے بھی بڑی ہو؟" میں نے کہا۔ "اگر میں اس کی موت کی خبر برداشت کر سکتا ہوں تو کتنی ہی بڑی خبر کیوں نہ سنائیں، اسے بھی برداشت کر لوں گا۔"

"کچھ یاد ہے، تم نے فضیلہ کو آخری بار کب دیکھا تھا؟"

"کار میں۔" میں نے کہا۔ "وہ خون میں نہائی ہوئی دم توڑ رہی تھی۔ میں اُسے دم توڑتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ ساری زندگی میں نے خود کو اتنا بے بس اور مجبور محسوس نہیں کیا، جتنا اُس وقت کر رہا تھا۔"

"پھر کیا ہوا؟"

"پھر فضیلہ کی گردن ڈھلک گئی اور میں فرطِ غم سے بے ہوش ہو گیا۔"

"تم نے بے ہوش ہونے میں کچھ زیادہ ہی عجلت سے کام لیا۔ تمہیں بے ہوش نہیں ہونا چاہئے تھا۔"

میں بھائی جان کے چہرے کو تکنے لگا۔ وہ بدستور مسکرا رہے تھے۔ "اگر تم بے ہوش نہ ہوتے تو......" بھائی جان جملہ مکمل کرتے کرتے خاموش ہو گئے۔

"تو؟" میں نے پوچھا۔

بھائی جان نے اپنی بات کو دہراتے ہوئے کہا۔ "اگر تم بے ہوش نہ ہوتے تو تمہیں پتہ چلتا کہ فضیلہ کی نبض چل رہی تھی اور اُس کی گردن بہت زیادہ خون بہہ جانے کے باعث ڈھلک گئی تھی۔"

"وہ زندہ تھی؟" میرا جسم کانپنے لگا۔ "اُس وقت تک اُس نے دم نہیں توڑا تھا؟"

"ہاں...... وہ اُس وقت زندہ تھی۔" بھائی جان بولے۔ اُن کے ہونٹوں پر ایک بار پھر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ "اور اِس وقت تک زندہ ہے۔"

ایک زوردار گھونسہ تھا، جو میرے سینے پر لگا تھا۔ آنکھیں پھٹ گئیں۔ اندر کا سانس اندر، باہر کا باہر رہ گیا تھا۔ ابا جی نے سہارا دے کر میرا سر تکیے پر روکنے کی کوشش کی، مگر میں اگلے لمحے اُن کے بازوؤں سے نکل کر بیٹھ گیا۔

"فضیلہ زندہ ہے؟" میں نے لرزتے ہوئے پوچھا اور دل ہی دل میں دعا مانگی کہ جواب میں نہ ہو۔

"بیٹا!" ابا جی نے کہا۔ "جسے اللہ رکھے اُسے کون چکھے؟ اُس کی زندگی باقی تھی، موت کے منہ میں جا کر بھی زندہ نکل آئی۔"

مسرت کا اظہار کرنے کے بجائے مجھے ان دونوں پر غصہ آ گیا۔ "میں یہاں تین مہینے ہسپتال میں پڑا ہوں اور یہ خبر مجھے آج سنائی جا رہی ہے۔" میں نے بمشکل اپنے ہاتھوں کو بھائی جان کا گریبان پکڑنے سے روکا۔ "پہلے کیوں نہیں بتایا کہ فضیلہ زندہ ہے؟"

"ہزار بار بتایا لیکن تم ہوش میں کب تھے کہ ہماری سنتے؟" ابا جی نے پیار سے کہا۔

میرا غصہ دھیما پڑ گیا، دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں، پچھلے لہجے پر ندامت ہونے لگی۔

"آپ کا مطلب ہے کہ میں مسلسل تین ماہ تک بے ہوش رہا ہوں؟"

"ہاں۔" بھائی جان نے جواب دیا۔ "آج صبح پہلی بار تم نے ابا جی سے ہوش کی باتیں کی تھیں۔ اس ڈر سے کہ تمہارا مرض دوبارہ حملہ آور نہ ہو جائے، ہم نے تمہیں آہستہ آہستہ فضیلہ کی زندگی کی نوید سنائی ہے۔"

میرا دماغ سن ہوتا جا رہا تھا۔ تیزی سے دھڑکتا ہوا دل ایکا ایکی ڈوبنے لگا تھا۔ نظروں میں فضیلہ گھوم رہی تھی۔ اُس کا زرق برق منگنی کا جوڑا کئی جگہ سے پھٹ چکا تھا۔ سارے اعضاء خون کے دھبوں سے لالہ زار ہو رہے تھے اور اُس کا دایاں ہاتھ، جس میں دو انگوٹھیاں تھیں، بغل کے پاس سے غائب تھا۔

"فضیلہ کا ہاتھ......" میں نے تڑپ کر پوچھا۔ "فضیلہ کا ہاتھ؟"

بھائی جان نے ابا جی کی طرف دیکھا۔ "سکندر کو پچھلی باتیں یاد آ رہی ہیں۔"

ابا جی نے اثبات میں سر ہلا کر کہا۔ "یہ علامت ہے شفائے کاملہ و عاجلہ کی۔"

"بتایئے۔" میں نے عاجزانہ لہجے میں دریافت کیا۔ "اُس کے ہاتھ کا کیا ہوا؟"

"کیا تمہیں اس بات کی خوشی نہیں کہ فضیلہ زمین کا پیوند ہونے سے بچ گئی؟" ابا جی بولے۔

ابا جی کا استفسار ہی میرے سوال کا جواب تھا۔ فضیلہ اپنے ہاتھ سے محروم ہو گئی تھی۔ بھائی جان نے کہا۔ "کتابوں میں عورتوں کی بہادری کے متعدد واقعات پڑھے تھے، لیکن زندگی میں پہلی بار فضیلہ جیسی نڈر لڑکی اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے۔ جو خود کو مرد کہتے نہیں تھکتے، کنارے پر کھڑے مدد کے لئے چیختے چلاتے رہے، لیکن فضیلہ جان پر کھیل کر پانی میں گھس گئی اور اُس خوفناک بلا سے جو نورین کو گہرے پانی میں لیے جا رہی تھی، لپٹ گئی۔ زخمی تو نورین بھی ہوئی تھی، مگر اُس کے زخم ایسے نہیں تھے، جو مندمل نہ ہو پاتے۔ ساری دنیا فضیلہ کی عظمت و شجاعت کی معترف ہے۔ پاکستان کا شاید ہی کوئی ایسا اخبار ہو، جس میں اُس کی تصویر نہ چھپی ہو اور واشگاف الفاظ میں تعریف و توصیف نہ کی گئی ہو۔"

میرا سر گھوم رہا تھا مگر میں پلنگ سے اُتر کر کھڑا ہو گیا۔ "میں ابھی اور اسی وقت فضیلہ سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"بیٹھ جاؤ، سکندر!" ابا جی نے سخت لہجے میں کہا۔ "تمہیں اپنی بیماری کی شدت کا کوئی اندازہ نہیں ہے۔ خدا خدا کر کے آج تین ماہ کے بعد تم نے کچھ ہوش کی باتیں کی ہیں۔ ہم کوئی مول نہیں لے سکتے۔ جب تک تمہارے معالجین اجازت نہیں دیں گے، تم یہاں سے ایک قدم بھی باہر نہیں نکال سکو گے۔"

ڈاکٹروں نے مزید دس دن تک ہسپتال چھوڑنے کی اجازت نہیں دی۔ اُس جان لیوا مدت میں بے شمار معائنوں سے گزرنا پڑا۔ معائنوں سے فراغت ملتی تو طرح طرح کی دوائیں اور انجکشنوں کے ذریعے مکمل آرام وسکون کی خاطر مجھے گہری نیند سلا دیا جاتا۔

نیند کے دوران ایک بار پھر فضیلہ سے ملاقاتیں ہونے لگیں۔ عام زندگی میں وہ جتنی خوب صورت اور پیاری تھی، اتنی ہی خوب صورت اور پیاری خوابوں میں بھی نظر آتی تھی۔ ایک بار امی جی اور رخسانہ بھی خواب میں آئیں۔ دونوں نے دل کھول کر فضیلہ کو پیار کیا۔ فضیلہ تو ہمیشہ ہی سے امی جی کی لاڈلی تھی۔ گھر میں کوئی اچھی چیز پکاتی تھیں تو جب تک فضیلہ کو نہیں کھلا لیتی تھیں، انہیں چین نہیں ملتا تھا اور رخسانہ نے بھی اپنی مختصر سی زندگی میں جس کو سہیلی بنایا تھا، وہ فضیلہ ہی تھی۔

ایک بار سو کر اُٹھا تو سرہانے کی میز پر سموسے رکھے ہوئے نظر آئے۔ میل نرس نے بتایا کہ فضیلہ کے امی ابو آئے تھے، مجھے دیکھنے کے لیے۔ میں گہری نیند سو رہا تھا اور نیند میرے علاج کا لازمی حصہ تھی۔ اس لیے دونوں کچھ دیر میرے پاس بیٹھے، پھر فضیلہ کی امی نے میرے ماتھے پر بوسہ دیا، میز کی پلیٹ میں سموسے رکھے اور شوہر کے ساتھ گھر واپس چلی گئیں۔ اُنہیں علم تھا کہ مجھے اُن کے بنائے ہوئے سموسے بہت اچھے لگتے تھے۔

میری دیکھ بھال کے لیے جو نرس مقرر کیے گئے تھے، اُن میں سے ایک کا نام تو یاد نہیں رہا، دوسرے کا نام سعید خان تھا۔ سعید خان مجھ سے کافی بے تکلف ہو گیا تھا۔ اگر کبھی میں جاگتا ہوتا یا میرا معائنہ نہ ہو رہا ہوتا تو وہ میرے پاس بیٹھ جاتا اور اپنے قصے سنانے لگتا۔ وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہتا تھا۔ لیکن والد کی موت کے بعد والدہ اور چار بہن بھائی کا بوجھ اُس کے کندھے پر پڑا تھا۔ سب سے پہلے اسی نے مجھے بتایا کہ میں ذہنی ہسپتال میں ہوں۔ پھر تشریح کرتے ہوئے کہا کہ پاگل خانے کو مہذب الفاظ میں ذہنی ہسپتال کہا جاتا ہے۔ اُس کا کہنا تھا کہ پاگلوں کو نیند نہیں آتی۔ جب کسی پاگل کو نیند آنے لگے تو سمجھ لو کہ وہ پاگل نہیں رہا۔ جتنی زیادہ نیند آئے گی، اتنی زیادہ دیوانگی ختم ہو جائے گی۔

سعید خان کے نزدیک چونکہ چوبیس گھنٹوں میں مجھے اٹھارہ اُنیس گھنٹوں تک نیند آتی تھی اس لیے میرا پاگل پن ختم ہو چکا تھا۔ ڈاکٹر صاحبان اپنی اہمیت جتانے کے لیے یا مرض کو جڑ سے ختم کرنے کے لیے ایک قسم کی "لیپا پوتی" کر رہے ہیں۔

خوف ناک ترین بات یہ تھی کہ مجھے ترشولی سے نجات مل گئی تھی۔ فضاؤں میں تیرتے ہوئے سائے محسوس ہوتے تھے نہ سرسراہٹوں کا احساس ہوتا تھا۔ جب میں نے ہوش کی باتیں کی تھیں، اپنے قریب آنے والوں کو پہچاننا شروع کیا تھا، تب دونوں کے ساتھ مجھے چہل قدمی کے لیے جانے لگا۔ میں نے ہسپتال کو بھی مدرسہ سمجھ رکھا تھا۔ خیال تھا کہ جس طرح مدرسے میں ترشولی

اور دوسرے سایوں کا گزر نہیں ہو سکتا تھا، اسی طرح ہسپتال کے دروازے بھی ان کے لئے بند ہوں گے۔ لیکن چہل قدمی کے لیے پارک تک آنا جانا شروع کیا تو احساس ہوا کہ میرا خیال غلط تھا۔ ہسپتال کے باہر بھی نہ ترشولی تھی اور نہ سائے تھے اور نہ کسی قسم کی کوئی سرسراہٹ تھی۔ اور یہ بات یقیناً باعثِ تشویش تھی۔

دشمن نظروں سے دُور ہو جائے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ وہ اپنی شکست تسلیم کر کے فرار ہو گیا ہے۔ جنگ کی حکمت عملی کے مطابق وہ خاموشی سے حملے کی تیاریوں میں لگا ہوتا ہے اور غافل پا کر اچانک ٹوٹ پڑتا ہے۔ ترشولی اس سے بھی زیادہ خطرناک ترین دشمن تھی۔ اس نے ہمیشہ نہتوں اور کمزوروں پر پیٹھ کے پیچھے سے حملے نہیں کیے تھے۔ یہ جان کر کہ فضیلہ زندہ بچ گئی ہے، وہ لازمی طور پر چوٹ کھائی ہوئی ایک شیرنی بن چکی ہو گی، جس کے شکار کو اُس سے چھین لیا گیا ہے۔

ذہنی ہسپتال میں زیادہ سے زیادہ سلایا جاتا تھا۔ اور کچھ سوچنے سمجھنے اور غور کرنے کے کم سے کم مواقع فراہم کیے جاتے تھے۔ میرے تصور کا اصل محور فضیلہ تھی۔ اُس کی یاد تو کبھی کبھی اتنا ستاتی تھی کہ سینے میں ٹیسیں اُٹھنے لگتی تھیں۔ لیکن شام کو جب دونوں نرسوں کے ساتھ پارک تک جاتا تو ہسپتال سے باہر نکلتے ہی ترشولی اس کی جگہ لے لیتی تھی۔ میں سوچنے لگتا تھا کہ فضیلہ کے ہمراہ پیار بھری، پُرسکون زندگی صرف اسی وقت گزاری جا سکتی ہے، جب ترشولی جیسی مکار اور خونخوار دشمن سے ہمیشہ کے لیے نجات حاصل کر لی جائے۔ اُس کے ہوتے ہوئے پھولوں کی سیج بھی کانٹوں کا بستر تھی۔

میری خواہش تو یہ تھی کہ یا تو اگلے حملے سے قبل ہی اُس کا وجود ختم ہو جائے یا ایسا ہو کہ جب وہ اگلا حملہ کرے تو مجھے نہتا اور غافل نہ پائے۔ میں ایسے ہتھیاروں سے اچھی طرح لیس ہو جانا چاہتا تھا، جو اُس سے مقابلہ کرنے کے لئے ضروری تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ ہتھیار سمندر کے درمیان چھوٹے جزیرے پر راج کنڈل نامی مندر میں موجود سادھو سے حاصل کیے جا سکیں گے۔ جس کا دعویٰ تھا کہ پورے سنسار میں اُس کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں ہے، جو مجھے میری خوشیوں کے دشمن سے نجات دلا سکے۔ میں پہلی ملاقات میں اُس کی روحانی قوت کا قائل ہو چکا تھا۔ اُس کی جنبش ابرو سے زمین نے میرے پاؤں پکڑ لیے تھے اور جب تک اُس نے اجازت نہیں دی تھی، وہاں کو زمین نے نہیں چھوڑا تھا۔

دسویں روز ابا جی کے بجائے بھائی جان اور نورین ہسپتال آئے تھے۔ ڈاکٹروں سے ملنے کے بعد اُنہوں نے مجھے یہ خوشخبری سنائی کہ گھر چلنے کی اجازت مل گئی ہے۔ ابا جی کی زبانی ایک روز قبل ہی معلوم ہو گیا تھا کہ اجازت مل جائے گی۔ اس لیے وہ دونوں میرے لئے ریڈی میڈ پینٹ

اور بش شرٹ لے کر آئے تھے۔ خوشخبری سنا کر بھائی جان ہسپتال کے باہر فٹ پاتھ پر بیٹھنے والے ایک حجام کو بلا لائے، جس نے میرے بال تراشے اور شیو بنایا۔ ہسپتال کے اس باتھ روم میں، جو ڈاکٹروں کے لئے مخصوص تھا، غسل کر کے میں نے نئے کپڑے پہنے اور عرصہ دراز کے بعد آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھا۔

آئینے میں جو چہرہ مسکراتا ہوا دیکھا، وہ اس چہرے سے بالکل مختلف تھا، جس سے میں واقف تھا۔ آخری بار میں نے جس چہرے کو دیکھا تھا، اس کی ٹھوڑی اور ناک کے نیچے کا سارا حصہ سخت و سیاہ روئیں سے پُر تھا۔ شیو کے بعد ایسا صاف ستھرا نکھرا چہرہ نکل آیا تھا کہ آئینے کے بجائے فوٹو دیکھتا تو یہی کہتا کہ شکل جانی پہچانی معلوم ہو رہی ہے، لیکن یاد نہیں آ رہا ہے کہ اس پُرکشش نوجوان کو کب اور کہاں دیکھا ہے۔

ابا جی نے فضیلہ کے گھر والوں کے علاوہ کسی پڑوسی کو میری آمد سے مطلع نہیں کیا تھا۔ اس لیے جب میں گھر پہنچا تو میرا استقبال صرف تین افراد نے کیا۔ ایک ابا جی اور دوسرے دو فضیلہ کے امی ابو۔ فضیلہ کے ابو نے داڑھی رکھ لی تھی۔ ٹخنوں سے اُونچی شلوار تھی۔ ہاتھ میں تسبیح تھی، جس کے دانے صرف گفتگو کے دوران گرنا بند ہوتے تھے۔ فضیلہ سے اُنہیں بے پناہ محبت تھی۔ حادثے کے بعد مصلّٰی لے کر اس ہسپتال کے برآمدے میں جہاں فضیلہ زیر علاج تھی، جا پڑے تھے اور دن رات فضیلہ کے لئے دعائیں مانگا کرتے تھے اور اپنے اوپر کھانا پینا حرام کر لیا تھا۔

تین روز بعد جب فضیلہ گفتگو کرنے کے قابل ہوئی اور ڈاکٹر نے قسمیں کھا کھا کر یقین دلایا کہ فضیلہ زندہ رہے گی، تب کہیں کھانا پینا شروع کیا۔ لیکن برآمدے سے مصلّٰی ایک ماہ بعد اس وقت اُٹھایا، جب فضیلہ صحت یاب ہو گئی، اپنے کمرے سے نکلی اور ان سے گھر چلنے کے لئے کہا۔ گھر پہنچ کر فضیلہ نے غسلِ صحت کیا تو اس کی امی نے انہیں بھی شیو کا سامان دیا۔ لیکن انہوں نے یہ کہہ کر شیو کرنے سے انکار کر دیا کہ مجھے اپنے اللہ میاں سے شرم آتی ہے۔ اور اس دن کے بعد وہ باقاعدہ باریش ہو گئے۔

فضیلہ کے ابو کی یہ کہانی فضیلہ کی امی نے اُنہی کی موجودگی میں سنائی۔ وہ خاموشی سے کھڑے سنتے رہے اور سر ہلاتے رہے۔ کہانی ختم ہوئی تو اُنہوں نے کہا۔

"خدانخواستہ اگر فضیلہ کو کچھ ہو جاتا تو میں زندہ نہ بچتا اور سکون تو مجھے اس وقت تک نہیں ملے گا، جب تک فضیلہ ایک ہاتھ سے محروم رہے گی۔ میں ہر قیمت پر اس کی یہ کمی دُور کر دوں گا، چاہے اس کے لیے مجھے اپنا سب کچھ داؤ پر لگانا پڑے اور چاہے اپنا ہاتھ ہی کیوں نہ دینا پڑے۔"

"تمہیں علم ہے کہ فضیلہ اپنے داہنے ہاتھ سے محروم ہو چکی ہے۔ اگرچہ فضیلہ کے ابو جی پُر امید ہیں کہ مصنوعی ہاتھ لگ سکے گا، مگر میں نے شہر کا کوئی ڈاکٹر ایسا نہیں چھوڑا، جس سے

نہ کیا ہو۔ سب کا یہی کہنا ہے کہ فضیلہ کا ہاتھ جس جگہ سے کٹا ہے، وہاں مصنوعی ہاتھ تو درکنار کوئی ایسی راڈ بھی نہیں ڈالی جا سکتی، جو بائیں ہاتھ کی معاونت کر سکے۔ فضیلہ کے ابو جو چاہیں کہیں، حقیقت یہ ہے کہ فضیلہ ساری زندگی اپنے ہاتھ سے محروم رہے گی۔"

مجھے نورین اور بھائی جان کے ذریعے معلوم ہو چکا تھا کہ فضیلہ ہمیشہ کے لیے ہاتھ سے محروم ہو گئی ہے۔ لیکن فضیلہ کے ابو کی طرح میں بھی اسی خوش فہمی میں مبتلا تھا کہ سائنس کی برکات کے باعث وہ ہمیشہ ہاتھ کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ میں نے ایک ایسے شخص کو دیکھا تھا، جس کی ایک ٹانگ لکڑی کی تھی اور بہت ہی معمولی طور پر لنگڑا کر چلتا تھا۔ اُسے دیکھ کر کسی کو بھی خیال نہیں آتا تھا کہ اس کی ٹانگ مصنوعی ہے۔ مگر فضیلہ کی امی کہہ رہی تھیں اور صاف ظاہر تھا کہ جھوٹ نہیں کہہ رہی تھیں کہ فضیلہ کو باقی زندگی ہاتھ کے بغیر گزارنا پڑے گی۔

"میں جتنا فضیلہ کو چاہتی ہوں، اتنا ہی تمہیں بھی چاہتی ہوں۔" انہوں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "اُس کی زندگی جہنم بن گئی ہے۔ اُسے اپناؤ گے تو خود کو بھی جہنم رسید کر لو گے۔ میری خواہش ہے کہ اس سلسلے میں جو بھی فیصلہ کرو، خوب سوچ سمجھ کر کرو۔ دو چار دن کی بات نہیں ہے کہ جیسے تیسے گزارہ کر لو گے۔ ساری زندگی کا سودا ہے۔ لڑکیوں کی کمی نہیں ہے کہ تم ایک لاچار لڑکی سے رشتہ کرنے پر مجبور ہو جاؤ۔ اس وقت کا انکار اس اقرار سے کہیں زیادہ بہتر ہو گا، جس کے باعث تم دونوں کو ہمیشہ رونا پڑے۔"

"اگر میں انکار کر دوں تو فضیلہ کو دُکھ نہیں ہو گا؟"

"یقیناً ہو گا۔ لیکن وہ بہادر لڑکی ہے، خندہ پیشانی سے اس دکھ کو برداشت کر لے گی۔"

"لیکن میں اتنا بہادر نہیں ہوں کہ میں اُس سے دستبردار ہونے کا دکھ برداشت کر سکوں۔" میں نے کہا۔ "آپ چاہتی ہیں کہ میں فضیلہ کو چھوڑ کر ایک بار پھر پاگل ہو جاؤں؟"

"خدا نہ کرے۔"

"امی......" میں نے کہا۔ "شاید آپ کو یاد نہیں رہا، میری منگنی فضیلہ سے ہوئی ہے، اُس کے ہاتھ سے نہیں۔"

اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "جس وقت تمہاری منگنی کی رسم ادا ہوئی، اس وقت تک فضیلہ ہاتھ سے محروم نہیں تھی۔ پہلے سے محروم ہوتی تو نہ تمہارے ابا جی اور بھائی جان اُسے تمہارے لیے پسند کرتے، نہ تم اُس سے منگنی کرتے۔"

"اگر منگنی سے پہلے مجھ پر وہ جنونی کیفیت طاری ہوتی، جس کی وجہ سے مجھے ہسپتال میں تین سال سے زیادہ کا عرصہ گزارنا پڑا ہے تو کیا آپ اور انکل میری منگنی فضیلہ کے ساتھ کر دیتے؟" میں نے کہا۔ "یوں ہوتا تو یوں ہوتا، یوں نہ ہوتا تو یوں ہوتا، میں کیا رکھا ہے؟ جو ہونا تھا، سو ہو چکا۔

جہاں تک فضیلہ کا تعلق ہے، وہ جیسی بھی ہے، مجھے دل و جان سے زیادہ عزیز ہے۔ بلکہ ایک طر
سے دیکھا جائے تو میرے دل میں کئی گنا اُس کی قدر بڑھ گئی ہے۔ دنیا میں ایسے لوگ کم ہی ہو
گے جو دوسروں کو بچانے کے لیے اپنی جان پر کھیل جائیں۔ سوال صرف یہ ہے کہ آیا فضیلہ ایک
ایسے شخص کو، جو ایک حادثے کی تاب نہ لا کر اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھا تھا، اب بھی پسند ہے یا نہیں؟"

"وہ زبان سے کچھ نہیں کہتی۔ لیکن میں اُس کی ماں ہوں، اُس کے دل کی کیفیت مجھ سے
زیادہ کون سمجھ سکتا ہے؟ سچ تو یہ ہے کہ وہ جی ہی جی میں دن رات تمہارے ہی نام کے وظیفے پڑھ
رہتی ہے۔"

"جب ہم دونوں ایک دوسرے کو اپنی تمام تر خامیوں اور کمزوریوں کے باوجود پسند کر
ہیں تو اس فیصلے پر جو آپ لوگ منگنی کی صورت میں کر چکے ہیں، نظرثانی کی کوئی گنجائش نہیں۔"
نے پُرعزم لہجے میں کہا۔ "میں فضیلہ سے ملنا چاہتا ہوں، امی!"

پہلے تو اُنہوں نے انکار کیا، خاندانی روایات کا حوالہ دیا، پاس پڑوس والوں کی چہ مگو
سے ڈرایا، لیکن میری ضد کے آگے اُن کی ایک نہ چلی۔ بہت جلد مجھے فضیلہ سے ملوانے پر تیا
گئیں۔ شاید وہ بھی یہی چاہتی تھیں کہ آخری فیصلہ کرنے سے پہلے ایک نظر دست بریدہ فضی
دیکھ لوں۔

"میں جا کر ابھی اُسے تمہاری آمد سے مطلع کرتی ہوں۔" اُنہوں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"نہیں امی!" میں نے کہا۔ "اُسے اطلاع دینے کی ضرورت نہیں۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں
مجھے اچانک دیکھ کر اُس کا ردِعمل کیا ہوتا ہے۔"

وہ مجھے گھر میں لے گئیں۔ فضیلہ کے کمرے کے باہر سے اُنہوں نے آواز دی۔ "مس
باہر آنا۔"

جو سسٹر، فضیلہ کے کمرے سے باہر نکلی اُسے دیکھتے ہی بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

"تم یہاں؟"

"ارے سکندر! تم؟" نرس نے ہنستے ہوئے کہا۔ "بولتے نہیں تو میں تمہیں پہچان ہی نہ

"امی!" میں نے کہا۔ "یہ سسٹر لوسی ہیں۔ رخسانہ کی موت کے بعد مجھے جس ہسپتال
گیا تھا، یہ اُس میں ملازمت کرتی تھیں۔ پھر ان کی شادی ہو گئی اور یہ چلی گئیں۔ اب
کے لئے آئی ہو؟"

"مستقل۔" لوسی نے کہا۔ "میری اور جان کی علیحدگی ہو گئی ہے۔"

"کیوں؟"

"یہ لمبی کہانی ہے، پھر کبھی سناؤں گی۔" اُس نے جواب دیا۔ پھر فضیلہ کی امی

ہوئی۔ "آپ نے مجھے آواز دی تھی؟"

"فضیلہ کیا کر رہی ہے؟"

"ابھی ابھی لیٹی ہے۔" پھر وہ اُچھل پڑی۔ "اوہو! تو تم وہی سکندر ہو، جس کی باتیں کرتے ہوئے فضیلہ کبھی نہیں تھکتی؟"

"جاؤ۔" فضیلہ کی امی نے کہا۔

"گڈ لک، سکندر!" لوسی نے زیرِلب مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

اچانک میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ نرس کی موجودگی بے معنی نہیں تھی۔ آہستہ سے دروازہ کھولا، اندر گیا، دروازہ بند کیا۔ سامنے مسہری پر فضیلہ لیٹی تھی۔ آنکھیں بند تھیں، سنہرے بال تکیے پر بکھرے پڑے تھے، چہرے پہلے سے کہیں زیادہ دلکش اور جاذبِ نظر ہو گیا تھا۔ آنکھیں ہٹائے نہیں ہٹ رہی تھیں۔

اُس نے بے نیازی سے آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھا، اگلے ہی لمحے ایک ہلکی سی چیخ کے ساتھ اُچھل کر بیٹھ گئی اور میرے چہرے پر حیران و پریشان نظریں گاڑ دیں۔ میں اُس کے سامنے کھڑا رہا اور مسکراتا رہا اور اُس کے سراپا کا جائزہ لیتا رہا۔ مجھے وہ الفاظ نہیں مل رہے تھے، جن کے ذریعے اُس کو مخاطب کیا جاتا۔

دیکھتے ہی دیکھتے فضیلہ کے گلابی ہونٹ تھرتھرانے لگے۔ رخسار انگاروں کی طرح دہک اُٹھے اور آنکھوں سے ساون بھادوں کی طرح جھڑی لگ گئی۔

میرے لئے کھڑا ہونا مشکل ہو گیا۔ ایک ہی جست میں، میں اُس کے پاس جا بیٹھا، اُس کے سر کو سینے سے لگا لیا اور اپنا چہرہ اُس کے سنہرے بالوں پر رکھ لیا۔ کئی سیکنڈ ہم گردوپیش سے بے خبر اسی طرح بیٹھے رہے۔ فضیلہ دل کھول کر رو چکی تھی اور سسکیاں قدرے مدھم ہوئیں تو پیٹھ کو آہستہ آہستہ تھپتھپاتے ہوئے میری نظر فضیلہ کی دائیں آستین پر پڑی، جو اندر سے خالی تھی اور جھول رہی تھی۔ دل پر گھونسہ سا لگا۔ میں نے پیار کے ساتھ اپنے سینے سے اُس کا سر ہٹایا اور اُس کی آنسوؤں بھری بڑی بڑی آنکھوں میں جھانکتا ہوا بولا۔

"فضیلہ!........ فضیلہ! میری فضیلہ!" اور دوبارہ اُسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ الفاظ کا سارا ذخیرہ ذہن سے نکل چکا تھا۔ یاد ہی نہیں آ رہا تھا کہ فضیلہ کے علاوہ بھی کچھ اور زبان سے ادا کیا جا سکتا ہے۔

اسی حال میں تقریباً ایک منٹ اور گزر گیا۔ گفتگو کی پہل فضیلہ نے کی۔ اُس نے سینے سے سر اُٹھا کر کندھے پر رکھ لیا اور اپنی اسی شیریں آواز میں، جس کے سامنے موسیقی بھی ماند تھی، آہستہ سے بولی۔ "یوں لگ رہا ہے، جیسے کوئی خواب دیکھ رہی ہوں۔ اور ڈر رہی ہوں کہ کہیں یہ خواب

ٹوٹ نہ جائے۔"

"ہاں فضیلہ!" میں نے کہا۔ "معلوم تو ایسا ہی ہو رہا ہے، گویا خواب ہے یہ سب کچھ۔ لیکن تم بھی جانتی ہو اور میں بھی جانتا ہوں کہ یہ خواب نہیں ہے، حقیقت ہے۔ قسمت نے کبھی جدا نہ ہونے کے لیے ہمیں ایک بار پھر یکجا کر دیا ہے۔"

وہ روتی ہوئی میرے بازوؤں سے نکل گئی۔ "کیا آپ مجھے، کٹی ہوئی لڑکی کو، جو اپنے کاموں کے لیے ایک نرس کی محتاج ہو کر رہ گئی ہے، اب بھی اپنانا چاہتے ہیں؟"

میں نے اُس کے آنسو خشک کیے۔ "کیونکہ تم فضیلہ ہو۔ اور فضیلہ سے مجھے محبت ہے۔ اس محبت میں کوئی کمی نہیں آئی ہے، بلکہ عقیدت بھی شامل ہو گئی ہے۔ بازو کی قربانی دے کر تم نے ایک انسانی زندگی بچائی ہے۔ تم تو اس قابل ہو کہ تمہاری پوجا کی جائے۔"

"پجارن تو میں ہوں آپ کی۔ میری خاطر آپ بہکی بہکی باتیں کرنے لگے تھے۔ کسی کو پہچانتے ہی نہیں تھے۔ بس مجھ کو ہی یاد کرتے رہتے تھے۔" اُس نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔ "اب کیسی طبیعت ہے؟"

"تمہارے سامنے ہوں....... دیکھ لو۔"

وہ مجھے دیکھنے لگی، میں اُسے دیکھنے لگا۔ کمرے میں دوبارہ روشنی طاری ہو گئی۔ جذبات کی اتنی زیادہ فراوانی تھی کہ ہم مسلسل ایک دوسرے کو آنکھوں میں آنکھیں ڈالے تک رہے تھے۔ کسی بھی طرح سیری نہیں ہو رہی تھی۔ ہماری زبانیں گنگ سی ہو کر رہ گئی تھیں۔ اسی محویت کے عالم میں، میں نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے اس کی لرزتی ہوئی آستینیں ہٹا کر زخم دیکھا۔ زخم بھر تھا۔ اُس پر لپٹی ہوئی پٹیاں اُتاری جا چکی تھیں۔ بغل کے نیچے تک گہرے پیلے رنگ کے پھا لگے تھے اور زخم بالکل ویسا ہی قلم کی طرح ترشا ہوا تھا، جیسا میں نے رخسانہ، خفا، ڈر جیکسن پولیس آفیسر کے جسموں پر دیکھا تھا۔ فضیلہ کے پھاہوں کو چھوٹا سا پیار کر کے میں نے شا قمیص پہلے ہی کی طرح کر دی۔ آستین حسبِ سابق جھولنے لگی۔ میری خوش قسمتی تھی کہ ف فوری طبی امداد مل گئی تھی۔ ورنہ اس سے قبل ترشولی نے جتنے بھی شکار کیے تھے، ان میں بھی نہیں بچ سکا تھا۔

"فضیلہ!" میں نے اُس کے بالوں کے سنہرے ریشم سے کھیلتے ہوئے کہا۔ "مجھے پو بتاؤ، پکنک کی اُس منحوس شام کو میری غیر موجودگی میں کیا ہوا تھا؟"

"میں ریت پر بچھی ہوئی دری پر بیٹھی ہوئی تھی۔ بھائی جان اور نورین باجی ہاتھ ڈالے کنارے پر ٹہل رہے تھے۔ پانی کی لہریں اُن کے پیروں کو چھو رہی تھیں اور نورین با سے ہنس کر بھائی جان کو پکڑ لیتی تھیں۔ اُن دونوں پر میری نظریں مرکوز تھیں اور میں اُن

دیکھ کر خوش ہو رہی تھی۔ پھر اچانک بھائی جان کے منہ سے بھیانک چیخ نکلی۔ وہ بری طرح چیختے ہوئے دیوانہ وار خشکی کی طرف بھاگے۔ میں اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس وقت اُس ترشولی نے، جسے اسکول سے واپس آتے ہوئے میں اندھیرے میں دیکھ چکی تھی۔ نورین باجی کو بالوں سے پکڑ رکھا تھا اور اُنھیں کھینچتی ہوئی پانی میں لیے جا رہی تھی۔ نورین باجی چلا رہی تھیں اور رو رہی تھیں اور اپنے بالوں کو اُس سے چھڑانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ کنارے پر پکنک پر جانے والے لڑکوں لڑکیوں کے علاوہ اور بھی بہت سے لوگ کھڑے تھے اور تقریباً سبھی کے منہ سے ڈری ڈری آوازیں نکل رہی تھیں، لیکن کسی کی اتنی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ پانی میں جا کر نورین کو اس عورت سے چھڑانے کی کوشش کرتا۔

مجھ سے وہ منظر نہیں دیکھا گیا۔ میں پانی میں گھس گئی۔ پہلے نورین باجی کی ٹانگیں پکڑ کر اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کی۔ لیکن جب ترشولی نے اُنھیں نہیں چھوڑا تو میں ٹانگیں چھوڑ کر اُس عورت سے لپٹ گئی اور اُسے دانتوں سے کاٹنے اور ناخنوں سے نوچنے لگی۔ میری کوشش بار آور ہوئی۔ اُس نے نورین باجی کو چھوڑ دیا اور میرے بال پکڑ لیے۔ اس اثناء میں نورین باجی بھاگ کر کنارے پر جا چکی تھیں۔ لیکن جیسا کہ اُنہوں نے خود بتایا کہ وہ اتنی زخمی ہو گئی تھیں کہ زیادہ دُور جانے کے بجائے کنارے پر پہنچتے ہی گر گئیں۔ میں اپنے بال چھڑانے کے لیے اُس عورت سے لپٹی ہوئی تھی کہ اچانک اُس کا دوسرا ہاتھ بلند ہوا اور پلک جھپکتے ہی اُس نے تیز دھار ہتھیار کی شکل اختیار کر لی۔ اس سے پہلے کہ میں اپنے آپ کو اس ہتھیار سے بچانے کی کوشش کرتی، وہ میرے بازو پر پڑا اور میرے جسم میں یخ بستہ لہری دوڑتی محسوس ہوئی۔ مگر یہ احساس نہیں ہوا کہ میرے ہاتھ کو کاٹا جا چکا ہے۔ ادھر اُس نے میرے بال چھوڑے اور ادھر میں نے کنارے کی طرف بھاگنا شروع کر دیا۔ کنارے تک جانے سے قبل میرے قدم لڑکھڑانے لگے اور میں وہیں پانی میں گر کر بے ہوش ہو گئی۔ ہوش آیا تو میں نے اپنے آپ کو ہسپتال میں اس حال میں پایا کہ بغل کے پاس سے میرا ہاتھ غائب ہو چکا تھا۔"

"حادثے کی تفتیش تو ضرور کی گئی ہو گی۔" میں نے پوچھا۔ "اور تمہارے بیانات بھی لیے گئے ہوں گے۔"

"بس، واجبی سی کارروائی ہوئی تھی۔ جو قصہ میں نے تمہیں سنایا، اُنہیں بھی وہی سنایا تھا۔ ترشولی کے نام پر سب ہنس پڑے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ کوئی مگرمچھ یا مچھلی وغیرہ راہ بھٹک کر ادھر آ گئی تھی اور شام کے اندھیرے میں مجھے اور نورین باجی کو ایسا محسوس ہوا تھا۔ سنا ہے اُنہوں نے سمندر میں کئی میل تک اُس مگرمچھ کو تلاش بھی کیا تھا۔"

"لیکن مگرمچھ کسی کو بالوں سے پکڑ کر تو اپنی طرف نہیں کھینچتا۔ نہ کسی کے بازو کو اس طرح قطع

کرتا ہے۔"

"یہ بات تو انہیں سوچنا چاہئے تھی، جو تفتیش کے لیے آئے تھے۔" فضیلہ ایک بار پھر منہ بسورنے لگی۔ "ہاتھ کے بغیر بھی بھلا کوئی زندگی ہے؟ کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ میں نے اس ترشولی کا کیا بگاڑا تھا کہ اس نے مجھے ہاتھ سے محروم کر دیا۔ میں نے اس کا ایسا کون سا جرم کیا تھا، جس کی پاداش میں اس نے اتنی بڑی سزا مجھے دی تھی؟"

"سزا تمہیں نہیں، مجھے دی گئی تھی۔" میں نے جواب دیا۔ "جرم تم نے نہیں، میں نے تمہیں اپنی خوشیوں کا مرکز بنا کر کیا ہے۔ ترشولی آج سے نہیں، ہمیشہ سے میری خوشیوں کی دشمن ہے۔ وہ مجھے خوش ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔"

اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔ "فضیلہ!......سکندر......!" مسز لوسی نے کہا لیکن وہ اندر نہیں آئی۔

اور تب فضیلہ سنبھل کر بیٹھ گئی۔ تکیے سے ٹیک لگالی۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کے بکھرے بالوں کو ٹھیک کیا اور دوپٹہ جو نجانے کب اور کس طرح فرش پر جا پڑا تھا، اٹھا کر اس کے شانوں پر ڈال دیا۔

"آ جاؤ سسٹر!" میں نے با آواز بلند کہا۔ "تم اس طرح پوچھ رہی ہو جیسے تمہارا اندر آنا منع ہو۔" لوسی مسکراتی ہوئی اندر آ گئی۔

"ملاقات کا وقت ختم ہوا۔" اس نے فضیلہ کے پاس بیٹھ کر مجھ سے کہا۔ "جس وقت تم آئے تھے، تمہارا چہرہ ایک دم مرجھایا ہوا تھا۔ لیکن اس وقت تازہ کھلے ہوئے گلاب کی طرح تروتازہ رہا ہے۔"

"شکریہ سسٹر!" میں نے جواب دیا۔ "تم کہہ سکتی ہو کہ فضیلہ نے مجھ پر جادو کر دیا ہے۔"

"میرے خیال میں تو تم دونوں نے ہی ایک دوسرے پر جادو کیا ہے۔" اس نے ہنستے ہوئے فضیلہ کی طرف دیکھا۔ "آئینہ لاؤں؟"

"آئینہ کس لئے؟" فضیلہ نے پوچھا۔

"تاکہ دیکھ سکو کہ تمہارا حسن کتنا نکھر گیا ہے۔"

فضیلہ کا چہرہ لال بھبھوکا ہو گیا۔

"جاؤ سکندر!" لوسی نے مجھے مخاطب ہو کر کہا۔ "اب کس لیے بیٹھے ہو؟"

"جانے کو دل نہیں چاہ رہا، سسٹر!" میں فضیلہ کی طرف دیکھتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ "خدا حافظ فضیلہ! دیکھو، اگلی ملاقات کب ہوتی ہے۔"

اس نے ہاتھ کے اشارے اور جنبش لب کے ساتھ مجھے خدا حافظ کہا۔

میں باہر نکلا تو فضیلہ کی امی میری منتظر تھیں۔ انہوں نے چائے کے علاوہ میرے لئے گرم گرم سموسے تیار کرائے تھے۔ ہسپتال میں بھائی جان اور نورین نے مجھے بہت تگڑا ناشتہ کرایا تھا۔ پیٹ بھرا ہوا تھا، لیکن میں انکار نہیں کر سکا اور کھانے کی میز پر جا بیٹھا۔

"امی!" میں نے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ "ماشاء اللہ فضیلہ آسانی سے گھر میں گھوم پھر سکتی ہے۔ پھر آپ نے اُسے کمرے میں کیوں قید کر رکھا ہے؟"

"میں نے نہیں، اُس نے خود ہی اپنے آپ کو قید کر رکھا ہے۔ رونے کے علاوہ کوئی کام ہی نہیں تھا۔ مگر میں سمجھتی ہوں کہ تمہارے آنے سے تھوڑی بہت تبدیلی ضرور آئے گی اور اب وہ زیادہ عرصے تک کمرے میں بند نہیں رہے گی۔"

"مسز چوبیس گھنٹے اُس کے پاس رہتی ہے؟"

"ہم نے تو صرف دن دن کی بات کی تھی، لیکن اُس نے کہا کہ اگر ہم اُسے ایک کمرہ دے دیں تو وہ اسی قیمت پر رات دن فضیلہ کی خدمت کرنے کو تیار ہے۔ بہت دُکھی ہے بے چاری۔ ماں باپ نہیں ہیں، شادی کے بعد شوہر کے ساتھ چلی گئی لیکن دونوں کی بنی نہیں۔ وہ بیوی سے ہیروئن کا دھندا کرانا چاہتا تھا۔ اس نے صاف انکار کر دیا کہ میں مریضوں کی خدمت کر کے انہیں اچھا بھلا بناتی ہوں، اچھے بھلوں کو مریض نہیں بناتی۔"

"امی!" میں نے اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے کہا۔ "آپ کو علم ہے کہ مجھ پر جنونی کیفیت کیوں طاری ہوئی تھی؟"

"جانتی ہوں بیٹا!" انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔ "تم یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ خدانخواستہ فضیلہ ختم ہو گئی ہے۔"

"بات عجیب سی ضرور ہے۔ امی جان زندہ ہوتیں تو شاید براہ راست کہنے کی نوبت نہ آتی۔ آپ چاہیں تو مجھے بے شرم کہہ لیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں فضیلہ سے زیادہ مجھے کوئی عزیز نہیں ہے۔"

"مجھے بھی کہنا تو نہیں چاہئے، لیکن تمہیں بتا رہی ہوں کہ فضیلہ بھی تم سے بے انتہا محبت کرتی ہے۔"

"امی!" میں نے کہا۔ "ایسی صورت میں کہ جب ہم دونوں ایک دوسرے کو بہت چاہتے ہیں، کیا یہ بہتر نہیں ہو گا کہ جتنی جلدی ممکن ہو سکے، ہماری شادی کر دی جائے؟"

وہ اس طرح اُچھل پڑیں، جیسے کوئی عجیب بات کہہ دی ہو۔

"فضیلہ تو ابھی بہت چھوٹی ہیں۔" انہوں نے سنبھل کر، دھیمی آواز میں کہا۔ "اور تم بھی کون سا بڑے ہو۔ انٹر میں پڑھ رہے ہو۔"

''انٹر پاس کر چکا ہوں۔'' میں نے جلدی سے کہا۔

''اس سے کیا ہوتا ہے؟ آج کل کے دور میں تو بی۔اے اور ایم۔اے بھی جوتیاں چٹخاتے پھر رہے ہیں۔ پہلے اپنے آپ کو کسی قابل بنا لو، پھر ایسی بات کرنا۔ شادی بیاہ گڑیوں کا کھیل نہیں ہے۔''

''آپ فضیلہ کے ابو سے بات تو کر کے دیکھیں۔ شاید وہ مان جائیں۔''

''انہیں مجھ سے زیادہ کون جانتا ہے؟ اُن کے کانوں میں بھنک بھی پڑ گئی کہ میں ابھی سے فضیلہ کے ہاتھ پیلے کر دینا چاہتی ہوں تو وہ مجھے گولی مار ڈالیں گے۔'' انہوں نے کہا۔ ''خود سوچ بیٹا! ابھی تمہاری حیثیت ہی کیا ہے؟ بالفرض محال شادی ہو جائے تو تمہاری تعلیم ادھوری رہ جائے گی۔ اپنے اخراجات کے لیے دوسروں کے محتاج ہو، بیوی کا خرچ کہاں سے اُٹھاؤ گے؟ بچے ہوں گے تو اُن کے کپڑے لتے، دوا دارو اور پڑھائی لکھائی کا انتظام کیسے کرو گے؟''

مزید کچھ کہنا سننا بے کار تھا۔ فضیلہ تو پہلے ہی کہہ چکی تھی، ابھی تو آپ بی۔اے کریں گے، پھر ایم۔اے کریں گے، پھر ملازمت یا کاروبار کریں گے، پھر کہیں میرا بازو بنیں گے۔ اُس نے صرف یہی نہیں کہا تھا، ایک اور بات بھی کہی تھی اور اُس کی اس بات نے مجھے امی کی منت کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔

''آپ میرا بازو بنیں یا نہ بنیں۔'' اُس نے جذبات میں والہانہ ڈوب کر کہا تھا۔ ''مگر میں ایک پل بھی آپ کے بغیر نہیں رہ سکوں گی۔''

فضیلہ کی امی کا ٹکا سا جواب سن کر میں نے اُنہیں سلام کیا اور بجھے ہوئے دل کے ساتھ گھر کی راہ لی۔ اُن کے اندیشے بے جا نہیں تھے، بالکل درست تھے۔ اگرچہ میں ایسے کئی لوگوں کو جانتا تھا، جنہوں نے شادی کے بعد بھی سلسلۂ تعلیم کو منقطع نہیں کیا تھا اور یونیورسٹی سے ڈگریاں حاصل کی تھیں۔ لیکن وہ ایسے لوگ تھے، جو یا تو کہیں ملازمت کر رہے تھے، یا اتنے امیر و کبیر تھے کہ گھر کی طرف سے مطمئن تھے۔ میری تو اتنی حیثیت ہی نہیں تھی کہ بیوی کی کوئی چھوٹی موٹی فرمائش بھی پوری کر پاتا۔ مستزاد یہ کہ وہ، جو میری دشمن تھی، گھات لگائے بیٹھی تھی اور کسی ایسے وقت کا انتظار کر رہی تھی کہ میں ہنسوں اور دل کھول کر ہنس نہ پاؤں کہ وہ میرے ہونٹوں کی ہنسی کو اُچک لے۔

ذہنی ہسپتال کے ڈاکٹروں نے ابا جی اور بھائی جان کو مشورہ دیا کہ مجھے زیادہ سے زیادہ مصروف رکھا جائے، تاکہ میں کم سے کم سوچ سکوں۔ ڈاکٹروں کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے اگلے روز بھائی جان سویرے ہی ہوسٹل سے آئے اور مجھے کالج لے گئے۔ کالج کے پرنسپل وہ پروفیسر چراغ علی تھے، جنہوں نے اسکول کی تقریب انعامات میں اسٹیج پر جا کر اعلان کیا تھا کہ اگر میں نے ان کے کالج میں داخلہ لیا تو نہ صرف یہ کہ میری فیس معاف کر دی جائے گی بلکہ دو سال

تک معقول قسم کا ماہانہ وظیفہ بھی ملے گا۔ ہم دونوں بھائی اُن سے اس وقت ملے، جب داخلے کی تاریخ کو گزرے ہوئے پندرہ دن گزر چکے تھے۔

پروفیسر موصوف نے صاف صاف کہہ دیا کہ اب مراعات کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تاہم اتنی رعایت کی جا سکتی ہے کہ پچھلی تاریخوں میں داخلہ دے دیا جائے۔ چند روز بعد یہ رعایت بھی ختم ہو جائے گی۔ کیونکہ یونیورسٹی کو داخل شدہ طالب علموں کی تعداد سے مطلع کر دیا جائے گا۔

بھائی جان نے اس رعایت کو غنیمت سمجھا اور ٹرم فیس جمع کرا کے جو آٹھ ہزار سے زائد بنتی تھی، مجھے بی۔اے پارٹ ون میں داخلہ دلا دیا۔ وہ پہلے سے رقم کا انتظام کر کے آئے تھے کیونکہ اُنہیں اچھی طرح علم تھا کہ پرائیویٹ کالجز کے کرتا دھرتا، طالب علموں کی مجبوریوں سے فائدہ اُٹھانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ پروفیسر چراغ علی کو بھی ان سے مستثنیٰ قرار نہیں دیا جا سکتا تھا۔ واپسی پر بھائی جان میڈیکل کالج چلے گئے۔ میں یہ سوچتا ہوا گھر پہنچا کہ فضیلہ اور اُس کی امی کو داخلے کی خوشخبری سنانا ہے۔ لیکن اس کی نوبت نہیں آئی۔ ابا جان پڑوس کے ہائی سکول لے گئے، جس کی لوئر مڈل سے اسی سال اپ گریڈنگ ہوئی تھی۔ پرنسپل کو میرے تعلیمی ریکارڈ اور پوزیشن کے بارے میں بتا چکے تھے اور اس اسکول کی انتظامیہ کو ایسے ذہین ٹیچرز کی، جو جتنے زیادہ قابل ہوں، اتنی ہی کم تنخواہ پر کام کرنے کے لیے تیار ہو جائیں، سخت ضرورت تھی۔

خاتون پرنسپل نے، جو کیمبرج سے ایجوکیشن کی ڈگری لے کر آئی تھیں، نام پوچھا۔ خیریت دریافت کی۔ پسندیدہ مضامین معلوم کیے اور شام کی شفٹ میں اسسٹنٹ ٹیچر کی حیثیت سے چھ ہزار روپے ماہانہ پر ملازم رکھ لیا۔ اس برائے نام انٹرویو کے بعد مجھے ابا جی کے ساتھ ہی گھر واپس آنا چاہیے تھا، مگر پرنسپل صاحبہ نے روک لیا۔ ہنس کر بولیں۔

''آج ہی سے جوائن کر لو۔ مس سعدیہ چھٹی پر ہیں۔ اُن کے پیریڈز لے لو۔ دو روز بعد مس سعدیہ آ جائیں گی تو تمہیں باقاعدہ ٹائم ٹیبل مل جائے گا۔''

ابا جی نے اُن کی ہاں میں ہاں ملائی۔ کاروباری آدمی تھے، ہر بات میں نفع و نقصان کو پیش نظر رکھتے تھے۔ سوچا، ہاتھ آئے روپے کیوں ضائع کیے جائیں۔

مجھے جن مس سعدیہ کے پیریڈز سونپے گئے، وہ کوئی بہت ہی قابل خاتون تھیں۔ اُنہیں کم و بیش ہر مضمون پر عبور حاصل تھا۔ اُردو، انگلش، سائنس، میتھ اور معاشرتی علوم، سبھی آٹھویں جماعت سے دسویں تک پڑھاتی تھیں۔ میں تو اُن کی طرح قابل نہیں تھا۔ نہ کوئی تیاری کر کے گیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جس کلاس میں گیا، وہاں دل کھول کر کھنچائی کی گئی۔

آٹھویں جماعت نے مجھے مسٹر کارٹون کے نام سے سرفراز فرمایا، نویں جماعت نے میرا نام مس شرمیلی رکھا۔ اسی جماعت کی لڑکیوں کے سیکشن سے جانگلوس کا خطاب ملا۔ میٹرک کے لڑکے

قدرے شریف تھے، انہوں نے زیادہ چھیڑ خانی نہیں کی۔ تین تین چار چار کے گروپوں میں بیٹھے سرگوشیوں میں باتیں کرتے رہے۔ بس دو لڑکے ایسے تھے، جنہوں نے میرا حدود اربعہ پوچھا۔ میں نے بتایا، پوزیشن ہولڈر ہوں تو ان میں سے ایک نے بڑی بے نیازی سے کہا۔

"میرے پاس ایک لاکھ روپے ہوں، تو میں بھی پوزیشن رکھ سکتا ہوں۔"

سب سے بدتمیز میٹرک کی لڑکیاں تھیں۔ پاس پڑوس کی جماعتوں سے انہیں نئے ٹیچر کے آنے کی اطلاع مل گئی تھی اور وہ اسی وقت میرا خیر مقدم کرنے کے لیے تیار تھیں۔ میں پسینے میں نہایا ہوا جونہی اُن کی کلاس میں پہنچا تو سب نے ہم آواز ہو کر "گڈ مارننگ سر!" کا نعرہ لگایا حالانکہ دوپہر کا وقت تھا پھر میرے کچھ کہنے سے قبل انہوں نے زور دیا کہ میں اپنا تعارف کراؤں۔ میں نے کہا۔

"مجھے سکندر کہتے ہیں۔"

زوردار قہقہوں کی گونج میں کلاس روم کے مختلف حصوں سے مختلف آوازیں آئیں۔

"اوہ...... سکندرِ اعظم! ملکہ عالیہ کو کہاں چھوڑ آئے؟"

"بڑے کیوٹ اور اسمارٹ معلوم ہو رہے ہیں۔"

"نئی ہیروئن کی تلاش میں آئے ہیں؟"

"شرمائیے مت۔"

"دانت مت نکالیے۔"

"رو کیوں رہے ہیں، سکندر صاحب؟"

"صورت ہی ایسی ہے۔"

"خاموش......" کسی لڑکی نے چلا کر کہا۔ "سکندر صاحب کو پورا تعارف تو کرا لینے دو۔"

کلاس روم میں اچانک سناٹا طاری ہو گیا۔

"میرا نام سکندر ہے۔" میں نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

"آگے بولیے۔" ایک بولی۔

دوسری نے کہا۔ "آج اتنا ہی یاد کر کے آئے ہیں۔ باقی کل بتائیں گے۔"

"نہیں...... یاد کر کے تو بہت کچھ آئے ہیں، مگر بھول گئے ہیں۔"

"بھولے نہیں ہیں۔" پیچھے سے آواز آئی۔ "سٹی گم ہو گئی ہے۔"

"آفس میں گم ہو گئی ہوگی۔"

"نہیں، وہاں سے تو لے کر آئے تھے۔ یہیں کہیں گم ہو گئی ہے۔"

"ڈھونڈ دو نا۔"

"کچھ اتہ پتہ تو بتائیں۔"

"سچ سچ بتائیے سکندر صاحب! آپ کو یقین ہے کہ آپ ہمیں پڑھانے آئے ہیں؟"

"یا...... ہم سے پڑھنے آئے ہیں؟"

"آپ تو کچھ بول ہی نہیں رہے ہیں؟"

"کڑکے کڑکے، بجلیاں گرائے جا رہے ہیں۔"

"بش شرٹ تو بڑی زوردار پہن رکھی ہے۔"

"لنڈا میں ایسا ہی زوردار مال ملتا ہے۔"

"خاموش...... خاموش......" پہلی لڑکی نے کہا۔ "کچھ سکندر صاحب کو بھی کہنے دو۔"

لڑکیاں خاموش ہو گئیں اور میرے چہرے کو تکنے لگیں۔ میں نے کہا۔

"آپ اسی طرح بولتی رہیں تو ہو چکی پڑھائی۔"

"پڑھائی بھی ہو جائے گی۔ پہلے تعارف تو مکمل ہو جائے۔"

"میں سمجھتا ہوں، جتنا تعارف ہو گیا، وہ کافی ہے۔" میں نے کہا۔

"کافی نہیں ہے۔" ایک آواز آئی۔

"چائے ہے۔" دوسری آواز سنائی دی۔

"دودھ اور چینی کے بغیر، کالی اور بدمزہ۔"

میں نے لہجے میں کرختگی پیدا کرتے ہوئے کہا۔ "بس، بہت ہو چکا...... اپنی اپنی کتابیں نکالیں۔"

"کس مضمون کی؟"

"اس مضمون کی، جو مس سعدیہ پڑھاتی تھیں۔"

"مس سعدیہ تو کچھ نہیں پڑھاتی تھیں۔"

"بس شعر سناتی ہیں۔"

"ملی نغمے سناتی ہیں۔"

"آپ کیا سنائیں گے...... شعر یا نغمہ؟"

پورا پیریڈ ایسی ہی خرافات میں گزر گیا۔ لڑکیوں نے ایک بھی لفظ پڑھ کر نہیں دیا۔ باہر نکلا تو نہ صرف یہ کہ موئے بدن سے پسینہ جاری تھا، بلکہ سر بھی بری طرح چکرا رہا تھا۔ میں نے پرنسپل سے صاف صاف کہہ دیا کہ میں ان کے سکول میں نہیں پڑھا سکوں گا۔

وہ ہنسنے لگیں۔ "اتنی جلدی دل چھوٹا نہیں کرنا چاہیے۔ کم و بیش ہر ٹیچر کو اس منزل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جو ڈرپوک ہوتے ہیں، وہ ڈر کر بھاگ جاتے ہیں۔ جن میں اہلیت اور صلاحیت ہوتی

ہے، وہ منزل کو پا لیتے ہیں۔"

"میڈم!" میں نے کہا۔ "میرے خیال میں میرے اندر اہلیت اور صلاحیت نہیں ہے، جو کسی اچھے ٹیچر میں پائی جاتی ہے۔"

"اور میں سمجھتی ہوں کہ تمہارا خیال غلط ہے۔ لڑکے ہوں یا لڑکیاں، کسی ایسے ٹیچر کو تنگ نہیں کرتے، جسے اپنے مضامین پر مکمل عبور حاصل ہو۔ اچانک تمہیں مختلف پیریڈز میں بھیجنے کا مقصد یہ بھی تھا کہ تمہیں آغاز میں ہی یہ اندازہ ہو جائے کہ کلاس میں جب بھی مکمل تیاری اور خود اعتمادی کے بغیر جاؤ گے، ہمیشہ آج جیسا ہی حشر ہو گا۔ لڑکوں اور لڑکیوں کی قوم ایسی ہی ہے۔ یہ کسی کو نہیں بخشتی۔" ان کی آواز دھیمی پڑ گئی۔

"گھر جا کر ان مضامین کی تیاری کرو، جن کو کل تمہیں پڑھانا ہے۔ میں مکمل یقین سے کہتی ہوں کہ کل جب تم مکمل تیاری سے کلاسز میں جاؤ گے تو وہاں کی فضا کو بالکل بدلا ہوا پاؤ گے۔"

اور اس طرح میں تقریباً نصف شب تک جاگتا رہا اور اسکول سے لائی ہوئی ان کتابوں کو پڑھتا اور سمجھتا رہا، جو مجھے اگلے روز پڑھانا تھا۔ نہ وہ ترشولی یاد آئی جو چھپ کر حملہ کرنے کی تیاریاں کر رہی تھی، نہ اُس فضیلہ کا خیال آیا، جو میری یاد سینے میں بسائے سلگ رہی تھی۔

ہاں، اگر خیال تھا تو اس بات کا کہ اسکول کے لڑکے اور لڑکیوں کے سامنے سبکی نہ ہو۔

دوسرے روز کالج اٹینڈ کیا۔ وہاں سے واپسی پر جلدی جلدی کھانا کھایا۔ کھانا فضیلہ کے گھر سے ہی آتا تھا۔ فضیلہ کے گھر والے نہ معاوضہ لینے پر راضی تھے، نہ ابا جی کو اجازت دیتے تھے کہ وہ کسی دوسری جگہ کھانے کا انتظام کریں۔ کھانا کھا کر بھاگم بھاگ اسکول پہنچا۔

بلاشبہ وہ میری زندگی کا روشن ترین دن تھا۔ اعتماد کے ساتھ کلاسوں میں گیا، اعتماد کے ساتھ لڑکوں اور لڑکیوں کو پڑھایا۔ وہی طلباء و طالبات، جو ایک روز قبل شیطان کی ذریت بنے ہوئے تھے، ایسے سیدھے بن گئے، جیسے لکھنے پڑھنے کے علاوہ اُنہیں کسی دوسری چیز سے سروکار ہی نہ ہو۔ پتہ چلا کہ جب تک معروف رکھا جائے، اُس وقت تک طلباء و طالبات کی رگِ شرارت نہیں پھڑکتی۔ اور چند منٹ کی بھی غفلت برتی جاتی تو اُنہیں آسمان سر پر اُٹھانے سے کوئی روک سکتا۔

میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ کالج میں پڑھنے اور اسکول میں پڑھانے کی غیر معمولی مصروفیت کے باعث میں نے محبت کی اس دیوی کو، جس کا نام فضیلہ تھا، بالکل ہی بھلا دیا تھا۔ ہاں یہ ہے کہ پہلے جیسی کیفیت نہیں رہی تھی۔ پہلے تو ایک لمحے کے لیے اُس کے تصور سے غافل ہوتا تو قیامت سی ٹوٹ پڑتی تھی۔ لگتا تھا، جیسے میرے جسم کے کسی عضو کو الگ کر دیا گیا ہو۔ رہ گئی تو وہ اور فضیلہ تو لازم و ملزوم سی ہو کر رہ گئی تھیں۔ فضیلہ یاد آتی تھی تو وہ بدمعاش بھی یاد آتا

جس نے اچھی بھلی فضیلہ کو بازو سے محروم کر دیا تھا۔

پہلا جمعہ آیا۔ دن چڑھے سو کر اُٹھا، شیو بنا کر غسل کیا۔ فضیلہ کے گھر سے علی الصبح ہی ناشتہ آ جاتا تھا۔ ابا جی کبھی ناشتہ کر کے اپنی خشک دودھ اور چائے کی پتی کی اس دکان پر جا بیٹھے، جو گلی میں نکالی گئی تھی۔ میں نے چائے گرم کی اور ناشتہ کرنے باہر بیٹھ گیا۔ اس وقت تک میں نے چھٹی کا دن گزارنے کا کہ کہاں گزاروں گا اور کس طرح گزاروں گا، کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا۔

ناشتہ کر رہا تھا کہ دیوار کی دوسری جانب سے "شش، شش" کی آواز سنائی دی۔ شبہ ہوا کہ شاید فضیلہ آواز دے رہی ہے۔ پھر اس خیال سے دل پر چوٹ لگی کہ ترشولی نے فضیلہ سے اس کی ساری شوخیاں اور شرارتیں چھین لی ہیں۔ "شش، شش" کی آواز وقفے وقفے سے آ رہی تھی، اس لیے میں نے آخری نوالہ منہ میں رکھا اور چائے کی پیالی ہاتھ میں لے کر باورچی خانے سے باہر آ گیا۔ دیوار کے دوسری جانب سرخ لباس پہنے ہوئے واقعی فضیلہ کھڑی تھی اور بے حد پیاری معلوم ہو رہی تھی۔

"بس، دیکھ لی آپ کی محبت۔"

"آہستہ بولو، فضیلہ!" میں نے کہا۔

"چار دن سے آئے کیوں نہیں؟"

"نہ آنے کا یہ مطلب تو نہیں کہ مجھے تم سے محبت ہی نہیں رہی۔"

"تو پھر نہ آنے کی وجہ؟"

"دراصل مجھے بی۔اے میں داخلہ مل گیا ہے۔"

"معلوم ہے مجھے۔" اُس نے کہا۔ "آپ کو تو توفیق نہیں ہوئی، لیکن ابا جی نے بتا دیا تھا۔"

"اور میں نے اسکول کی شام کی شفٹ میں ملازمت بھی کر لی ہے۔"

"ابا جی نے یہ بات بھی بتا دی تھی۔"

"پھر بھی پوچھ رہی ہو کہ میں چار دن سے کیوں نہیں آیا؟ .... صبح کو گھر سے نکلتا ہوں، سورج ڈھلے گھر پہنچتا ہوں۔ اتنا تھک جاتا ہوں کہ جسم کا جوڑ جوڑ درد کر رہا ہوتا ہے۔ اس کے باوجود نجانے کس کس طرح رو رو کر اپنے کالج کی اسائنمنٹس تیار کرتا ہوں اور ان اسباق کو دیکھتا ہوں، جو اگلے دن اسکول میں پڑھانا ہوتے ہیں۔"

"ایسی صورت میں تو آپ مجھے بھولنے میں حق بجانب ہیں۔"

"اتنی لمبی چوڑی وضاحت کر دی، اب بھی ایک ہی رٹ ہے۔ ٹھیک ہے، میں نہیں آ سکا تو تمہیں آ جانا چاہیے تھا۔ آخر پہلے بھی تو آتی تھیں، دن میں دس دس بار۔"

"پیروں میں منگنی کی مہندی نہ لگی ہوتی تو دس بار چھوڑ، بیس بار آتی۔ دو پہرے دار ہر وقت

پہرہ دیتے رہتے ہیں۔ ایک کمرے میں سسر اور باہر امی۔ ایک بار دونوں کی نظروں سے بچ کر دروازے تک پہنچ گئی تھی، مگر نہ جانے امی کو کیسے پتہ چل گیا۔ کہنے لگیں۔

"جب تک ماں باپ کی ناک نہیں کٹواؤ گی، تمہیں چین نہیں ملے گا۔"

"آج تو تمہارے ابو بھی گھر پر ہوں گے۔ تین تین پہرے داروں کے باوجود دیوار کے پیچھے کھڑی ہوں۔ سسر نے صبح سے شام تک چھٹی لی ہوئی ہے۔ اپنے کسی چاہنے والے کے ساتھ گھومنے گئی ہوئی ہے۔ اور ابو، امی کو لے کر میٹرنٹی ہوم گئے ہوئے ہیں۔"

"کہاں گئے ہیں؟"

فضیلہ ہنسنے لگی۔ "میٹرنٹی ہوم۔"

"کسی عزیز کے ہاں ولادت ہوئی ہو گی؟"

اُس نے بہت غور سے مجھے دیکھا، مسکرائی، پھر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر رازدارانہ انداز میں بولی۔ "امی اُمید سے ہیں۔"

"اوہ......"

"اس میں اوہ اور آہ، کی کیا بات ہے؟ دوا تو آپ ہی نے دی تھی۔"

"میں نے دوا دی تھی؟...... کیا بک رہی ہو؟"

"چلو، دوا نہیں دی تھی، مشورہ تو دیا تھا، نارنگی یا کینو کی پھانک کھانے کا۔"

"اوہ......" ساری بات یاد آ گئی تھی۔ فضیلہ کی امی، مدرسے کے سامنے نالے کے قریب بیٹھنے والے باؤلے فقیر کے پاس گئی تھیں اور اس نے اُن کی منتوں اور خوشامدوں سے تنگ آ مٹی میں آلودہ ایک پھانک دے دی تھی۔ اُنھوں نے اس پھانک کو بہت سینت کر رکھا ہوا ایک بار مجھ سے شکایت کی کہ پھانک نے کوئی کرامت نہیں دکھائی۔ تو میں نے یہ معلوم کیے بغیر اُن کی مراد کیا تھی، اُن سے کہا کہ وہ پھانک کھا جائیں۔

"کیا بات ہے؟ آج آپ، اوہ...... اوہ...... بہت کر رہے ہیں۔" فضیلہ نے ہوئے پوچھا۔

میں نے اُس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "گویا آج تم گھر پر بالکل تنہا ہو؟"

"ہاں...... اور دروازہ بھی کھلا ہوا ہے۔ آ رہے ہیں؟"

وہ دعوت نہ بھی دیتی، تو بھی میں اس کے پاس پہنچ جاتا۔ دعوت کے بعد تو رُکنے کا نہیں تھا۔ میں کم و بیش ڈیڑھ گھنٹے تک فضیلہ کے ساتھ رہا۔ تقریباً بارہ بجے جب اُس کے نے میٹرنٹی ہوم سے واپس آ کر دروازے کی گھنٹی بجائی تو میں دوسرے دروازے سے اور وہ دروازہ کھولنے چلی گئی۔

ڈیڑھ گھنٹے کی اس ملاقات میں میری اور فضیلہ کی بہت کم گفتگو ہوئی۔ زیادہ وقت ہم نے ایک دوسرے کو دیکھنے اور محسوس کرنے میں گزارا۔ گھر واپس پہنچا تو مجھ پر اس کی محبت کا اتنا نشہ طاری تھا کہ قدم زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ جیسے تیسے بستر پر لیٹا اور اُن رنگین لمحات کے تصور میں کھو گیا، جو فضیلہ کی معیت میں گزار کر آیا تھا۔ کہانیاں تو کئی پڑھی تھیں اور دوستوں سے قصے بھی بہت سنے تھے، لیکن درحقیقت پہلی بار معلوم ہوا تھا کہ زندگی کسے کہتے ہیں۔

خیالات کا سلسلہ جتنا دلچسپ تھا، اتنا ہی بے ربط بھی تھا۔ مختلف النوع دلکش مناظر تھے۔ جو اپنی جملہ رعنائیوں کے ساتھ ذہن میں گردش کر رہے تھے۔ حسین و دلفریب قوس قزح نے مجھے اپنے رنگوں میں نہلا رکھا تھا۔ اور میں یہ فیصلہ کرنے میں قطعی طور پر قاصر تھا کہ ان میں سے کون سا رنگ سب سے اچھا ہے۔

آنکھ کھلی تو ابا جی کو سامنے پایا۔ ابا جی جمعہ کے فریضے کی ادائیگی کے لیے کہہ رہے تھے، لیکن اللہ معاف کرے، مجھے یوں محسوس ہوا جیسے مجھے تصورات کی جنت سے نکال کر کسی نے دوزخ میں پھینک دیا ہو۔

"آپ چلئے۔" میں نے انگڑائی لے کر کہا۔ "میں ابھی دو منٹ میں آتا ہوں۔"

"صبح اُٹھ کر غسل نہیں کیا تھا؟"

میں ایک بار پھر فضیلہ کے تصور میں کھو گیا۔ دل میں گدگدی سی ہونے لگی، ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

جمعہ کی نماز کے بعد ابا جی گھر کے دروازے پر پہنچ گئے اور میں پیچھے رہ گیا۔ جب میں قریب پہنچا تو ابا جی نے کہا۔ "گھر کے دروازے کی چابی مجھے دو اور تم بھاگ کر رفیق کو بلا لاؤ۔ کہنا بہت ضروری کام ہے۔"

میں نے کنجیوں کا گچھا اُن کے ہاتھ پر رکھا اور رفیق کے گھر کی جانب روانہ ہو گیا، جو مین روڈ کے پار تھا۔ عجیب بات یہ تھی کہ پے در پے گناہ کرنے کے باوجود نہ مجھے گناہ کا احساس ہو رہا تھا، نہ ندامت ہو رہی تھی، بلکہ شرابیوں جیسا سرور محسوس ہو رہا تھا۔

رفیق، بھائی جان کا بچپن کا دوست تھا۔ دونوں کی کوئی بات ایک دوسرے سے چھپی ہوئی نہیں تھی۔ گھر پر بوڑھی ماں کے علاوہ کوئی اور نہیں تھا۔ اُس کے والد کو زمینیں اور پلاٹ خریدنے کا بہت شوق تھا۔ ویران اور بے آباد مقامات پر کوڑیوں کے مول پلاٹ خرید لیتے تھے۔ اُن کی موت کے بعد دیکھتے ہی دیکھتے پلاٹوں کی قیمتیں آسمان سے باتیں کرنے لگی تھیں۔ اُنہی کو بیچ بیچ کر گزارہ ہو رہا تھا۔ ایک پلاٹ اب بھی باقی تھا، جو رفیق کے والد نے کبھی پانچ ہزار میں خریدا تھا۔ کئی کنسٹرکشن کمپنیاں اب اس کے لئے پچاس سے ساٹھ لاکھ کی بولی لگا چکی تھیں، لیکن رفیق کی والدہ

پورے ایک کروڑ مانگ رہی تھیں۔

میں نے رفیق کے گھر جا کر اُسے آواز دی۔ اور جب وہ باہر نکلا تو اُسے بتایا کہ ابا جی نے بلایا ہے۔

رفیق میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کچھ کہنا چاہتا تھا۔ لیکن اِدھر ہاتھ رکھا اور اُدھر تیزی سے کھینچ لیا۔

"تمہیں تو تیز بخار ہے، سکندر!"

میں مسکرانے لگا۔

"غضب خدا کا۔" اُس نے اپنی ہتھیلی کو اس طرح دیکھا، جیسے اس پر آبلے پڑ گئے ہوں۔ "اتنے شدید بخار میں گھومتے پھر رہے ہو؟"

میں نے کہا۔ "میری فکر مت کرو۔ یہ بتاؤ کہ ابا جی سے کیا کہوں؟"

"زیادہ تکلیف نہ ہو رہی ہو تو اندر چل کر بیٹھو۔ میں ذرا کپڑے بدل لوں۔ تہبند پہن کر باہر نہیں جا سکتا۔"

وہ عموماً گھر میں تہبند پہنا کرتا تھا۔ میں نے اندر جانے پر آمادگی ظاہر کر دی اور اس کے ڈرائنگ روم میں چلا گیا۔ ڈرائنگ روم میں فریج دیکھ کر مجھے پیاس کا احساس ہوا۔ رفیق کپڑے تبدیل کرنے دوسرے کمرے میں گیا ہوا تھا۔ میں نے اس کے فریج سے سرد پانی کی بوتل نکالی اور منہ لگا کر غٹاغٹ پی گیا۔ بوتل خالی کرنے کے بعد ناک اور منہ سے سانس لینے کے بجائے گہری بھاپ نکالی۔ یوں لگا، جیسے اندر جلتے ہوئے اعضاء پر اس طرح پانی پڑ گیا ہو جس طرح دہکتے ہوئے لوہے پر پڑتا ہے اور بھاپ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

پیاس کم نہیں ہوئی تھی۔ میں نے پانی سے بھرا ہوا گیلن نکال لیا اور اُس کا یخ پانی حلق سے نیچے اُتارنے میں مصروف ہو گیا۔ جتنی دیر میں رفیق لباس تبدیل کر کے آیا، میں آدھے سے زیادہ گیلن پی چکا تھا۔ گرمی کا موسم ہونے کے باوجود ناک اور منہ سے بھاپ کے مرغولے نکل رہے تھے۔

"ڈاکٹر کو دکھاؤ، سکندر!" رفیق نے حیران و پریشان نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم اندر ہی اندر جل رہے ہو، اور اس کی تپش......." اس نے ایک بار پھر اپنی ہتھیلی کی طرف دیکھا۔ "اس کی تپش باہر تک محسوس ہو رہی ہے۔"

"میری فکر چھوڑو....... گھر چلو۔ ابا جی تمہارے منتظر ہوں گے۔"

عادت کے مطابق اُس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھنا چاہا، لیکن ہاتھ رکھنے سے پہلے ہی ہٹ گیا۔ وہ دوبارہ اپنی ہتھیلی کو نذرِ آتش نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"ابا جی سے بات کرتے ہی ہم دونوں ہسپتال چلیں گے۔" رفیق نے میرے ساتھ گھر سے باہر قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔ "کیونکہ جمعہ کی وجہ سے سارے پرائیویٹ کلینک بند پڑے ہوں گے۔"

"مجھے کچھ نہیں ہوا، رفیق بھائی!" میں نے ہنس کر جواب دیا۔ "تم خوامخواہ میری وجہ سے پریشان ہو رہے ہو۔"

"کم از کم کسی ڈاکٹر سے مشورہ تو کر لینا چاہئے۔ میں نے پہلی بار اتنے زیادہ ٹمپریچر کو محسوس کیا ہے۔"

"کوئی ضرورت نہیں ہے۔ تقریباً ایک گھنٹہ پہلے ہی جسم اس طرح جل رہا تھا کہ میرے سر پر روٹی پکائی جا سکتی تھی۔ اب تو مجھے بہت افاقہ ہے۔ کھانا کھا کر سو جاؤں گا۔ اور جب اُٹھوں گا تو بالکل نارمل ہوں گا۔"

ہم دونوں گھر پہنچے۔ دسترخوان لگ چکا تھا۔ ابا جی اور فضیلہ کے ابو بیٹھے میرا اور رفیق کا انتظار کر رہے تھے۔ رفیق نماز سے پہلے کھانا کھا چکا تھا۔ اُس نے معذرت چاہ لی۔ فضیلہ کے ابو نے ہماری پلیٹوں میں گرم گرم کھچڑی نکالی۔ بھوک نہ ہونے کے باوجود میں نے چھوٹا سا لقمہ منہ میں رکھا اور چبانے لگا۔

"رفیق!" ابا جی نے کہا۔ "اپنے دوست کی وکالت کرنے مت بیٹھ جانا۔ یہ ہم سب کی عزت کا سوال ہے۔ فضیلہ کے ابو نے اپنی آنکھوں سے ہاشم کو نورین کے بجائے ایک اور لڑکی کے ساتھ گھومتے دیکھا ہے۔"

رفیق سٹپٹا سا گیا۔ میرے کان کھڑے ہو گئے اور میں نے مکھن کا بڑا سا ٹکڑا منہ میں رکھ لیا۔

"اور اپنے طور پر ہم نے جو تفتیش کی ہے، وہ بڑی بھیانک ہے۔" ابا جی کہہ رہے تھے۔ "لڑکی، ہاشم کی کلاس فیلو نہیں ہے۔ اور پچھلے ایک ہفتے سے ہر منگل کی رات ہاشم ہوسٹل میں نہیں ہوتا۔ ہوسٹل سے یہ کہہ کر غائب ہو جاتا ہے کہ میں گھر جا رہا ہوں۔ جب وہ نہ ہوسٹل ہوتا ہے، نہ گھر آتا ہے تو کہاں ہوتا ہے؟"

رفیق چند لمحوں تک سوچتا رہا کہ کیا کہے اور کیا نہ کہے۔ پھر تھوک نگل کر بولا۔ "میں نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔"

"گویا ہم نے جو سنا ہے، وہ بالکل درست ہے؟"

رفیق نے ندامت سے اثبات میں سر ہلایا۔ میں اُن لوگوں کی گفتگو سے فائدہ اُٹھا کر چمچے بھر بھر کر دہی کھا رہا تھا اور بڑا سکون محسوس کر رہا تھا۔

"کون ہے وہ لڑکی؟" ابا جی نے پوچھا۔ "رہتی کہاں ہے؟"

"اس کا علم تو شاید ہاشم کو خود بھی نہ ہو۔" رفیق نے جواب دیا۔

"حیرت ہے۔"

"ہر منگل کی شام وہ ہوسٹل کے عقب میں واقع پارک میں آ کر بیٹھ جاتی ہے۔ اگرچہ ہاشم ہر ملاقات کے بعد مصمم ارادہ کر لیتا ہے کہ آئندہ اُس سے نہیں ملے گا، لیکن اُس کے قدم خود بخود پارک کی طرف اُٹھنے لگتے ہیں اور وہ دونوں پارک سے نکلتے ہیں۔ تھوڑی دور پیدل چلتے ہیں اور کسی ریستوران میں جا کر کچھ کھاتے پیتے ہیں، پھر ٹیکسی میں بیٹھ کر چلے جاتے ہیں۔ صبح کو جب ہاشم کی آنکھ کھلتی ہے تو وہ خود کو تنہا پاتا ہے۔ اُس کے سرہانے پانچ سو کا ایک نوٹ رکھا ہوتا ہے۔ یہ گویا اس بات کا اشارہ ہوتا ہے کہ ہاشم اس سے ٹیکسی کا کرایہ ادا کرے اور اس سے جو رقم بچ جائے، اسے اپنے مصرف میں لائے۔"

"کسی نودولتیے گھرانے کی لڑکی معلوم ہوتی ہے۔" ابا جی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"بڑی شرم ناک بات ہے۔" فضیلہ کے ابو بولے۔ "ہاشم تو بڑا شریف اور نیک لڑکا تھا۔"

"ایسی بات زیادہ عرصہ نہیں چھپتی۔ نورین کے ابو کو پتہ چلے گا تو کیا ہو گا؟ اُسے نورین ہی سے ہاتھ نہیں دھونا پڑیں گے، بلکہ تعلیم بھی کھٹائی میں پڑ جائے گی۔ میری تو آمدنی بھی اتنی نہیں کہ اُس کے تعلیم کے اخراجات اُٹھاؤں۔ اُسے سمجھاؤ، رفیق!"

"میں تو اُسے سمجھا سمجھا کر تھک گیا ہوں۔" رفیق نے کہا۔ "وہ خود بھی اس لڑکی سے بڑا عاجز ہے۔ دل سے چاہتا ہے کہ اُس کا پیچھا چھوڑ دے۔ لیکن چھوڑ نہیں پا رہا۔"

"سب بکواس ہے۔" ابا جی بولے۔ "بہانے بازی ہے۔ ہاشم کے دل میں کھوٹ نہ ہوتا تو نوبت کیوں آتی؟ اگر وہ پارک میں نہ جائے تو خود بخود چھٹکارا حاصل کر سکتا ہے۔ مجھے تو یہ معلوم ہوتا ہے، جیسے حرفوں کی بنی ہوئی وہ لڑکی کسی ایسے وقت کے انتظار میں ہے، جب شہر کے ساتھ بیچ چوراہے میں ہماری عزت و آبرو کا بھانڈا پھوڑ سکے اور ہم اُسے ہاشم کی بیوی کی حیثیت سے گھر لا سکیں۔ کیوں خان صاحب؟" ابا جی نے فضیلہ کے ابو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

فضیلہ کے ابو نے ہاں میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ اس ضمن میں پولیس کی مدد حاصل کی جائے؟"

"اپنا ہی سونا کھوٹا ہے، خان صاحب! اپنا ہی سونا کھوٹا ہے۔ لڑکی کو دوش دینے سے فائدہ نہیں ہو گا۔ پولیس لڑکی کو ہی نہیں، لڑکی کے عاشق کو بھی پکڑے گی۔ ہماری کل کی مٹی ہوئی عزت آج ہی مٹی میں مل جائے گی۔"

رفیق نے کہا۔ "یہ نہ سمجھیں کہ میں ہاشم کی وکالت کر رہا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ منگل

کی رات اُس لڑکی کے ساتھ سیر و تفریح پر مجبور ہے۔"

"پھر وہی بکواس۔ میں کہنا تو نہیں چاہتا، لیکن کہنا پڑتا ہے کہ لڑکے مجبور نہیں ہوتے۔ وہ احمق اپنے آپ کو مجبور کیوں سمجھ رہا ہے؟"

"کیونکہ اُسے آپ کی اور اپنے بھائی کی زندگی عزیز ہے۔"

میں نے چمچے سے دہی کھاتے کھاتے پورا پیالہ اُٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا تھا۔ رفیق کے منہ سے ادا ہونے والا جملہ سن کر میں ٹھٹک گیا اور پیالہ دوبارہ دسترخوان پر رکھ کر رفیق کی طرف دیکھا۔ کئی یادیں تازہ ہو گئیں۔ مجھ سے بھی یہی کہا گیا تھا کہ تمہیں اپنے ابا جی اور امی جی کی زندگی عزیز ہے تو نورین کو ختم کر دو۔

رفیق کہنے لگا۔ "اُس لڑکی نے ہاشم کو دھمکی دی ہے کہ اگر اُس نے منگل کی راتوں کو اُس سے ملنا جلنا بند نہ کیا تو وہ آپ کو اور سکندر کو زندہ نہیں چھوڑے گی۔"

"اور ہاشم اتنا گدھا ہے کہ اُس کی دھمکی میں آ گیا۔ یہ بھی نہیں سوچا کہ کسی کو قتل کرنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ ایک آوارہ، بدمعاش لڑکی کی یہ مجال نہیں ہو سکتی کہ وہ ہمیں نقصان پہنچائے۔ اور ہم بھی مٹی کے مادھو نہیں ہیں کہ آسانی سے قتل ہو جائیں گے۔ کیوں بھائی صاحب؟"

فضیلہ کے ابو نے کہا۔ "ادھر کا رخ تو کر کے دیکھے۔ گولی نہ مار دوں تو نام نہیں۔"

میرے پورے جسم میں تیز سنسناہٹ سی دوڑ رہی تھی۔ کچھ دیر قبل محسوس ہونے والی گرمی اور تپش بڑی حد تک کم ہو گئی تھی۔

"اُس لڑکی کے لئے کسی کو قتل کرنا بائیں ہاتھ کا کام ہے۔" رفیق نے کہا۔ "اور ہاشم کے سامنے اُس نے دو افراد کو موت کے گھاٹ اُتار دیا ہے۔"

"استغفر اللہ۔" ابا جی نے زور سے کہا۔ پھر نسبتاً دھیمے لہجے میں بولے۔ "تمہارا مطلب ہے کہ ہاشم عینی شاہد ہے؟"

خان صاحب سنبھل گئے۔ غیر اختیاری طور پر اُن کی انگلیاں اپنی کھچڑی داڑھی سے کھیلنے لگی تھیں۔ کھانے کے دوران اتنے نازک موضوع پر گفتگو کر کے ابا جی اور فضیلہ کے ابو دونوں نے اپنے کھانے کا کام کر لیا تھا۔ مجھے تو پہلے ہی بھوک نہیں تھی۔ صرف ٹھنڈی چیزیں کھانے کو دل چاہ رہا تھا۔ سب کی پلیٹوں میں جوں کی توں کھچڑی رکھی تھی۔ بمشکل دو دو، تین تین نوالے کھائے ہوں گے۔

"جی ہاں۔" رفیق نے کہا۔ "ہاشم عینی شاہد ہے۔ اُس نے اپنی نظروں سے اس لڑکی کو دو آدمیوں کی جان لیتے ہوئے دیکھا ہے۔ اور اچھی طرح سمجھ چکا ہے کہ اگر اُس نے اُس لڑکی کو ٹھکرا دیا تو جو حشر اُن کا ہوا، وہی خدانخواستہ آپ کا اور سکندر کا بھی ہو سکتا ہے۔"

ابا جی اُن لوگوں میں سے تھے، جنہیں اپنی زندگی سے زیادہ قانون کی بالاتری عزیز تھی۔ بولے۔ "ہاشم نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے تو ہماری زندگی کی پروا کیے بغیر اُسے پولیس کو اطلاع دینی چاہیے تھی۔ کیا وہ نہیں جانتا کہ قانون اور مذہب کی نظر میں جرم کو چھپانے والا بھی جرم کا شریک سمجھا جاتا ہے" وہ غصے سے کانپنے لگے۔ "جان رہے یا نہ رہے، میں خود تھانے جاؤں گا اور پولیس کو اُس بدمعاش اور قاتل لڑکی کے کرتوتوں سے آگاہ کروں گا۔ مجھے اُن لوگوں کے نام بتاؤ، جو اُس کے ستم کا نشانہ بنے ہیں۔"

"نام تو بتا دوں گا، لیکن یقین کیجیے، لڑکی کا آپ کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔ ہمارا کام صرف اتنا ہے کہ اُسے قانون کے حوالے بھی نہیں کیا جا سکتا۔" رفیق نے کہا۔ "مقتولین میں ایک پارک کا مالی ہے، دوسرا ایک چوکیدار ہے۔"

ابا جی جوش میں آ کر کھڑے ہو گئے اور فضیلہ کے ابو کی آستینیں پکڑ کر بولے۔

"تھانے چلتے ہیں۔"

رفیق بولا۔ "پوری بات تو سن لیجیے۔ مالی، سانپ کے ڈسنے سے ہلاک ہوا اور چوکیدار سے بندوق صاف کرتے ہوئے گولی چل گئی، جو اُس کے حلق کے پار نکل گئی۔"

"لاحول ولا......" ابا جی دوبارہ دھم سے بیٹھ گئے۔

خان صاحب نے کہا۔ "تم تو کہہ رہے تھے، لڑکی اُن دونوں کی قاتل ہے۔"

"میرا نہیں، ہاشم کا یہی کہنا ہے۔ ہاشم کے کہنے کے مطابق پارک کے مالی نے لڑکی کی نازیبا حرکت دیکھ کر اُسے ڈانٹتے ہوئے پارک سے جانے کا حکم دیا تھا۔ لڑکی نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا تھا کہ "میں تو باہر نہیں جاؤں گی، البتہ تمہاری لاش پارک سے باہر جائے گی۔ کیونکہ ابھی ایک پل میں سانپ تمہیں ڈس لے گا۔" اور اِدھر اُس کا جملہ پورا ہوا، اُدھر پیڑ کے اوپر سے ایک سانپ مالی کی گردن پر گرا۔ مالی چلاتا ہوا بھاگا۔ بے شمار لوگ اکٹھے ہو گئے۔ لیکن اس سے پہلے کہ مالی خود کو سانپ کی گرفت سے آزاد کراتا، وہ اُسے کئی جگہ سے ڈس چکا تھا۔ مالی کا جسم نیلا پڑ چکا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ گر کر ڈھیر ہو گیا۔ جبکہ سانپ جسم کو چھوڑ کر رینگتا جھاڑیوں میں چلا گیا۔ کچھ دیر کے بعد جیسا کہ اُس نے دعویٰ کیا تھا، مالی کی لاش کو پارک سے لے جایا گیا۔"

ابا جی نے آخری اُمید کے طور پر پوچھا۔ "کیا وہ لڑکی کا پالتو سانپ تھا؟"

"جی نہیں۔ پارک میں موجود لوگوں نے اس خونی منظور کو دیکھا تھا۔ اُن کا کہنا تھا کہ [illegible] سانپ تھا۔ اور اتنی بات تو آپ بھی جانتے ہیں کہ کوبرا سانپ صرف ماہر سپیرے ہی رکھتے ہیں۔ اور وہ بھی بے حد محتاط رہتے ہیں۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ لڑکی بہت بری اور بہت خراب ہے۔ لیکن جو واقعہ تم نے سنایا ہے، اس کی روشنی میں اُسے قاتل نہیں کہا جا سکتا۔ کیا دوسرا گولی چل جانے کا واقعہ بھی ایسا ہی ہے؟"

"اس سے بھی انوکھا۔" رفیق نے بتایا۔ "چوکیدار نے رات کو ہاشم کے ساتھ لڑکی کو دیکھ کر کشتی میں سفر سے منع کیا۔ دو چار گالیاں بھی دیں۔ لڑکی رُک گئی اور ہاشم سے کہنے لگی۔ "تھوڑی دیر چہل قدمی کرتے ہیں۔ ابھی یہ اپنی بندوق صاف کرے گا اور حماقت سے کارتوس نکالنا بھول جائے گا۔ صفائی کے دوران گولی چل جائے گی۔ اور جب یہ گولی کا نشانہ بن جائے گا تو ہم کشتی میں چلیں گے۔"........ ہاشم احتجاج کرتا رہا، مگر چوکیدار کو نہیں بچا سکا۔ چوکیدار اُن دونوں کو برا بھلا کہتا ہوا مزدور دوستوں میں جا بیٹھا اور بندوق صاف کرنے لگا۔ اور تب بندوق چل گئی اور چوکیدار کے حلق کو چیرتی ہوئی دوسری طرف نکل گئی۔"

"گویا مالی کی طرح اُس پُراسرار لڑکی پر چوکیدار کے قتل کا الزام بھی عائد نہیں ہوا۔"

فضیلہ کے ابو کہنے لگے۔ "مگر قاتل نہ ہوتے ہوئے بھی وہ سو فیصدی قاتل ہے۔ کیونکہ یہ سب کچھ اُس کی مرضی اور ایماء سے ہوا ہے۔"

"اور یہی وجہ ہے۔" رفیق نے کہا۔ "نفرت کرنے کے باوجود ہاشم اس لڑکی کے ہاتھوں میں کھلونا بنا ہوا ہے۔ وہ الٹی میٹم دے چکی ہے کہ ہاشم نے اُسے دھوکا دیا تو اُس کے والد اور بھائی بھی مالی اور چوکیدار جیسا بھیانک حشر پائیں گے۔"

ابا جی کا چہرہ سفید پڑ چکا تھا۔ حالت فضیلہ کے ابو کی بھی بہتر نہیں تھی۔ زبان سے دونوں نے کچھ نہیں کہا تھا، لیکن میں جانتا تھا کہ وہ کیا سوچ رہے ہیں۔ جس خوف ناک بلا نے معصوم رخسانہ کو ختم کیا تھا، نورین اور فضیلہ پر حملہ آور ہوئی تھی، وہ دوبارہ آ موجود ہوئی تھی۔ اور اس مرتبہ اُس نے میرے بجائے بھائی جان کے گرد گھیراؤ کیا تھا۔

"سکندر!" ابا جی نے کہا۔ "کھانا کھا چکے ہو تو برتن سمیٹ کر بھائی صاحب کے گھر دے آؤ۔"

"خانساماں لے جائے گا۔" فضیلہ کے ابو بولے۔ "دیوار کے پاس جا کر آواز دے لو۔"

میں نے اُٹھ کر خانساماں کو آواز دی۔ اس تصور سے کہ دیوار کے دوسری جانب فضیلہ تھی، میرے جسم میں سوئیاں چبھنے لگیں۔ اس چبھن میں اُس وقت مزید اضافہ ہو گیا، جب فضیلہ نے جواب دیا۔

"خانساماں ایک کام سے باہر گیا ہوا ہے۔ جیسے ہی واپس آئے گا، اُسے بھیج دیا جائے گا۔"

"کس کام سے باہر گیا ہے؟" میں نے خواہ مخواہ بات کو طول دینا چاہا تھا۔

اس مرتبہ فضیلہ کے بجائے اُس کی امی کی آواز سنائی دی۔ "وہ میری گولیاں لینے گیا ہے۔"

نماز کے بعد کیسٹ کی دُکان کھل گئی ہوگی۔"

"اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟"

"تم سے کس نے کہا کہ میری طبیعت خراب ہے؟" اُنہوں نے پوچھا۔

میں ایک لمحے کے لیے سٹپٹا گیا، لیکن فوراً ہی سوجھ گیا۔ "آپ خود ہی تو کہہ رہی ہیں کہ خانساماں سے گولیاں منگوائی ہیں۔"

"وٹامن اور کیلشیم کی گولیاں ہیں۔" اُن کی مسکراتی ہوئی آواز آئی۔ "صحت برقرار رکھنے کے لیے کھاتی ہوں۔"

"آپ نے تو ڈرا ہی دیا تھا۔" میں نے دل ہی دل میں اتنا اچھا بہانہ ڈھونڈنے پر خود کو مبارک باد دی اور واپس وہیں آ کر بیٹھ گیا، جہاں ابا جی اور فضیلہ کے ابو بیٹھے تھے، اور رفیق سر جھکائے گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

"ابا جی!" میں نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "رفیق بھائی نے جو واقعات سنائے ہیں، اُن سے آپ کو یقیناً اندازہ ہو گیا ہوگا کہ بھائی جان، ترشولی کے مشقِ ستم کا نشانہ بن رہے ہیں۔"

"وہ عورت........وہ چھلاوہ......" ابا جی کی آواز بھرا گئی۔ "شاید اس وقت تک چین نہیں بیٹھے گی، جب تک چن چن کر ہم سب کو ختم نہیں کر دے گی۔ یقیناً یہ وہی بلا ہے، جسے ترشولی کہتے ہو۔ اور اس کے سامنے ہاشم ہی نہیں، ہم سب بے بس ہیں۔"

فضیلہ کے ابو نے اثبات میں سر ہلایا۔ "میرا کوئی دن ایسا نہیں گزرتا، جب مجھے یہ خیال نہ آتا ہو کہ میری بے قصور بچی کو ایک ہاتھ سے محروم کر دیا گیا ہے۔ انگاروں پر کروٹیں بدلتا ہوں، لیکن کتنا مجبور ہوں کہ اس سے بچی کا بدلہ نہیں لے سکتا۔" اُن کے سینے سے گہری آہ نکلی۔ "ہم اُس سے نہیں لڑ سکتے۔ اور اگر لڑیں، تب بھی ہوا کو کوئی گزند نہیں پہنچا سکتے۔"

"سچ کہتے ہیں، بھائی صاحب!" ابا جی نے کہا۔

"ایک شخص ایسا ہے، جو دعویٰ کرتا ہے کہ اُس کی مدد سے ہم ترشولی سے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "آپ کو یاد ہوگا، رفیق بھائی! جب ہم پکنک پر گئے تھے تو ٹہلتے ہوئے چٹانوں کی طرف نکل گئے تھے اور وہاں تمہیں ایک سادھو نظر آیا تھا، جس نے کہا تھا کہ وہ مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔"

"ہاں، ہاں......" رفیق نے جلدی سے کہا۔ "بہت خوف ناک چہرہ تھا اُس کا۔ میں نے اپنی زندگی میں آج تک کسی کی اتنی گھنی داڑھی، مونچھیں اور جٹائیں نہیں دیکھیں۔ وہ جادوگر ہو سکتا ہے۔ اُس کے حکم پر زمین نے میرے پاؤں پکڑ لیے تھے۔"

"کیا؟" ابا جی نے حیرت سے پوچھا۔ "زمین نے پاؤں پکڑ لیے تھے؟"

"خدا کی قسم! جھوٹ نہیں کہہ رہا ہوں۔ بالکل ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے کسی نے میرے پیروں میں میخیں ٹھونک دی ہوں۔ میں نہ آگے جا سکتا تھا، نہ پیچھے ہٹ سکتا تھا۔ ایک ہی جگہ پر جم کر رہ گیا تھا۔ جب تک سادھو نے "جاؤ بچہ!" نہیں کہا، میں اسی طرح جما کھڑا رہا۔

میں نے کہا۔ "میں اُس کے پاس گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جس وقت فضیلہ کو حادثہ پیش آیا تھا، میں وہاں نہیں تھا۔ سادھو کے پاس جا کر میرے پاؤں بھی زمین سے پیوست ہو گئے تھے۔ اُس وقت سادھو نے مجھ سے کہا تھا کہ مزید ہلاکت سے بچنے کے لیے بلا سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہو تو مجھ سے سمندر کے اس جزیرے میں، جہاں رنج کنڈل نام کا مندر ہے، منگل کے دن صبح سے شام تک جب وقت ملے، آ کر ملو۔ میں واپس آیا تو وہ سانحہ رونما ہو چکا تھا، جس کے باعث فضیلہ ہاتھ سے محروم ہو گئی تھی۔ اور میں اُس کی حالت دیکھ کر ہوش و حواس کھو بیٹھا تھا۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو، سکندر!" رفیق بولا۔ "مگر اُس نے ہمیں اس چڑیل سے نجات دلانے کا دعویٰ کیا ہے تو میں پورے یقین سے کہتا ہوں کہ اُس کا دعویٰ غلط نہیں ہوگا۔ وہ ہمیں ضرور نجات دلا سکتا ہے۔"

فضیلہ کے ابو کچھ سوچتے ہوئے بولے۔ "مگر وہ تو کافر ہے۔"

"کافر ہے تو کیا ہوا۔" ابا جی نے جواب دیا۔ "کس کتاب میں لکھا ہے کہ کافر سے علاج کرانا منع ہے۔ ہم تو اپنے درد کا مداوا کرانے کے لیے اُس کے پاس جائیں گے۔ اسی طرح، جس طرح تم نے فضیلہ کے لیے مصنوعی ہاتھ کے سلسلے میں دوسرے مذاہب کے ڈاکٹروں سے بھی مشورہ کیا ہے اور اس سلسلے میں اسے انگلینڈ اور امریکہ تک لے جانے کے لیے تیار ہو۔"

"میں نے تو بس یوں ہی کہہ دیا تھا۔" فضیلہ کے ابو نے اپنے غیر ضروری تبصرے پر پشیمان ہو کر کہا۔ لیکن اگلے ہی لمحے چونک کر اُچھل پڑے۔ "ہو سکتا ہے کہ وہ سادھو، فضیلہ کو بھی ہاتھ مہیا کر دے، ایسی ترکیب بتا دے کہ ہاتھ کی کمی دُور ہو جائے۔ میں بھی تم لوگوں کے ساتھ چلوں گا۔"

"سادھو نے تم سے کسی بھی منگل کو ملنے کے لیے کہا ہے؟" ابا جی نے پوچھا۔

"جی ہاں۔" میں نے کہا۔ "یہ اس لیے کہ اہلِ ہنود منگل کو ایک مقدس اور متبرک دن تصور کرتے ہیں۔"

"اور وہ لڑکی بھی ہاشم سے صرف منگل کی رات کو ملنے کے لیے آتی ہے۔" ابا جی کچھ سوچتے ہوئے بولے۔ "یہ کوئی حُسنِ اتفاق نہیں ہے، بلکہ اس میں بھی کوئی اسرار ہے۔ کوئی ایسا راز ہے، جو سادھو سے ملنے کے بعد ہی معلوم ہو سکتا ہے۔ لڑکی اور سادھو دونوں ہی مافوق الفطرت کام انجام دیتے رہے ہیں۔ سنو بھائی صاحب!" انہوں نے گھوم کر فضیلہ کے ابو سے کہا۔

"ہم سکندر کو لے کر پیر کی صبح یہاں سے روانہ ہو جائیں گے، تاکہ منگل کے دن آسانی کے

ساتھ اُس سادھو سے مل سکیں۔"

"ٹھیک ہے۔" فضیلہ کے ابو سر ہلاتے ہوئے بولے۔ "تمہیں معلوم ہے کہ سمندر میں وہ جزیرہ کہاں ہے، جس پر مندر واقع ہے؟"

"معلوم تو نہیں ہے۔ لیکن معلوم کرلوں گا۔ ایک مچھیرا میرا جاننے والا ہے۔ اُس کی ساری زندگی اسی مندر میں گزری ہے۔ بڑھاپے اور صحت کی خرابی کے باعث وہ سمندر کے کنارے چٹانوں کے پاس آگیا ہے اور اُس کے بیٹوں نے اُس کا کام سنبھال لیا ہے۔"

اُس شام جب ابا جی اور فضیلہ کے ابو مغرب کی نماز پڑھنے مسجد گئے تھے، فضیلہ ایک بار پھر چھوٹی دیوار کے پیچھے پڑے اسٹول پر آ کھڑی ہوئی۔ میں غسل کے ارادے سے غسل خانے میں جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ "شش، شش" کی سرگوشیانہ آواز سن کر کپڑے پھینک پھانک کر دیوار کے قریب جا کھڑا ہوا۔

"تمہاری شامت آئی ہے، فضیلہ؟" میں نے کہا۔ "کسی نے دیکھ لیا تو خود بھی پٹو گی اور مجھے بھی پٹواؤ گی۔"

"ابو تو نماز کو گئے ہوئے ہیں، سسٹر رات کو آئے گی۔ خانساماں صرف دوپہر کو رات تک کا کھانا تیار کرنے آتا ہے اور دو ڈھائی گھنٹے میں فارغ ہو کر چلا جاتا ہے۔ امی اپنے کمرے میں مگن بیٹھی چھوٹے چھوٹے لباس تیار کر رہی ہیں۔"

"چھوٹے لباس؟"

"اُس بھائی کے، جو ابھی اس دنیا میں نہیں آیا۔"

"کب تک آجائے گا؟"

فضیلہ ہنس پڑی، جیسے میں نے کوئی پُر مزاح بات پوچھ لی ہو۔ رخسار تمتما اُٹھے۔ سنہرے بالوں کو جھٹکتے ہوئے بولی۔ "دو چار مہینے بعد۔" پھر فوراً ہی موضوع بدل کر بولی۔

"پچھلے ایک گھنٹے سے ایک ہی بات سوچے جا رہی ہوں، بھائی جی اور سکندر بھائی کہنے پر پابندی لگ گئی ہے، اب آپ کو کیا کہہ کر مخاطب کروں؟"

"یہ بھی کوئی دریافت طلب مسئلہ ہے؟ بس وہی کہا کرو، جو تمہاری امی تمہارے ابو کو کہا کرتی ہیں۔"

وہ ہنسی سے دوہری ہوگئی۔ "امی تو انہیں فضیلہ کے ابو کہتی ہیں۔"

میں بھی ہنسنے لگا اور اسی طرح ہنستے ہوئے بولا۔ "تم مجھے مُنّے کے ابو کہہ لیا کرو۔"

وہ سمجھ تو گئی کہ مُنّے سے میری کیا مراد ہے۔ کیونکہ اُس کی آنکھیں اچانک خمار آلود ہوگئی تھیں اور رخساروں کی سرخی پورے چہرے پر پھیل گئی تھی۔ لیکن انجان سی بن کر بولی۔

"مُنّا کون ہے؟"

"مُنّا......" میں نے کہا۔ "درحقیقت مُنّا نہیں ہے۔ لیکن آجائے گا۔"

اچانک اُس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔ نگاہیں بازو کے اُس حصے پر جم گئیں، جہاں کڑھے ہوئے پٹھانی کرتے کی خالی آستین جھول رہی تھی۔

میں اُس کے آنسو خشک کرنے کے لیے تڑپ اُٹھا۔ "فضیلہ!...... فضیلہ!" میں نے مضطربانہ انداز میں کہا۔ "تم تو بڑی باہمت اور حوصلہ مند لڑکی ہو۔"

اُس نے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی آنکھوں پر پھیری اور سسکاری بھر کر بولی۔

"میں مر جاتی تو زیادہ اچھا ہوتا۔ روز روز کے اس عذاب سے تو چھٹکارا مل جاتا۔"

میں نے کہا۔ "کیا یہ سمجھ لوں کہ تم مجھے کوس رہی ہو؟"

اُس کی آنسوؤں بھری آنکھیں سوالیہ انداز میں میرے چہرے پر جم گئیں۔ "تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ پھر بھی ایسی باتیں کہہ رہی ہو، جسے کوسنا ہی کہا جا سکتا ہے۔"

"میں جا رہی ہوں۔" وہ بولی۔ "ابو نماز ختم کر کے آنے ہی والے ہوں گے۔"

"سنو فضیلہ!" میں نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے روکتے ہوئے کہا۔ "جس طرح آج تم سے تنہائی میں ملاقات ہوئی تھی، اس طرح ہمیں کوئی اور موقع نہیں مل سکتا؟"

اُس نے انکار میں سر ہلایا۔ "فی الحال نہیں۔ ایسے تو کوئی آثار نظر نہیں آتے۔" اُس کا دُکھ کم نہیں ہوا تھا۔ آواز میں پہلے جیسی شگفتگی اور بے ساختگی نہیں تھی۔

"کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ رات کو جب تمہارے گھر والے سو جائیں تو تم دیوار پر چڑھ کر میرے پاس آجایا کرو۔ میں دیوار سے میز لگا کر رکھ دوں گا۔"

اُس نے جھانک کر ہمارے گھر کا فرش دیکھا، ایک عجیب سے انداز میں مسکرائی اور انکار میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ "میز رکھنے کی زحمت نہ کریں۔ میں میز کے بغیر بھی آسکتی ہوں۔"

اس سے پہلے کہ میں کچھ اور کہتا، وہ اسٹول سے نیچے کود گئی۔ میں لپک کر کرسی اُٹھا لایا اور اس پر کھڑا ہو کر دیوار پر جھک گیا۔ فضیلہ اپنے کمرے میں جا چکی تھی۔ پورا گھر سائیں سائیں کر رہا تھا۔

میں نے ایک طویل، سرد آہ بھری اور کرسی سے اُتر کر غسل خانے کی طرف روانہ ہوگیا۔

ابا جی مسجد سے آئے تو میں اُن سے اجازت لے کر کچھ دیر کے لیے بھائی جان سے ملنے اُن کے ہوسٹل چلا گیا۔ رفیق نے ہم لوگوں کو جو کہانی سنائی تھی، بھائی جان نے اس کی تصدیق کر دی۔ فرق اتنا تھا کہ رفیق کے کہنے کے مطابق بھائی جان پُراسرار لڑکی سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے تھے۔ جبکہ خود بھائی جان کا ارشاد تھا کہ وہ نورین سے چھٹکارا چاہتے ہیں۔ وہ اس لڑکی کو کسی قیمت پر نہیں چھوڑ سکتے۔

میں نے کہا۔ "رفیق بھائی تو بتا رہے تھے کہ وہ لڑکی حیرت انگیز قوتوں کی مالک ہے اور آپ کو مرعوب کرنے کے لیے اپنی قوت کو بروئے کار لا کر دو بے گناہ افراد کا خون کر چکی ہے۔"

"مجھے مرعوب کرنے کے لیے نہیں، اپنی بے لوث، بے غرض محبت کا اظہار کرنے کے لیے اُس نے ایسا کیا ہے۔" بھائی جان نے تردید کی۔ "اُسے مجھ سے اتنی محبت ہے، اتنی محبت ہے کہ وہ میری خاطر پوری دنیا کو ختم کر سکتی ہے۔"

جتنی عجیب و غریب لڑکی تھی، اتنی ہی عجیب و غریب اُس کی محبت تھی۔ اظہارِ محبت کے لیے دو بے گناہ افراد کا قتل کرا سکتی تھی اور محبت کا ثبوت پیش کرنے کے لیے پوری دنیا کو نیست و نابود کرنے کے لیے تیار تھی۔

"بھائی جان.......!" میں نے پوچھا۔ "کیا یہ درست ہے کہ لڑکی نے آپ کو دھمکی دی ہے اور کہا ہے کہ اگر کبھی آپ نے اُس سے بے وفائی کی تو وہ مجھے اور ابا جی کو ختم کر کے بھرپور انتقام لے گی؟"

"اگر یہ بات رفیق نے کہی ہے، تو وہ بکواس کرتا ہے۔ اُس نے کوئی دھمکی نہیں دی۔ دھمکی اُسے دی جاتی ہے، جس سے بے وفائی کا ڈر ہو۔ وہ اچھی طرح جانتی ہے کہ میں بے وفائی نہیں کر سکتا۔ اس کے برعکس اُس کا کہنا ہے کہ اگر میں ایک چھوٹے سے کام کے سلسلے میں اُس کی مدد کر دوں تو وہ مجھے، تمہیں اور ابا جی کو ملک کا امیر ترین خاندان بنا دے گی۔"

"کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ بے انتہا پُراسرار طاقت و قوت رکھنے والی لڑکی آپ سے کون سا چھوٹا سا کام کرانا چاہتی ہے؟"

"نہیں، یہ میرا اور اُس کا معاملہ ہے۔"

"گویا آپ اُس کا کام کرنے کے لیے ذہنی طور پر آمادہ ہو چکے ہیں؟"

"ہاں....... میں اُسے کھونا نہیں چاہتا۔"

"اگر آپ نے اُس کا کام نہیں کیا تو کیا وہ آپ کو چھوڑ جائے گی؟"

"مر جائے گی۔ ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ وہ چند ماہ سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکتی۔"

"آپ بھی تو نصف سے زیادہ ڈاکٹر ہیں۔ آپ کا کیا کہنا ہے؟"

"اس ضمن میں میرا کوئی تجربہ نہیں ہے۔ میں تو بس اتنا جانتا ہوں کہ اُسے ہر قیمت پر زندہ رہنا ہے۔"

میرے جسم میں سوئیاں سی چبھنے لگی تھیں۔ ترشولی جس خوب صورت بدن میں بھائی جان کے پاس آئی تھی، اُس نے اچھے اچھوں کی تمیز چھین لی تھی اور وہ اُس کی خاطر ذلیل سے ذلیل کام بھی کر سکتے تھے۔

اپنے خیال کو میں نے مزید تقویت دینے کے لیے پوچھا۔ "آپ نے اُس کا کام کر دیا تو کیا وہ مرنے سے بچ جائے گی؟ اور کیا اُس کی زندگی میں، جس سے ڈاکٹر صاحب مایوس ہو چکے ہیں، غیر معمولی اضافہ ہو جائے گا؟"

"یقیناً۔" بھائی جان نے کہا۔ "کسی ایسے چراغ کو دیکھا ہے، جو تیل ختم ہو جانے پر ٹمٹمانے لگتا ہے۔ اس میں دوبارہ تیل ڈال دیا جائے تو کیا ہوتا ہے۔ نہ صرف چراغ بجھنے سے بچ جاتا ہے، بلکہ اس کی زندگی بھی بڑھ جاتی ہے۔"

ساری بات میری سمجھ میں آ چکی تھی اور ترشولی کو، جو نہ جانے کس حسین لڑکی کے مُردہ جسم میں آ چکی تھی اور بھائی جان کے اعصاب پر سوار ہو گئی تھی، اچھی طرح پہچان گیا تھا۔ یہ خوبی اُس میں تھی کہ جس کو نظر بھر کر دیکھ لیتی، اُسے اپنی محبت کے جال میں پھانس لیتی تھی۔

اُس کے جال میں پھنسنے والے اسی قسم کی بے تکی تاویلات کیا کرتے تھے۔ ورنہ انسانی زندگی کا چراغ سے کیا تعلق؟ ابھی تک تو کوئی ایسا تیل ایجاد نہیں ہوا تھا، جو دم توڑتے ہوئے انسان کو چراغ کی طرح نئی قوت اور نئی زندگی دے سکے۔

"اُس کا نام کیا ہے؟"

"کہکشاں۔"

"جی نہیں۔" میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "اُس کا اصل نام ترشولی ہے۔"

"حد سے بڑھنے کی کوشش مت کرو، سکندر!" بھائی جان بگڑ کر بولے۔ "میں اُس کریہہ صورت عورت کو دو بار دیکھ چکا ہوں۔ اُس منحوس کا نام لے کر مجھے ورغلانے کی کوشش مت کرو۔

اچھی طرح سمجھ لو کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو دیوانہ وار چاہتے ہیں۔ اور اب تک جو شخص ہماری راہ میں حائل ہوا ہے، اُسے جان سے ہاتھ دھونا پڑے ہیں۔ کہکشاں کو پتہ چل گیا کہ تم مجھے اُس سے بدظن کرنے کے لیے اُسے دنیا کی غلیظ ترین مخلوق قرار دے رہے ہو تو وہ تمہیں زندہ نہیں چھوڑے گی۔" وہ کھڑے ہو گئے۔ "بہتر یہ ہو گا کہ تم یہاں سے چلے جاؤ۔"

میں نے انہیں سمجھانے اور ترشولی کے کرتوت بتانے کی کوشش کی، لیکن وہ کچھ بھی سننے کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ کہنے لگے۔ "بکواس بند نہیں کرو گے تو میں خود باہر نکل جاؤں گا۔"

مجبوراً دل ہی دل میں کڑھتا اور بھائی جان کی حالت زار پر افسوس کرتا ہوا گھر چلا آیا۔ ترشولی نے اُن سے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں چھین لی تھیں۔ انہیں نہ تعلیم کی پروا تھی، نہ نورین کا خیال۔ ترشولی بڑی خوش اسلوبی سے انہیں تباہ کر رہی تھی۔

گھر پہنچا تو فضیلہ کی امی سے بالکل ہی الگ کہانی سننے کو ملی۔ عشاء کے وقت ہماری گلی سے ایک عورت شیر خوار بچے کو گود میں لیے ہوئے گزر رہی تھی۔ گلی کے سرے پر عامل کامل کا مکان تھا۔ وہی عامل کامل جس کو چند سال پہلے کچھ ڈاکوؤں نے قتل کر دیا تھا۔ قتل کے بعد کچھ دنوں کی تحقیق و تفتیش کے سلسلے میں عامل کامل کا مکان پولیس کی تحویل میں رہا تھا۔ بعد کے واقعات کچھ یوں تھے کہ ضابطے کی کارروائی کے بعد مکان کا قبضہ عامل کے کسی عزیز کو دے دیا گیا تھا۔ لیکن جب وہ مکان میں رہنے کی نیت سے آیا تو نجانے اُسے کیا نظر آیا کہ راتوں رات وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ پھر یکے بعد دیگرے دو کرائے دار آئے اور دونوں کے خاندانوں نے مکان سے باہر گلی میں اپنی پہلی راتیں گزاریں اور صبح ہوتے ہی پڑوسیوں سے یہ کہہ کر کہ مکان آسیب زدہ ہے، نو دو گیارہ ہو گئے۔ اس کے بعد سے وہ مکان خالی پڑا ہوا تھا۔

فضیلہ کی امی کے کہنے کے مطابق جب وہ عورت، شیر خوار بچے کو گود میں لیے عامل کامل کے مکان کے سامنے سے گزری تو اچانک ایک سر کٹا انسان مکان سے باہر نکلا اور بچے کو چھین کر دوبارہ اسی مکان میں گھس گیا۔ عورت کی چیخ و پکار پر سارے محلے والے اکٹھے ہو گئے۔ مکان کی تلاشی لی گئی، چپہ چپہ دیکھ ڈالا گیا لیکن نہ بچے کا پتہ چل سکا اور نہ مکان میں کوئی سر کٹا نظر آیا۔ سر کٹے کی تلاش جاری تھی، لیکن تلاش کا دائرہ کار بڑھا دیا گیا تھا۔ مکان کے علاوہ بھی آس پاس پڑوس کی گلیوں، سڑکوں اور مکانوں میں ڈھونڈا جا رہا تھا۔ عورت نے جس سر کٹے آدمی کو دیکھا تھا، اُس کے بارے میں فرض کر لیا گیا تھا کہ اُس کا تعلق بچوں کو اغواء کرنے والے کسی گروہ سے تھا، جس نے ڈراؤنا بھیس بدل کر عورت سے اُس کے بچے کو جھپٹ لیا تھا۔ فضیلہ کی امی ظاہر... سے یہ واقعہ سنانے میرے پاس آئی تھیں۔ وہ بہت زیادہ خوف زدہ تھیں۔ انہوں نے اپنی... سے اپنے اس خوف کا اظہار نہیں کیا، لیکن چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ اُن کے ذہن میں

کی موت سے لے کر فضیلہ کے ہاتھ کی محرومی تک کے واقعات گردش کر رہے تھے۔ اور یہ سوچنے میں بھی وہ حق بجانب تھیں کہ بلا سے چھٹکارا ابھی نہیں ملا ہے، بلکہ اب دروازے تک پہنچ گئی تھی۔

میں بھائی کے پاس سے بہت پریشان ہو کر واپس آیا تھا۔ فضیلہ کی امی نے جو داستان سنائی، اس نے اور زیادہ پریشان کر دیا۔ کچھ دن غائب رہنے کے بعد ترشولی ایک بار پھر اپنی تمام تر تباہ کاریوں کے ساتھ حملہ آور ہو گئی تھی۔ ایک طرف اُس نے بھائی جان کے دل و دماغ پر قبضہ کر لیا تھا اور دوسری طرف وہ عامل کامل کے گھر سے برآمد ہو کر ایک شیر خوار بچے کو اُس کی ماں کی گود سے چھین کر لے گئی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ اس عورت کو دوبارہ اپنے بچے کو دیکھنے اور اُس کو پیار کرنے کا موقع نہیں ملے گا۔

رانی نے بتایا تھا کہ وہ بڑے ذوق و شوق سے انسانی ہاتھوں کو کھاتی ہے، اور باقی ماندہ جسم کو فضا میں بکھرے ہوئے اُس کے بے شمار بھائی بند ہڑپ کر جاتے ہیں۔ اور میں یہ بھی جانتا تھا کہ کہکشاں کے روپ میں بھائی جان پر مسلط ہونے والی بھی ترشولی ہی تھی اور وہ اُن سے کسی قسم کا چھوٹا سا کام کرانا چاہتی تھی۔

بمشکل کروٹیں بدل بدل کر نیند آئی۔ آنکھ لگی ہی تھی کہ کسی نے میرا ہاتھ پکڑ کر ہلایا اور میں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ سامنے فضیلہ کھڑی تھی۔

"تم.......؟" میں نے حیرت سے سوال کیا۔

اُس کا جسم لرز رہا تھا۔ وہ خاموشی سے میرے پاس بیٹھ گئی اور میرا ہاتھ اپنے دل پر رکھ لیا۔

"دیوار کود کر آئی ہو؟"

اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"تمہارے امی، ابو کو پتہ چل گیا تو کیا ہو گا؟"

فضیلہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میرے ہاتھ کی اُنگلیوں کو دیکھنے لگی۔ اور تب نہ اُس نے کچھ کہا اور نہ میں نے۔ اچانک ایک طوفان آیا، جس نے ہم دونوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

صبح ہونے میں کچھ دیر باقی تھی۔ طوفان اپنے اختتام کو پہنچ چکا تھا۔ میں نے فضیلہ کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے گھر واپس چلی جائے۔

"میں واپس جانے کے لیے نہیں آئی ہوں۔" اس نے اتنی سنجیدگی سے کہا کہ میں اُس کا جواب سن کر حیران رہ گیا۔ "اب تو یہاں سے میرا جنازہ ہی باہر جائے گا۔"

میری ساری منتیں سماجتیں بے سود ثابت ہوئیں، طلوع آفتاب تک ہم دونوں گھروں میں چھوٹا موٹا زلزلہ آ چکا تھا۔ ابا جی نے، فضیلہ کے امی ابو نے اور خود میں نے فرداً فرداً فضیلہ کو سمجھایا، پھر اجتماعی طور پر اُسے سمجھانے کی کوشش کی گئی۔ لیکن وہ کسی طرح بھی گھر جانے پر رضامند نہ

ہوئی۔ گزشتہ شب کے دوسرے پہر میں نے اپنے گھر میں ترشولی کو دیکھا تھا، جس نے ساحل سمندر پر اُسے ہمیشہ کے لیے دائیں ہاتھ سے محروم کر دیا تھا۔ اُس عورت کے پیروں میں چند ماہ کا ایک نیم مُردہ بچہ پڑا ہوا تھا، جس کے ہاتھ کو وہ کتیا کی طرح جھنجھوڑ کر کھا رہی تھی۔ اور فضیلہ کو ایسی نظروں سے دیکھ رہی تھی، جیسے اُسے جتا رہی ہو کہ تم بار بار مجھ سے بچ نہیں سکتی ہو۔

"ابو!" اُس نے اپنے والد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "مجھے بے حیا یا بے شرم کہیں یا آوارہ اور بدمعاش۔ مجھے بندوق کی گولی مار دیں یا میرے دل میں چاقو اُتار دیں۔ میں اس گھر میں نہیں جاؤں گی، جہاں موت انتہائی بھیانک انداز میں میرا انتظار کر رہی ہے۔"

فضیلہ نے یہ واقعہ مجھے نہیں بتایا تھا۔ اور میں بھی جذبات سے مغلوب ہو کر اُس سے پوچھنا بھول گیا کہ اتنی رات گئے اُس نے اتنا اہم قدم کیوں اُٹھایا۔ میرا خیال تھا کہ میری محبت اُسے میرے پاس کھینچ لائی ہے۔

سب حیران و پریشان بیٹھے تھے، کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ فضیلہ کا دوٹوک فیصلہ سننے کے بعد کیا، کیا جائے۔ اسی دوران سسٹر لوسی معذرت چاہتی ہوئی ہمارے گھر کے اندر داخل ہوئی۔ اُس کا چہرہ اُترا ہوا تھا اور آنکھوں سے وحشت ٹپک رہی تھی۔ اُس نے فضیلہ کی امی کے قریب جا کر کوئی چیز زمین پر ڈالتے ہوئے کہا۔

"یہ فضیلہ کے کمرے کے سامنے پڑا ہوا تھا۔"

فضیلہ کی امی کے منہ سے بھیانک چیخ نکلی اور وہ زمین پر ڈالی گئی چیز سے کئی قدم پیچھے ہٹ گئیں۔ دوسروں نے بھی دیکھا اور میں نے بھی دیکھا۔ سسٹر نے فضیلہ کی امی کے سامنے ننھے سے ہاتھ کا خون آلود پنجہ ڈالا تھا اور اس طرح اُس کا ایک ایک حرف سچا تھا۔

"سکندر!" اباجی نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ "اس پنجے کو اُٹھاؤ اور گھر کے پچھلے حصے میں گڑھا کھود کر دبا دو۔"

میرا وہاں سے ہٹنے کے لیے دل نہیں چاہ رہا تھا۔ لیکن حکم عدولی بھی نہیں کی جا سکتی تھی۔ میں نے پنجہ اُٹھایا اور عقبی حصے میں چلا گیا۔ تقریباً سات آٹھ منٹ بعد گڑھا کھودنے اور چھوٹی چھوٹی انگلیوں کے نازک سے پنجے کو دبا کر واپس اپنے کمرے میں پہنچا تو سسٹر اور فضیلہ کے سارے افراد غائب تھے۔

"یہ لوگ کہاں گئے، سسٹر؟" میں نے پوچھا۔

سسٹر لوسی کے چہرے پر اب پہلے جیسی وحشت نہیں تھی۔ فضیلہ کا غصہ بھی کافور ہو چکا تھا۔ اس کے برعکس اُس کی جگہ رخساروں پر وہی گہری سرخی تھی، جو شدتِ جذبات کے باعث چھا جاتی تھی۔ اور یوں محسوس ہونے لگتا تھا، جیسے چند لمحوں سے گرم گرم خون ٹپک پڑے گا۔

"بتاؤ، فضیلہ!" لوسی نے شریر لہجے میں کہا۔

فضیلہ بیر بہوٹی بن گئی۔

"سکندر!" لوسی بولی۔ "فضیلہ کی طرف دیکھو اور سمجھنے کی کوشش کرو کہ سب لوگ کہاں جا سکتے ہیں؟"

میں نے فضیلہ کی طرف دیکھا۔ اُس کے ہونٹوں پر ایک ملکوتی مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی اور آنکھوں کے ڈورے کسی شرابی کی طرح سرخ ہو رہے تھے۔

"مجھے تو ایسا لگ رہا ہے، جیسے فضیلہ کی ضد کے آگے کسی کی ایک نہیں چلی۔" میں نے کہا۔ "اب یہ ہمیشہ میرے پاس ہی رہے گی۔"

"جواب درست ہے۔" لوسی نے ہنس کر کہا۔ "باقی تفصیلات مجھ سے سن لو۔ تمہارے اباجی، قاضی کو بلانے گئے ہیں اور فضیلہ کے ابو مٹھائی خریدنے اور فضیلہ کی امی سامان لانے، جو انہوں نے جہیز کے لئے اکٹھا کیا تھا۔ حقیقت یہ کہ میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ میں نے فضیلہ کا باغ و بہار چہرہ دیکھ کر یوں ہی تکا سا لگا دیا تھا۔ اصل بات لوسی کی وضاحت کے بعد سمجھ میں آئی۔ دونوں گھروں کے تینوں بڑوں نے اچانک فیصلہ کر لیا تھا کہ جو کام کل کرنا ہے، وہ آج ہی کر لیا جائے۔ کیونکہ فضیلہ واپس گھر جانے کے لیے تیار نہیں تھی اور ہمارے ہاں صرف اسی وقت قیام کر سکتی تھی جب کہ مجھے اور اُسے شادی کے بندھن میں باندھ دیا جائے۔ البتہ مسرت اور انبساط کے ان حیات افزاء لمحات میں کچھ یوں محسوس ہوا، جیسے کوئی ڈرامہ اسٹیج کیا جا رہا ہو اور اسے لوسی اور فضیلہ نے خوب سوچ سمجھ کر ترتیب دیا ہوا۔ شیر خوار بچے کے ماں کی گود سے چھینے جانے میں یا اُس بچے کے ہاتھ کا پنجہ فضیلہ کے کمرے کے سامنے ملنے میں اگرچہ ان دونوں کا کوئی ہاتھ نہیں ہو سکتا تھا، تاہم ان واقعات نے سونے پر سہاگے کا کام کیا تھا۔ جس کے باعث ڈرامے کو طربیہ اختتام تک پہنچانے میں آسانی ہو گئی تھی۔

فضیلہ بہت سیدھی سادی اور معصوم سی لڑکی تھی۔ لوسی کسی کام سے اُٹھ کر باتھ روم میں گئی تو میرے استفسار پر اُس نے تسلیم کر لیا کہ دو روز قبل جب اُس نے لوسی کو بتایا تھا کہ وہ میرے بغیر ایک پل بھی نہیں رہ سکتی اور یہ کہ اُس کے امی ابو فوری طور پر شادی کرنے سے صاف انکار کر چکے ہیں، تب لوسی نے اُسے یہ ترکیب سمجھائی تھی کہ وہ شرم کو بالائے طاق رکھ کر میرے پاس پہنچ جائے اور واشگاف الفاظ میں کہہ دے کہ اس کا اصلی گھر یہی ہے اور وہ اس گھر کو چھوڑ کر کہیں نہیں جائے گی۔ منصوبے پر کئی روز بعد عمل کرنا تھا۔ کل شام تک اُس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اتنا اہم قدم آج ہی اُٹھانا ہے۔ لیکن جوں ہی اُسے معلوم ہوا کہ کسی عورت سے کسی سرکٹی مخلوق نے اُس کے بچے کو چھین لیا ہے تو ہم نے فیصلہ کیا کہ اس سے فائدہ اُٹھایا جائے۔

دن بھر کی چھٹی کے بعد جب لوسی گھر واپس لوٹی اور فضیلہ نے اُسے اپنے فیصلے سے آگاہ کیا تو اُس نے نہ صرف یہ کہ اُس کی ہاں میں ہاں ملائی بلکہ دیوار پر چڑھانے اور ہمارے گھر میں اُسے اُتارنے میں بھی بھرپور مدد دی۔

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم نے بچے کا ہاتھ چبانے کی جو کہانی سنائی، وہ بالکل غلط تھی؟''

''نہیں، وہ کہانی غلط نہیں تھی۔ اس کا ایک ایک لفظ درست ہے۔ وہ بدصورت ترشولی نظر نہ آتی تو شاید میں اپنے فیصلے کو مؤخر کر دیتی۔ کیونکہ گھر چھوڑنے کا تصور بہرحال بڑا تکلیف دہ تھا۔''

''مسٹر نے بھی اُس عورت کو دیکھا تھا؟''

''نہیں۔'' فضیلہ نے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہ اُس نے دیکھا، نہ میں نے بتانا مناسب سمجھا۔ بتا دیتی تو شاید وہ ڈر جاتی اور میری مدد سے ہاتھ کھینچ لیتی۔''

''تم نہیں ڈریں؟''

''میں تو جانتی ہی نہیں کہ ڈر کسے کہتے ہیں؟'' وہ بولی۔ ''اگر مجھے آپ کے پاس نہ آنا ہوتا تو چاہے میرا دوسرا ہاتھ بھی ضائع ہو جاتا، میں اس معصوم بچے کے مُردہ جسم کو اُس کے ہاتھوں سے ضرور چھین لیتی۔''

''یہ مت کہو کہ تمہیں ڈر نہیں لگتا۔ پچھلے دنوں میں کئی مرتبہ تم مجھ سے اپنے خوف کا اظہار کر چکی ہو۔''

''اس خوف میں اور کسی کو دیکھ کر خوف زدہ ہو جانے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ مجھے صرف اور صرف اس بات کا خوف ہوا کرتا تھا کہ کہیں کوئی آپ کو مجھ سے چھین نہ لے۔''

''ایک بات اور بتا دو؟'' میں نے کہا۔ ''مسٹر، ہاتھ میں جو پنجہ لے کر آئی تھی، کیا وہ اسی کا تھا، جس کا ہاتھ ترشولی کھا رہی تھی؟''

''میرے خیال میں اُسی کا ہوگا۔'' اس نے کہا۔ ''ویسے وہ پنجہ، مسٹر کو بالکل اتفاقیہ طور پر مل گیا۔ منصوبے میں پنجہ شامل نہیں تھا۔ اس کے برعکس مسٹر کو وحشیانہ انداز میں چیختے ہوئے یہ کہنا تھا۔ اور جو لوگ مجھے گھر واپس آنے کی نصیحت کر رہے تھے، اُن سے کہنا تھا کہ فضیلہ کے کمرے میں ایک چڑیل بیٹھی ہے اور کہہ رہی ہے کہ فضیلہ کو بلا کر لاؤ، مجھے اُس کا خون پینا ہے۔''

میں بے اختیار ہنسنے لگا۔ سارا کیا دھرا اُسی کا تھا۔ اور فضیلہ میں یہ جو تھوڑی بہت تیزی چالاکی آ گئی تھی، وہ لوسی جیسی تجربہ کار، جہاں دیدہ نرس کی بدولت تھی۔ ورنہ بھولپن تو اب بھی اُس کے رویئے رویئے سے ٹپکتا تھا۔ معصومیت کا دوسرا نام فضیلہ تھا۔

ابا جی، قاضی کو بلانے نہیں، بلکہ بعد نماز ظہر آنے کے لیے کہنے گئے تھے۔ واپسی پر انہوں نے رفیق کو بھائی جان کے پاس دوڑایا۔ پڑوس کے دو چار معززین کو اکٹھا کیا، پندرہ کلو

چھوہارے خریدے، گھر آ کر فضیلہ کے ہاں سے نورین کے گھر فون کیا کہ اپنے امی ابو کو لے کر فوراً پہنچ جاؤ۔ سکندر کا نکاح پڑھوایا جا رہا ہے۔

فضیلہ کے ابو کے متعلق بھی لوسی کو غلط فہمی ہوئی تھی۔ وہ مٹھائی لینے نہیں، بلکہ باورچی کو ساٹھ آدمیوں کے کھانے کا آرڈر دینے گئے تھے۔ فضیلہ کی امی پڑوس کی کئی لڑکیوں اور عورتوں کو دعوت دے آئی تھیں۔ اور کچھ لڑکیوں کی مدد سے اُنہوں نے دس بجے صبح ہی سے ہلکا پھلکا جہیز ہمارے ہاں منتقل کرنا شروع کر دیا تھا۔ بہانہ یہ بنایا تھا کہ گزشتہ رات فضیلہ کے ابو کو دل کا دورہ پڑا، اُنہوں نے اسی شدید تکلیف کے عالم میں سکندر کے ابا جی کو بلا کر فضیلہ کا ہاتھ اُن کے ہاتھ میں دے دیا کہ آج سے یہ تمہاری بہو ہی نہیں، بیٹی بھی ہے۔ طبیعت کچھ سنبھلی تو اُنہوں نے شور مچانا شروع کر دیا کہ اس سے پہلے کہ دوسرا دورہ پڑے، فضیلہ اور سکندر کی شادی کر دی جائے۔ صبح ہوئی تو اَڑ گئے کہ آج ہی نکاح پڑھا دیا جائے کیونکہ دوسرے دورے کی کوئی میعاد مقرر نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے، آج ہی رات کو دورہ پڑ جائے، جو جان لیوا ثابت ہو اور وہ بیٹی کے فرض سے سبکدوش ہوئے بغیر ہی اس دنیا سے رخصت ہو جائیں۔ اب دیکھو کس طرح ہشاش بشاش گھومتے پھر رہے ہیں۔ کوئی کہہ سکتا ہے کہ رات کو اُن کو دل کا دورہ پڑا ہے؟

بہانہ ایسا نہیں تھا کہ عورتوں کو یقین آ جاتا۔ کچھ نے کہا، نیک اور شریف لڑکے کے سر پر اپنی ہاتھ کٹی لڑکی کو منڈھنے کے لیے دل کے دورے کا حیلہ بنایا گیا ہے۔ اور کچھ کہنے لگے کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ جس کی وجہ سے لڑکی کو نہ مایوں بٹھایا گیا، نہ مہندی کی رسم کی گئی۔ بس اچانک شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا۔

نکاح سے کچھ دیر قبل انجینئر صاحب بے پناہ مصروفیات کے باوجود اپنی بیگم کے ساتھ شرکت کرنے کے لیے آئے۔ ایکا ایکی والی شادی پر متحیر بھی تھے۔ لیکن ابا جی نے ایک طرف لے جا کر انہیں ساری بات سمجھا دی کہ فضیلہ کو گھر میں ترشولی سے خطرہ لاحق ہو گیا ہے اور وہ جان بچا کر ہمارے ہاں بھاگ آئی تھی۔ اور چونکہ کسی بھی طرح گھر جانے پر راضی نہیں ہو رہی تھی، اس لیے طے کیا گیا کہ سکندر اور فضیلہ دونوں کو رشتہ ازدواج میں منسلک کر دیا جائے۔

نورین کی امی میرے سر پر ہاتھ پھیرنے آئیں تو میں نے پوچھا۔

''نورین کیوں نہیں آئی؟''

''منگنی کے بعد سے آج تک وہ کہیں اکیلی نہیں گئی۔'' انہوں نے کہا۔ ''ہاشم کے پاس ہوسٹل گئی ہوگی۔ اُس کے ساتھ ہی آئے گی......لو، دونوں آ گئے۔ بڑی عمر ہے ان کی۔''

میں نے دروازے کی طرف دیکھا۔ بھائی جان اور نورین مسکراتے ہوئے چلے آ رہے تھے۔ یقین نہیں آیا کہ یہ وہی بھائی جان ہیں، جو گزشتہ رات ترشولی جیسی ذلیل کی خاطر جو نہ جانے کس

بدنصیب لیکن خوب صورت لڑکی کے روپ میں اُن کے پاس گئی تھی، نورین جیسی والہانہ محبت کرنے والی لڑکی کو چھوڑنے پر آمادہ تھی۔ لڑکپن کی ایک چھوٹی سی غلطی کے علاوہ جو اُس نے مجھ سے اظہارِ محبت کر کے کی تھی، بھائی جان کو ہی ہمیشہ چاہا تھا۔

کم از کم اتنی بات تو میں پورے یقین اور اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا تھا کہ جب سے ان دونوں کا رشتہ طے ہوا تھا، نورین کے ذہن میں بھائی جان کے علاوہ کسی دوسرے شخص کا تصور تک نہیں آیا تھا۔ اُس نے اپنی تمام آرزوؤں اور تمناؤں کا مرکز بھائی جان کو ہی بنا رکھا تھا۔ ہمارے معاشرے میں جہاں کورٹ شپ کی اجازت ہے اور نہ ہی کسی لڑکی کو منگیتر کے ساتھ گھومنے پھرنے کی، بھائی جان کے ہمراہ رہ کر وہ اچھی خاصی بدنام ہو چکی تھی۔ اس لیے وہ اس بدنامی کو بھی نیک نامی اور باعث افتخار سمجھتی تھی۔

سرگوشی میں بھائی جان سے کچھ کہہ کر نورین، فضیلہ کے کمرے میں چلی گئی، جہاں دُلہن کو سجایا سنوارا جا رہا تھا۔ بھائی جان مسکراتے ہوئے میرے پاس چلے آئے۔ پہلے اُنہوں نے بڑے ادب سے نورین کی امی کو سلام کیا، پھر میرے سر پہ ہلکی سی چپت لگا کر بولے۔

"یار! کل رات تک تو تم اچھے بھلے تھے۔ راتوں رات یہ کیا انقلاب آ گیا؟"

میں ہنسنے لگا۔

"سنو سکندر!" اچانک اُنہوں نے پینترا بدل کر کہا۔ "یہ شادی نہیں ہو سکتی۔"

"کیا؟" میں اچھل پڑا۔ نورین کی امی سمیت سب لوگوں کی نظریں بھائی جان پر جم گئیں۔

"دیکھو، دولہا کی شادی دُلہن سے اور دُلہن کی شادی دُولہا سے ہوتی ہے۔" بھائی جان بولے۔ "مجھے بتایا گیا ہے کہ دُلہن تیار ہو رہی ہے۔ جبکہ تم ہونق بنے ہوئے ہو۔ یہ شادی اس وقت تک نہیں ہو گی، جب تک تم بھی باقاعدہ دُولہا نہیں بن جاؤ گے۔"

قہقہوں کی گونج میں مجھے جلدی جلدی دُولہا بنایا گیا۔ ڈھونڈ ڈھانڈ کر اباجی کی شیروانی نکالی گئی، استری کی گئی، میرے لیے نئے کرتے پاجامے کا سوٹ اور پھولوں کا سہرا منگوایا گیا۔ قاضی صاحب کے آتے آتے مجھے دُولہا بنایا جا چکا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ میں موجودہ سج دھج میں کارٹون معلوم ہو رہا ہوں۔ دُلہن بنی ہوئی فضیلہ اتنی ہی زیادہ پیاری سی جاپانی گڑیا معلوم ہو رہی ہو گی۔

نکاح کا انتظام فضیلہ کے گھر فرش پر دری بچھا کر کیا گیا۔ اُدھر میں نے قاضی صاحب کی ہدایت پر تین مرتبہ قبول، قبول، قبول کہا اور اُدھر مبارکباد کا تانتا لگ گیا۔ کم و بیش پچیس مہمان تھے۔ باری باری سب نے مجھے مبارک باد دی۔ نورین کو پتہ چلا کہ نکاح ہو گیا ہے تو وہ دُلہن کو چھوڑ کر بھاگی بھاگی مجھے مبارکباد دینے آ گئی۔

"زندگی کا نیا سفر مبارک ہو، سکندر!" اُس نے کہا۔

"شکریہ۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اصولی طور پر تو پہلے تمہارے اور بھائی جان کے سہرے کے پھول کھلنا چاہئیں تھے۔"

"کیا کروں۔ یہ دور ہی بے اصولی کا ہے۔" وہ منہ بنا کر بولی۔ پھر دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگی۔ "ارے سکندر! یہ لڑکی کون ہے؟"

"یہ........ یہ........" میں نے اپنی جانب آتی ہوئی لڑکی کو پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ رانی ہے۔"

وہ رانی ہی تھی۔ سیاہی مائل رنگت کے باوجود اُس میں نہ جانے ایسی کیا کشش تھی کہ جو بھی اُسے دیکھتا، دم بخود رہ جاتا تھا۔ اُس نے دودھ جیسا سفید ریشمی لباس پہن رکھا تھا۔ مہمانوں کی نگاہیں اُس پر اس طرح مرکوز ہو کر رہ گئی تھیں، جیسے اُنہوں نے زندگی میں پہلی بار کسی لڑکی کو دیکھا ہو۔

"پھنس گئے، سکندر!" اُس نے میرے قریب آ کر ہنستے ہوئے کہا۔

"یہاں کیسے پہنچ گئیں تم؟........ تم تو ملک سے باہر تھیں؟"

"تمہارے سوالات کے جوابات اُدھار رہے۔" وہ بولی۔ پھر اُس نے نورین کی طرف اس طرح دیکھا، جیسے کوئی قصاب، بکری کا جائزہ لیتا ہے۔

"تم نورین ہو؟........ سکندر کے بھائی کی منگیتر؟" اُس نے پوچھا۔

نورین اچانک خوف زدہ سی نظر آنے لگی۔ رانی کے سوال پر اُس نے اثبات میں سر ہلا دیا اور جانے کے ارادے سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ "میں فضیلہ کے پاس جا رہی ہوں۔"

"ٹھہرو........ میں تمہارے ساتھ چل رہی ہوں۔" رانی نے کہا۔ پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولی۔ "اچھا سکندر! اجازت دو........ ایک بار پھر میری طرف سے مبارکباد قبول کرو۔"

رانی کو دیکھ کر میری ساری خوشی مٹی میں مل گئی تھی۔ وہ موت کی سوداگر تھی۔ جہاں جاتی تھی، موت اُس کے ساتھ ساتھ چلتی تھی۔ رخسانہ کی موت سے لے کر فضیلہ کے ہاتھ کٹنے تک، ایک طویل فہرست اُن لوگوں کی تھی، جو کسی نہ کسی صورت میں اُس کے بہیمانہ ظلم و ستم کا شکار ہو چکے تھے اور اب وہ بھائی جان کو کہکشاں بن کر کٹھ پتلی کی طرح انگلیوں پر نچا رہی تھی تاکہ اُن کے ذریعے ایک چھوٹا سا کام کرا سکے۔

رفیق اور بھائی جان کی گفتگو سن کر مجھے پہلے ہی یقین ہو گیا تھا کہ بھائی جان، ترشولی کے بچھائے ہوئے جال میں پھنس چکے ہیں۔ لیکن جب تک رانی کو نہیں دیکھا تھا، یہ سمجھ رہا تھا کہ رانی اپنے جسم کو چھوڑ کر کسی اور جسم میں منتقل ہو گئی ہے۔ میرا خیال غلط تھا۔ رانی ابھی تک اپنے اس جسم

سے نجات حاصل نہیں کر سکی تھی، جو پولیس افسر داراب کے قتل کے الزام میں پولیس کو مطلوب تھا۔ لازمی طور پر اُس نے دوسرے ملک میں بھی یہی کارنامے سرانجام دیئے ہوں گے کہ وہاں کی پولیس اُسے تلاش کرتی پھر رہی ہوگی۔

گویا اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے باوجود رانی کو اپنے بدن سے چھٹکارا حاصل کرنا تھا اور اس چھونے سے کام کے لیے اس نے بھائی جان کو منتخب کیا تھا۔

دوسرے کمرے میں کھانا لگ گیا تو میں مہمانوں کے ساتھ وہاں پہنچا۔ نورین کے ابو، رفیق کو ہٹا کر میرے پاس آگئے اور شادی کی مبارکباد دے کر سرگوشی میں بولے۔ ”گہرے سانولے رنگ والی وہ لڑکی، جس نے سفید لباس پہن رکھا ہے، کون تھی؟ میں نے شاید اُسے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔“

”آپ نے اُس کی تصاویر دیکھی ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اپنے اُسی پارسی دوست کے البم میں، جس کا تعلق ہندوستان سے تھا۔“

”اوہ.......موہن کے البم میں؟“ اُنہوں نے پوچھا اور فوراً ہی اُچھل پڑے۔ ”رانی....... یہ وہی رانی تھی، جسے موہن نے فلمی ہیروئن کے طور پر چنا تھا؟“

”جی ہاں....... یہ وہی رانی تھی۔ لیکن اب اس نے اپنا نام تبدیل کر کے کہکشاں کہلوانا شروع کر دیا ہے۔“

”خدا کی قسم، سکندر!.......خدا کی قسم!“ وہ ہاتھوں کو مسلنے لگے۔ ”اگر یہ وہی رانی ہے تو یہ تو قاتل ہے۔ موہن لعل کی قاتل۔ ٹھیک اُس دن جب فلم کی مہورت ہونے والی تھی، اس نے موہن لعل کو متعدد مہمانوں کی موجودگی میں قتل کر دیا تھا اور جس چھرے سے قتل کیا تھا، اُسے لہراتی ہوئی باہر غائب ہوگئی تھی۔“

فضیلہ کے ابو نے کہا۔ ”باتیں پھر بھی ہو سکتی ہیں، نعیمی صاحب! کھانا کھائیے اور سکندر کو بھی کھلائیے۔“

نورین کے ابو نے میری اور اپنی پلیٹوں میں بریانی نکالی۔ ”تم اُس لڑکی سے کس طرح واقف ہو؟“ اُنہوں نے ایک چھوٹا سا لقمہ منہ میں رکھ کر پوچھا۔

”آپ کو یاد ہوگا، ایک بار مجھے ایک پولیس افسر کو قتل کرنے کے الزام میں گرفتار کر لیا تھا۔ دراصل اُسے اسی لڑکی نے، جو اُس کی بیوی کی حیثیت سے اُس کے فلیٹ میں رہ رہی تھی، قتل کیا تھا۔ شاید اُس افسر کو اُس کی حرکات کا علم ہو گیا تھا۔ وجہ کچھ بھی رہی ہو، اُس نے مجھے قاتل ظاہر کر کے پکڑوا دیا۔ کئی روز کی تفتیش اور پوچھ گچھ کے بعد جب مجھے بے قصور سمجھ کر چھوڑ دیا گیا اور پولیس اُسے گرفتار کرنے پہنچی تو پہرے کے باوجود یہ لڑکی وہاں سے فرار ہو چکی تھی۔“

”انجینئر صاحب!“ فضیلہ کے ابو نے دوبارہ شکایت کی۔ ”آپ نہ خود کھا رہے ہیں، نہ سکندر کو کھانے دے رہے ہیں۔“

”دراصل میرا پیٹ پہلے ہی بھرا ہوا ہے۔“ نعیمی صاحب ہاتھوں کو رومال سے صاف کرتے ہوئے بولے۔ ”آپ کا فون کدھر ہے؟ مجھے ایک ضروری کال کرنی ہے۔“

کھانے کے بعد، جس وقت مجھے فضیلہ کے گھر سے اپنے گھر، جہاں ساری عورتیں جمع تھیں، لے جایا جا رہا تھا، میں نے پولیس کی ایک بڑی نفری کو آتے دیکھا، جس نے چند منٹوں میں پورے گھر کو گھیرے میں لے لیا۔ مجھے اور اُن لڑکیوں کو، جو مجھے اندر لیے جا رہی تھیں، باہر ہی روک لیا گیا۔ کئی کانسٹیبل عورتیں گھر میں گھس گئیں۔ چند منٹ بعد وہ باہر آئیں تو اُن کے ساتھ رانی تھی۔ جس کے بازوؤں کو کانسٹیبل عورتوں نے بڑی مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا۔ میرے قریب سے گزرتے ہوئے رانی ایک ثانیے کے لئے رُکی، مسکرائی اور اس طرح آنکھ ماری، جیسے کہہ رہی ہو کہ ہر کام اُس کی منشاء اور مرضی کے مطابق ہو رہا ہے۔

پولیس کی گاڑیاں چلی گئیں۔ رانی اُن کے ساتھ رخصت ہو گئی تو مجھے اندر لے جایا گیا۔ لیکن پولیس کی آمد اور رانی کی گرفتاری سے ماحول اتنا پراگندہ ہو گیا تھا اور مہمان عورتیں اور لڑکیاں اتنی بددل ہو چکی تھیں کہ کوئی رسم ادا نہیں کی گئی۔ مجھے گھر میں چھوڑ کر سب نے جلدی جلدی وہاں سے بھاگنا شروع کر دیا۔ صرف تین خواتین رہ گئیں۔ فضیلہ کی امی، نورین کی امی اور لوسی۔

”نورین کہاں ہے؟“ میں نے نورین کی امی سے پوچھا۔

”اچانک اُس کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ تمہارے پاس سے آتے ہی وہ گھر چلی گئی۔“

”بھائی جان بھی اُس کے ساتھ گئے ہیں؟“

”ہاشم تو فرنیچر کی دکان پر گیا ہوا ہے۔“ فضیلہ کی امی نے بتایا۔ ”نکاح سے پہلے گیا تھا، ابھی تک فرنیچر لے کر نہیں آیا۔“

”فرنیچر کی کیا ضرورت تھی؟“ میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ یہ بات بہرحال اطمینان بخش تھی کہ بھائی جان اپنی کہکشاں کی آمد اور گرفتاری سے بے خبر تھے۔ وہ موجود ہوتے، کہکشاں آتی اور گرفتار کی جاتی تو ایک نیا ہنگامہ اُٹھ کھڑا ہوتا۔ بہت سوں کو اُن کے عشق کا پتہ چل جاتا۔

میری اور فضیلہ کی شادی بالکل اچانک اور بڑی افراتفری میں ہوئی تھی۔ تاہم فضیلہ کے والدین نے دل کھول کر جہیز دیا تھا۔ زیورات کے کئی سیٹ تھے، پچاس سے زیادہ سوٹ تھے، اسٹیل اور چینی کے برتن کی بھرمار تھی، رنگین ٹی وی تھا، پانچ بینڈ کا ریڈیو تھا، فریج تھا، ڈیپ فریزر تھا، ڈبل بیڈ تھا، صوفہ سیٹ تھا، کھانے کی بڑی میز اور چھ کرسیاں تھیں اور دیگر الابلا کے ساتھ فضیلہ کی دیکھ بھال اور خدمت کے لیے لوسی تھی۔ وہ خود کہہ کر ہر آئے گئے سے یہ تعارف کراتی کہ میں

تو جہیز میں آئی ہوں۔

بھائی جان جس وقت منی ٹرک میں جہیز کا فرنیچر لدوا کر گھر پہنچے تو نورین کے امی ابو گھر سے جا چکے تھے۔ انھوں نے جلدی جلدی شادی کا کھانا کھایا اور یہ کہہ کر چلے گئے کہ انھیں بہت ضروری آپریشن اٹینڈ کرنا ہے۔ ممکن ہو سکا تو شام کو، ورنہ اگلے روز فضیلہ سے ملنے اور منہ دکھائی دینے آئیں گے۔

شام کو بھائی جان تو نہیں آ سکے، البتہ نورین کار دوڑاتی ہوئی ہمارے گھر پہنچ گئی۔ میں اپنے کمرے میں فضیلہ کے سنہری بالوں سے کھیل رہا تھا۔ کل تقریباً اسی وقت وہ چھوٹی دیوار کے دوسری جانب کھڑی مجھ سے باتیں کر رہی تھی۔ اُس وقت نہ میں نے، نہ اُس نے، نہ کسی تیسرے شخص نے سوچا تھا کہ اگلے روز ہم دونوں ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے کے ہو جائیں گے۔

"معاف کرنا، فضیلہ!" اُس نے کہا۔ "میں تمھیں ڈسٹرب کرنا نہیں چاہتی تھی۔ لیکن بہت مجبور اور پریشان ہو کر یہاں آئی ہوں۔"

"کیسی باتیں کر رہی ہیں، نورین باجی؟" فضیلہ سنبھل کر بیٹھ گئی۔ "میں تو ہمیشہ آپ کی مداح ہوں۔ بتائیے، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں؟"

"کرسی کھینچو اور بیٹھ جاؤ۔" میں نے کہا اور اطمینان سے اپنی پریشانی کا سبب بتاؤ۔"

وہ چند لمحوں تک سوچتی رہی اور پھر مسکرانے کی ناکام کوشش کرتی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"سکندر! میں تنہائی میں تم سے گفتگو کرنا چاہتی تھی۔ لیکن تم اور فضیلہ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو۔ میں سمجھتی ہوں، تم دونوں پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔"

"شکریہ نورین باجی!" فضیلہ نے کہا۔

"جن دنوں تم ہسپتال میں تھے۔" نورین نے کہنا شروع کیا۔ "ہمارے شہر کا ایک بہت بڑ موسیقار، جسے تمہارے بھائی بہت پسند کرتے تھے، کسی کام سے ابو سے ملنے آیا۔ اگلے روز اُسے کسی دوسرے شہر جانا تھا۔ ابو کی عادت سے تو تم واقف ہو، وہ اُسے رات کے کھانے اور چند احباب کے ساتھ گزارنے کے لیے گھر لے آئے۔ میں یہ سوچ کر کہ تمہارے بھائی جان اس موسیقار سے مل کر اور اُس کے فن کا مظاہرہ دیکھ کر بہت خوش ہوں گے، اُنھیں بلانے کے لیے ہوسٹل پہنچ گئی۔ مگر وہ ہوسٹل میں نہیں تھے، اُن کے کمرے کے دروازے پر تالا لگا ہوا تھا۔

نورین کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئی، پھر فضیلہ کے چہرے پر نظر ڈال کر بولی۔ "اگر میں تم سے یہ کہوں کہ تم اپنے آپ کو اتنا نہیں جانتے، جتنا فضیلہ تمھیں جانتی ہے تو یہ غلط نہیں کہوں گی۔ لڑکیاں جس کو دل میں بساتی ہیں تو کورس کی کتاب کی طرح اُسے لفظ بہ لفظ پڑھتی اور دل سے سمجھتی ہیں۔

میں نے بھی تمہارے بھائی جان کو پڑھا ہے، سمجھا ہے۔ اور دعوے کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ مجھ سے زیادہ اُن کی پسند اور ناپسند سے اور عادات و اطوار سے کوئی اور واقف نہیں ہے۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ اکثر راتوں کو وہ ہوسٹل کے عقب میں واقع ایک پارک میں جا کر بیٹھ جاتے تھے۔ چنانچہ میں نے اُن کے کمرے کو تالا لگا دیکھا تو پارک میں چلی گئی۔

نورین ایک بار پھر خاموش ہو گئی۔ آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو تیرنے لگے۔

"پارک کے دوسرے گیٹ سے تمہارے بھائی ایک لڑکی کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے سڑک کی طرف جا رہے تھے اور اتنے خوش نظر آ رہے تھے، جتنے خوش اُس دن تھے۔ جس دن ہماری منگنی تھی، میری آنکھوں کے گرد تاریکی چھا گئی۔ جہاں کھڑی تھی، وہیں کھڑی رہ گئی۔ پھر ایکا ایکی مجھے ہوش آیا۔ تقریباً بھاگتی ہوئی دوسرے گیٹ پر پہنچی، تمہارے بھائی جان اُس لڑکی کے ساتھ ٹیکسی میں سوار ہو رہے تھے۔ دونوں کسی نامعلوم مقام کی طرف روانہ ہو گئے تھے۔ میں پارک کے گیٹ پر کھڑی آنسو بہاتی رہی۔ نگاہوں میں اُس لڑکی کا چہرہ گھومتا رہا، جس نے تمہارے بھائی جان کو مجھ سے چھین لیا تھا۔ جانتے ہو، وہ لڑکی کون تھی؟

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ حالانکہ میں اچھی طرح سمجھ گیا تھا کہ وہ رانی تھی۔

"وہ، وہی لڑکی تھی، جو تمھیں شادی کی مبارکباد دینے آئی تھی۔ اور میرے سوال پر تم نے بتایا کہ اُس کا نام رانی ہے۔"

"ہاں۔" میں نے جواب دیا۔ "میں اُسے رانی ہی کے نام سے جانتا ہوں۔"

وہ لڑکی جو میرے لیے موت کے فرشتے سے کم نہیں تھی، میرے ساتھ فضیلہ کو بھی مبارکباد دینے آئی تھی اور اس کے دیکھتے ہی فضیلہ اس سے اس طرح بغل گیر ہوئی، جیسے وہ ماں جائی بہنیں ہوں، جن کی عرصہ دراز بعد اچانک ملاقات ہوئی ہو۔

فضیلہ کا پورا چہرہ سرخ ہو گیا۔ "میں تو اسے جانتی بھی نہیں۔ میں نے تو اسے آپ کی کوئی رشتے دار یا گہری سہیلی سمجھ کر گلے لگا لیا تھا۔"

"مگر میں یہ سمجھی کہ میرے علاوہ سب لوگ اس سے واقف ہیں اور چپکے چپکے میرے خلاف محاذ بنایا جا چکا ہے۔ اس تصور سے اور اُس لڑکی کی خونخوار آنکھوں سے میری طبیعت اتنی بگڑی کہ میں فوراً گھر چلی گئی۔ گھر جا کر بھی مجھے سکون نہیں ملا۔ یقین کرو، جب سے اُس لڑکی کو دیکھا ہے، یوں لگ رہا ہے، جیسے اندر ہی اندر کوئی میرے دل کو مسل رہا ہے۔"

نورین کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

"فضیلہ اُس لڑکی سے واقف ہو یا نہ ہو، لیکن سکندر! تم اُس لڑکی سے اچھی طرح واقف ہو۔ مجھے بتاؤ وہ کون ہے، کیا کرتی ہے، کہاں رہتی ہے؟ اور میری چھوٹی سی دنیا کو کس لیے برباد کر دینا

چاہتی ہے؟“

فضیلہ نے کہا۔”نورین باجی! آپ کے ساتھ جو پُرکشش لڑکی آئی تھی، اُسے تو پولیس.......“

میں نے جلدی سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔”ہاں....... میں اُس سے واقف ہوں۔“ میں نے نورین سے کہا۔”اس سے پہلے کہ تمہیں اس کے بارے میں بتاؤں، تم سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ تم نے کبھی بھائی جان کو اور اُسے یکجا دیکھا؟“

”نہیں، دوبارہ نہیں دیکھا۔ حالانکہ میں نے اپنے طور پر تمہارے بھائی جان کی سراغ رسانی بھی کی۔ کئی شاموں کو اچانک ان کے پاس ہوسٹل میں گئی۔ کئی بار اُن کے ساتھ گھنٹوں کے حساب سے پارک میں بھی جا کر بیٹھی۔“

”مگر منگل کی شام کو نہیں گئیں۔“ میں نے دل ہی دل میں کہا، پھر اُس سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”گویا تم نے رانی کو اُس رات دیکھا تھا، جب وہ بھائی جان کے ساتھ ٹیکسی میں جا رہی تھی، یا آج سہ پہر کے وقت دیکھا۔ درمیان میں وہ تمہیں نظر نہیں آئی؟“

”نہیں۔“

”بھائی جان نے جواب طلب کیا؟“

”نہیں۔“ وہ بولی۔”پہلی بار میں نے جب ان دونوں کو دیکھا تھا، اس وقت میرے ذہن پر ایک عجیب سا بوجھ سوار ہو گیا تھا۔ ایک تلوار تھی، جو میرے سر پر لٹکنے لگی تھی۔ ڈرتی تھی کہ میں نے اُس لڑکی کے بارے میں ایک لفظ بھی منہ سے نکالا تو وہ تلوار مجھ پر گر پڑے گی۔ مجھے خوف تھا کہ اگر اُنہوں نے اعتراف کر لیا کہ وہ اس لڑکی کو چاہتے ہیں اور مجھے صرف اس لیے گوارہ کیے ہوئے ہیں کہ ابو اُن کے تعلیمی اخراجات اُٹھا رہے ہیں تو میں کہیں کی نہیں رہوں گی۔“

فضیلہ نے کہا۔”نورین باجی درست کہہ رہی ہیں۔ بھائی جان کے سامنے اُس لڑکی کا ذکر کر کے یہ اپنی موت کو کس طرح آواز دے سکتی تھیں؟“

”تمہارا کہنا ہے کہ تم اپنے بھائی جان کی پسند ناپسند اور عادات و اطوار سے اچھی طرح واقف ہو۔“ میں نے کہا۔”کیا پارک والے واقعے کے بعد تم نے اُنہیں کچھ بدلا ہوا پایا؟“

”بہت زیادہ۔“ وہ دوبارہ منہ بسورنے لگی۔”پہلے کوئی اچھی بات کہتے تھے تو صاف ظاہر ہو جاتا تھا کہ دل سے کہہ رہے ہیں، لیکن بعد میں یوں محسوس ہونے لگا، جیسے زبان سے تو اچھی باتیں کر رہے ہیں، لیکن اس میں دل شریک نہیں ہے۔ میں نے اُن کے کپڑوں میں ایسی خوشبو کا احساس کیا، جس کی شیشی نہ اُن کے کمرے میں ہے، نہ میں لگانے کی عادی ہوں۔ ان کے لباس سے مجھے ایسے بال ملے، جو میرے نہیں تھے۔ اور لباس ہی سے میں نے یہ اندازہ بھی لگایا کہ وہ مجھ سے بے وفائی کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ پہلے وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر باتیں

کرتے تھے اور میں اُن کی آنکھوں میں ڈوب کر رہ جاتی تھی۔ اس کے برعکس وہ اب مجھ سے نظریں چرانے لگے تھے۔ اب میری طرف دیکھتے ہیں تو آنکھیں چار نہیں کرتے۔ اُن کی نظریں میرے گلے پر جم کر رہ جاتی ہیں۔ خوف سا محسوس ہونے لگتا ہے کہ شاید وہ میرا گلا دبا کر مجھ سے ہمیشہ کے لیے چھٹکارا حاصل کر لینا چاہتے ہیں۔ اس کے علاوہ پچھلے کئی ہفتے سے مجھے بڑے بھیانک قسم کے خواب نظر آنے لگے ہیں۔ کبھی اپنا جنازہ دیکھتی ہوں اور کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے گہری تاریکی کا بھیانک اژدھا مجھے نگل رہا ہے۔“

نورین نے بھائی جان کے لباس کو دیکھ کر جو اندازے لگائے تھے، وہ بڑی حد تک درست تھے۔ رانی نے بھائی جان کو اس بری طرح اپنے شکنجے میں جکڑ لیا تھا کہ وہ اُس کی خاطر ہر جائز، ناجائز، غیر قانونی اور غیر اخلاقی کام سرانجام دینے پر کمربستہ ہو گئے تھے۔

”جس وقت میری، تمہارے بھائی جان کے ساتھ منگنی ہو رہی تھی۔“ نورین نے سلسلۂ گفتگو کو منقطع کیے بغیر کہا۔”ہمارے کئی عزیزوں اور تمہارے کئی پڑوسیوں نے امی ابو کو سمجھایا کہ وہ اس گھر میں میری منگنی نہ کریں۔ کیونکہ لڑکے کا چھوٹا بھائی کسی چڑیل کے زیرِ اثر ہے۔ مگر امی ابو نے ہنس کر اس اعتراض کو مسترد کر دیا۔

فضیلہ نے تائید میں سر ہلایا۔”میرے امی ابو سے بھی یہی کہا گیا تھا کہ یہاں منگنی کرنے سے بہتر ہے کہ اپنی بیٹی کو کسی اندھیرے کنوئیں میں پھینک آؤ۔“

”پھر سمندر کے کنارے والا واقعہ ہوا۔“ نورین نے اس طرح کہا، جیسے اُس نے فضیلہ کی بات نہ سنی ہو۔”عزیزوں، دوستوں اور ہمدردوں نے دوبارہ امی ابو کو مشورہ دیا کہ اب بھی وقت ہے، منگنی توڑ دو۔ تمہاری بیٹی کے لیے رشتوں کی کمی نہیں ہے۔ امی ابو پھسلنے لگے تو مجھے غصہ آ گیا۔ ابو کے سامنے تو کچھ کہنے کی ہمت نہیں ہوئی، لیکن میں نے امی سے صاف صاف کہہ دیا کہ بھول کر بھی منگنی توڑنے کے بارے میں نہ سوچیں۔ حقیقت یہ ہے، سکندر! کہ تمہارے بھائی جان کتنے ہی بے وفا کیوں نہ ہوں، میں اُنہیں نہیں چھوڑ سکتی۔ کیا اب بھی نہیں بتاؤ گے کہ وہ لڑکی کون ہے جس نے تمہارے بھائی جان کو مجھ سے بدظن کر دیا ہے؟“

”شاید تمہیں یاد ہو....... کسی زمانے میں میدان سے پرے اُس مقام پر جہاں کئی منزلہ عمارتیں بنی ہوئی ہیں، وہاں جھونپڑیاں ہوا کرتی تھیں۔ رانی کی پیدائش وہیں ایک جھونپڑی میں ہوئی تھی۔“ میں نے بتانا شروع کیا۔”بڑی ہوئی تو جھونپڑیوں کے رواج کے مطابق اُس کی منگنی وہیں کے ایک نوجوان سے کر دی گئی۔ رانی شروع ہی سے اچھی لڑکی نہیں تھی۔ نوجوان کو اُس کی حرکتوں کا علم ہوا تو اُس نے اُس پر قاتلانہ حملہ کر دیا۔ لڑکا گرفتار ہو گیا۔ اور وہیں سے رانی نے پَر پُرزے نکالے، ایک پولیس آفیسر سے پینگیں بڑھائیں اور اُسے قتل کر کے پولیس کے ڈر سے ملک

سے باہر چلی گئی۔ وہاں اپنے ایک عاشق کو قتل کر کے دوبارہ یہاں واپس آ گئی۔ میں نہیں جانتا کہ اُس کے اور بھائی جان کے کیا تعلقات وابستہ رہے ہیں، البتہ یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ بھائی جان تم سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔ وہ تمہیں چھوڑ کر کیچڑ اور غلاظت میں پرورش پانے والی لڑکی کی طرف ملتفت نہیں ہو سکتے۔ تم نے جو اندازے لگائے، وہ بدگمانی پر مبنی ہیں۔"

نورین نے گہری سانس لی۔ "مشرق کی ہر لڑکی نیک پروین ہوتی ہے، سکندر!"

"مشرق کی لڑکی تو رانی بھی ہے۔ لیکن وہ تو بدترین پروین ہے۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "اب دونوں ہاتھوں سے کلیجہ تھام کر خوشخبری سننے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ اتنی مسرت انگیز خوشخبری ہے کہ اسے خوش خبرا کہنا چاہئے۔ ہاں فضیلہ! اب بتاؤ، تم کیا کہہ رہی تھیں، یہاں پولیس آئی تھی؟"

"پولیس والیاں تھیں۔" فضیلہ نے بھولپن سے کہا۔ "پولیس والے باہر کھڑے تھے۔ پولیس والیوں نے آتے ہی اُس لڑکی کو پکڑ لیا اور کھینچتی ہوئی باہر لے گئیں۔"

"کیوں؟" نورین نے پوچھا۔ حیرت سے اُس کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔

"کیونکہ وہ ایک مفرور قاتلہ تھی۔ اُس نے دو قتل کیے تھے۔ ایک اپنے ہی ملک میں اور دوسرا غیر ملک جا کر۔"

"پولیس کو کیسے معلوم ہوا کہ وہ یہاں ہے؟"

"میں نے تمہارے ابو کو ساری باتیں بتا دی تھیں اور تمہارے ابو نے وقت ضائع کیے بغیر پولیس کو مطلع کر دیا تھا۔"

"تمہارے کہنے پر اُس کی گرفتاری عمل میں آئی ہے؟"

"جناب!" میں نے فخر سے سینہ پھلا کر کہا۔

نورین اچانک روتی ہوئی فضیلہ سے چمٹ گئی۔ "مجھے معاف کر دو۔ میں سمجھ رہی تھی کہ مجھے اُجاڑنے اور تباہ کرنے میں تم سب شریک ہو۔ اُسے گرفتار کرا کے تم نے مجھ پر جو احسان کیا ہے، اسے میں تمام زندگی فراموش نہیں کر سکتی۔"

فضیلہ نے کہا۔ "روئیے نہیں نورین باجی! ورنہ میں بھی رو پڑوں گی۔"

"اور میں فضیلہ کو روتا ہوا نہیں دیکھ سکوں گا۔" میں نے کہا۔ "اور اپنا خوشخبرا واپس لے لوں گا۔" اُس نے آنسو پونچھے اور ہنسنے کی کوشش کی اور فضیلہ کے جسم کو چھوڑ دیا اور سنبھل کر بیٹھ گئی۔

"اب کیا ہوگا؟" نورین نے پوچھا۔

"شادیانے بجیں گے، شہنائیاں گونجیں گی۔ بھائی جان دولہا بنیں گے، بی نورین کو دلہن بنایا جائے گا۔ اور جیسی میری اور فضیلہ کی تصویر بنی، ویسی ہی بھائی جان اور بی نورین کی بنے گی۔"

نورین رونا دھونا بھول گئی اور باقاعدہ ہنسنے لگی۔ "میں تو یہ پوچھ رہی تھی کہ اُس حرافہ کا کیا

گا؟"

"اُس نے دو قتل کیے ہیں، اس لئے اُسے دو بار پھانسی دی جائے گی۔"

"بے چاری۔"

ان لڑکیوں کو کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ وہی رانی جو ایک منٹ پہلے نورین کے لیے دنیا کی ذلیل ترین لڑکی تھی، پھانسی کے تصور پر اچانک بے چاری بن گئی۔ حالانکہ وہ بے چاری نہیں تھی۔ اُس نے اچھی طرح سوچ سمجھ کر خود کو گرفتار کرایا تھا۔

نورین ہمارے ہاں روتی ہوئی آئی تھی لیکن ہنستی ہوئی گئی تھی۔ اُس کے جانے کے بعد لوسی، فضیلہ سے پوچھنے آئی کہ کسی کام کے سلسلے میں اُس کی ضرورت تو نہیں ہے؟ ایسے کئی کام تھے، جو فضیلہ اپنے ایک ہاتھ سے انجام نہیں دے سکتی تھی۔ فضیلہ نے انکار میں سر ہلایا تو وہ مسکرا کر چلی گئی۔ ہم نے اُسے بھائی جان کا کمرہ دے دیا تھا۔

وہ رات ایسی نہیں تھی، جسے سو کر ضائع کیا جاتا۔ ہم دونوں دنیا و مافیہا سے بے خبر ایک دوسرے میں گم ساری رات جاگتے رہے۔ صبح ہوئی اور لوسی نے آ کر فضیلہ کا چارج لیا تو یاد آیا کہ کالج اور اسکول بھی جانا ہے۔ گزشتہ روز گھر کے اس خوشگوار ہنگامے کے باعث، جس کے نتیجے میں وہ فضیلہ، جسے کم از کم چار سال بعد آنا تھا، دُلہن بنی میرے کمرے میں بیٹھی تھی۔ گزشتہ دن میں صبح کے وقت کالج نہ جا سکا، نہ دوپہر کے وقت اسکول۔ اتفاقیہ چھٹی کی درخواست بھی نہیں بھیج سکا تھا۔

ناشتہ حسبِ معمول فضیلہ کے ہاں سے آیا تھا اور ایسا زوردار تھا کہ میں نے زندگی بھر نہیں کھایا تھا۔ ابا جی نے کہا کہ فضیلہ کو بھی یہیں بلا لو۔ فضیلہ، ابا جی کے سامنے ناشتہ کرتے ہوئے شرما رہی تھی۔ اُس نے آنے سے انکار کیا تو خود میرے کمرے میں جا کر اُسے لے آئے۔ وہ شرم سے دوہری ہوتی ہوئی، سر جھکا کر بیٹھ گئی۔

ابا جی نے پیار سے اُس کے سر پر ہلکی سی چپت لگائی۔ ”مجھ سے شرما رہی ہے، پگلی؟ ارے میں تو وہی ابا جی ہوں، جو تجھے کندھے پر بٹھا کر ٹافیاں دلانے جاتا تھا۔“

فضیلہ کے ساتھ ساتھ آنے والی لوسی نے کہا۔ ”خداوند نے چاہا تو کچھ دنوں بعد اسی طرح فضیلہ کے بچوں کو بھی ٹافیاں دلانے لے جائیں گے۔“

”ان شاء اللہ!“ ابا جی نے چھوٹا سا قہقہہ لگا کر کہا۔ شرم و حجاب کے باعث فضیلہ پہلے سے زیادہ جھک گئی کہ اُس کا سر چائے کی کیتلی سے جا لگا۔

”ہمارے یار کو بلاؤ، سسٹر!“ ابا جی نے لوسی سے کہا۔

”کسے؟“

”دنیا میں ایک ہی تو ہمارا یار ہے۔“

لوسی پھر بھی نہیں سمجھی تو میں نے کہا۔ ”ابا جی کہہ رہے ہیں کہ فضیلہ کے ابو کو بلاؤ۔“

وہ ہنستی ہوئی اُنہیں بلانے چلی گئی اور پہلے سے زیادہ ہنستی ہوئی واپس آئی۔ ”امی کہہ رہی ہیں، اب وہ آپ کے یار نہیں رہے، رشتہ دار بن چکے ہیں۔“

”اُس سے کہو، یاری ختم نہیں ہوئی، اور پکی ہو گئی ہے۔ یہ بتاؤ، ہمارا یار آ رہا ہے یا اُسے پکڑ کر لانا پڑے گا؟“

”وہ علی الصبح ہی ناشتہ کر چکے ہیں۔“

”بیٹی کا شرمانا تو سمجھ میں آتا ہے، لیکن وہ کیوں شرما رہا ہے، اتنی لمبی داڑھی رکھ کر؟“

”کھی، کھی، کھی ......“ فضیلہ کی ہنسی نکل گئی۔

لوسی جلدی سے آگے بڑھ کر نہ پکڑ لیتی تو فضیلہ لازمی طور پر لوسی پر گر جاتی۔

ابا جی کھانے کی میز سے اُٹھے اور چھوٹی دیوار کے پاس جا کر با آوازِ بلند ہانک لگائی۔

”بھائی صاحب! آ جاؤ۔ یار! کیوں تنگ کر رہے ہو؟“

دوسری جانب سے فضیلہ کی امی کی آواز آئی۔ ”ابھی ابھی کچھ اور ضروری سامان خریدنے باہر گئے ہیں۔“

”ٹھیک ہے، بھابی!“ ابا جی نے کہا۔ ”جب تک ہمارا یار نہیں آئے گا، ہم بھی ناشتہ نہیں کریں گے۔“

اِدھر ابا جی واپس اپنی کرسی پر آ کر بیٹھے اور اُدھر فضیلہ کے ابو پہنچ گئے۔

”تم تو بازار گئے ہوئے تھے۔“ ابا جی نے پوچھا۔

”کھاؤ۔“ فضیلہ کے ابو بولے اور کھانے پر اتنی تیزی سے ٹوٹ پڑے، جیسے فوج حملہ آور ہوتی ہے۔

”بسم اللہ کرو بیٹی!“ ابا جی نے فضیلہ سے کہا۔ پھر لوسی سے مخاطب ہو کر بولے۔ ”تم دُلہن کے پاس بیٹھ جاؤ۔ خود بھی کھاؤ اور اسے بھی کھلاؤ۔“ پھر فضیلہ کے ابو سے مخاطب ہوئے۔ ”ہمارے ہاں جب کوئی لڑکی بیاہ کر آتی ہے تو اس کے سسر کی طرف سے شایانِ شان خطاب دیا جاتا ہے۔ ہم نے اپنی شہزادی کو بے نظیر کا خطاب دیا ہے۔ کیسا خطاب ہے؟“

”بک بک کیے جاؤ گے، کھاؤ گے نہیں۔“ فضیلہ کے ابو نے شکایت کی۔

”کھا رہا ہوں یار! کھا رہا ہوں۔ بگڑو نہیں۔“ ابا جی نے کھانا شروع کرتے ہوئے کہا۔

میں نے زیرِ لب کہا۔ ”بے نظیر ...... یعنی بے مثال دُلہن۔ اچھا خطاب ہے۔ بہت ہی اچھا۔“ اور سر ہلاتا ہوا کالج چلا گیا۔ رات بھر جاگنے کے باوجود نیند آنکھوں سے کوسوں دُور تھی۔ ذہن میں گزشتہ رات کی باتیں گردش کر رہی تھیں۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد از خود ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ جاتی تھی۔

تیسرے پیریڈ تک پتہ ہی نہیں چلا کہ کلاس روم میں کون سا لیکچرار آیا ہے۔ چوتھا پیریڈ شروع ہوتے ہی کالج میں شور و غل شروع ہو گیا۔ کالج کے باہر ہزاروں کی تعداد میں دوسرے کالجوں کے

طلباء جمع تھے اور پولیس کے خلاف نعرے لگا رہے تھے۔ متعدد طلباء کالج میں گھس آئے۔
"کالج بند کرو........کالج بند کرو۔"
اسی دوران کسی نے چھٹی کی گھنٹی بجا دی۔ لڑکوں نے کلاس چھوڑ کر بھاگنا شروع کر دیا۔ آفس کے دروازے پر ہمارے پرنسپل، پروفیسر چراغ علی متفکر سے کھڑے تھے۔ انہوں نے مجھے سست رفتاری سے گیٹ کی جانب جاتے دیکھا تو اشارے سے اپنے پاس بلایا۔
"لڑکے دیوانے ہو رہے ہیں۔" وہ بولے۔ "جلوس میں شامل ہونے کی ضرورت نہیں، خاموشی سے اپنے گھر چلے جاؤ۔ اور کالج کا جو طالب علم بھی نظر آئے، اُسے بھی یہ کہہ دو کہ اُسے جو بھی طلباء ملیں، وہ اُن تک میرا پیغام پہنچا کر گھر چلا جائے۔"
میں باہر نکلا، اپنے ایک واقف کار کو پروفیسر چراغ علی کی ہدایت سے مطلع کر کے پوچھا کہ اس شور وغل اور ہنگامے کا سبب کیا ہے؟"
"پولیس کے مظالم کے خلاف احتجاج کیا جا رہا ہے۔ انہوں نے ایک زیرِ حراست لڑکی کو گولی مار کر ختم کر دیا ہے۔"
"کون تھی وہ لڑکی؟"
"مجھے کوئی علم نہیں۔ اور میں سمجھتا ہوں، جلوس میں آدھے سے زیادہ ایسے طلباء ہوں گے، جو میری ہی طرح ناواقف ہوں گے۔ احتجاج کرنے کے لیے واقفیت کی نہیں، بہانے کی ضرورت ہوتی ہے۔"
"چراغ علی صاحب کے منع کرنے کے باوجود تم جلوس میں شرکت کرو گے؟"
"پرنسپل کو تعلیم اور کالج کے ایڈمنسٹریشن کے علاوہ طلباء کے مسائل میں ٹانگ نہیں اڑانا چاہیے۔" اُس نے کہا۔ "طلباء کو اپنی اہمیت جتانے اور اپنی قوت کا مظاہرہ کرنے کے سنہرے مواقع روز روز حاصل نہیں ہوتے۔" پھر اس نے "پولیس، ہائے ہائے" کا نعرہ لگایا اور بھاگ کر جلوس میں شامل ہو گیا۔
میں نے ایک اور طالب علم تک چراغ علی صاحب کا پیغام پہنچایا۔
"یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ پولیس ہماری ماؤں، بہنوں کو اپنی گولیوں کو نشانہ بناتی رہے اور ہم خاموش تماشائی بنے بیٹھے رہیں؟"
"پروگرام کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔
"پہلے سارے اسکول بند کرائیں گے، پھر ہمارا پُرامن جلوس راہ میں پڑنے والے پولیس اسٹیشنوں پر پتھراؤ کرتا ہوا پولیس ہیڈ کوارٹر تک جائے گا اور مطالبہ کرے گا کہ لڑکی کو گولیوں کا نشانہ بنانے والے پولیس کے کارندوں کو گرفتار کر کے شہر کے مختلف چوراہوں پر پھانسی دی جائے۔"

میں نے مزید کسی طالب علم تک پروفیسر صاحب کا پیغام پہنچانے کی کوشش نہیں کی۔ اُن کی آنکھوں میں خون اُترا ہوا تھا اور ڈر تھا کہ وہ مجھے دشمن اور تخریب کار قرار نہ دے دیں۔ خاموشی سے گھر واپس آ گیا۔ فضیلہ، لوسی کے ساتھ اپنی امی کے پاس گئی ہوئی تھی۔ ابا جی اپنی خشک دودھ اور چائے کی پتی والی دکان پر بیٹھے ہوئے تھے۔
"اتنی جلدی کیسے آ گئے، سکندر؟" اُنہوں نے پوچھا۔
"پولیس نے کسی لڑکی کو گولی مار کر ہلاک کر دیا ہے۔" میں نے بتایا۔ "سارے اسکول اور کالج بند کرا کے طلباء احتجاجی جلوس نکال رہے ہیں۔"
"اس کا مطلب ہے کہ تم ایک بجے اسکول میں پڑھانے بھی نہیں جا سکو گے۔"
"میرا خیال ہے کہ اُس وقت تک احتجاج ختم ہو چکا ہو گا اور شام کی شفٹ والے اسکول معمول کے مطابق کھل جائیں گے۔"
اسی اثناء میں ایک بچہ خشک دودھ خریدنے آ گیا۔ ابا جی اُس کی طرف متوجہ ہو گئے اور میں اپنے کمرے میں جا کر کچھ دیر سونے کے لیے لیٹ گیا۔ یکسوئی کے لیے میں نے جہیز میں ملا ہوا ریڈیو ہلکی آواز میں کھول لیا۔ ریڈیو پاکستان سے فلموں کے دوگانے سنائے جا رہے تھے۔ بستر پر لیٹتے ہی نیند آ گئی۔ تقریباً ساڑھے بارہ بجے آنکھ کھلی۔ ریڈیو پر شہر کے مختلف علاقوں میں شام چار بجے سے کرفیو لگانے کا اعلان کیا جا رہا تھا اور اُن لوگوں کو، جو دُکانوں یا دفاتر میں تھے، مشورہ دیا جا رہا تھا کہ چار بجے سے پہلے پہلے اپنے اپنے گھروں میں پہنچ جائیں۔
میں جلدی سے اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ ریڈیو کو چلتا ہوا چھوڑ کر باہر نکلا۔ ابا جی دُکان پر بیٹھے ہوئے تھے اور دُکان میں بڑی تعداد میں عورتیں اور بچے کھڑے دودھ اور پتی خرید رہے تھے۔ ابا جی مصروفیت کے باعث میری طرف توجہ مبذول نہیں کر سکے۔ میں گلی سے نکل کر سڑک پر پہنچا۔ مسافروں سے بھری ہوئی بسیں آ رہی تھیں۔ کچھ بسیں تو ایسی تھیں، جن کے پیچھے لوگ لٹکے ہوئے تھے۔ دو آدمی بس اسٹاپ پر اتر کر میری طرف آ رہے تھے۔ میں لمبے لمبے قدم اُٹھاتا ہوا اُن سے جا ملا۔
"کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا۔ "کرفیو کیوں لگایا گیا ہے؟"
"طلباء نے کئی تھانوں پر حملہ کیا تھا۔ اُنہیں منتشر کرنے کے لیے پولیس کو لاٹھی چارج کرنا پڑا اور آنسو گیس استعمال کی گئی۔ کئی لڑکے زخمی ہوئے ہیں۔ سنا ہے، ان میں ایک لڑکا مارا بھی گیا ہے۔ لڑکوں کی آڑ میں شر پسند باہر نکل آئے ہیں۔ دُکانوں کو لوٹا جا رہا ہے، بسوں کو جلایا جا رہا ہے۔ پورا شہر سلگ رہا ہے، فوج طلب کر لی گئی ہے۔"
دوسرے آدمی نے کہا۔ "ساری ذمہ داری پولیس پر عائد ہوتی ہے۔"

"پولیس پر نہیں۔" پہلا بولا۔ "اُن درس گاہوں پر عائد ہوتی ہے، جہاں طلباء کو تشدد کی تعلیم دی جاتی ہے۔"

دونوں بحث کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ میں واپس پلٹ پڑا۔ اباجی کی مختصر سی دُکان کے سامنے مجمع میں کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا۔ میدان کے پار رہنے والی عورتیں بھی دودھ پتی لینے کھنچی چلی آ رہی تھیں۔ سڑک کے دوسری جانب آٹے دال کی دُکان پر بھی کم و بیش ایک فرلانگ لمبی قطار لگی ہوئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے کئی ہفتوں تک کھانے کی کوئی چیز دستیاب ہی نہیں ہوگی۔

میں نے مناسب سمجھا کہ فضیلہ کو اپنی خیر و عافیت سے مطلع کر دوں۔ اُسے کوئی علم نہیں تھا ک میں جلوس میں شامل ہونے کے بجائے گیارہ بجے کے لگ بھگ گھر چلا آیا تھا۔ اور جب اُ معلوم ہوا ہوگا کہ طلباء پر لاٹھی چارج کیا گیا ہے اور آنسو گیس کے شیل پھینکے گئے ہیں تو اُس کا سا، معصوم دل خوف سے لرز گیا ہوگا۔ شرم و حجاب کے باعث وہ زبان سے کچھ کہہ بھی نہیں رہی گی، لیکن حالت غیر ہو چکی ہوگی۔

فضیلہ کے گھر پہنچا تو لوسی سے ملاقات ہوئی۔ فضیلہ گہری نیند سو رہی تھی اور اُس کی ا خانساماں کو لے کر سودا سلف لینے گئی ہوئی تھیں۔

"فضیلہ کو علم ہو گیا ہے کہ ہنگاموں کے باعث شہر کے مختلف علاقوں میں، جن میں ہمارا علا بھی شامل ہے، چار بجے شام سے غیر معینہ مدت کے لیے کرفیو لگا دیا گیا ہے؟" میں نے لوسی پوچھا۔

"نہیں۔" اُس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "بے نظیر دُلہن تو جب سے میکے تشریف لا ہیں، گھوڑے بیچ کر ایسی سوئی ہیں کہ گرد و پیش کی کوئی خبر ہی نہیں ہے۔ دوپہر کے کھانے کی کوئی فکر نہیں۔ میرا خیال ہے کہ تم نے بھی ابھی تک کھانا نہیں کھایا ہوگا۔ جاؤ، دُلہن کو جگا دو دونوں ایک ساتھ کھانا کھا لینا۔"

فضیلہ کو سوتے ہوئے دیکھنے اور جگانے کا تصور رومان انگیز تھا۔ مجھے زندگی کے جس دو گزرنا پڑا تھا، اس میں ساری تلخیاں اور پریشانیاں ثانوی حیثیت اختیار کر گئی تھیں۔ بے حد حساب محبت نے سب کو دبا دیا تھا۔ ایسی عجیب و غریب تشنگی تھی، جو کم ہونے کے بجائے اور جا رہی تھی۔

"سنو، سکندر!" میں نے اُس کمرے کی طرف، جہاں فضیلہ محوِ خواب تھی، قدم اُٹھائے نے آواز دے کر مجھے روک لیا۔ "ڈیڈی کی وہ کتابیں کہاں ہیں، جو میں نے تمہیں بھیجی تھیں"

"مدرسے لے گیا تھا۔ دوبارہ وہاں جانے کا اتفاق نہیں ہوا کہ کتابیں لے آتا۔ وہیں پڑی ہوں گی۔ کسی روز موقع ملا تو جا کر لے آؤں گا۔"

"اُن کا مطالعہ کیا تھا؟"

"صرف اُن کتابوں کو پڑھ سکا، جو رومن میں تھیں۔ دوسری کتابیں اتنی ثقیلہ انگلش میں تھیں کہ ڈکشنری کی مدد سے بھی سمجھ میں نہیں آئیں۔ اور ہندی کتابیں پڑھنے کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"مدرسے میں تمہارے دوست تو ضرور ہوں گے۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ اُن میں سے کسی کو فون کر دو اور وہ تمہاری کتابیں یہاں پہنچا جائے؟ یہاں زیادہ کام دھام تو نہیں ہے۔ پڑے پڑے انہی کو پڑھ لیا کروں گی۔"

پورے مدرسے میں میرا صرف ایک دوست تھا۔ حافظ احمد علی۔ میرے ہی کمرے میں رہتا تھا۔ مدرسے میں فون کر کے اُس تک پیغام پہنچا دوں گا۔"

"کیوں نہ یہ نیک کام آج ہی کر لیا جائے۔"

"کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔" میں نے کہا۔ "کرفیو کی وجہ سے نہ وہ یہاں آ سکتا ہے اور نہ میں اُس کے پاس جا سکتا ہوں۔ ویسے تم مطمئن رہو، کرفیو سے نجات ملتے ہی فون کر دوں گا۔"

کمرے میں فضیلہ واقعی گہری نیند سو رہی تھی۔ میں چند لمحوں تک اُس کے سرہانے کھڑا حُسنِ خوابیدہ سے محظوظ ہوتا رہا۔ سوتے میں بھی وہ اتنی ہی حسین لگ رہی تھی، جتنی جاگتے میں معلوم ہوتی تھی۔ محویت اُس آستین کو دیکھ کر ٹوٹی، جو اندر سے بالکل خالی تھی۔ دل پر چوٹ سی لگ گئی۔ میں فضیلہ کو سب کچھ دے سکتا تھا، لیکن اُس کی اس محرومی کو دُور نہیں کر سکتا تھا۔

اگر وہ عام لڑکیوں کی طرح ڈرپوک اور بزدل ہوتی تو نورین کو بچانے کے لیے کوشش نہ کرتی۔ بلاشبہ فضیلہ ایک عظیم لڑکی تھی۔ میں اپنی خوش بختی پر جتنا بھی نازاں ہوتا، کم تھا۔ اباجی نے اُسے بے نظیر دُلہن کا خطاب بالکل صحیح دیا تھا۔ اتنی خوب صورت کہ پری دیکھے تو شرما جائے۔ اور اتنی پُر عظمت کہ چشمِ فلک نے شاید ہی کسی ایسی لڑکی کو دیکھا ہوگا۔ اس طرح کی لڑکیاں واقعی بے مثال اور بے نظیر تھیں۔

میں بے پناہ عقیدت و محبت کے جذبے سے سرشار ہو کر اُس کے پاس بیٹھ گیا اور اُس پر جھک کر اُس کے سنہرے بالوں کو چہرے پر بکھیر دیا۔ اُس نے آنکھیں کھولیں، نیم وا آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور اگلے ہی لمحے ہنستی ہوئی اُٹھ بیٹھی اور میرے سینے پر سر رکھ لیا۔

"کالج سے کب آئے؟" اُس نے پوچھا۔

"کئی گھنٹے ہو گئے۔" میں نے کہا۔ "خوشی کی بات یہ ہے کہ اسکول بھی نہیں جاؤں گا۔ شہر میں ہنگامے ہو رہے ہیں۔ ہم دونوں غیر معینہ مدت تک ایک ہی کمرے میں رہیں گے۔"

پھر میں نے اُسے ہنگاموں کا سبب بتایا کہ پولیس نے ایک زیرِ حراست لڑکی کو گولی مار کر

ہلاک کر دیا تھا۔

”بہت ہی دلفریب اور دلکش جسم تھا اُس کا۔“ فضیلہ نے کہا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟ تمہیں کس نے بتایا کہ مرنے والی کا جسم دلفریب اور دلکش تھا؟“

”وہ مجھے شادی کی مبارکباد دینے آئی تھی۔ اور اُس وقت تک میرے پاس ہی بیٹھی رہی تھی، جب تک پولیس کی عورتیں اُسے گرفتار کر کے نہیں نکل گئی تھیں۔“

میں بے اختیار ہنسنے لگا۔ ”بہت بھولی ہو، فضیلہ! تم سمجھ رہی ہو کہ پولیس نے رانی کو گولیوں کا نشانہ بنایا ہے۔ کم و بیش ایک کروڑ کی آبادی والے شہر میں صرف ایک رانی ہی زیر حراست نہیں ہے۔ اُس جیسی نجانے کتنی لڑکیاں پولیس کی تحویل میں ہوں گی اور ان میں سے کوئی ایک ختم ہوئی ہے۔“

فضیلہ بھی ہنسنے لگی۔ ”میں بھی کتنی بدھو ہوں۔ اگر وہ لڑکی، جسے آپ رانی کہہ رہے ہیں، ماری جاتی تو اتنے حسین جسم کے ضائع ہونے کا مجھے بہت رنج ہوتا۔ کیا خیال ہے آپ کا؟“

”میں تو صرف ایک جسم کو جانتا ہوں۔ اور میرا خیال ہے، اس جیسا حسین جسم آج تک تخلیق ہی نہیں کیا گیا۔“ میں نے ایک بار پھر ان سنہری بالوں کو بکھیر دیا، جنہیں اُس نے انگلیوں کی سے سنوار لیا تھا۔ ”راز کی بات بتاؤں، فضیلہ!....... گزشتہ رات نورین کی زبانی تم یہ سن چکی ہو کہ بھائی جان، رانی پر فریفتہ ہیں۔ اور میری زبانی تمہیں یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ رانی نے دو افراد قتل کیا ہے۔ لیکن مصلحت کے تحت میں نے نورین کو یہ نہیں بتایا تھا کہ سمندر پر اس پر قاتلانہ حملہ کرنے اور تمہیں بازو سے محروم کر دینے والی بھی رانی ہی ہے۔“

”ہرگز نہیں۔“ فضیلہ نے میرے سینے پر رکھا ہوا سر اُٹھایا اور میری آنکھوں میں جھانکتی ہوئی بولی۔ ”میں اُس بدصورت بلا کو اچھی طرح پہچانتی ہوں۔ کیونکہ اسکول کی تقریب انعامات سے واپس آتے ہوئے تاریک گلی میں آپ نے پہلے ہی مجھے اُس سے متعارف کرا دیا تھا۔ وہ ترشولی تھی، رانی نہیں تھی۔

”رانی اور ترشولی، دو الگ الگ ہستیاں نہیں ہیں۔“

”یہ بات آپ نے مجھے اُس وقت کیوں نہیں بتائی، جب وہ مجھے مبارکباد دینے آئی تھی“ اُس نے شکایت کی۔ ”میں تو اُس سے انتقام لینے کے لیے تڑپ رہی ہوں۔ ہاتھ سے محروم ہونے کے باوجود مجھ میں اتنی ہمت ہے کہ اُس کے سینے پر سوار ہو کر کم از کم دونوں آنکھوں سے تو محروم کر سکوں۔ اب کب آئے گی؟“

”اب تو پولیس کے حوالے کر دی گئی ہے۔ پھانسی نہیں بھی ہوئی، تب بھی چھ سات سال سزا بھگتے بغیر باہر نہیں آ سکے گی۔

فضیلہ نے سر کو ہلکا سا جھٹکا دے کر بکھرے ہوئے بال درست کیے۔ ”خدا کی لاٹھی بے آواز ہے۔“ اُس نے دھیمی آواز میں کہا۔ ”پتہ تو کیجیے، مجھے یقین ہے کہ رانی کو ہی پولیس نے گولیوں کا نشانہ بنایا ہوگا۔“ اچانک وہ ہنس پڑی۔ ”اگر ایسا ہوا تو میں پورے محلے میں مٹھائی بانٹوں گی۔“

وہ نہیں جانتی تھی کہ کتنی خوفناک خواہش کا اظہار کر رہی ہے۔

ساری تفصیلات شام کے اخبارات، ریڈیو اور ٹی وی کے ذریعے معلوم ہو گئیں۔ پولیس کے ہاتھوں جو لڑکی ماری گئی تھی، وہ رانی ہی تھی۔

قصور پولیس کا نہیں تھا۔ ہوا یہ تھا کہ آٹھ بجے صبح کے درمیان اُسے ضروری پوچھ گچھ کے لیے حوالات سے نکال کر تھانے دار کے سامنے پیش کیا گیا۔ کسی کو علم نہیں تھا کہ حسین جسم والی نازک سی رانی کتنی خطرناک تھی۔ اُسے ہتھکڑیاں پہنائی گئی تھیں۔ یوں بھی تھانے میں اندر اور باہر درجنوں پولیس مین موجود تھے۔ اُن کی موجودگی میں بڑے بڑے مجرم فرار ہونے کی کوشش نہیں کرتے تھے۔ رانی تھانے دار کے آفس میں معصوم سا چہرہ بنائے داخل ہوئی۔ اندر پہنچتے ہی اُس نے قلابازی کھائی اور تھانے دار کی کمر سے لٹکے ہوئے پستول کو کھینچ لیا۔

اس سے پہلے کہ تھانیدار مزاحمت کرتا، وہ اُس کے سینے پر گولی داغ چکی تھی۔ تھانیدار کے گرتے ہی ایک کانسٹیبل اُس کی طرف دوڑا تو رانی نے دوسری گولی سے اُس کا بھیجہ بھی اُڑا دیا اور اس طرح سینہ تان کر کھڑی ہو گئی، جیسے تھانے والوں کو دعوت دے رہی ہو کہ جس میں ہمت ہو وہ سامنے آئے۔

اُس کے خطرناک ارادوں کو بھانپ کر تھانے کا عملہ ستونوں اور دیواروں کی آڑ میں ہو گیا۔ پھر ٹھیک اس وقت جب وہ تھانے کے محرر پر گولی چلانے والی تھی، ایک کانسٹیبل نے ہمت سے کام لے کر اُس کے پیروں کا نشانہ لیا۔ وہ یہ سمجھ کر کہ اُس کے سر یا سینے کو گولی کا نشانہ بنایا گیا ہے، جلدی سے بیٹھ گئی اسی لمحے رائفل چل گئی اور گولی بیٹھی ہوئی رانی کے حلق کے آر پار ہو گئی۔

یہ تھا پورا واقعہ۔ لیکن جیسا کہ کالج کے طالب علم نے کہا تھا کہ حقائق کوئی نہیں دیکھتا، احتجاج اور خون خرابے کے لیے بہانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ کرفیو کے باوجود پورے شہر میں گولیاں چل رہی تھیں۔ تھانوں میں دستی بم پھینکے جا رہے تھے، دُکانیں لٹ رہی تھیں، بینکوں، بسوں اور کاروں کو نذرِ آتش کیا جا رہا تھا۔ کسی کو تھانیدار یا کانسٹیبل سے ہمدردی نہیں تھی، جنہیں ایک ایسی لڑکی نے، جس پر پہلے ہی قتل کے الزامات تھے، موت کے گھاٹ اُتار دیا تھا۔ سب سے حیرت ناک شام کے اخبار میں چھپنے والے دو سیاسی رہنماؤں کے بیانات تھے، جنہوں نے طلباء اور عوام کے حملے کو حق بجانب قرار دیا تھا۔

لیکن شہر میں ایک نوجوان ایسا بھی تھا، جو حلف اُٹھا کر کہہ سکتا تھا کہ رانی نے ایک سوچے

سمجھے منصوبے کے ساتھ اپنے آپ کو قتل کرانے کی نیت سے تھانے گئی تھی۔ وہ نوجوان میرے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ جس وقت اُسے گرفتار کر کے لے جایا جا رہا تھا، اُس نے بڑے معنی خیز انداز میں مسکرا کر مجھے آنکھ ماری تھی اور زبان سے کچھ نہ کہنے کے باوجود بتا دیا تھا کہ وہ اپنے موجودہ جسم سے چھٹکارا حاصل کرنے جا رہی ہے۔ کیونکہ بھائی جان اُس کا چھوٹا سا کام انجام دینے کے لیے راضی ہو چکے تھے۔

خبروں کے مطابق جب اُس کی ٹانگوں کا نشانہ لیا گیا، وہ غلطی سے سر اور سینے کو بچانے کے لیے بیٹھ گئی۔ مگر میں جانتا ہوں کہ وہ جان بوجھ کر بیٹھی تھی۔ اُسے لنگڑی ہو جانے سے زیادہ اپنی موت عزیز تھی کہ اُس کی موت دراصل ترشولی کی آزادی تھی۔ وہ ایک ایسے جسم میں قید ہو کر رہ گئی تھی، جو کئی الزامات میں پولیس کو مطلوب تھا۔ اس جسم میں رہ کر وہ حسب مرضی گلچھڑے نہیں اُڑا سکتی تھی۔ گلچھڑے اُڑانے کے لیے اُسے نئے جسم کی ضرورت تھی۔

ابا جی بہت خوش تھے۔ دودھ کی ساری بوریاں خالی ہو گئی تھیں، اور چائے کی صرف اتنی بچی تھی، جو انہوں نے گھر کے استعمال کے لیے باورچی خانے میں رکھی تھی۔ اُن کی پوری زند میں کبھی اتنی زور دار بکری نہیں ہوئی تھی۔ چند گھنٹوں میں انہوں نے لگ بھگ چار پانچ ہز روپے منافع کے حاصل کر لیے تھے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ خوشی کی بات یہ تھی کہ وہ لڑکی، جس خاطر بھائی جان خاندان کی عزت و آبرو کو مٹانے کے درپے تھے، ایک پولیس کانسٹیبل کی گولی نشانہ بن چکی تھی۔

فضیلہ کے امی ابو خوش تھے کہ ایک خوف ناک بلا سے نجات مل گئی۔ نورین خوش تھی کہ اُس منگنی ٹوٹتے ٹوٹتے بچی۔

احمد علی صاحب خوش تھے کہ اُن کی بے نام کال پر پولیس نے فوری ایکشن ہی نہیں لیا بلکہ کے پارسی دوست کی قاتل کو بھی کیفر کردار تک پہنچا دیا ہے۔

رات کے کھانے پر فضیلہ کے ابو سمیت ہم لوگ اُس خوب صورت ٹیبل پر بیٹھے، جو جہیز ملی تھی، تو کھانے کے دوران میں نے فضیلہ کے ابو سے پوچھا۔

"آپ کا واقف کار وہ مچھیرا، جس کے لڑکے یہاں کے ریستوران میں میٹھے پانی کی سپلائی کرتے ہیں، کہاں رہتا ہے؟"

"میٹھے پانی کی مچھلی کھانے کو دل چاہ رہا ہے؟" اُنہوں نے مسکرا کر دریافت کیا۔

"جی نہیں۔" میں نے کہا۔ "اُس سے راج کنڈل کا پتہ پوچھنا ہے۔"

"کس لیے؟" وہ بولے۔ "تمہارے ابا جی تو کہہ رہے تھے کہ اب وہاں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

ابا جی نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "بھول جاؤ راج کنڈل کو۔ خس کم جہاں پاک۔" میں نے کہا۔

"آپ دونوں نے ایک خاص بات کو نظر انداز کر دیا ہے۔" میں نے کہا۔ پھر گھوم کر فضیلہ کے ابو کو مخاطب کیا۔ "کیا آپ نے نہیں کہا تھا کہ سیر و تفریح اور تبدیلی آب و ہوا کے لیے فضیلہ کے ساتھ گھومنے پھرنے چلے جانا کہ دریا کے بیچ میں ایک قابل دید مندر ہے۔"

"اوہ......" فضیلہ کے ابو نے گہری سانس لی۔ "اب سمجھا۔ میں نے واقعی مشورہ دیا تھا۔ اور اب پھر مشورہ دے رہا ہوں، سکندر بیٹے! تم فضیلہ کو لے کر راج کنڈل ضرور جانا۔ کل پیر ہے۔ میرے خیال میں تو کل ہی چلے جاؤ، تاکہ منگل کے روز آسانی سے مندر میں تفریح کرنے جا سکو۔"

فضیلہ نے ہمت کر کے دھیمی آواز میں باپ سے کہا۔ "مندر میں تو پوجا کی جاتی ہے، سیر و تفریح کون کرتا ہے؟" نکاح کے بعد پہلی بار اس نے ابا جی کے آگے زبان کھولی تھی۔

فضیلہ کے ابو نے کہا۔ "تم ان باتوں کو نہیں سمجھ سکو گی۔" پھر مجھ سے مخاطب ہوئے۔ "کل جس وقت بھی کرفیو کے اوقات میں وقفہ دیا جائے، فضیلہ کو لے کر اسٹیشن چلے جاؤ۔"

"جب یہ ہی نہیں معلوم کہ راج کنڈل کہاں ہے، تو اسٹیشن جانے سے کیا ہوگا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں، یہ بات تو ہے۔" فضیلہ کے ابو بولے۔ "غلطی تمہارے باپ کی ہے۔ اُنہیں پہلے ہی بتا دینا چاہیے تھا کہ مسئلہ حل ہو گیا ہے۔ لیکن راج کنڈل کا پروگرام کینسل نہیں ہوا۔ میں کہیں نہ کہیں سے ضرور معلوم کر لیتا ہوں۔"

لوسی نے پوچھا۔ "آپ لوگ یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ راج کنڈل نام کا مندر کہاں ہے؟"

"ہاں۔"

"میں جانتی ہوں۔"

"تم جانتی ہو، اُس کے بارے میں؟"

"ہاں......" اُس نے جواب دیا۔ "میں نے جس ہائی اسکول میں تعلیم حاصل کی ہے، ایک بار ہماری کلاس ٹیچر ہم سب کو پہاڑوں اور دریا کے درمیان ایک مندر میں سیر کے لیے لے کر گئی تھیں اور بتایا تھا کہ اسے راج کنڈل کہا جاتا ہے۔ کسی زمانے میں دُور دُور کے سادھو پوجا پاٹ کرنے کے لیے آیا کرتے تھے۔ مندر میں سادھوؤں کے قیام کے لیے درجنوں چھوٹے چھوٹے کمرے بنے ہوئے ہیں۔"

ابا جی نے کہا۔ "لو بھئی، سکندر! تمہاری ایک مشکل تو آسان ہو گئی۔"

"خدا نے چاہا تو دوسری مشکل بھی آسان ہو جائے گی۔" فضیلہ کے ابو نے کہا۔

کھانے کے بعد وہ مجھے ایک طرف لے گئے۔ "تمہیں یقین ہے کہ پُراسرار سادھو، فضیلہ کا ہاتھ مہیا کر سکتا ہے؟"

"جی نہیں۔ مجھے اس قسم کی کوئی خوش فہمی نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "میں تو آپ کے ارشاد پر عمل کر رہا ہوں۔ ایک بار آپ ہی نے فرمایا تھا کہ شاید وہ سادھو کوئی ایسی ترکیب بتا دے، جس سے ہاتھ کی کمی دور ہو جائے۔ چاہتا ہوں کہ آخری کوشش کے طور پر اس سے بھی مشورہ کر لوں۔"

شہر کے حالات ٹھیک ہوتے ہی میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔" وہ بولے۔ "کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم اپنے پروگرام کو اگلے منگل تک کے لیے موخر کر دو؟"

میں انھیں کس طرح بتاتا کہ ایک ایک منٹ، ایک ایک لمحہ کس قدر قیمتی ہے۔ ترشولی، جسم کی قید سے آزاد ہو گئی ہے اور بھائی جان اُس کے آلۂ کار بنے ہوئے ہیں۔ کسی بھی وقت، کوئی بھی دھماکا ہو سکتا ہے۔

"نیک کام میں دیر نہیں کرنی چاہئے۔" میں نے انھیں سمجھایا۔ "اس وقت ہنگاموں کی وجہ سے کالج اور اسکول بھی بند ہیں۔ شاید بعد میں مجھے شہر سے باہر جانے کی فرصت ہی نہ ملے۔ بہتر یہی ہے کہ اس وقت جو مہلت ملی ہے، اس سے پورا پورا فائدہ اُٹھانے کی کوشش کی جائے۔"

ابا جی گلیوں گلیوں میں ہوتے ہوئے مٹھائی لینے جا سکتے تھے تو میں بھی کرفیو میں رفیق کے ہاں جا سکتا تھا۔ اُس کا گھر سڑک کے پار تھا، کہیں دُور نہیں جانا تھا۔

"بھائی رفیق!" میں نے اُس کے کمرے میں بیٹھ کر کہا۔ "تمہیں یہ تو معلوم ہو ہی گیا ہو گا کہ وہ لڑکی، جس نے بھائی جان کو اپنا دیوانہ بنا رکھا تھا، پولیس کے ہاتھوں ماری جا چکی ہے۔"

رفیق نے خبر پڑھی اور ریڈیو، ٹی وی پر سنی تھی۔ اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ ایک لڑکی کے مارے جانے کے بعد شہر بھر میں ہنگامے پھوٹ پڑے ہیں، جن کے باعث انتظامیہ کو کرفیو نافذ کرنا پڑا ہے۔ لیکن وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ ماری جانے والی لڑکی، بھائی جان کی چہیتی تھی۔

وہ بولا۔ "جو کچھ کہہ رہے ہو، اگر صحیح ہے تو خدا کی قسم بہت ہی اچھی خبر ہے۔" دوسرے لمحے اُس کا چہرہ لٹک گیا۔ "ہاشم کا تو بہت ہی برا حال ہو گا۔"

"کوئی علم نہیں۔" میں نے کہا۔ "ویسے بھی میں یہ سمجھتا ہوں کہ بھائی جان اُن عشاق سے نہیں ہیں، جو محبوب کی موت کو زندگی بھر کا غم بنا لیتے ہیں۔ اوّل تو انھیں اس لڑکی کے مرنے کا کوئی دُکھ نہیں ہو گا۔ اور اگر ہوا بھی تو نورین کی محبت بہت جلد اس کا ازالہ کر دے گی۔"

اِدھر اُدھر کی چند ضروری باتوں کے بعد رفیق سے اجازت لے کر میں نے نورین کا فون کیا۔ نورین جب فون پر آئی تو میں نے کہا۔ "کرفیو کے باوجود گھر سے نکل کر مجھے فون کرنے کے لیے رفیق کے گھر آنا پڑا ہے۔ مجھے تم سے ایسی بات کہنا ہے، جو فضیلہ کے فون پر نہیں کہی جا

تم یقیناً رانی کی موت پر خوش ہو رہی ہو گی؟"

"ہاں، سکندر!" اُس نے جواب دیا۔ "تم اندازہ نہیں لگا سکتے کہ میں کتنی خوش ہوں۔"

"خدا تمہیں ہمیشہ خوش رکھے۔ اپنی خوشیوں کو قائم رکھنا چاہتی ہو تو جو کچھ کہنے والا ہوں، اسے غور سے سنو اور میری ہدایت پر عمل کرو۔"

"کوئی ایسی بات مت کرنا سکندر! جس سے میری خوشی کا خون ہو جائے۔"

"نہیں، ایسی کوئی بات نہیں کہوں گا دراصل میں تمہاری خوشی کو مستقل اور پائیدار بنانا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "تمہیں یاد ہو گا، جب کئی سال پہلے، چھوٹے ماموں کی شادی کی بات چل رہی تھی، میں نے تمہیں منع کیا تھا کہ میرے گھر مت آنا، تمہاری زندگی کو خطرہ لاحق ہے۔ لیکن تم میری واضح ہدایت کے باوجود ہمارے ہاں آ گئی تھیں۔ تم نے میرا کہنا نہیں مانا تھا۔"

میرے سنجیدہ لہجے پر نورین گھبرا سی گئی۔ پھر بھی اُس نے ہنسنے کی کوشش کی۔ "گڑے مُردے اُکھیڑ رہے ہو۔ وہ لڑکپن کی بات تھی۔ اُس وقت شعور نہیں تھا۔ طبیعت میں مہم جوئی اور ایڈونچر پسندی کا مادہ تھا۔"

"اُس وقت تمہاری زندگی کو واقعی خطرہ لاحق تھا، لیکن خوش قسمتی سے ٹل گیا۔ تم بچ گئیں نورین!...... نورین! سن رہی ہو؟...... موت کے سائے تمہارے سر پر منڈلا رہے تھے، مگر تم بچ گئیں۔ حالانکہ تم نے اپنے طور پر میری بات نہ مان کر اپنی ہلاکت کی پوری پوری کوشش کر ڈالی تھی۔"

"ڈراؤ نہیں، سکندر!"

"آج پھر تمہاری زندگی کو خطرہ ہے۔" میں نے اسی رو میں کہا۔ "موت کے سائے دوبارہ تمہارے سر پر منڈلا رہے ہیں۔ اگلے چار دن بہت بھاری ہیں۔ میں ایک ضروری کام کے سلسلے میں فضیلہ کے ساتھ شہر سے باہر جا رہا ہوں۔ وعدہ کرو کہ جب تک ہم دونوں کی واپسی نہیں ہو گی، تم میری ہدایت پر پورا پورا عمل کرو گی۔ خدا گواہ ہے، جو کچھ کہہ رہا ہوں، نورین! وہ بالکل سچ ہے۔ اور مجھے تمہاری زندگی عزیز ہے۔ میں تمہیں زندہ اور خوش و خرم دیکھنا چاہتا ہوں۔"

اُس کی لرزتی ہوئی آواز آئی۔ "مجھے کیا کرنا ہو گا؟"

"چار دن تک...... صرف چار دن تک، جب تک میں اور فضیلہ واپس نہیں آئیں گے، تم بھائی جان سے نہیں ملو گی۔ اور ملو گی تو تنہائی میں نہیں ملو گی۔ اُن کے ساتھ کہیں گھومنے پھرنے بھی نہیں جاؤ گی۔ خوب اچھی طرح سمجھ لو کہ اگر تم نے میری ہدایت پر عمل نہیں کیا اور بھائی جان کے ساتھ چند لمحے بھی گزارے تو تم زندہ نہیں بچو گی۔ بھائی جان تمہیں قتل کر دیں گے۔"

"یہ نہیں ہو سکتا۔"

"یہی ہو گا، نورین! خدا کی قسم یہی ہو گا۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"بھائی جان کی چکنی چپڑی باتوں میں نہ آجانا۔ صرف چار دن کی تو بات ہے۔ کیا تم چار دن محتاط رہ کر نہیں گزار سکتیں؟ ایسا کرو کہ چار دن کے لیے بیمار پڑ جاؤ اور صبح ہوتے ہی اپنی دو چار سہیلیوں کو تیمارداری کے لیے بلالو اور اُن سے کہہ دو کہ وہ کسی بھی وقت تمھیں تنہا نہ چھوڑیں۔"

"ٹھیک ہے، سکندر! تم ٹھیک کہتے ہو۔ میں تمہاری بات مانے لیتی ہوں۔"

"پکا وعدہ؟"

"ہاں، ہاں...... پکا وعدہ۔"

"بھائی جان تمھیں ورغلانے اور دھوکا دینے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھیں گے۔ پوری پوری کوشش کر ڈالیں گے کہ تنہائی میں تمہارے ساتھ دو چار منٹ گزار سکیں۔ اگر تم نے ذرا سی بھی کمزوری دکھائی تو دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت تمھیں مرنے سے نہیں روک سکتی۔ خدا حافظ!"

"خدا حافظ، سکندر! فضیلہ تک میرا پیار پہنچا دینا۔"

نورین کو فون کر کے میں نے آواز دے کر رفیق کو بلایا، جو اس وجہ سے کسی دوسرے کمرے میں چلا گیا تھا کہ میں آزادی کے ساتھ گفتگو کر سکوں۔ رفیق آگیا تو میں نے اُس کا شکریہ ادا اور جس طرح دبکتا ہوا اُس کے گھر گیا تھا، اُسی طرح خاموشی سے اپنے گھر واپس چلا آیا۔

کمرے میں پہنچا تو فضیلہ اور لوسی ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھیں۔ مجھے دیکھ کر لوسی کھڑی ہو گئی۔ "سکندر!" اُس نے کہا۔ "کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ تم نے اچانک ایک رات کی دُلہن کے ساتھ راج کنڈل جانے کا پروگرام کیوں بنا لیا ہے؟"

"ایک رات کی نہیں، دو رات کی دُلہن ہے۔" میرا ہنسنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ مگر میں ہنستے ہوئے کہا۔ "ہم لوگ آج رات یہیں گزار کر کل رات کسی وقت جائیں گے۔"

اُس رات کا تھوڑا سا حصہ میں نے اور فضیلہ نے پیار محبت کی باتوں میں گزارا۔ زیادہ تر میں ترشولی اور رانی کی، بھائی جان کی، نورین کی باتیں ہوتی رہیں۔ میں نے فضیلہ کو سب بتا دیا۔ ایک لفظ بھی نہیں چھپایا۔ بچپن سے لے کر اب تک ترشولی کے مشقِ ستم کا جس جس نشانہ بنا تھا، سب کا ذکر کر دیا۔ وہ، جو ہمیشہ میری محبت کا دم بھرتی تھی، میری طرف سے نا اُمید ہو کر اب بھائی جان کی جانب مائل ہو چکی ہے۔ رانی کے روپ میں اُن کے دل و دماغ پر قبضہ کر کے اُس نے اُنھیں اس چھوٹے سے کام کے لیے تیار کر لیا ہے۔ جو وہ ہر ممکن کوشش کے باوجود مجھ سے نہیں کرا سکی تھی، جانتی ہو وہ چھوٹا سا کام کیا ہے؟ ترشولی، رانی کے جسم کی قید سے آزاد ہو چکی اور اب نورین کے جسم پر قابض ہونا چاہتی ہے۔ مگر ہمیشہ کی طرح اس مرتبہ بھی اُسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے گا۔

میں نے نورین کو فون کر کے سختی سے منع کر دیا ہے کہ وہ میری واپسی تک بھائی جان سے

تنہائی میں بات نہ کرے۔ سادھو سے مل کر واپس آؤں گا تو یقیناً کسی نہ کسی ایسے ہتھیار سے لیس ہو چکا ہوں گا، جس کے ذریعے ترشولی کو فنا کیا جا سکے گا۔ سادھو نے مجھے یقین دلایا تھا کہ اس بلا سے اُسی کے ذریعے نجات حاصل ہو سکتی ہے۔"

فضیلہ نے انتہائی دلچسپی اور توجہ کے ساتھ میری باتیں سنیں۔

"آپ کا خیال ہے کہ ترشولی نے، جو رانی کی شکل میں تھی، مجھے دائیں ہاتھ سے محروم کیا ہے۔ جبکہ میں نے جس بدصورت عورت کو دیکھا تھا، وہ رانی نہیں تھی۔"

"تم پر حملہ کرتے وقت اُس نے بدصورت عورت کا بھیس بدل لیا ہو گا۔"

"مگر آپ تو کہہ رہے تھے کہ وہ عورت رانی کے جسم میں مقید تھی اور صرف موت کے بعد ہی آزادی حاصل کر سکتی تھی۔ موت سے پہلے اُس کے لیے کسی دوسری شکل میں ظاہر ہونا ممکن نہیں تھا۔"

میں نے اس بات پر تو غور ہی نہیں کیا تھا۔ فضیلہ نے واقعی بڑی گہری بات کہی تھی۔ رانی، ترشولی تھی تو وہ بدصورت عورت کون تھی، جس نے فضیلہ کا ہاتھ قلم کیا تھا؟ اور اگر فضیلہ کو بازو سے محروم کرنے والا سفاکانہ کارنامہ ترشولی نے انجام دیا تھا تو پھر رانی کون تھی؟ رانی نے تو خود قبرستان میں ترشولی ہونے کا اعتراف کیا تھا۔ اعتراف ہی نہیں کیا تھا، ہاتھ اور ناک سے محروم شخص کو، جو الف لیلوی الہ دین کا چچا بننے کی کوشش کرتے ہوئے مجھے قبر میں دفن کر دینا چاہتا تھا، پلک جھپکتے میں ختم کر کے اپنی پُراسرار قوت کا مظاہرہ بھی کیا تھا۔

"بتایئے۔" فضیلہ نے دوبارہ پوچھا۔ "رانی اور ترشولی ایک ہی شخصیت کے دو نام ہیں، یا وہ دونوں علیحدہ علیحدہ وجود ہیں؟"

"یہ وہ معمہ ہے، جو راج کنڈل جا کر ہی حل ہو سکتا ہے۔"

فضیلہ بے اختیار ہنستی ہوئی میری گود میں گر گئی۔

معمہ راج کنڈل جا کر بھی حل نہیں ہوا، بلکہ پہلے سے زیادہ اُلجھ گیا کہ غیر مرئی طاقتوں نے، جن سے میں بچپن سے برسرِ پیکار تھا، بالآخر مجھے فتح کر کے مجھ پر اپنا تسلط جما لیا ہے۔ اب میں کبھی ان کی گرفت سے نہیں نکل سکوں گا۔

واقعات یوں ہیں کہ سمندر کے کنارے، اس مقام پر جو منزل گاہ تھا، لوسی نے اس جزیرے تک جانے کے لیے، جس پر راج کنڈل نامی مندر تھا، منہ مانگے کرائے پر کشتی لی۔ کشتی بان نے سمندر کی تند و تیز موجوں کا مقابلہ کرتے ہوئے ہمیں جزیرے تک پہنچا دیا۔ جس وقت ہم مندر پہنچے، سورج طلوع ہو رہا تھا۔ ایک شخص پانی کی لُٹیا سامنے رکھے طلوع ہوتے ہوئے سورج کی پوجا کر رہا تھا۔ مندر کے کھلے اور کشادہ حصے میں ایک مور رقص کر رہا تھا۔ دو چھتی پر دو مور اس طرح

کھڑے تھے، جیسے اپنے ساتھی مور کا رقص دیکھ رہے تھے۔

لوسی نے نمسکار کے انداز میں دونوں ہاتھ جوڑ کر سورج کے پجاری سے پوچھا۔

"مہاراج ویشا بھگت کہاں ہیں؟"

پہلی حیرت تھی، جو مجھے لوسی کے سوال پر ہوئی۔ خود مجھے سادھو کا نام نہیں معلوم تھا، لیکن وہ جانتی تھی کہ میں کس سے ملنے آیا ہوں۔

پجاری کے اشارے پر ہم تینوں کا قافلہ آگے بڑھا۔ پھولوں کی کیاریوں اور چہچہاتی ہوئی چڑیوں کے غول سے ہوتے ہوئے ہم لوگ سنگ مرمر کے بنے ہوئے چبوترے پر پہنچے اور چبوترے پر وہی لمبی لمبی جٹاؤں، بدنما داڑھی مونچھوں اور بیل جیسی خوف ناک آنکھوں والا سادھو، جو مجھے سمندر کے نزدیک پہاڑیوں پر ملا تھا، آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ اچانک مجھے پیچھے چھوڑ کر فضیلہ اور لوسی تیزی سے آگے بڑھیں اور سادھو کے قدموں پر سجدہ ریز ہو گئیں۔

مجھ پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ سادھو نے ہاتھ آگے بڑھایا اور فضیلہ کے سر پر پھیرتا ہوا بولا۔ "تم نے بہت دُکھ اُٹھائے ہیں، ترشولی! پر ہمیں خوشی ہے کہ تمہیں تمہارا بچھڑا ہوا محبوب مل گیا ہے۔"

میں پوری قوت سے چیخا اور وہاں سے بھاگنا چاہتا تھا۔ لیکن میری چیخ حلق میں گھٹ کر رہ گئی اور سنگ مرمر کے فرش میں میرے پیر اس طرح جکڑ گئے تھے کہ میں نہ آگے جا سکتا تھا اور نہ پیچھے۔

سادھو نے فضیلہ کے سر سے ہاتھ اُٹھا کر لوسی کے سر پر پھیرنا شروع کر دیا۔

"ہم تم سے بہت خوش ہیں، پورنما! تم بھی محروم نہیں رہو گی۔ ترشولی کی طرح تمہارے بھاگ بھی جاگ جائیں گے۔"

فضیلہ اور لوسی، جنہیں سادھو، ترشولی اور پورنما کے ناموں سے مخاطب کر رہا تھا، قدموں پر پڑیں، اُس کے قدموں کو چوم رہی تھیں۔

اور تب بیل سے بھی زیادہ بھیانک آنکھوں نے فضیلہ اور لوسی سے توجہ ہٹا کر میری طرف دیکھا۔ میں اُس سے خوف زدہ نہیں تھا، لیکن ریڑھ کی ہڈی میں تیز لہر دوڑ گئی۔ اُس کے ہونٹوں کو بے ہنگم طور پر پھیلی ہوئی بدنما مونچھوں اور داڑھی کے بالوں نے چھپا رکھا تھا، پھر بھی صاف محسوس ہو رہا تھا کہ وہ میری بے بسی اور بے چارگی پر مسکرا رہا تھا۔

"تم نے ہمارے پاس آنے میں بہت دیر لگا دی، بچہ!" اُس نے پیار سے کہا۔ "لیکن صبح کا بھولا شام کو واپس آ جائے تو اُسے بھولا نہیں کہتے۔ آؤ، دونوں بالکاؤں کی طرح تم بھی ہمارے قریب آ جاؤ۔"

میں نے قدم اُٹھانے کی کوشش کی اور کسمسا کر رہ گیا۔ پاؤں زمین سے اس طرح چپکے ہوئے تھے۔ گویا گوند لگا کر انہیں زمین ہی کا ایک حصہ بنا دیا گیا ہو۔

"مذاق کر رہے ہو، مہاراج!" میں نے تلملا کر کہا۔ "تمہیں نہیں معلوم کہ تمہارے بچگانہ چمتکار کی وجہ سے زمین نے میرے پاؤں پکڑ رکھے ہیں؟"

سادھو نے پلٹ کر فضیلہ پر نگاہ ڈالی اور آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ کہا۔ وہ اپنے واحد ہاتھ سے لباس درست کرتی ہوئی ادب کے ساتھ اُٹھی اور اُلٹے قدم چلتی ہوئی کہ سادھو کی طرف پیٹھ نہ ہونے پائے، میرے نزدیک آئی۔ خوشی سے اُس کا چہرہ گلنار ہو رہا تھا۔ کہنے لگی۔

"آپ کی آنکھوں نے جو کچھ دیکھا اور کانوں نے جو کچھ سنا، اس پر آپ کو حیرت ہوئی ہو گی۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ فضیلہ جس سے آپ کی منگنی ہوئی تھی، حقیقت میں اس دنیا میں نہیں ہے۔ وہ اسی شام ختم ہو گئی تھی جب اُسے سمندر سے ہسپتال لے جایا جا رہا تھا۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اس وقت جو فضیلہ آپ کے سامنے کھڑی ہے، وہ آپ کی نکاحی اور قانونی بیوی ہے۔"

"کسی وضاحت کی ضرورت نہیں۔ میں بے وقوف نہیں ہوں، دو اور دو چار کی طرح ہر بات اچھی طرح مجھ پر عیاں ہو چکی ہے۔"

"نہیں......بہت سی باتیں ایسی ہیں، جن کی وضاحت ضروری ہے۔ اور ان میں سے سب سے اہم وضاحت یہ ہے کہ میں فضیلہ کی قاتل نہیں ہوں۔ اُس پر کسی اور نے حملہ کیا تھا اور جو بعد میں جان لیوا ثابت ہوا۔"

"کیا فائدہ اس غلط بیانی سے؟"

"یقین کیجیے، میں کسی غلط بیانی سے کام نہیں لے رہی ہوں۔"

"غلط بیانی سے کام لے رہی ہو یا حقیقت بیانی سے۔" میں نے کہا۔ "میں پہلے ہی شکست تسلیم کر چکا ہوں۔ فضیلہ نہ ہوتے ہوئے بھی تم ہنوز وہی مجسم فضیلہ ہو، جس کی طرف دیکھنے سے آنکھوں میں ٹھنڈک اُترنے لگتی ہے اور دل میں تراوٹ سی محسوس ہوتی ہے۔"

غیر معمولی مسرت کے باعث فضیلہ کے رخسار تمتما اُٹھے۔ گویا کسی بھی لمحے ان سے خون چھلک اُٹھے گا۔ اس وقت بھی ایسا ہی ہوا۔ اُس نے پیار بھری آنکھوں سے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "میں نے فضیلہ بننے کے لیے بڑی محنت کی ہے۔ اُس کی حرکات و سکنات، اس کی بول چال کو اس قدر اپنایا ہے کہ آپ کو کبھی اُس کی کمی کا احساس نہیں ہو گا۔"

"جتنا رنج اُس کی موت کا ہے، اتنا ہی یہ امر میرے لئے باعثِ اطمینان ہے کہ مر کر بھی فضیلہ مجھ سے جدا نہیں ہوئی۔ تم نے اس خوب صورت جسم کو اپنے لیے پسند کر کے اسے نئی زندگی نہ دی ہوتی تو آج یہ قبر کی تاریکی میں گل سڑ کر کبھی کا ختم ہو گیا ہوتا۔"

فضیلہ ہنستی تو جلترنگ سی بج اُٹھتی تھی۔ میرا جملہ سن کر ہنسی تو حسب معمول جلترنگ بجی اور حسب سابق گرد و پیش کی ہر شے جھوم اُٹھی۔ اصل اور نقل میں سرِ مو بھی تفاوت نہیں تھا۔ وہی ہنسی، وہی بے ساختگی۔ وہی سپردگی، وہی آواز، وہی لہجہ، وہی ادا اور وہی سراپا۔

"مجھے خوشی ہے کہ آپ نے بہت جلدی حالات سے سمجھوتہ کرلیا۔" اُس نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اب کسی موزوں وقت پر سکون سے بتا سکوں گی کہ میں کون ہوں اور ہزاروں لاکھوں میں، میں نے آپ کو اپنی محبت کے لیے کیوں منتخب کیا ہے؟"

"کیوں؟....... کیا تم ترشولی نہیں ہو؟" میں نے دریافت کیا۔ "کیا سامنے بیٹھے ہوئے سادھو نے تمھیں ترشولی کہہ کر مخاطب نہیں کیا؟"

"دنیا میں صرف فضیلہ کے ابو ہی خان صاحب نہیں ہیں، ان کے علاوہ بھی ایسے بے شمار افراد ہیں، جنھیں خان صاحب کہا جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح میں بھی واحد ترشولی نہیں ہوں۔ میرے علاوہ اور بھی بہت سی رُوحیں ہیں، جو ترشولی کہلاتی ہیں۔ جس طرح ہر خان صاحب کا ایک الگ نام ہوتا ہے، اسی طرح ہمارے نام بھی الگ الگ ہوتے ہیں۔"

"تمھارا نام کیا ہے؟"

"فضیلہ۔" اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "چلیے۔ مہاراج آپ کو اپنی سیوا میں بلا رہے ہیں۔"

اِدھر اس نے کندھے پر ہاتھ رکھا، اُدھر زمین نے میرے پاؤں چھوڑ دیے۔ میں سحر زدہ سا فضیلہ کی معیت میں آگے بڑھا۔ میرے اور سادھو کے درمیان بمشکل چند گز کا فاصلہ ہو گا، مگر وہ میری اور فضیلہ کی جانب متوجہ نہیں تھا، بڑے انہماک سے لوسی سے کسی مسئلے پر گفتگو کر رہا تھا۔ مختصر سا فاصلہ طے کر کے جب میں اس کے روبرو پہنچا تو ادب اور احترام کے ساتھ آداب بجا لایا۔

سادھو نے مڑ کر میری طرف دیکھا اور اس کے چہرے پر ناگواری کے آثار اُبھر آئے۔

"پورنما!" اس نے لوسی سے کہا۔ "نوجوان بالک کو بتاؤ کہ ہمیں کس طرح پرنام کیا جاتا ہے۔"

لوسی اُٹھی، کھڑی ہوئی، لباس کی سلوٹیں درست کر کے دونوں ہاتھوں کو جوڑا اور سادھو کے قدموں میں سجدہ ریز ہو گئی۔

"پورنما کی طرح تم بھی ہمیں پرنام کرو، بچہ!" سادھو نے مجھے حکم دیا۔

"سادھو مہاراج!" میں نے بلا خوف و خطر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "مکمل طور پر نہ سہی، مگر کسی نہ کسی حد تک مجھے تمھاری قوت کا اندازہ ہو چکا ہے۔ اور یہ جانتے ہوئے کہ اگر میں نے حکم عدولی کی تو مجھے ناقابلِ تلافی نقصان پہنچ سکتا ہے، میں تمھیں صاف صاف بتا دینا چاہتا ہوں کہ بخوشی اپنا سر کٹا دوں گا، لیکن خدا کے علاوہ اور کسی کے سامنے ہرگز نہیں جھکاؤں گا۔"

چند لمحوں کے لیے جزیرے کے اس سمندر میں بھونچال سا آ گیا۔ دریا کی وہ لہریں، جو وہاں سے نظر آ رہی تھیں، بپھر کر کئی فٹ بلند ہو گئیں اور بھیانک انداز میں تھپیڑے کھانے لگیں۔ سادھو کی شگفتگی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ لوسی کانپنے لگی اور فضیلہ کا چہرہ سفید پڑ گیا۔

سادھو گرج دار آواز میں بولا۔ "جو لوگ ہمارا حکم نہ مانیں، ہم انھیں ایک اشارے میں بھسم کر دیتے ہیں۔"

میں نے ترکی بہ ترکی کہا۔ "یہ کام تو آج کل کے وہ طالب علم بھی کر لیتے ہیں، جن کے ہاتھوں میں کچھ لوگوں نے اپنی دکانداری چمکانے کے لیے کتابوں کے بجائے خودکار ہتھیار دے دیے ہیں۔"

میرا جواب گستاخانہ ہی نہیں تھا بلکہ غصے کی آگ کو اور بھڑکانے والا تھا۔ شکست خوردہ ہونے اور پراسرار افراد میں گھرے ہونے کے باوجود مجھ جیسے ڈرپوک، بزدل اور ذرا سی بات پر بچوں کی طرح رو پڑنے والے میں نجانے اتنی جرأت و ہمت کہاں سے آ گئی تھی کہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جانا گوارا تھا مگر کوئی ایسا عمل قابلِ قبول نہیں تھا، جس سے بوئے شرک آتی ہو۔

"مورکھ!" سادھو نے نفرت سے کہا۔ اُس کی آنکھیں شعلے اُگل رہی تھیں۔

فضیلہ روتی ہوئی میرے پیروں میں گر گئی۔ "کتنی مصیبتوں اور کٹھنائیوں کے بعد آپ کو حاصل کیا ہے۔ آپ کی ذرا سی گستاخی ہمیں صدا کے لیے جدا کر دے گی۔"

میں نے جھک کر اُسے کھڑا کیا۔ فضیلہ نہ ہوتے ہوئے بھی وہ فضیلہ سے الگ نہیں تھی۔ اُس کی اُداسی دُور کرنے اور اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھنے کے لیے زندگی تک کو قربان کیا جا سکتا تھا۔ صدا تو بہت لمبا اور کبھی نہ ختم ہونے والا عرصہ ہوتا ہے، مجھے تو فضیلہ کی ایک دن کی بھی جدائی گوارا نہیں تھی۔

"مہاراج کو ناراض نہ کیجیے۔" وہ ملتجیانہ انداز میں مجھ سے کہہ رہی تھی۔

میں تھوڑی دیر کے لیے بھول گیا کہ میں کہاں ہوں اور کن لوگوں میں ہوں۔ بے اختیار مجھے سادھو کی غیر فطری اداکاری پر ہنسی آ گئی۔ سادھو ٹھٹک کر رہ گیا۔ اس کی خوف ناک آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ وہ توقع کر رہا تھا کہ مجھے ڈرانے، دھمکانے، مرعوب کرنے اور میرا سر جھکانے میں کامیاب ہو جائے گا۔ لیکن ہوا اس کے برعکس۔ سجدہ ریز ہو کر پرنام کرنا تو درکنار، میں اُلٹا اُس کی حرکات پر بڑی ڈھٹائی کے ساتھ تضحیک آمیز انداز میں ہنس رہا تھا۔

"بچہ......!" سادھو نے سانپ کی طرح پھنکارتے ہوئے کہا۔ "کیا تمھیں اپنی زندگی پیاری نہیں؟"

"نہیں۔" میں نے نفی میں سر ہلایا۔

لوسی اور فضیلہ دونوں میری فہمی پر سہمی سی کھڑی تھیں۔ ایکا ایکی فضیلہ چبوترے کی جانب بڑھی اور خوشامدانہ انداز میں بولی۔

"انہیں معاف کر دیجیے، مہاراج! دراصل یہ نہیں جانتے کہ آپ کون ہیں۔"

میں اپنے سینے میں ایمان کی حلاوت محسوس کر رہا تھا، اس لئے ذرہ برابر بھی کسی سے خائف نہیں تھا۔ "فضیلہ درست کہہ رہی ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں تمہارے بارے میں اس کے علاوہ کچھ نہیں جانتا کہ تم اپنی دنیا میں ظلم و بربریت کی علامت سمجھے جاتے ہو۔"

سادھو مجھے گھورتا ہوا دوبارہ اپنی جگہ چار زانو ہو کر بیٹھ گیا۔ اُس کے تیور اچھے نہیں تھے۔ میں ہمہ تن مرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ زندگی ایک بوجھ سی معلوم ہونے لگی۔ دل چاہنے لگا کہ جلد از جلد یہ بوجھ اُتر جائے اور میں ہوا کی طرح ہلکا پھلکا ہو جاؤں۔

پھر نہ جانے کیا ہوا کہ سادھو نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ فضیلہ اور لوسی کے مرجھائے ہوئے چہروں پر شادابی آگئی۔ دریا کی تلاطم خیز لہریں پُرسکون ہو گئیں۔

"یہاں آ کر اچھے اچھوں کے پتے پانی ہو جاتے ہیں۔" سادھو نے ہنستے ہوئے کہا۔ اُس کے لہجے میں پہلے جیسا غصہ اور رعب و دبدبہ نہیں تھا۔ "ہم تمہاری ہمت اور جرأت کی قدر کرتے ہیں، بالک! ہمیں تم جیسے ہی نڈر لوگوں کی ضرورت ہے۔ تم غلط جگہ نہیں آئے ہو۔ تمہاری وہ سبھی ضرورتیں پوری کی جائیں گی، جن کی خاطر تم نے یہاں تک سفر کیا ہے۔ اور بن مانگے بہت سے انعامات بھی دیئے جائیں گے۔ اور اب تم اور ترشولی گیارہ نمبر کی کٹیا میں جا کر آرام کرو۔ پورنما یہیں رہ کر ہم سب کے جل پانی کا انتظام کرے گی۔"

جزیرے پر پہنچ کر جب ہم سادھو کے پاس مغربی حصے کی طرف واقع سنگ مرمر کی بنی ہوئی عمارت کی طرف جا رہے تھے، مندر کے جنوب میں ہم نے درجنوں چھوٹے چھوٹے کمرے دیکھے تھے۔ کسی زمانے میں یہ کمرے یاتریوں سے بھرے رہتے ہوں گے۔ اور خاص خاص تہواروں کے موقعوں پر تو اتنی بھیڑ بھاڑ ہوتی ہو گی کہ اوپر نیچے خیمے بھی لگائے جاتے ہوں گے۔ کٹیا سے سادھو کی مراد جنوبی کمروں ہی میں سے کوئی کمرہ تھا۔

"آؤ، فضیلہ!" میں نے کہا۔ اور پھر کمرے میں جانے کے بجائے سادھو سے مخاطب ہوا۔

"مہاراج! میری کسی بات سے تکلیف پہنچی ہو، تو سچے دل سے معاف کر دینا۔"

"طویل سفر کی وجہ سے میرے جسم کا جوڑ جوڑ درد کر رہا ہے۔" فضیلہ نے کروٹ لے کر میری جانب چہرہ کر لیا۔ "پھر بھی اتنی خوش ہوں کہ الفاظ کے ذریعے خوشی کا اظہار نہیں کر سکتی۔ سفر کے دوران راستے بھر یہ سوچ سوچ کر ڈرتی رہی کہ حقیقت سے آگاہ ہونے کے بعد اگر آپ نے مجھے ٹھکرا دیا تو کیا ہو گا؟"

میں نے کہا۔ "میرے لئے یہ تصور بڑا تکلیف دہ ہے کہ فضیلہ مر چکی ہے۔ میری نظروں میں بار بار وہ منظر گھوم جاتا ہے، جب سمندر پر جاتے ہوئے اُس نے آخری بار اپنی امی کو دیکھ کر آہستہ سی آواز میں خدا حافظ کہا تھا...... دل نہیں چاہتا کہ اُس کی باتیں کی جائیں، لیکن کچھ چیزیں ایسی ہیں، جو وضاحت طلب ہیں۔ تم کہتی ہو کہ تم نے اُس کا خون نہیں کیا۔ اور یہ بات ایسی ہے، جو میرے حلق سے اُتارے نہیں اُتر رہی۔"

"میں بتا چکی ہوں کہ حملہ کرنے والی کوئی اور تھی۔ میں نے تو اس جسم کو اپنا کر آپ کے اوپر کرم کیا ہے، جس کا اعتراف آپ خود کر چکے ہیں۔"

"کیا تم اس دوسری حملہ آور کی نشاندہی کر سکتی ہو؟"

"کیوں نہیں۔" وہ بولی۔ "آپ اُس سے اچھی طرح واقف ہیں۔ وہ، وہی ہے، جو داہنے بازو کھا کر اپنی قوت بحال رکھتی ہے۔"

مجھے رانی یاد آگئی۔ قبرستان میں اُس نے اعتراف کیا تھا کہ انسانی بازو اُس کے ہاتھوں میں پاپڑ بن جاتے ہیں۔

"جھوٹ مت بولو۔" میں نے بگڑ کر کہا۔ "فضیلہ پر رانی نے نہیں، ایک سیاہ فام بلا نے حملہ کیا تھا۔ سیاہ فام بلا کی صورت میں آنے کے لیے رانی کی موت ضروری تھی۔ جبکہ اس وقت وہ زندہ تھی۔ اُس کی موت تو اب تھانے میں پولیس کی گولی سے ہوئی ہے۔"

"میں نے کب کہا کہ اس سانحے کی ذمہ داری رانی پر عائد ہوتی ہے؟"

"نام نہیں لیا، لیکن انسانی بازو کے پاپڑ بن جانے کا ذکر کر کے اشارہ تو اس کی طرف کیا ہے۔"

وہ ہنس پڑی۔

"میں بھول ہی گئی تھی کہ رانی کی قوت کا دارومدار بھی انسان کے داہنے ہاتھ پر ہے۔ ویسے وہ اس کی قاتل نہیں ہے۔"

"رانی قاتل نہیں ہے، تم قاتل نہیں ہو۔ تو پھر فضیلہ کا قاتل کون ہے؟"

"ترشولی۔"

"ترشولی تو تم بھی ہو اور رانی بھی ہے۔"

"ہم میں سے جسے جسم مل جائے، وہ ترشولی نہیں رہتی، اس کا نام وہی ہو جاتا ہے، جو اس جسم کا ہوتا ہے۔ فضیلہ پر جس نے حملہ کیا تھا، وہ انسانی جسم میں نہیں تھی۔ اس لئے وہ ترشولی ہے۔ اور اب تو رانی بھی ترشولی بن چکی ہے۔"

عجیب و غریب قسم کی منطق تھی۔ بھٹکی ہوئی روحوں کا ایک مخصوص گروہ برسرِ عمل تھا، جس کی فرداً فرداً ہر روح اس وقت تک ترشولی تھی، یا اُسے قتل کرایا گیا تھا؟

”آپ سمجھ رہے ہیں کہ لوسی مر چکی ہے، اور اس کے جسم پر کسی اور کا قبضہ ہے؟“ فضیلہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”جی نہیں۔ اس کے جسم پر کسی کا قبضہ نہیں۔ وہ جیسی کل تھی، ویسی ہی آج ہے۔“

”لوسی فطری موت مری تھی یا اُسے قتل کرایا گیا تھا؟“

”اچھا، اب فی الحال ان باتوں کو چھوڑیے۔“ فضیلہ نے اِٹھلا کر جواب دیا اور میرے ہاتھ کو اپنی جانب کھینچتی ہوئی بولی۔ ”بیٹھیے، بیٹھیے۔ تھکے ہوئے ہیں۔ پوری رات سفر کرتے آئے ہیں اور اب یہاں بھی بیٹھے ہوئے ہیں۔ تھوڑی دیر لیٹ کر کمر سیدھی کر لیجے۔ یہ باتیں تو بعد میں بھی ہوتی رہیں گی۔“

❁

تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کے بعد لوسی نے کٹیا کے دروازے پر دستک دی۔ میں نے اُٹھ کر دروازہ کھولا۔ وہ پیتل کے تھال میں ناشتہ لے کر آئی تھی۔ ناشتے میں تازہ مٹھائی تھی، پوریاں، کچوریاں تھیں، آلو اور چھولوں کا سالن تھا، چند قاشیں آم کے اچار کی تھیں۔

”کھانے پینے کی یہ چیزیں......“ میں نے حیرت سے تھال کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”جزیرے پر مل جاتی ہیں؟“

”ندی کے پار شہر کے بازار سے منگوائی گئی ہیں۔“ لوسی نے جواب دیا۔ ”یہاں ملتیں تو تمہارے ناشتے میں اتنی دیر نہ لگتی۔“

”توبہ ہے، سکندر! تم تو بال کی کھال اُتارتے ہو۔ مندر کی حفاظت اور دیکھ بھال کے لیے یہاں جو تین افراد رہتے ہیں، اُنھیں میں سے ایک کو ناشتہ لانے کے لیے شہر بھیجا تھا۔“

”کشتی میں بھیجا ہوگا؟“

”تمہارا کیا خیال ہے، کیا کشتی کے علاوہ شہر جانے کا کوئی طریقہ ہو سکتا ہے؟“

میرا سوال فضول اور بے معنی نہیں تھا، مگر میں نے یہ بات لوسی کو نہیں بتائی اور اگلا سوال کر ڈالا۔ ”یہاں کے رہنے والوں کو علم ہے کہ ہمارے سادھو مہاراج رام نہیں، رام کے دشمن، راون کے پجاری ہیں؟“

”انھیں علم ہو جائے تو مہاراج کو کھڑے کھڑے باہر نکال دیں۔ وہ تو یہ سمجھتے ہیں کہ مہاراج، رام اور سیتا کے سچے بھگت ہیں۔ اور منگل کے منگل راج کنڈل میں تشریف لاتے ہیں۔ سوال ختم ہو گئے ہوں تو تم دونوں ناشتہ کرو۔ میں واپس جا رہی ہوں۔ تمہارے لیے چائے تیار کرنی ہے۔“

”ایک بات اور بتا دو۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”ہاتھ منہ دھونے اور دانت صاف کرنے کے لیے پانی کہاں سے ملے گا؟“

”جزیرے میں پانی کی کوئی کمی نہیں ہو سکتی۔ جس طرف بھی نکل جاؤ گے، ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر نظر آئے گا۔ کٹیا سے باہر نکل کر دیکھو، چند قدم کے فاصلے پر سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں۔ آخری سیڑھی پر بیٹھ کر اطمینان کے ساتھ ہاتھ منہ دھو سکتے ہو۔ ایک بات کا خیال رہے، جو سیڑھیاں پانی

میں ڈوبی ہوئی ہیں، اُن پر قدم رکھنے کی غلطی مت کرنا۔ پانی کی لہریں بہت تیز ہیں۔ تمہارے ساتھ کوئی رعایت نہیں کریں گی۔"

لوسی کے جانے کے بعد تھال کو فضیلہ کے دوپٹے سے اچھی طرح ڈھانپ کر میں نے فضیلہ کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "آؤ، پہلے ہاتھ منہ دھولیں۔"

سیڑھیاں زیادہ دور نہیں تھیں۔ پانی کے تھپیڑوں کے باعث جگہ جگہ سے ٹوٹ گئی تھیں۔ کچھ پر کائی بھی جم گئی تھی۔ ایک دوسرے کے سہارے احتیاط سے قدم اٹھاتے ہوئے ہم دونوں نے سیڑھیاں طے کیں اور اس سیڑھی تک گئے، جو پانی میں ڈوبنے سے بچی ہوئی تھی۔ فضیلہ سیڑھی پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئی۔ میں جھک کر صاف شفاف پانی میں ہاتھ دھونے لگا۔

"مسٹر نے ڈرا دیا ہے۔ ورنہ دل تو چاہ رہا ہے کہ ایک سیڑھی اور اتر جاؤں اور اس پر بیٹھ کر غسل کروں۔"

"غسل کے لیے شمال کی طرف اشنان گھر موجود ہے۔" فضیلہ نے بتایا۔ "ناشتے کے بعد آپ کو راج کنڈل کی سیر کرانے لے چلوں گی تو اشنان گھر بھی لے جاؤں گی۔ آپ نے ایسا اشنان گھر کبھی نہیں دیکھا ہوگا۔"

پھر اس نے کم و بیش ڈیڑھ دو میل کے فاصلے پر بنے ہوئے دو پُل دکھائے، جن کی طرف میرا دھیان نہیں گیا تھا۔ اُن میں سے ایک ہیمرن برج تھا اور دوسرا کیمرج برج۔ دونوں پُل ستون کے بغیر تعمیر کیے گئے تھے۔

"سمندر کی گہرائی اتنی زیادہ ہے اور پانی اتنی قوت سے بہہ رہا ہے کہ اس پر ستون بنائے نہیں جاسکتے۔"

اسی لمحے کیمرج برج سے ایک مسافر ٹرین گزری۔ بلاشبہ دونوں پلوں کی تعمیر بڑی حیرت انگیز تھی۔ میں نے پُل سے گزرتی ہوئی ٹرین کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"ایسا معلوم ہو رہا ہے، جیسے پانی سے اُونچی ایک طویل ترین ہوائی چھت بنا کر بڑی مہارت کے ساتھ سمندر کے دونوں کناروں سے پیوست کر دی گئی ہو۔ یہ پُل سائنس کے کرشموں کے شاہکار ہیں۔"

"کیا یہ ممکن ہے کہ پُل کا وہ حصہ، جو پانی سے اُوپر ہے، وہ جسے آپ ہوائی چھت کہہ رہے ہیں، سمندر کے صرف ایک کنارے پر ڈالا جاسکے اور دوسرے کنارے کا کوئی سہارا نہ لیا جاسکے؟"

"نہیں، یہ قطعی طور پر ناممکن ہے۔ دونوں پُل توازن کے اصول پر بنائے گئے ہیں۔ کنارے اس توازن کو برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ صرف ایک کنارے پر ستون کے بغیر پُل یا پُل کا کچھ حصہ بنایا جائے تو توازن قائم نہیں رہ سکے گا اور پُل نیچے گر جائے گا۔"

میں نے کوئی غلط بات نہیں کی تھی۔ ہم اپنے مکانوں کی چھتیں بھی اسی توازن کے اصول پر ڈالتے آئے ہیں۔ کسی ایسے کمرے کا تو کوئی تصور بھی نہیں کیا جاسکتا، جس کی چھت ایک دیوار پر ڈال کر سمجھ لیا جائے کہ وہ نیچے نہیں گرے گی۔ مگر میری بات غلط تھی۔ راج کنڈل میں واقعی اشنان گھر نام کا ایک ایسا کمرہ موجود تھا، جس کے فرش کا ایک حصہ جزیرے پر تھا اور دوسرا دور تک کسی ستون اور کسی سہارے کے بغیر صرف اور صرف پانی کے اوپر قائم تھا۔ فرش کے درمیان میں کھلی ہوئی مربع نما جگہ تھی، جس کے نیچے بہتا ہوا دریا صاف نظر آتا تھا۔ اس مربع نما جگہ پر بیٹھ کر بہتے ہوئے دریا کے تازہ پانی سے غسل کیا جاتا تھا۔

ناشتے کے بعد جب فضیلہ نے مجھے اشنان گھر کا معائنہ کروایا تو میں صدیوں پرانے ان معماروں کی کاریگری پر حیران رہ گیا، جنہوں نے نظریۂ توازن سے روگردانی کر کے پانی پر کسی سہارے کے بغیر چھت ڈال دی تھی۔ یہ ایسا کارنامہ تھا، جس کے سامنے ہیمرن برج اور کیمرج برج جیسے بے ستون کے پلوں والے کرشمے بھی ماند تھے۔

جزیرے پر گھومتے ہوئے ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔

فضیلہ چلتے چلتے تھک گئی، اس لیے مشرقی کنارے پر واقع جھاڑیوں کے پاس ستانے کے لیے بیٹھ گئی اور ایک پتھر سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کرلیں۔ میں قدرے فاصلے پر کھڑا ہو کر سمندر میں چلنے والی ایک مسافر لانچ کو دیکھنے لگا۔ بہت سے لوگ ایک شہر سے دوسرے شہر آنے جانے کے لیے رکشاؤں اور تانگوں کے بجائے لانچ پر سفر کیا کرتے تھے۔ یہ بات فضیلہ نے بتائی تھی۔ اُس کا کہنا تھا کہ لانچ کا کرایہ کم ہوتا ہے اور وقت بھی کم لگتی ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ ایک بڑے بازار کے بالکل قریب اُتارتی ہے۔

لانچ کو دیکھتے ہی دیکھتے میری نظریں اس کنارے پر پڑیں، جس کی جھاڑیوں کے پاس فضیلہ آنکھیں بند کیے بیٹھی تھی۔ پانی میں زرد رنگ کا ایک لمبا سانپ تیر رہا تھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ خشکی پر آگیا اور بل کھاتا ہوا فضیلہ تک پہنچ گیا۔ فضیلہ کی زمین پر پھیلی ہوئی ٹانگوں کے نزدیک وہ نصف سے زیادہ دم پر کھڑا ہوگیا اور اُس کی دوشاخہ زبان باہر نکل آئی۔

میں دم بخود سا کھڑا تھا۔ نہ فضیلہ کو آواز دے کر خطرے سے آگاہ کرسکتا تھا اور نہ خود دم پر کھڑے سانپ کو وہاں سے ہٹانے کی کوشش کرسکتا تھا۔ اسی لمحے ایک عجیب سی آواز ہوئی۔ میں نے ایک مور کو سانپ کے اوپر گرتے دیکھا۔ پلک جھپکتے میں سانپ کا منہ اُس کے پنجوں کے نیچے تھا اور دم مور کی چونچ میں دبی ہوئی تھی۔

فضیلہ نے جونہی یہ منظر دیکھا، گھبرا کر بھاگی اور میرے سینے سے لگ کر کھڑی ہوگئی۔ مجھے معلوم تھا کہ ابتدائے آفرینش سے سانپ اور مور کی دشمنی چلی آرہی ہے، لیکن اپنی آنکھوں سے

کبھی کسی مور کو سانپ کا شکار کرتے نہیں دیکھا تھا۔ سانپ بری طرح بلبلا رہا تھا، جبکہ مور اُسے دُم کی طرف سے اپنے حلق میں اُتار رہا تھا۔ سانپ کی جدوجہد کم ہوتی گئی اور اسی نسبت سے مور اُسے آہستہ آہستہ نگلتا گیا۔ یہاں تک کہ پنجوں پر جھک کر سانپ کو اس حد تک نگل گیا کہ صرف سانپ کا سر اُس کے پنجوں کے نیچے دبا رہ گیا۔ تقریباً دو منٹ اسی حال میں گزر گئے۔ پھر جس طرح مور نے سانپ کو آہستہ آہستہ نگلا تھا، اسی طرح اُگلنا شروع کر دیا۔ سانپ کا سارا گوشت پوست مور کے پیٹ میں جا کر گل گیا تھا اور مور کے منہ سے ایک لمبی سی سفید ہڈی باہر آ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد اُس نے پورے سانپ کو، جس کی صرف ہڈی باقی رہ گئی تھی، اُگل دیا، پَر تولے اور اُڑتا ہوا دُور کی ایک منڈیر پر جا بیٹھا۔

”شکر کرو، تم بچ گئیں۔“ میں نے فضیلہ سے کہا۔

”شکر کیجیے کہ آپ کی فضیلہ بچ گئی۔“ اُس نے میرے لہجے کی نقل اُتارتے ہوئے کہا۔ اُس کا جملہ ذومعنی تھا، کیونکہ مرنے کے بعد بھی اُسے مرنا نہیں تھا، کسی دوسری لڑکی کی تلاش میں مصروف ہو جانا تھا۔ تاہم میں اپنی فضیلہ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محروم ہو جاتا اور مجھ سے اُس کا بے روح سہارا بھی چھین لیا جاتا۔ میں اُس کی بات کو پی گیا۔

”میرا خیال تھا کہ نیولے کی طرح مور بھی سانپ کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہوگا۔“ میں نے کہا۔ ”یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ اسے نگل کر دوبارہ ہڈی کی صورت میں اُگل دیتا ہے۔“

”جزیرے پر ایسے تماشے عام ہیں۔“ فضیلہ بولی۔ ”سانپوں کی جب بھی موت آتی ہے، وہ یہاں کھنچے چلے آتے ہیں۔“

”سانپ کو دیکھ کر تو میں اتنا نہیں گھبرایا تھا، جتنا اُس وقت، جب میں نے اُسے دم پر کھڑا ہو کر تم پر حملہ کرنے کی تیاری کرتے ہوئے دیکھا۔“

”تعجب ہے۔ اُسے دُم پر کھڑے ہونے کی مہلت مل گئی۔ ورنہ مور اتنی مہلت بھی نہیں دیتے۔ ادھر کوئی سانپ خشکی پر آتا ہے اور ادھر کوئی نہ کوئی مور اُس کے منہ کو اپنے پنجے میں دبا لیتا ہے۔ آپ جب تک یہاں ہیں، روزانہ ایسے منظر دیکھیں گے۔“

”تم سمجھ رہی ہو، میں یہاں کئی روز کے لیے آیا ہوں؟“

”جی ہاں...... میرا بھی خیال ہے کہ جب تک شہر میں کرفیو نافذ ہے، ہم لوگ یہیں قیام کریں گے۔“

”نہیں...... میں کرفیو ہٹنے سے پہلے ہی واپس جانے کی کوشش کروں گا۔“

”اتنی جلدی کی کیا ضرورت ہے؟ گھر سے دُور تنہائی کے جو لمحات ملے ہیں، ان سے فائدہ اُٹھانے کے لیے ہمیں انہیں طول دینا چاہیے۔ آخر وہ لوگ بھی تو ہیں، جو شادی کے بعد ہنی مون

منانے کی خاطر کئی کئی ہفتے گھر سے دُور رہ کر گزارتے ہیں۔“

”بُرا مت ماننا۔“ میں نے کہا۔ ”تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ میں مہاراج کے پاس کیوں آیا ہوں۔ تمہارے ہاتھ کا محض بہانہ تھا۔ کیونکہ تمہارے ابو کچھ ہی کیوں نہ سمجھیں، مجھے یقین ہے کہ اس سادھو سمیت دنیا کا کوئی شخص ایسا نہیں، جو تمہیں ہاتھ فراہم کر سکے۔ تم جب تک اس خوب صورت جسم میں ہو، ہاتھ کے بغیر ہی زندگی گزارو گی۔ میرا مقصد تو یہ تھا کہ سادھو کی مدد سے نورین کو بھائی جان کے ہاتھوں قتل ہونے اور اُس ترشولی کے قبضے میں جانے سے بچایا جائے، جو پولیس کانسٹیبل کی گولی کا نشانہ بننے سے پیشتر رانی کے روپ میں بھائی جان کو اپنا دیوانہ بنائے ہوئے تھی۔ میں یہ نہیں جانتا کہ تم، لوسی، رانی اور سادھو سب کے سب ایک ہی تھالی کے چٹے بٹے ہو۔ علم ہوتا تو ہرگز نہ آتا۔ اور اب پتہ چل گیا ہے تو ایک لمحہ بھی یہاں رُکنے کا روادار نہیں ہوں۔“

”میں مانتی ہوں کہ مجھے بھی دوسروں کی طرح مہاراج ویشا بھگت کی سیوک ہونے کا شرف حاصل ہے۔“ اُس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”میں ان کے حکم کو مانتی ہوں اور مشن کی تکمیل کے لیے انہوں نے جو بیڑا اُٹھایا ہے، اس کی دل سے قدر کرتی ہوں۔ لیکن یہ نہ بھولیے کہ آپ میرے شوہر ہیں۔ ہمارے ہاں شوہر کی حیثیت دیوتا جیسی ہوتی ہے۔ دیوتا کو ناراض نہیں کیا جا سکتا، اس کی پوجا کی جاتی ہے۔ اگر آپ رُکنا نہیں چاہتے تو میں ضد نہیں کروں گی۔ ہاں، اتنی درخواست ضرور کروں گی کہ مہاراج کو اپنی آمد کا مقصد تو بتا کر دیکھیے۔ ہو سکتا ہے کہ نورین باجی کی زندگی بچ جائے اور وہ اور بھائی جان ایک بار پھر پہلے جیسی محبت کرنے لگیں۔“

میرا تو دل نہیں چاہ رہا تھا کہ فضیلہ کے مشورے پر عمل کیا جائے، مگر یہ سوچ کر تیار ہو گیا کہ نقصان ہی کیا ہے۔ کام بنے یا نہ بنے، جس مقصد کے لیے اتنا طویل سفر کیا ہے، اس سے سادھو کو آگاہ تو کر ہی دینا چاہیے۔

ایک گھنٹے بعد اُس نے لوسی کے ذریعے مجھے اور فضیلہ کو اپنی سیوا میں طلب کیا۔ وہ دریا کے اُس کنارے پر جس کی دیوار کی پشت پر ایک بڑا سا بت نصب کیا گیا تھا، اس طرح پاؤں پھیلائے ہوئے بیٹھا تھا کہ پانی کی شفاف لہریں اس کے پیروں سے ٹکرا رہی تھیں۔ میں نے فضیلہ سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ اگر اُس نے صبح کی طرح اس وقت بھی سجدے کے انداز میں سادھو کی تعظیم کی تو میں ہمیشہ کے لیے اسے چھوڑ دوں گا۔ اس جسم کا کوئی خیال نہیں کروں گا، جس کا ایک ایک رواں مجھے بہت پیارا تھا۔

فضیلہ نے میری ہدایت پر عمل کرتے ہوئے سجدے سے گریز کیا۔ اُس کا عمل سادھو کے لیے حیرت کا باعث تھا۔ وہ چند لمحے تک آنکھیں پھاڑے فضیلہ کو دیکھتا رہا، پھر ہنس پڑا۔

''عجیب بات ہے۔'' اُس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''ہر ناری میں اتنی شکتی ہوتی ہے کہ وہ اپنے تن کو من چاہے رنگ میں رنگ سکتی ہے، لیکن وہ اس شکتی کا فائدہ نہیں اٹھاتی اور اُلٹی خود غرض کے رنگ میں رنگ جاتی ہے۔ تم نے ہم سے ہماری ترشولی کو چھین لیا، بچہ!''

''کس نے کیا چھینا، کیا کھویا اور کیا پایا، اس بات کو تم سے بہتر اور کون جانتا ہے؟'' میں نے چمکتی ہوئی ریت پر بے تکلفی سے بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''آج صبح کی ملاقات میں تم نے کہا تھا کہ میں غلط جگہ نہیں آیا ہوں۔ میری وہ سبھی ضرورتیں پوری کی جائیں گی، جن کی خاطر میں نے یہاں کا سفر کیا ہے۔''

''ہاں.......'' وہ اثبات میں سر ہلاتا ہوا بولا۔ ''اور چاہے تم مانگو یا نہ مانگو، تمہیں دوسرے انعام بھی دیئے جائیں گے۔''

''میری ضروریات میں لمبی چوڑی فہرست نہیں ہے۔ میں صرف اتنا چاہتا ہوں.......''

''ہمیں معلوم ہے، بچہ! کہ تم چاہتے ہو کہ تمہارا بھائی اپنی منگیتر کے قتل سے باز رہے اور اُس سے پہلے جیسی محبت کرنے لگے۔''

''ہاں۔ اور ترشولی، جورانی کے جسم میں تھی، ہمیشہ کے لیے بھائی جان کا پیچھا چھوڑ دے۔''

''کل کا دن تمہارے بھائی کی منگیتر پر بہت سخت ہے۔'' سادھو نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''اُس علاقے میں، جہاں وہ رہتی ہے، کل صبح تین گھنٹے کا وقفہ دیا جائے گا۔ اس وقفے میں وہ تمہارے بھائی کی خیر خبر لینے ہوسٹل جائے گی۔''

''میں نے اُسے منع کر دیا ہے کہ بھائی جان سے اکیلے میں نہ ملے۔ اور.......''

''مگر وہ تمہاری ہدایت پر عمل نہیں کرے گی۔ وہ ضرور جائے گی۔ اور ادھر وہ ہوسٹل میں جائے گی، اُدھر شر پسندوں کے غیر قانونی اقدامات کے باعث کرفیو کا وقفہ قبل از وقت ختم کر دیا جائے گا۔ وہ کرفیو ختم ہونے تک تمہارے بھائی کے کمرے میں ٹھہرنے پر مجبور ہو جائے گی۔ شام کو دوبارہ کرفیو کا وقفہ دیا جائے گا، اس میں وہ گھر واپس آئے گی۔ لیکن اس حالت میں کہ روح اور کی ہو گی اور جسم اُس کا ہو گا۔''

''کیا مطلب ہے، اس بات کا؟'' میں نے بگڑ کر کہا۔ ''کیا میں سمجھ لوں کہ تمہارا دعویٰ غلط تھا؟ تم نورین کو نہیں بچا سکو گے؟''

''پورے سنسار میں کوئی اور نہیں ہے، جو اُسے بچا سکے۔'' اُس نے اپنے سینے پر ہاتھ مار کر کہا۔ ''میری بتائی ہوئی ترکیب پر عمل کرو گے تو وہ لڑکی بچ جائے گی۔''

''ترکیب بتاؤ، مہاراج! لیکن ایک بات سمجھ لو کہ تمہاری ترکیب اگر میرے دین اور ایمان کے منافی ہوئی تو میں اس پر عمل نہیں کروں گا۔''

''چاہے تمہارے بھائی کے ہاتھوں ایک بے قصور اور بے گناہ لڑکی کو زندگی سے ہاتھ دھونا پڑیں اور بعد میں تمہارے بھائی کو بھی اس اندوہناک موت کا شکار ہونا پڑے۔ تمہیں یہ تو معلوم ہی ہے کہ وہ ترشولی جورانی کے جسم میں تھی، اپنے چاہنے والوں سے دل بھر جانے کے بعد ان کے قتل سے کم پر راضی نہیں ہوتی۔''

''یہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔ میری بوٹی بوٹی بھی کر دو گے، تب بھی کفر و شرک کا ارتکاب نہیں کروں گا۔''

''ہم نے صبح بھی کہا تھا اور اب بھی دوبارہ کہتے ہیں کہ ہمیں تم جیسے عزم اور حوصلے والے نوجوان کی ضرورت ہے۔''

''تمہیں ہو سکتی ہے، لیکن اب مجھے تمہاری کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' میں کھڑا ہو گیا اور لوسی کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔ ''واپسی کا انتظام کرو، سسٹر! میں یہاں ایک منٹ بھی نہیں رک سکتا۔''

''بیٹھ جاؤ، بچہ!'' سادھو بولا۔ ''ترکیب سنے بغیر اتنا زیادہ غصہ کرنا ٹھیک نہیں ہے۔''

''ہم نے تم سے کہا کہ ہم تمہیں کوئی ایسی ترکیب بتائیں گے، جو تمہارے مذہب اور دھرم کے خلاف ہو گی؟''

''کیوں.......کیا تم نے نہیں پوچھا ہے، نورین اور بھائی جان کو کیوں نہ مار دیا جائے؟''

''یہ سوال تو تمہیں آزمانے کے لیے کیا گیا تھا۔''

''ترکیب سن لو، سکندر!'' لوسی نے کہا۔ ''بعد میں تمہیں اس پر عمل کرنے یا نہ کرنے کا پورا پورا اختیار ہے۔''

''مہاراج!'' فضیلہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''ان کی حالت آپ سے ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ بچپن سے لے کر اب تک ایسا کون سا ظلم ہے، جو ان پر نہ کیا گیا ہو۔ سب سے پہلے بھیانک شکلیں دکھا دکھا کر خوف زدہ کیا جاتا رہا، پھر چڑیوں کی طرح چہک چہک کر باتیں کرنے والی بہن کو چھین لیا گیا، قتل کے جھوٹے الزام میں قید کر دیا گیا.......زندگی اجیرن کرنے کے لیے سایوں اور آوازوں کو ان پر مسلط کر دیا گیا۔ اور آخر میں اس لڑکی کو چھیننے کی کوشش کی گئی، جسے انہوں نے ٹوٹ کر چاہا تھا۔ اگر میرا گزر نہ ہوتا تو اس وقت یہ جسم بھی مٹی میں مل کر مٹی ہو گیا ہوتا اور اس کی ساری زندگی روتے اور بلکتے گزر جاتی۔ اگر ان سے کوئی گستاخی ہوئی بھی ہے تو انہیں معاف کر دیجیے۔ انہیں آپ کی ہمدردی اور مدد کی ضرورت ہے، مہاراج!''

''ہم نوجوان بالک سے ناراض نہیں ہیں۔'' سادھو نے فضیلہ کو یقین دلایا۔ پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''داسی کہہ رہی تھی کہ تم نے صبح کے وقت جل پان سے پہلے ان سیڑھیوں پر، جو دریا میں اُترتی ہیں۔ بیٹھ کر ہاتھ منہ دھویا تھا؟''

”ہاں!“

”شام کے وقت جب سورج دیوتا کا رتھ آنکھوں سے اوجھل ہو جائے تو تم انہی میں سے ایک سیڑھی پر جا کر بیٹھ جانا اور ندی کی لہروں کی طرف دیکھتے رہنا۔ ترشولی کو کٹیا ہی میں چھوڑ جانا۔ کچھ رات گزر جائے گی تو تمہیں ندی میں عجیب عجیب تماشے دیکھنے کو ملیں گے۔ پھر ایک کچھوے کی پیٹھ پر لیٹی ہوئی ایک ایسی مخلوق گزرے گی، جس کا آدھا دھڑ مچھلی کا ہو گا اور آدھا ایک خوب صورت لڑکی کا۔ سیڑھیوں کے قریب کچھوا آ کر رک جائے گا اور وہ لڑکی، جسے اُس علاقے کے مچھیرے، جل پری کہتے ہیں، تمہاری طرف دیکھے گی، لیکن منہ سے کچھ نہیں کہے گی۔ تم اُس سے میرا پرنام کہنا اور پھر بتانا کہ میرے حکم پر تم وہاں بیٹھے ہو، تا کہ ویشا بھگت کو اپنی بپتا پہنچا سکو۔ اس تعارف کے بعد مختصر الفاظ میں بتانا کہ تمہارے بھائی کے دل و دماغ میں ایک آتما اس حد تک سوار ہو گئی ہے کہ اس کی خاطر وہ اپنی منگیتر کے خون سے ہاتھ رنگنے کے لیے تیار ہو گئے ہیں۔ تمہاری خواہش ہے کہ تمہارے بھائی کے سر پر جو عشق کا بھوت سوار ہے، وہ اُتر جائے۔ اور اس آتما کو، جو اب تک متعدد لوگوں کا خون کر چکی ہے، قید کر کے پاتال میں ڈال دیا جائے۔ کچھوا وہیں رُکا رہے گا اور وہ مخلوق پلکیں جھپکائے بغیر تمہاری طرف دیکھتی رہے گی۔ کہنا کہ تم جانتے ہو کہ وہ کیا چاہتی ہے۔ یہ کہہ کر میرا دیا ہوا کپڑا، جو میں تمہیں تھوڑی دیر بعد دوں گا، اس کی طرف اُچھال دینا........ کپڑے کو دیکھ کر وہ مطمئن ہو جائے گی کہ اس کے ساتھ دھوکا کیا گیا۔ اس کے اشارے پر کچھوا تیزی سے تیرتا ہوا تمہاری نظروں سے اوجھل ہو جائے گا۔ تم وہیں بیٹھے رہنا۔ سب سے پہلے کچھوا اس مخلوق کے ساتھ دوبارہ آئے گا اور وہ مخلوق تمہیں تعویذ جیسی کوئی شے دے گی۔ اس تعویذ کو تین بار چوم کر اور تین بار آنکھوں سے لگا کر اپنے گلے میں پہن لیا۔ تعویذ پہنتے ہی تمہاری اور تمہارے گھر والوں کی تمام پریشانیاں دُور ہو جائیں گی۔ جبکہ اس آتما کو، جو تمہاری خوشیوں کی دشمن ہے، قید کر لیا جائے گا۔ اس تعویذ کی جان سے زیادہ حفاظت کرنا اور منگل وار کو پابندی سے اس کے اوپر سے سو روپے کا نوٹ گھما کر اپنی پیٹھ کے پیچھے پھینک دیا کرنا۔“

مہاراج خاموش ہوئے تو لوسی بولی۔

”میں سمجھتی ہوں کہ اس میں کوئی ایسی بات نہیں ہے، جو مذہب کے خلاف ہو۔ کیوں سکندر! کیا خیال ہے؟“

”بظاہر تو ٹھیک ہے۔ البتہ اتنی بات ضرور کھٹکتی ہے کہ راون سے مدد مانگی جائے۔“

”تم جیسا مورکھ ہم نے آج تک نہیں دیکھا۔ مدد تم نہیں، ہم مانگ رہے ہیں۔ تم تو بس ہمارا پیغام پہنچانے کا کام سرانجام دے رہے ہو۔“

”ٹھیک ہے۔ پھر میں اپنی کسی خواہش کا اظہار نہیں کروں گا۔ یہ بات تم سے منسوب کر کے کہوں گا۔“

”جس طرح چاہو گے، کہہ دینا۔“ سادھو بولا۔ ”کوئی اور مین میخ بھی نکالنا ہو، تو وہ بھی نکال لو۔ کیونکہ سورج دیوتا کے رتھ کے ساتھ ساتھ ہم بھی تبت کی طرف چلے جائیں گے۔ اور منگل وار سے پہلے ہماری تمہاری ملاقات نہیں ہو گی۔“

”میں نے کہا۔ ”ایک بات اور ہے۔ ہمارے مالی حالات ایسے نہیں ہیں کہ ہفتے کے ہفتے سو روپے کا نوٹ تعویذ کے اوپر سے نچھاور کیا جائے۔“

”ہماری ترشولی۔“ اُس نے فضیلہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”جہاں جاتی ہے، وہاں دھن برسنے لگتا ہے۔ ہم نے صرف سو کے نوٹ کے لیے کہا ہے۔ پانچ سو ہزار روپے کے لیے کہتے تو تمہارے لئے وہ بھی کاغذ کے معمولی ٹکڑوں سے زیادہ نہیں ہوتے۔ ویسے بچہ! اگر ہم یہ کہیں کہ تم بڑے خود غرض ہو، تو غلط نہیں ہو گا۔ تم نے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ اپنے ساتھ ترشولی کو کیوں لے کر آئے ہو؟“

میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ ”حقیقت یہ ہے کہ میں فضیلہ کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس کو ساتھ لانے کے لیے میں نے اس کے امی ابو سے بہانہ بنایا تھا کہ ضائع شدہ ہاتھ کے سلسلے میں تم سے مشورہ کروں گا۔ فضیلہ کے ابو بڑے ضعیف الاعتقاد ہیں۔ انہیں جب سے تمہارے بارے میں معلوم ہوا ہے، یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ تم اپنے کسی کمال کے ذریعے اُسے ہاتھ کی محرومی سے نجات دلا دو گے۔ حالانکہ یہ ممکن نہیں ہے۔“

”ویشا بھگت سے کچھ بھی ناممکن نہیں ہے۔“ اُس نے زمین پر ہاتھ مار کر کہا۔

خوشی سے فضیلہ کانپنے لگی۔ ”کیا یہ سچ ہے، مہاراج؟“

”تم بھی ہم پر شک کر رہی ہو، ترشولی؟“

”نہیں مہاراج! بھول سے منہ سے غلط بات نکل آئی۔ آپ کے لیے تو کچھ بھی ناممکن نہیں ہے۔ میری اس کمی کو دُور کر دیجیے۔ ہاتھ کے بغیر ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے میں آدھی عورت ہوں۔“

”کیوں بالک!“ سادھو نے میری طرف دیکھا۔ ”تم کیا چاہتے ہو؟“

”میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ ہاتھ کے بغیر فضیلہ آدھی عورت معلوم ہوتی ہے۔ البتہ یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ انہونی ہونی چاہیے اور فضیلہ کو ہاتھ مل جائے تو اس کے حُسن میں چار چاند لگ جائیں گے۔“

لوسی نے درخواست کی۔ ”اپنا چمتکار دکھاؤ، مہاراج!“

سادھو چند لمحے تک آنکھیں بند کر کے سوچتا رہا۔ پھر اُس نے آنکھیں کھولیں اور دھیمی آواز

میں بولا۔ ''اس کام کے لیے تمہیں اگلے منگل وار تک انتظار کرنا پڑے گا۔''

فضیلہ کا چہرہ تمتما اُٹھا۔ ''مجھے ہاتھ مل جائے گا۔ اگلے منگل وار کو مجھے ہاتھ مل جائے گا۔''

میں نے پوچھا۔ ''تم چاہتے ہو، میں اگلے منگل وار کو پھر فضیلہ کو یہاں لے کر آؤں؟''

''نہیں۔'' اُس نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ''ہم چاہتے ہیں کہ اگلے منگل وار تک تم یہیں ٹھہرو۔''

رات کا کھانا ہم لوگوں نے سرِ شام ہی کھا لیا۔ جو شخص کھانا لینے گیا تھا، وہ لوسی کے کہنے پر اُس روز کا اخبار بھی لے آیا۔ اخبار سے معلوم ہوا کہ شہر کے ہنگاموں میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ شر پسندوں کی عید ہو گئی تھی۔ بینکوں، بسوں اور دکانوں کو لُوٹا اور جلایا جا رہا تھا۔ شاہراہوں پر جگہ جگہ ٹائروں کو آگ لگا دی گئی تھی۔ سرکاری عمارتوں کو بچانے کے لیے پولیس کو غیر قانونی مجمعوں پر گولی چلانا پڑی تھی۔ متعدد افراد زخمی ہوئے تھے۔ ڈبل روٹی کی تلاش میں نکلنے والا لڑکا مارا گیا تھا۔ موقع پرست سیاست دان بڑھ چڑھ کر پولیس کے خلاف بیان دے رہے تھے۔ رانی کی تلاش اُس کے باپ کے حوالے کر دی گئی تھی۔ تجہیز و تکفین کے تمام اخراجات ایک فلاحی ادارے نے برداشت کیے تھے۔ رانی کے باپ کو یقین دہانی کرائی گئی تھی کہ بیٹی کا بہیمانہ قتل رائیگاں نہیں جائے گا اور جب تک اس کے قاتلوں کو گرفتار کر کے مقدمہ نہیں چلایا جائے گا اور اُسے بیٹی کے قتل کے ضمن میں کم از کم پچاس ہزار روپے نہیں دیے جائیں گے، احتجاج جاری رہے گا۔

سوتیلے باپ کے لیے رانی سونے کی چڑیا ثابت ہوئی تھی۔ مرتے مرتے اُس کی عیاشیوں اور آوارگیوں کے لیے ایک بڑی رقم کا انتظام کر گئی تھی۔

میں نے لوسی سے کہا۔ ''ہم لوگ صرف ایک دن کے لیے یہاں آئے تھے۔ آج رات کی ٹرین سے ہمیں شہر جانا تھا۔ اب اگر کل صبح یا دوپہر تک گھر نہیں پہنچے تو سب پریشان ہو جائیں گے۔''

''دسترا!'' فضیلہ نے کہا۔ ''کل دن میں اس شخص کے ساتھ، جو ہمارے لیے کھانے پینے کی چیزیں لے کر آتا ہے، تم بھی شہر چلی جانا اور وہاں سے ابا جی کو تار بھیج دینا کہ ہم ایک ہفتے کے بعد شہر پہنچیں گے۔''

''تار سے بہتر فون رہے گا۔'' میں نے رائے دی۔ ''تم فضیلہ کے گھر فون کر دینا۔ پیسے ضرور زیادہ خرچ ہوں گے، لیکن شہر کے حالات کے پیشِ نظر تار پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ ان حالات میں تار وقت پر نہیں پہنچے تو ہنگاموں کے دوران کیسے پہنچ جائیں گے؟''

غروبِ آفتاب کے تقریباً ایک گھنٹے بعد فضیلہ اور لوسی نے مجھے ان سیڑھیوں پر جانے کے لیے، جو دریا میں اُترتی تھیں، رخصت کیا۔ سادھو کی واضح ہدایت تھی کہ میں وہاں تنہا جا کر بیٹھوں

شروع مہینے کا چاند تھا، جو بہت جلدی غروب ہو گیا۔ آسمان پر تارے جھلملا رہے تھے۔ ان کی جھلملاہٹ نے تاریکی کا احساس نہیں ہونے دیا۔ پانی کی لہریں بڑی بھلی معلوم ہو رہی تھیں۔ کبھی کبھی کوئی بڑی سی مچھلی پانی میں اُچھل کر خاموشی کو توڑ دیتی تھی۔ میں سیڑھی پر جا بیٹھا تھا اور سبک رو دریا کے منظر سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ تقریباً گیارہ بجے رات کو ادھر سے ماہی گیروں کی ایک کشتی گزری۔ کشتی میں لالٹینیں روشن تھیں، جن کی روشنی اندر بیٹھی ایک ایسی عورت پر پڑ رہی تھی، جس کی گود میں شیر خوار بچہ تھا۔ کشتی کا مالک باہر کشتی کے اس حصے پر بیٹھا تھا، جہاں سے اسے کنٹرول کیا جاتا تھا۔ کشتی اور جزیرے کے درمیان تقریباً ایک فرلانگ کا فاصلہ تھا۔

رات کے سناٹے میں بیراج کی جانب رواں دواں کشتی بہت ہی اچھا منظر پیش کر رہی تھی۔ وہ منظر اسی وقت کئی گنا زیادہ خوب صورت نظر آنے لگا، جب اندرونی حصے میں بیٹھی ہوئی عورت بچے کو سینے سے لگائے بیرونی حصے کی طرف گئی اور باہر بیٹھا ہوا ماہی گیر گیت الاپنے لگا۔ گیت کے الفاظ تو سمجھ میں نہیں آئے، تاہم چند لمحوں کے لیے یہ ضرور محسوس ہوا، گویا فضا میں کسی نے رس گھول دیا ہو۔ میں نے بڑے بڑے نامور گانے والوں کے گیت سنے تھے لیکن کبھی کسی کے گیت سے اتنا متاثر نہیں ہوا تھا، جتنا متاثر اس ماہی گیر کی الاپ نے کیا۔ وہ گائیکی کی الف بے سے واقف نہیں تھا، لیکن اُسے دلوں میں اُتر جانے کا فن آتا تھا۔ کشتی دریا کی روانی پر بہتی ہوئی آہستہ آہستہ نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ ایک بار پھر چہار اطراف میں گہرا سناٹا چھا گیا۔

''سکندر!''

میں اپنے کندھوں کی پشت سے سرگوشی کے انداز میں دی جانے والی آواز پر تقریباً اُچھل پڑا۔ پلٹ کر دیکھا تو لوسی کھڑی تھی۔

''سکندر!'' اُس نے دوبارہ مجھے مخاطب کیا۔ ''جب سے تم ذہنی ہسپتال سے آئے ہو، میں تم سے تنہائی میں چند باتیں کرنے کے لیے بے چین ہوں۔ اور اس وقت ہتھیلی پر جان رکھ کر آئی ہوں۔ فضیلہ کو پتہ چل گیا تو مجھے زندہ نہیں چھوڑے گی۔''

''کیا کہنا چاہتی ہو؟''

''دنیا میں ایک بڑی مصیبت آنے والی ہے۔ اسے بچانے کی ذمہ داری ہم دونوں پر عائد ہوتی ہے۔'' وہ بولی۔ ''تم نے پورنما کی حیثیت سے میرے جس روپ کو دیکھا ہے، اس سے دھوکا نہ کھا جانا۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ ہم شیطان کے نرغے میں ہیں اور اس سے بچ نکلنے کی ایک ہی ترکیب ہے کہ ناراض کیے بغیر اس کی ہر بات مان لی جائے۔ تاوقتیکہ ہمیں اسے ٹھکانے لگانے کا طریقہ معلوم ہو جائے۔''

''مجھے تفصیل سے بتاؤ کہ تم ان لوگوں کے متعلق کیا جانتی ہو؟''

”یہ تفصیل کا موقع نہیں ہے۔ کل صبح فون کرنے شہر جا رہی ہوں۔ شہر میں مجھے اتنا وقت مل جائے گا کہ میں ہر وہ بات، جس کا مجھے علم ہے، قلم بند کر سکوں۔ شہر سے واپسی پر ان کاغذات کو اشنان گھر میں ایک پتھر کے نیچے دبا دوں گی۔ ان کے مطالعے سے تمہیں پتہ چل جائے گا کہ یہ لوگ کون ہیں اور ان کے عزائم کیا ہیں؟“

اچانک اس کا لہجہ بدل گیا۔ سرگوشی تیز آواز میں بدل گئی۔ ”بس یہ معلوم کرنے آئی تھی کہ تمہیں کوئی پریشانی تو محسوس نہیں ہو رہی؟ مہاراج کے کہنے پر چلو گے تو کبھی پشیمانی نہیں ہوگی۔ کامیابی اور کامرانی تمہارے قدم چومے گی۔ اب چلتی ہوں۔ وش یو بیسٹ آف لک۔“

میں نے اطراف میں دیکھا، لیکن سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ لوسی نے اپنا لہجہ تبدیل کیوں کر لیا تھا۔ اور اگر فضیلہ سے خوف زدہ ہو گئی تھی تو فضیلہ کا دور دور تک کوئی پتہ نہیں تھا۔ اور تب مجھے دریا میں ایک عظیم الجثہ شے نظر آئی۔ میں لوسی اور فضیلہ کو بھول کر اُس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ کچھ دیر بعد پتہ چلا کہ وہ کچھوا تھا۔ میں نے زندگی میں پہلی بار ہاتھی جیسی قد و قامت کا کچھوا دیکھا تھا۔ وہ میری ہی طرف آ رہا تھا اور جیسا کہ سادھو نے کہا تھا، اُس کی پشت پر ہاتھ کا تکیہ بنائے ایک لڑکی لیٹی تھی۔ ستاروں کی روشنی میں اُس کا مچھلی جیسا نچلا دھڑ اس طرح جگمگا رہا تھا، گویا وہ سونے چاندی کا بنا ہوا ہو۔

سیڑھیوں کے قریب آ کر کچھوا رک گیا۔ مچھلی کے دھڑ والی لڑکی میری طرف دیکھنے لگی۔ لڑکی اتنی حسین تھی کہ اُس کے سامنے فضیلہ کا حُسن کچھ بھی نہیں تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں تھوڑی دیر کے لیے بالکل مبہوت سا ہو کر رہ گیا۔ سادھو نے کہا تھا کہ وہ ایک ایسی مخلوق ہے، جسے مچھیرے جل پری کہتے ہیں۔ اس ضمن میں مجھے سادھو سے اتفاق نہیں تھا۔ مچھیرے درست کہتے تھے۔ وہ واقعی پانی کی پری تھی۔ اور کچھوا اُس کی سواری تھا۔

کئی لمحے گزر گئے تو لڑکی نے میرے چہرے سے نظریں ہٹائے بغیر بے چینی سے پہلو بدلا اور یوں ظاہر کیا، جیسے وہ واپس پلٹ جانا چاہتی ہو۔ اس کے پہلو بدلنے پر میری محویت ٹوٹی۔ میں نے اُس تک سادھو کا پیغام پہنچایا اور ثبوت کے طور پر سادھو کا دیا ہوا کڑا اُس کی طرف اچھال دیا۔ میرا نشانہ خطا ہو گیا۔ کڑا کچھوے کے جسم سے ٹکرا کر دریا میں گر گیا۔ دوسرے ہی لمحے لڑکی قلابازی کھائی اور دریا میں کود گئی۔ مجھے یقین تھا کہ دریا کی لہریں اُسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکیں گی، پھر بھی اندر ہی اندر میرا دل لرزنے لگا تھا۔

پانی سے اوپر آنے میں اُس نے کم و بیش دو منٹ لگا دیے۔ دو منٹ کا وہ عرصہ میرے لیے گھنٹوں سے کم نہیں تھا۔ کئی بار جھک کر پانی میں دیکھنے کی کوشش کی۔ ایک بار تو پھسلتے پھسلتے بچا۔ لیکن کچھ دکھائی نہیں دیا۔ سطح سے چند انچ نیچے تک پانی شفاف تھا لیکن اس کے آگے اتنی تاریکی تھی

کہ کچھ نظر آنا محال تھا۔ بالآخر وہ پانی پر اُبھری، قلانچ لگا کر کچھوے پر سوار ہوئی، مسکرا کر مجھے کڑا دکھایا، جسے دریا کی تہہ سے نکال کر لائی تھی اور میرے دیکھتے ہی دیکھتے کچھوا تیزی سے تیرتا ہوا کہیں دُور نکل گیا اور ایک دھبے کی طرح نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

مجھے نصف لڑکی اور نصف مچھلی کے غیر معمولی حُسن ہی نے متاثر نہیں کیا تھا، اس واقعہ کے بعد میرے دل میں سادھو کی قدر بھی بڑھ گئی تھی۔ وہ قول و فعل کا سچا تھا اور اپنی پراسرار قوت کے ذریعے مجھے اور میرے گھر والوں کو اس ترشولی سے نجات دلانے کے جتن کر رہا تھا، جس نے مجھے دُکھ اور غموں کے سوا کچھ بھی نہیں دیا تھا۔

دل چاہنے کے باوجود مجھ سے سیڑھیوں سے اُٹھا نہیں گیا۔ سادھو ایک غاصب اور بدمعاش حکمران کا پجاری تھا، لیکن جیسا بھی تھا، میرا تو نجات دہندہ تھا۔ وہ مجھے اور میرے گھر کے دوسرے افراد کو ترشولی سے نجات دلا رہا تھا۔ اُس نے ایک عجیب اور حسین الخلقت مخلوق سے میری ملاقات کرائی تھی، جس کی روشنی میں توقع کی جا سکتی تھی کہ میں بچپن سے جس عذاب کا شکار تھا، اس سے مجھے چھٹکارا ملنے والا تھا۔

میں سیڑھیوں پر بیٹھا اونگھتا رہا اور کچھوے پر سوار پری زادی کا انتظار کرنے لگا۔ بھگوان اور راکھشس کے تصور کو میں نے اپنے ذہن سے نکال پھینکا۔ اس کے برعکس فضیلہ کے بارے میں سوچنے لگا۔ اُس کے جسم پر ترشولی کا قبضہ تھا۔ وہ مجھ پر ہمدرد اور مہربان تھی۔ اُس ترشولی جیسی نہیں تھی، جو جہاں بھی جاتی تھی، موت کو اپنے ساتھ لے کر جاتی تھی۔ ایک میری محسن تھی تو دوسری نجانے کیوں میری دشمن بنی ہوئی تھی۔

اسی اثناء میں مچھیروں کی ایک ٹولی نے اپنی کشتی سے دریا میں جال ڈال کر مچھلیاں پکڑیں اور آگے جال ڈالتے چلے گئے۔ دو نوجوانوں نے اپنی اپنی کشتیوں پر دوڑ لگا دی اور ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کرتے ہوئے کیمرج برج کی سمت نکل گئے۔

ایک اور بڑی کشتی، جس میں گیس بھری ہوئی تھی اور گیس کی لالٹین روشن تھی، دھیمی رفتار سے منزلِ مقصود کی طرف گئی تھی۔ اُسے ایک نوجوان لڑکی نے سنبھال رکھا تھا۔ کشتی کے باقی سارے مکین گہری نیند سو رہے تھے۔ مچھلیاں بھی رات کی تاریکی سے فائدہ اُٹھا کر پانی میں اُچھل پھاند کر رہی تھیں۔ یوں لگ رہا تھا، جیسے ان میں ہائی جمپ کا مقابلہ ہو رہا ہو۔ ایک مچھلی پانی سے اوپر اُچھلتی تو دوسرے ہی لمحے دوسری مچھلی اس سے زیادہ اوپر اُچھلنے لگتی تھی۔ کبھی کبھی بیک وقت دو اور تین مچھلیاں چھلانگ لگا کر پانی سے کئی فٹ اوپر آ جاتی تھیں۔

ایک تہائی سے زیادہ رات گزر چکی تھی۔ میں نے تھک کر آنکھیں بند کر لی تھیں۔ نیند آنا شروع ہو گئی تھی، لیکن اس ڈر سے نہیں سو رہا تھا کہ جل پری پاتال سے وشنا بھگت کا دیا ہوا

تعویذ لے کر آئے اور مجھے غافل پایا تو کہیں ایسا نہ ہو کہ تعویذ دیئے بغیر واپس چلی جائے۔ نیند نے بہت ہی تنگ کیا تو میں نیند کو بھگانے کے لیے اُس سیڑھی تک پہنچ گیا، جہاں بیٹھ کر منہ دھویا جا سکتا تھا۔

چلو میں پانی لینے کے لئے جھکا ہی تھا کہ سطح آب پر وہی کریہہ صورت عورت اُبھر آئی، جس نے میری زندگی اجیرن کر رکھی تھی۔ میں گھبرا کر سیدھا ہو گیا اور اُس کی طرف دیکھنے لگا۔ اُس کے ارادے اچھے نہیں معلوم ہو رہے تھے۔ دھنسی ہوئی بے نور آنکھیں شعلے اُگل رہی تھیں اور بے انتہا غصے کے باعث اُس کا بدصورت چہرہ اور بھی بدصورت ہو گیا تھا۔ وہ اشارے سے مجھے واپس جانے کے لیے کہہ رہی تھی اور ڈر بھی رہی تھی کہ اگر میں نے اُس کا کہنا نہیں مانا تو وہ مجھے نقصان پہنچا دے گی۔

"سنو ترشولی!" رات کے سناٹے میں میرے منہ سے جو آواز نکلی، وہ میرے کانوں کو اجنبی سی معلوم ہوئی۔ "تمہاری کرم فرمائیوں سے میں آج اس حالت کو پہنچ چکا ہوں کہ زندگی وبال بن کر رہ گئی ہے۔ ڈرانا، دھمکانا بے سود ہے۔ اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہناؤ اور مجھے بھی وہیں پہنچا دو، جہاں رخسانہ، امی جان اور فضیلہ کو پہنچا چکی ہو۔"

وہ ہوا میں تیرتی ہوئی میری طرف بڑھی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ کسی بھی لمحے وہ میرے بازو پر وار کرنے والی ہے۔ آخری مرتبہ کلمہ طیبہ پڑھنا چاہا، لیکن زبان تالو سے چمٹ گئی۔ ہر ممکن کوشش کے بعد بھی منہ سے کلمہ طیبہ نہ نکل سکا۔

ترشولی مجھ سے تھوڑے فاصلے پر اس سیڑھی پر بیٹھ گئی، جس پر میں بیٹھا ہوا تھا۔ پھر اُس نے نجانے کہاں سے ایک ریگزین کی بنی ہوئی تھیلی برآمد کی، اُس کا منہ کھول کر مجھے دکھایا۔ پوری تھیلی آنکھوں کو خیرہ کر دینے والے چھوٹے بڑے ہیروں سے بھری ہوئی تھی۔

اُس نے تھیلی کو میرے آگے رکھ دیا اور اشارے سے کہا۔

"ہیرے لو اور یہاں سے چلے جاؤ۔"

جواب میں، میں نے تھیلی کو ایسی زوردار ٹھوکر رسید کی کہ وہ لڑھک کر دریا میں جا گری اور وہ میں بیٹھ گئی۔ اور تب غصے سے بلبلاتی اور نتھنوں سے شوں شوں کی آوازیں نکالتی وہ منحوس کھڑی ہو گئی۔ اُس نے ہوا میں اپنا ایک ہاتھ بلند کیا اور میری نظروں کے سامنے ایک بجلی سی کوندی۔ اُس کا ہاتھ چمک دار، دو دھاری شمشیر میں تبدیل ہو گیا تھا۔

میں مرنے کے لیے تیار تھا۔ لیکن ردعمل کے طور پر میرا جسم پیچھے کو ہو گیا۔ اسی وقت اوپر کی جانب سے فضیلہ کی آواز آئی۔ "ارے آپ نچلی سطح کی سیڑھی پر بیٹھے کیا کر رہے ہیں؟"

"ادھر مت آنا، فضیلہ!" میں نے اُس کی طرف چہرہ کر کے کہا اور جلدی سے چہرہ گھما

منحوس عورت کی طرف دیکھا، مگر وہ غائب ہو چکی تھی۔ نہ سیڑھیوں پر تھی، نہ سطح آب پر، نہ فضاؤں میں۔

منع کرنے کے باوجود فضیلہ تیزی سے سیڑھیاں اُترتی ہوئی میرے پاس پہنچ گئی اور ہنستی ہوئی بولی۔ "آپ یہاں تک آ سکتے ہیں تو میں کیوں نہیں آ سکتی؟"

"کاش! تم ایک دومنٹ تک اور نہ آئی ہوتیں۔" میں نے ہلکی سی آہ بھر کر کہا۔

"کیوں؟"

"کیونکہ مجھے اپنی زندگی سے نفرت ہو گئی ہے۔ میں مرنا چاہتا ہوں۔ اگر اس وقت تم نہ آتیں تو وہ منحوس عورت مجھے ختم کر چکی ہوتی۔ اُس کا ہاتھ مجھ پر حملہ کرنے کے لیے دو دھاری شمشیر کی شکل اختیار کر چکا تھا۔" "بزدل۔" فضیلہ نے بڑی حقارت سے کہا۔

"میں بزدل نہیں ہوں۔ بزدل ہوتا تو کبھی کا بھاگ کر اوپر جا چکا ہوتا۔"

"میں آپ کو نہیں، اس عورت کو بزدل کہہ رہی ہوں، جو مجھ سے ڈر کر بھاگ گئی۔ وہ اچھی طرح جانتی ہے کہ میں اُسے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔"

میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ "ارواح کو بھی کسی نے مارا ہے؟"

فضیلہ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا، بلکہ اُلٹا سوال کر دیا۔ "آئی کیوں تھی؟"

"مجھے رشوت دے رہی تھی کہ میں یہاں بیٹھنے کے بجائے کٹیا میں واپس چلا جاؤں۔"

"گویا اُسے پتہ چل چکا ہے کہ یہاں کیا ہو رہا ہے۔" فضیلہ نے کہا۔ "منہتوں کو بازو سے محروم کرنے والی، کم ذات، کمینہ خصلت اس دنیا میں تھوڑی دیر کی مہمان ہے۔ ادھر تمہارے ہاتھوں میں تعویذ آئے گا اور اُدھر وہ جل بھن کر ختم ہو جائے گی۔"

ایک بار پھر اُس نے اس بات کا اعادہ کیا تھا، جو میرے لئے ناقابلِ یقین تھی۔ جہاں تک میرا علم تھا، اس کے مطابق روح ایک ایسی شے تھی، جس کو ختم کرنا ناممکن تھی۔ مگر فضیلہ کے مقابلے میں میری معلومات محدود ترین تھیں۔ بحیثیت ترشولی وہ ایسے بہت سے اسرار و رموز سے واقف تھی، جن تک میری عقل و فہم کی رسائی نہیں تھی۔ اگر وہ کہہ رہی تھی کہ تعویذ کی کرامت سے میری زندگی کو دوزخ بنانے والی ترشولی جل بھن کر ختم ہو جائے گی تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ اُس کا اعتبار نہ کیا جاتا۔ اپنی دوسری ہم نام روحوں کی طرح اب تک اُس نے کوئی دھوکا فریب نہیں کیا تھا بلکہ میرا دل بہلانے اور مجھے پریشانیوں سے بچانے کی کوشش کرتی رہی تھی۔ مگر اُسے مجھ سے ہمدردی نہ ہوتی تو وہ مجھے راج کنڈل لے کر کیوں آتی؟ اور اس سادھو سے کیوں ملواتی، جس کا دعویٰ تھا کہ پورے سنسار میں اُس کے علاوہ کوئی اور ایسا شخص نہیں ہے، جو میرے درد کا درماں کر سکے۔ جس فہم کے سمجھ میں نہ آنے والے واقعات پیش آ رہے تھے، ان کی بنا پر کہا جا سکتا تھا کہ میں غلط جگہ

نہیں آیا ہوں۔

صبح سے کچھ پہلے کچھوا سطح پر نمودار ہوا۔ اُس کی پشت پر مچھلی کے دھڑ والی لڑکی سوار تھی۔ تاروں کی روشنی پھیکی پڑ چکی تھی۔ اس کے باوجود اُس کے چہرے سے ایسی روشنی پھوٹ رہی تھی کہ گرد و پیش کی چیزیں چمک رہی تھیں۔ کچھوا سیڑھیوں کے نزدیک آیا تو اچانک لڑکی نے قلابازی کھائی اور ایک جست میں دریا کی تہہ میں اتر گئی۔ پھر وہ آہستہ آہستہ تیرتی ہوئی سیڑھیوں تک آئی، ہاتھوں کی مدد سے سیڑھیوں پر چڑھی اور گھسٹتی ہوئی میرے قریب پہنچی اور سونے کی ایک چھوٹی سی ڈبیہ، جس میں سیاہ رنگ کا موٹا سا دھاگا پڑا ہوا تھا، میری طرف بڑھا دی۔ مجھے یہ سمجھنے میں کچھ دیر نہ لگی کہ جس تعویذ کا وعدہ سادھو نے کیا تھا، وہ اسی ڈبیہ میں تھا۔

میں نے ڈبیہ لے لی۔ ڈبیہ ہاتھ میں آتے ہی ایسا معلوم ہوا، جیسے ہوا اور لہروں نے بین کرنا شروع کر دیے ہوں۔ ایک غیر مرئی شے نے باقاعدہ اس ڈبیہ کو مجھ سے چھیننے کی کوشش کی، لیکن میں جانتا تھا کہ میرے سارے مصائب کا علاج ڈبیہ میں مخفی ہے۔ میں نے ہواؤں اور لہروں کے ماتم کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ ڈبیہ کو چوما، ماتھے سے لگایا اور ادب کے ساتھ اس کی ڈوری کو گلے میں ڈال لیا۔ اور تب ہر طرف سکون ہی سکون ہو گیا۔

خوش گوار ہوائیں چلنے لگیں اور دریا کی لہروں سے پیدا ہونے والا ترنم کانوں کو بھلا لگنے لگا۔ جسم میں قوت و طاقت کا ایسا سرچشمہ پھوٹتا ہوا محسوس ہوا کہ اگر میں پتھر کے کسی ٹکڑے کو مٹھی میں لے کر زور سے دباتا تو اسے بھی سرمہ کر سکتا تھا۔

اس دوران اُس عجیب الخلقت لڑکی نے سیڑھیاں چڑھ کر کچھوے کی پشت پر چھلانگ لگا دی اور کچھوا تیزی سے پانی میں چاروں ہاتھ پاؤں چلاتا ہوا سیڑھیوں سے دُور جانے لگا۔

"شکریہ!" میں نے با آواز بلند لڑکی سے کہا۔ "اس زحمت کا بہت بہت شکریہ۔"

"مجھے نہیں معلوم تھا کہ میری آواز لڑکی تک پہنچی یا نہیں۔ تاہم میں اُسے اور کچھوے کو وہیں کھڑا ایک نقطے میں تبدیل ہوتا دیکھتا رہا۔ نقطہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو میں مڑا اور کٹیا کی سمت بھاگ کھڑا ہوا۔

کٹیا کی چٹائی پر فضیلہ محو خواب تھی اور اتنی حسین معلوم ہو رہی تھی کہ یوں لگ رہا تھا، جیسے [illegible] کا سارا حُسن اُس میں سما گیا ہو۔ کچھ دیر قبل کچھوے پر سوار مچھلی کے دھڑ والی لڑکی دیکھ کر میں نے سوچا تھا کہ اُس کے حُسن کے سامنے فضیلہ کچھ بھی نہیں ہے۔ لیکن اب احساس ہو رہا تھا کہ وہ لڑکی تو فضیلہ کے انگوٹھے کے برابر بھی نہیں تھی۔

"فضیلہ!" میں نے اُس کے چہرے پر جھک کر کہا۔ "میری مراد پوری ہو گئی۔ مہاراج مہربانی سے مجھے تعویذ مل گیا۔ دیکھو!"

فضیلہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی۔ اُس نے میرے گلے میں پڑی ہوئی سونے کی ڈبیہ کو دیکھا اور بڑی متانت سے میرے سینے کی طرف چہرہ بڑھا کر ڈبیہ کو اپنی دونوں آنکھوں سے لگا لیا۔

"اب دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی۔" وہ پیار بھری نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"میں بھی کچھ ایسا ہی محسوس کر رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "دل چاہتا ہے کہ پہاڑوں سے جا کر ٹکرا جاؤں اور انہیں گھونسے مار مار کر ریزہ ریزہ کر دوں۔"

صبح کا بیشتر حصہ ہم دونوں نے پیار محبت کی باتیں کر کے گزارا۔ باتیں اس وقت ختم ہوئیں جب لوسی ناشتہ لے کر آئی اور اُس نے دروازے پر دستک دی۔

میں نے اُٹھ کر دروازہ کھولا۔ "اندر آ جاؤ، سس........"

مگر میں سسٹر کہتے کہتے رُک گیا۔ لوسی کے چہرے پر ایسی ملاحت نظر آئی تھی کہ میری زبان نے میرا ساتھ دینے سے صاف انکار کر دیا۔ حیرت تھی کہ میں اُسے لڑکپن سے دیکھتا آیا تھا۔ لیکن کبھی اُس کے دلکش سراپا پر توجہ نہیں دی تھی۔ عمر میں وہ مجھ سے تقریباً دس بارہ سال بڑی ہوگی۔ اس وقت بوٹے سے قد والی ایک گڑیا نظر آ رہی تھی۔ فضیلہ چٹائی پر دراز نہ ہوتی تو شاید میں اُس سے اظہار محبت کرنے سے بھی نہ چوکتا۔

غالباً لوسی کو میری بھوکی نظروں سے احساس ہو گیا کہ میں اُس کے بارے میں کیا سوچ رہا ہوں۔ وہ جھجکی جھجکی سی اندر آئی، مجھ سے نظریں چراتی ہوئی چٹائی کی طرف بڑھی اور ناشتے کا تھال ایک طرف رکھتے ہوئے بولی۔ "تم دونوں ناشتہ کرو۔ میں چائے بھجواتی ہوں۔"

"نہیں، چائے بعد میں آتی رہے گی۔ اس وقت تم ہمارے ساتھ ہی ناشتہ کرو گی۔"

"نہیں، یہ صرف تمہارا اور فضیلہ کا ناشتہ ہے۔" وہ فرش کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "اور یوں بھی میں پہلے ہی ناشتہ کر چکی ہوں۔"

"بیٹھ جاؤ، سسٹر! کسی کا دل توڑنا ٹھیک نہیں۔"

"مگر میں ناشتہ نہیں کروں گی۔"

"ٹھیک ہے، ناشتہ مت کرنا۔ بس جب تک ہم دونوں ناشتہ نہ کر لیں، یہیں بیٹھی رہنا۔" فضیلہ نے معنی خیز نگاہوں سے مسکراتے ہوئے کہا۔

لوسی بہت خوف زدہ تھی۔ وہ ایک لمحے کے لئے بھی وہاں رُکنے کے لیے تیار نہ تھی۔ کہنے لگی۔ "چائے کا پانی اُبل اُبل کر ختم ہو جائے گا۔ کیتلی جل جائے گی۔" اور اس سے پہلے کہ ہم دونوں میں سے کوئی کچھ کہتا، وہ ڈری ہوئی وحشی ہرنی کے سے انداز میں چوکڑیاں بھرتی ہوئی کٹیا سے باہر نکل گئی۔

فضیلہ بہت زیادہ لطف اندوز ہو رہی تھی۔ خود میں بھی اپنی حالت سے بے خبر نہیں تھا۔ جسم کی بیشتر رگیں گرم گرم خون کی روانگی کے باعث اُبھر کر گہری نیلی ہو گئی تھیں۔ چہرہ اس طرح تمتما اُٹھا تھا، جیسے میں نے کئی میل تک چلچلاتی دھوپ میں سفر کیا ہو۔ پیاس اتنی تھی کہ سمندر کا سمندر چڑھا جاتا، جب بھی اس میں کوئی کمی نہ آتی اور طاقت اور قوت کا یہ عالم تھا کہ جی چاہ رہا تھا کہ کے مار مار کر کٹیا کی پختہ دیواروں کو توڑ دوں۔

''ناشتہ کیجیے۔'' فضیلہ نے کہا۔ ''مسٹر کا انتظار فضول ہے۔ وہ اتنی خوف زدہ ہو کر ادھر سے گئی ہے کہ دیر تک ادھر کا رخ نہیں کرے گی۔''

میں نے ناشتے کی تھالی پر نظر ڈالی۔ پوریاں، کچوریاں، آلو اور چھولوں کے دانے تھے، برف کے ٹکڑے تھے اور یہی ایک ایسی چیز تھی، جو گزشتہ ناشتے سے زائد تھی۔

''تم جل پان کرو۔'' میں نے کہا۔ ''میں اشنان کرنے جا رہا ہوں۔ اگر میں نے اشنان نہ کیا تو میرا پورا شریر جل جائے گا۔''

میں بے تحاشا وہ الفاظ بول رہا تھا، جو پہلے کبھی میری زبان سے ادا نہیں ہوئے تھے۔ یہ غیر اختیاری تبدیلی تھی، جس پر شروع میں مجھے حیرت ہوئی تھی۔ کیونکہ میں، میں نہیں رہا تھا، اور ہی ہو گیا تھا۔

''اشنان سے کچھ نہیں ہوگا۔'' فضیلہ نے کہا۔ ''یہ نہ اندر کی گرمی ہے، نہ باہر کی، اصل گرمی اس جنتر کی ہے، جو آپ نے اپنے گلے میں ڈال رکھا ہے۔ آہستہ آہستہ اس کے عادی ہو جائیں گے۔''

میرے باہر کی سمت اُٹھتے ہوئے قدم رک گئے۔ فضیلہ کے پاس پلٹ آیا اور تھال میں رکھی ہوئی چیزوں کو حسرت سے دیکھنے لگا۔ کاش پورا تھال برف کے چھوٹے بڑے ٹکڑوں سے بھرا ہوتا۔ میں نے کہا۔

''گرمی اور تپش کا یہی حال کچھ دیر اور رہا تو میں جنتر کو دریا کی لہروں کے سپرد کر دوں گا۔ میرا خیال تھا کہ کچھ دیر تمہارے ساتھ رہوں گا تو گرمی کی شدت میں کمی آ جائے گی، لیکن الٹا تپش بڑھتی جا رہی ہے۔ تم اندازہ نہیں لگا سکتیں، فضیلہ! کہ میرے جسم کا ایک ایک رُواں کس طرح جل رہا ہے۔''

''کیا یہ خوشی کی بات نہیں ہے کہ آپ کو ترشولی سے نجات مل گئی ہے، جو آپ کی خوشیوں کی دشمن تھی؟ کیا آپ چاہتے ہیں کہ ایک بار پھر قتل و غارت گری کا بازار گرم ہو۔ اگر آپ نے جنتر اُتارنے کی غلطی کی تو کوئی بھی آپ کو اس سے نہیں بچا سکے گا۔ مہاراج منگل وار سے پہلے آئیں گے اور اُن کے آنے تک آپ راکھ کا ڈھیر بن چکے ہوں گے۔''

بے اختیار میرے منہ سے آہ نکل گئی۔

''دائمی راحت یوں ہی تو حاصل نہیں ہوا کرتی۔'' فضیلہ نے مجھے سمجھایا۔ ''اس کے لیے تھوڑی سی تکلیف برداشت کرنا ہی پڑتی ہے۔ اچھا یہ بتائیے، گرمی کے احساس کے علاوہ آپ اور کیا کچھ محسوس کر رہے ہیں؟''

''یوں لگ رہا ہے، جیسے میرے اندر درجنوں بدمعاش حلول کر گئے ہوں۔ میں ہر وہ کام کر ڈالنا چاہتا ہوں، جسے دنیا والے پاپ سمجھتے ہیں۔''

اسی اثناء میں مندر کا ایک پجاری دو کپ لے کر آ گیا۔

''پورنما کہاں گئی؟'' فضیلہ نے سوال کیا۔

''پورنما جی شہر گئی ہیں، دوپہر کے بھوجن کا پربندھ کرنے۔''

فضیلہ نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور بولی۔ ''مسٹر کو آپ نے بھگا دیا۔'' پھر گھوم کر پجاری سے بولی۔ ''شمشان گھاٹ سے کسی ایسے مُردے کی راکھ اور دو چار ہڈیاں لا دو، جنہیں تازہ تازہ جلایا گیا ہو۔''

''رام، رام......'' پجاری نے کان پکڑ کر کہا۔ ''مجھ سے یہ ہتیا نہیں ہو سکتی۔''

''کیا مہاراج نے تم سے نہیں کہا کہ جب تک میں یہاں ہوں، تمہیں میری آگیا کا پالن کرنا ہوگا؟''

''پرنتو انہوں نے مرگھٹ سے راکھ اور ہڈیاں لانے کے لیے نہیں کہا تھا۔''

''راکھ اور ہڈیاں میں منگوا رہی ہوں۔'' فضیلہ نے بگڑ کر کہا۔ ''اگر تم نے میری آگیا کا پالن نہیں کیا تو تم اچھی طرح جانتے ہو، کہ مہاراج تمہارا بھرتہ بنا دیں گے۔''

پجاری دونوں ہاتھ جوڑ کر فضیلہ کے سامنے جھک گیا۔ ''میں آپ کا سیوک ہوں، دیوی! آپ کی آگیا کا پالن نہیں کروں گا تو کس کی آگیا کا پالن کروں گا؟ پرنتو اتنا تو بتا دیجیے کہ آپ ہڈیوں اور راکھ کا کیا کریں گی؟''

''سیوک کام کرتے ہیں۔ کسی کام کا کارن نہیں پوچھا کرتے۔'' فضیلہ نے بگڑے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''جاؤ اور جتنی جلدی ہو سکے، دونوں چیزیں میرے پاس پہنچا دو۔''

میں نے ناشتہ کیا، نہ چائے پی، فضیلہ کے منع کرنے کے باوجود دو بار اُس اشنان گھر میں جا کر گھس گیا اور غسل کیا، جس کے فرش کے نیچے سے دریا گزرتا تھا اور دونوں مرتبہ جھلس کر واپس آ گیا۔ پانی نے میرے جلتے ہوئے جسم پر وہی اثر کیا تھا، جو مٹی کا تیل آگ پر کرتا ہے۔ گیارہ بجے تک سیخ کباب بن چکا تھا۔ کسی پہلو چین نہیں تھا۔ دریا کی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آگ کے شعلے بن گئے تھے، جو مسلسل میرے جسم سے ٹکرا رہے تھے۔ ایک بار تو اس حد تک حالت بگڑ گئی کہ میں

نے گلے میں پڑی سونے کی ڈبیہ کو اُتارنے کا تہیہ کر لیا، مگر اس خیال سے رُک گیا کہ ترشولی کے دوبارہ وجود میں آنے سے مجھے ساری زندگی جلنا پڑے گا۔ جبکہ اس وقت جس آگ میں جل رہا تھا، وہ فضیلہ کے قول کے مطابق بالکل وقتی اور عارضی تھی۔

گیارہ بجے پجاری مرگھٹ کی راکھ اور ہڈیاں لے کر آیا۔ فضیلہ نے تھیلا لے کر اُسے رخصت کیا، پھر ایک بڑی ہڈی، جو غالباً گھٹنے کی تھی، تھیلے سے نکال کر میری طرف بڑھائی۔

''اس کو چوسنے سے آپ کی تکلیف میں افاقہ ہو گا۔''

میری آنکھیں اُبلی پڑ رہی تھیں، پھر بھی میں نے کراہتے ہوئے کہا۔ ''یہ تو کسی مُردے کی ہڈی ہے۔''

''جب تک کسی زندہ کی ہڈی نہ ملے، اسی پر اکتفا کیجیے، سرکار!''

''میرا یہ مطلب ہے........''

''مطلب کچھ بھی ہو، اس تکلیف سے چھٹکارا حاصل کیجیے، جس سے آپ دوچار ہیں۔''

بادل نخواستہ میں نے ہڈی اُٹھالی۔ ''تمہیں یقین ہے کہ اس کو چوسنے سے میری تکلیف رفع ہو جائے گی؟''

''سانچ کو آنچ کیا؟'' وہ بولی۔ ''آزما لیجیے۔''

ڈرتے ڈرتے میں نے ہڈی پر زبان لگائی، زبان لگتے ہی زوردار اُبکائی آئی۔ مگر اگلے ہی لمحے یوں لگا، جیسے میری زبان پر برف کا ٹکڑا چھوڑ گیا ہو۔ اور میں نے اس ہڈی کو، جس پر راکھ اور مٹی کی دبیز تہہ جمی ہوئی تھی، جلدی جلدی چوسنے لگا۔ ایک عجیب سی ٹھنڈک تھی، جو میرے جسم میں اُترتی جا رہی تھی۔ میں نے چوسنے ہی پر بس نہیں کیا بلکہ چند لمحوں بعد اُسے کتے کی طرح بھنبھوڑنے لگا۔ بھربھری ہڈی تھی۔ اُس کا کافی حصہ ٹوٹ کر میرے حلق کے نیچے اُتر گیا۔ مزید سکون ملا تو میں نے اُسے پاپڑ کی طرح کھانا اور چبانا شروع کر دیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت میری حالت کسی خونخوار بھیڑیئے سے کم نہیں تھی۔

فضیلہ نے میرے کپڑے اُتارے اور اپنے واحد ہاتھ سے میرے جسم پر مرگھٹ کی راکھ ملنے لگی۔

''اندرونی گرمی کو ہڈی مارے گی اور باہر کی گرمی اس راکھ سے دور ہو گی۔'' اُس نے بھبھوت ملتے ہوئے کہا۔

وہ درست کہہ رہی تھی۔ گرمی کا اثر تیزی سے زائل ہو رہا تھا۔ جسم کے جس حصے پر فضیلہ راکھ بھرا ہاتھ لگاتی، یوں معلوم ہوتا تھا، جیسے سرد پانی میں بھیگا ہوا پھایا رکھ دیا گیا ہو۔ نصف سے زیادہ بدن پر بھبھوت مل گیا ہو گا کہ مجھے نیند آنا شروع ہو گئی۔ ہڈی پہلے ہی ریزہ ریزہ ہو کر میرے پیٹ

میں اُتر چکی تھی۔

جاگتے ہوئے دو راتیں ہو گئی تھیں۔ ایک رات سفر میں ضائع ہو چکی تھی، جبکہ دوسری رات دریا میں اُترنے والی سیڑھیوں پر بیٹھے بیٹھے گزری تھی۔ گزشتہ روز سہ پہر میں کچھ دیر لیٹنے اور آرام کرنے کا موقع ملا تھا، مگر وہ بھی فضیلہ کے پیار کی نذر ہو گیا تھا۔ ہڈی اور بھبھوت کی وجہ سے سکون ملنا شروع ہوا تو اس سے پہلے کہ فضیلہ اپنے کام سے فارغ ہوتی، مجھے نیند آ گئی۔

سوتے میں کہیں دُور سے مدھم سی آواز سنائی دی۔

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟''

میں نے اس آواز کو پہچان لیا تھا۔ دنیا میں ایک ہی تو آواز تھی کہ جو کانوں میں پڑتی تھی تو گویا کانوں میں شہد گھل جاتا تھا۔

''تمہارے اشاروں پر ناچ رہا ہوں، فضیلہ!'' میں نے جواب دیا۔ ''تم نہ ہوتیں تو آج نجانے میرا کتنا برا حشر ہوتا۔ تمہاری مسیحائی نے مجھے کرب و اذیت سے بچا لیا ہے۔''

یوں لگا جیسے ہر وقت ہنسنے ہنسانے، مزے مزے کی باتیں کرنے والی لڑکی رو رہی ہو۔

''تم رو رہی ہو، فضیلہ؟'' میں نے پوچھا۔ ''سامنے تو آؤ۔''

تیز سسکاری کے ساتھ جواب ملا۔ ''پچھلے چار ماہ سے آپ کو مسلسل آوازیں دے رہی ہوں۔ شکر ہے، آج میری آواز تک آپ کی رسائی ہو گئی۔''

''کدھر ہو، فضیلہ؟ سامنے کیوں نہیں آ رہی ہو؟ اور مسلسل آنسو کیوں بہائے جا رہی ہو؟''

''مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ مجھ سے اتنی زیادہ محبت کرتے ہیں۔'' اُس نے میرے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ''کیا آپ نہیں جانتے کہ میری محبت میں آپ سے کیسے کیسے گناہ سرزد ہو رہے ہیں۔''

''وِیشا بھگت کا قول ہے کہ پاپ اور پُن کی دو زنجیروں نے ہر انسان کو اپنی غلامی میں جکڑ رکھا ہے۔ میں نے ان زنجیروں کو توڑ دیا ہے۔''

وہ دوبارہ رونے لگی۔ ''کیسے بتاؤں کہ آپ بھٹک گئے ہیں؟''

''اور میرا خیال ہے کہ میں اپنی منزل کے قریب تر ہوتا جا رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''وِیشا بھگت کی مہربانی سے وہ منحوس، جس نے رخسانہ کی، تمہاری اور نہ جانے کس کس بدنصیب کی جان لی تھی، اپنے آخری انجام کو پہنچ چکی ہے۔ اُنہوں نے تمہاری نورین باجی کو بھی ہلاکت سے بچا لیا ہے۔''

کوئی جواب نہیں ملا۔ وہ آوازیں جو سسکیوں کی صورت میں سنائی دے رہی تھیں، بند ہو گئیں اور میں اُسے زور زور سے پکارنے لگا۔

"فضیلہ!......فضیلہ!......فضیلہ!"

اور تب میری آنکھ کھل گئی۔ کٹیا خالی پڑی تھی اور میں سرتاپا مرگھٹ کے لباس میں چٹائی پر پڑا تھا۔ گرمی کی اذیت دور ہو چکی تھی، دل میں ہلکا ہلکا سا درد ہو رہا تھا۔ اسی لمحے فضیلہ تیز تیز قدموں سے اندر داخل ہوئی۔

"توبہ ہے، آپ تو ایک پل بھی میرے بغیر نہیں رہ سکتے۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ "آپ کو سوتا دیکھ کر دو منٹ کے لئے باہر گئی تھی کہ مجھے آوازیں دینا شروع کر دیں۔ کہیے، کیا بات ہے؟"

میں ٹکٹکی باندھے اُس کی طرف دیکھتا رہا۔ ایک فضیلہ میرے خواب میں آئی تھی، دوسری فضیلہ میری نظروں کے سامنے بیٹھی تھی، اور وہ فضیلہ، جو میرے سامنے بیٹھی تھی، مجسم تھی۔ اور اس فضیلہ سے بدرجہا بہتر تھی، جو میرے خواب میں آئی تھی اور جس کی صرف آواز سنائی دی تھی۔ دونوں میں فرق وہی تھا، جو ایک خواب اور حقیقت میں ہوتا ہے۔

مجھے اپنی جانب متوجہ دیکھ کر فضیلہ کے رخساروں پر خون اتر آیا۔ آنکھیں مخمور ہو گئیں اور بولی۔ "ہر وقت مجھے تکتے رہتے ہیں، پھر بھی آپ کا دل نہیں بھرتا۔ چلیے، اشنان کر کے کپڑے بدل لیجیے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے راج کنڈل میں چند یاتری آئے ہیں۔ انہوں نے اس حالت میں آپ کو دیکھ لیا تو کیا سوچیں گے؟"

اشنان گھر کے بجائے وہ مجھے دریا میں اُترنے والی سیڑھیوں پر لے گئی۔ کیونکہ اشنان گھر کی طرف متعدد یاتری گھوم پھر رہے تھے۔

"اطمینان سے اچھی طرح اشنان کریں۔" اس نے مجھے آخری سیڑھی پر بٹھا کر کہا۔ "لیکن ایک بات کا خیال رکھیں، اشنان کے دوران نہ تو کلی کریں، نہ پانی پئیں۔ اگر آپ نے کلی کر لی یا پانی پی لیا تو اشنان درست نہیں ہوگا۔"

"مگر میں تو سمجھتا ہوں کہ جب تک اچھی طرح کُلی نہ کی جائے، یا جسم کا ایک بھی روآں خشک ہو جائے تو اشنان مکمل نہیں ہوتا۔"

میں نے حیرت سے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تو پھر ٹھیک ہے......جس طرح آپ مناسب سمجھیں، اس طرح اشنان کر لیجیے۔ مرگھٹ والی گرمی دوبارہ آپ پر مسلط ہو گئی تو مجھے الزام نہ دیں۔ پھر آپ کا علاج مرگھٹ کی راکھ بھی نہیں کرے گی۔ اور مہاراج اگلے منگل وار تک آئیں گے۔ اور جب تک اُن کا انتظار کرنا پڑے گا۔"

میں اس آگ کی حدت سے کانپ اُٹھا، جس میں مجھے صبح گیارہ بجے تک گزرنا پڑا تھا۔

اس سے محفوظ رہنے کے لیے میں نے کُلی ہی نہیں کی، بلکہ جسم پر پانی ڈالنے سے بھی احتراز کر سکتا تھا۔

"گویا جب تک مہاراج نہیں آئیں گے، مجھے ناپاک ہی رہنا پڑے گا۔" میں نے ہنس کر کہا۔ اور سختی سے منہ بند کر کے کہ پانی کا ایک قطرہ بھی منہ میں نہ جانے پائے، غسل کرنے میں مصروف ہو گیا۔

غسل کے بعد میں اپنے آپ کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا اور کپڑے پہن کر ان یاتریوں سے ملنے چلا گیا، جو راج کنڈل کی یاترا کے لیے آئے تھے۔ کُل تیس افراد تھے، جن میں مرد، عورتیں، لڑکے، لڑکیاں اور بچے بچیاں بھی شامل تھے۔ ان میں چھ سالہ بچی ان میں سب سے پیاری تھی۔ سارے یاتری اُس کی معصوم باتوں اور شرارتوں پر شیدا تھے، کرشن جی کی مورتی کے سامنے کھڑے ہو کر اُس نے والہانہ انداز میں رقص کیا اور آرتی اُتاری۔ اُسے دیکھ کر سب عش عش کر اٹھے۔ کچھ یاتریوں نے اُس کے ماتا پتا کو مشورہ دیا کہ وہ اُس سے بڑے پیمانے پر رقص کا مظاہرہ کرائیں، تا کہ فلم سازوں میں اُس کی پذیرائی ہو سکے۔ اُس کی ماں نے جواب دیا کہ وہ فی الحال اُسے اسکول کی تعلیم تک محدود رکھنا چاہتی ہے۔ بڑی ہو کر وہ خود اپنے مستقبل کا فیصلہ کرے گی۔

اُس بچی نے جس کا نام امریتا تھا، فضیلہ کو بھی بہت متاثر کیا تھا۔ رقص کے دوران وہ مسلسل اُس کو دیکھتی رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا، جیسے وہ سانس لینا بھی بھول گئی ہو۔ ایک بار میں نے ایک بلی کو چوہے کے بل کے آگے گھات لگائے بیٹھے ہوئے دیکھا تھا۔ فضیلہ کی حالت کم و بیش اسی بلی جیسی تھی۔

امریتا کا رقص دیکھ کر ہم اپنی کٹیا میں واپس آ گئے۔ یاتریوں نے ہمیں اتنا پرشاد دیا کہ دوپہر کے کھانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ لیکن تین بجے کے لگ بھگ جب میں اور فضیلہ سونے کی تیاری کر رہے تھے، لوسی کھانا لے کر آ گئی۔ شہر میں اُس کی ایک پرانی سہیلی سے ملاقات ہو گئی تھی۔ وہ کچھ دیر کے لیے اُس کے گھر چلی گئی تھی۔ تقریباً ایک بجے یاد آیا کہ اُسے کھانا لے کر راج کنڈل جانا ہے۔ سہیلی سے اجازت لے کر بازار گئی، کھانا خریدا، تازہ اخبار لیا اور چلتے چلتے الیکٹرونکس کی ایک دُکان سے پاکٹ ریڈیو بھی لے ڈالا تا کہ شہر کی تازہ ترین صورتِ حال سے آگاہی ہوتی رہے۔ ان کاموں سے نمٹ کر سمندر کے کنارے پہنچی تو تقریباً ایک گھنٹے کے انتظار کے بعد راج کنڈل تک پہنچانے والی کشتی ملی۔ صبح کی طرح وہ مجھ سے خوف زدہ نہیں تھی، اس طرح ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی، جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

"سکندر!" اُس نے کہا۔ "میں نے فضیلہ کے گھر فون کر کے اس کے ابو سے بات کر لی ہے اور انہیں بتا دیا ہے کہ ہم لوگ منگل وار تک مزید یہیں قیام کریں گے۔ وہ تمہارے ابا جی کو تمہاری اور فضیلہ کی خیریت سے مطلع کر دیں گے۔"

"شکریہ!" میں نے کہا۔ نجانے کیوں میری زبان نے ایک بار پھر سسٹر کہنے سے انکار کر دیا۔

اسی شام کو جب فضیلہ کیرتن میں، جسے ایک قسم کی قوالی کہا جا سکتا ہے، امریتا کے پاس بیٹھی لطف اندوز ہو رہی تھی۔ میں خاموشی سے باہر نکل گیا۔ مجھے یقین تھا کہ امریتا کے ہوتے ہوئے فضیلہ کسی دوسرے کی طرف متوجہ نہیں ہو سکتی۔ ہوا بھی ایسا ہی۔ میں ٹہلتا ہوا دروں کے درمیان سے ایک لمبا چکر کاٹ کر اشنان گھر میں پہنچا۔ وہاں جیسے کہ لوسی نے گزشتہ شب کہا تھا، کونے کے پتھر کے نیچے پلاسٹک کے تھیلے میں لپٹا ہوا پرچہ رکھا تھا۔ میں نے تھیلے کو دریا میں بہا دیا اور پرچے کو لیے ہوئے اس چھت پر جا بیٹھا، جہاں عقیدت مند، چڑیوں کے کھانے کے لیے سیروں کے حساب سے دانے ڈال جاتے تھے۔

"سب سے پہلے تو بات وہ کہوں گی، جس کے بارے میں، میں نے آج صبح تمہاری کٹیا میں آنے سے پہلے سوچا تک نہیں تھا۔ گزشتہ رات تم نے سیڑھیوں پر بیٹھ کر کوئی جاپ کیا تھا، یا کوئی اور عمل کیا تھا۔ اس کا لازمی نتیجہ وہی ہونا تھا، جو ہوا۔ تم تہذیب اور اخلاق کی ساری حدود کو پھلانگ گئے ہو۔ تمہاری آنکھوں میں وہی درندگی اور وحشت تھی، جو میں نے غنڈوں کی آنکھوں میں دیکھی ہے۔ میں جانتا ہوں، اس کا اثر دیرپا نہیں ہو گا، لیکن یہ بھی جانتی ہوں کہ جب تک فضیلہ کے ساتھ ہو، وہ تمہیں غلط کاموں کے لیے اُکساتی رہے گی۔ اور جلد ہی وہ وقت بھی آ جائے گا، جب کسی بھی لڑکی کی عزت تمہارے ہاتھوں محفوظ نہیں رہے گی۔ ہو سکتا ہے کہ میں نے جو لکھا ہے، اسے پڑھ کر تمہیں غصہ آ جائے۔ کیونکہ تم فضیلہ سے بے انتہا محبت کرتے ہو۔ ذہنی ہسپتال سے چھٹی ملنے کے بعد جب تم پہلی بار فضیلہ سے ملنے آئے تھے اور میں نے تمہیں دیکھا، اسی روز سے میں تمہیں ایک بات بتانے کے لیے بے چین ہوں۔ اسے کچھ میری تساہلی کہہ لو اور کچھ وہ نگرانی، جو فضیلہ میری کرتی رہی ہے۔

میں تمہیں ابھی تک اصل بات نہیں بتا سکی ہوں، مگر اب جبکہ پانی سر سے اونچا ہو چکا ہے، یہ بتانے پر مجبور ہو گئی کہ جسے تم فضیلہ سمجھتے ہو، وہ فضیلہ نہیں۔ فضیلہ کے مُردہ جسم میں کوئی ایسی شے سرایت کر گئی ہے، جو اس سے مافوق

الفطرت اور خرق عادات کام کرتی ہے۔ اُس کے والدین نے مجھے یہ کہہ کر ملازم رکھا تھا کہ چونکہ فضیلہ ایک ہاتھ سے محروم ہو چکی ہے، اس لئے مجھے اس کے وہ کام سرانجام دینا ہوں گے، جن میں دونوں ہاتھوں کی ضرورت پیش آتی ہے۔ مگر یقین کرنا، سکندر! اُس نے آج تک مجھ سے کوئی کام نہیں کرایا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے اُس کا دوسرا ہاتھ بھی موجود ہے۔ لیکن کوئی اس ہاتھ کو نہیں دیکھ سکتا۔ تھوڑی سی کوشش سے تمہیں بھی اس بات کا اندازہ ہو جائے گا کہ وہ ایک نادیدہ ہاتھ کی مالک ہے۔ ایک اور بات...... رات کو بارہ بجے سے دو بجے تک وہ شے، جو فضیلہ کے جسم میں سرایت کر چکی ہے، عام طور پر جسم چھوڑ کر کہیں چلی جاتی ہے۔ عام طور پر اس لیے کہہ رہی ہوں کہ ہمیشہ نہیں جاتی ہے۔ کہاں جاتی ہے اور کیوں جاتی ہے، اس کا مجھے علم نہیں۔ یہ باتیں جاننے کے لیے مجھے اپنے ڈیڈی کی ان کتابوں کی ضرورت ہے، جو میں نے تمہیں دی تھیں۔

شہر جاتے ہی وہ کتابیں مدرسے سے لے آنا۔ تم ان کتابوں سے فائدہ نہیں اُٹھا سکے۔ جبکہ مجھے معلوم ہے کہ ان میں ہر بات کی تفصیل موجود ہے۔ آخر میں ایک راز کا انکشاف کرنا چاہتی ہوں۔ سمندر کے آس پاس رہنے والوں کا خیال ہے کہ دریا میں جل پریاں پائی جاتی ہیں۔ کچھ مچھیرے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ انہوں نے سات بہنوں کے مزار کے قریب کھجور کے باغ میں جل پریوں کو چہلیں کرتے دیکھا ہے۔ لیکن میری زندگی کا بیشتر حصہ یہیں گزرا ہے۔ اور اس ضمن میں، میں نے اپنی سہیلیوں کے ساتھ بڑی تحقیق کی ہے۔ جل پریوں کا یا کسی ایسی مخلوق جس کا نصف دھڑ انسان کا اور نصف دھڑ مچھلی کا ہو، کوئی وجود نہیں ہے۔ مہاراج اور فضیلہ نے اُس تعویذ یا جنتر کی اہمیت کو بڑھانے چڑھانے کے لیے، جو آج صبح میں نے طلائی ڈبیہ میں بند تمہارے گلے میں پڑا دیکھا تھا، ایک قسم کا ڈھونگ رچایا تھا۔ تم نے سوچا بھی نہیں ہوگا کہ جو ڈرامہ تمہیں دکھایا گیا ہے، اس کا مرکزی کردار فضیلہ ادا کر رہی ہے۔ یہ بات میں پورے وثوق سے کہہ رہی ہوں۔ اور اس لیے کہہ رہی ہوں کہ اس کا تانا بانا میرے ہی سامنے بُنا گیا تھا۔ اور رہ گئی وہ چیز، جو تمہارے گلے میں ڈلوائی گئی ہے، میں سمجھتی ہوں کہ اثر سے خالی نہیں ہو گی۔ ایک طرف وہ تمہیں بلاؤں اور مصیبتوں سے بچائے گی اور دوسری طرف تم فضیلہ اور مہاراج کا بندۂ بے دام ہو کر رہنے پر مجبور ہو جاؤ گے۔

ایک بات اور تم نے مجھے مہاراج کے قدموں پر جھکتے ہوئے دیکھا، آئندہ بھی دیکھو گے۔ میری اس حرکت سے دھوکا نہ کھا جانا۔ ہو سکے تو کسی رات کو جب فضیلہ محوِ خواب ہو اور درحقیقت کہیں گھومنے پھرنے گئی ہو تو مجھ سے ملنے کی کوشش کرنا۔ وہ کٹیا میں موجود ہے یا نہیں، اس کا اندازہ تو تم اس کے دل کی دھڑکن سے لگا سکتے ہو۔ جب محسوس کرو کہ اس کا دل بالکل ساکت و جامد ہے، سمجھ لینا کہ وہ جسم کو چھوڑ کر کسی ایسی جگہ جا چکی ہے، جہاں سے فی الحال میری اور تمہاری رسائی نہیں ہو سکتی۔ باقی باتیں زبانی ہوں گی۔ اور ہاں، جوش میں آ کر کوئی ایسی حرکت مت کر بیٹھنا، جو میرے، تمہارے یا دونوں کے لئے نقصان دہ ثابت ہو۔

دعا گو۔ تمہاری لوسی۔"

لوسی نے اپنے اس خط میں، جس کے میں نے صرف اقتباسات تحریر کیے ہیں، بہت سی ایسی باتیں بتائی تھیں، جو مجھے پہلے سے معلوم تھیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ فضیلہ، فضیلہ نہیں تھی۔ لیکن اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ جو کوئی بھی تھی، اُس بدصورت عورت کی طرح میری دشمن نہیں تھی۔ اُس نے مجھے فضیلہ ہی جیسی یا اس سے بھی بڑھ کر محبت دی تھی۔ مجھے ایک لمحے کے لیے بھی یہ احساس نہیں ہونے دیا تھا کہ میں کیا کھو چکا ہوں۔ وہی تھی جس نے مرگھٹ کی راکھ اور ہڈیوں کے ذریعے میری اس جان لیوا تکلیف کو دور کیا تھا، جو جنتر گلے میں ڈالنے کے بعد مجھے برداشت کرنا پڑ رہی تھی۔ وہ مہربان، رحم دل اور دیالو روح تھی اور ان روحوں سے یکسر مختلف تھی، جن سے مجھے سابقہ پڑا تھا۔ رہی یہ بات کہ اُس نے دریائی مخلوق کا بھیس بدل کر مجھے دھوکا دیا تھا، اس لیے قابلِ اعتناء نہیں تھی کہ مجھے اس تک جنتر کو پہنچانے کا، جو واقعی بااثر تھا، ایک حسین ذریعہ تھا۔

لوسی کی ایک بات سے مجھے اختلاف تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ جنتر کے ذریعے مجھے اپنا بندۂ بے دام بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ میں تو پہلے ہی فضیلہ کی زلفوں کا اسیر تھا۔ لوسی کے خط سے ایک انکشاف یہ بھی ہوا تھا کہ فضیلہ کے جسم میں جو رُوح تھی، بدصورت عورت اور رانی سے زیادہ بااختیار اور مختلف تھی۔ وہ دونوں جس پر قبضہ کرتی تھیں، اسی میں قید ہو کر رہ جاتی تھیں اور اس وقت تک اس کی قید سے رہائی حاصل نہیں ہوتی تھی، جب تک اس جسم کو ختم نہ کر دیا جائے۔ مگر فضیلہ کے جسم میں داخل ہونے والی مقید نہیں تھی۔ اکثر راتوں کو وہ جسم چھوڑ دیتی تھی۔ اور یہ اُس کی حد درجہ عنایت تھی۔ میری خاطر اس جسم میں دوبارہ آ جاتی تھی۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ میری زندگی اُس سے وابستہ ہے۔

میں نے لوسی کے پرچے کو پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ اور ان ٹکڑوں کو دریا میں بہا کر چھت سے نیچے اُتر آیا۔

مندر سے کیرتن کی محفل ختم ہو چکی تھی اور امریتا کے والدین کی خوشامد جاری تھی کہ وہ اپنی بچی کو رقص پر آمادہ کریں۔ پہلے تو امریتا انکار کرتی رہی، لیکن جب اُس نے فضیلہ کو بھی اثبات میں سر ہلاتے دیکھا تو فوراً راضی ہو گئی۔

"ڈیڈی کے کہنے سے ناچ لوں گی۔ پر ایک بار ناچوں گی۔"

"ہاں، ہاں........بس ایک بار ناچنا۔" کئی یاتریوں نے بیک وقت کہا۔

"ابھی آئی۔" وہ اپنی ننھی سی ساڑھی کو سنبھالتی ہوئی ایک کٹیا کی طرف بھاگ گئی۔

امریتا کا پتا، جو طبلہ لے کر بیٹھ گیا تھا اور تال درست کر رہا تھا۔

دونوں نے اتنا شاندار رقص پیش کیا کہ حاضرین کی آنکھیں اُبل پڑیں۔ کنہیا جی جتنے نیلے اور کالے تھے، رادھا جی اتنی ہی گوری اور خوب صورت تھیں۔ یہی نہیں بلکہ کنہیا جی سے عمر میں بڑی بھی تھیں۔ لطف آ گیا۔ رادھا اور کنہیا ملتے ہوں گے تو اسی طرح رقص میں ڈوب کر دنیا سے بے خبر ہو جاتے ہوں گے۔ فضیلہ ایک ہاتھ سے محروم تھی، جبکہ محبت اور ادا کے اظہار کے لیے رقص میں دونوں ہاتھوں کی ضرورت پیش آتی ہے۔

پھر بھی وہ اتنی خوبی اور مہارت سے رقص کر رہی تھی کہ کسی کو ایک لمحے کے لیے بھی اُس کے ہاتھ کی کمی کا احساس نہیں ہوا۔ رقص کا، جھنکار کا اور طبلے کی تھاپ کا ایسا طلسم کدہ تھا، جس نے وہاں پر موجود ہر شخص کو مبہوت کر کے رکھ دیا تھا۔ امریتا اور فضیلہ ہی رقص میں کھوئے ہوئے نہیں تھے، امریتا کے پتا جی بھی، جن کے پاس طبلہ تھا، بے خود ہو گئے تھے اور جھوم رہے تھے اور جھوم جھوم کر اس طرح طبلہ بجا رہے تھے، جیسے حقیقت میں رادھا اور کنہیا کی سنگت کر رہے ہوں۔

رقص تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کے بعد اختتام کو پہنچا۔ امریتا چھم چھم کرتی کٹیا کی طرف بھاگ گئی۔ فضیلہ فرش پر گر گئی اور لمبے لمبے سانس لینے لگی۔ امریتا نے پتا جی کے طبلے پر سر رکھ لیا اور ہانپنے لگی۔

اس رقص کے بعد کسی کو امریتا کا رقص دیکھنا نصیب نہیں ہوا۔ وہ اُس کی زندگی کا آخری رقص ثابت ہوا۔

کچھ عورتیں رادھا اور کنہیا کے مدھر ملن کے رقص سے متاثر ہو کر ہچکیوں سے رو رہی تھیں۔ اُن کی ہچکیاں بندھ ہوئیں اور ساڑھیوں کے پلوؤں میں آنسو جذب ہو گئے اور دلوں کی بے قراری نے کچھ قرار پکڑا تو ایک عورت نے امریتا کے پتا سے کہا۔

"ذرا امریتا کو تو بلائیے بھائی صاحب! ہم اس کی بلائیں لیں گے۔"

امریتا کی ماں ہنستی ہوئی اُٹھی، امریتا کو اُٹھانے کے لیے کٹیا میں گئی اور ایک ہی منٹ میں

گھبرائی ہوئی پلٹ آئی۔ "بے بی تو کٹیا میں نہیں ہے۔"

"اشنان گھر میں میک اپ اتار رہی ہو گی۔" امریتا کے پتا نے کہا۔ "تم تو ذرا ذرا سی بات پر ڈر جاتی ہو۔ یہ بھی نہیں سوچتیں کہ ہم بھگوان کے گھر میں ہیں۔ بھگوان ہم سب کی رکھشا کر رہے ہیں۔"

وہ تقریر کرتا ہوا کھڑا ہو گیا اور اشنان گھر کی سمت قدم اُٹھانے لگا۔ اُس کے پیچھے اُس کی بیوی لپکی۔ دونوں ہی پریشان پریشان سے نظر آ رہے تھے۔ چند ہی لمحوں بعد میاں بیوی اشنان گھر سے چیختے ہوئے نکل آئے۔

"امریتا، اشنان گھر میں بھی نہیں ہے۔" امریتا کی ماں نے ہسٹریائی انداز میں چیخ کر کہا۔

امریتا اشنان گھر میں بھی نہیں تھی۔

"امریتا!........امریتا!" امریتا کا باپ وحشیوں کی طرح آوازیں دے رہا تھا۔ "بے بی! بے بی!"

مندر میں موجود تمام افراد باہر کی طرف دوڑ پڑے اور امریتا کو ڈھونڈنے کے لیے جزیرے کے اطراف میں پھیل گئے۔ میں بھی باہر جانے کی نیت سے اُٹھا۔ ڈانس کی تھکان کے باعث فضیلہ اس وقت فرش پر پڑی تھی۔ جاتے جاتے میرے قدم رک گئے۔ سوچا کہ فضیلہ کو اُٹھا کر کٹیا میں پہنچا دوں اور کٹیا کی طرف جاتے ہوئے بتا دوں کہ امریتا کہیں اِدھر اُدھر ہو گئی ہے، یاتری اُسے تلاش کر رہے ہیں۔

میں نے اُس کے تلوؤں میں گدگدی کی۔ اُٹھی نہیں تو اُس کے چہرے کی طرف جا کر سارے بال بکھیر دیئے۔ پھر بھی نہیں اُٹھی تو اندر ہی اندر میرا دل لرزنے لگا۔ میں نے اُسے جھنجھوڑ ڈالا۔ وہ بے حس و حرکت پڑی رہی۔ میرے دماغ میں آتش بازی سی پھوٹ پڑی۔

اچھی خاصی روشنی تھی۔ مگر چاروں طرف تاریکی پھیل گئی۔ جیسے تیسے خود کو سنبھال کر رکھا تو نبضیں ندارد۔ کان سینے پر رکھا، دل کی دھڑکنیں سننے کی کوشش کی تو یوں لگا جیسے لکڑی کے بے جان ٹکڑے پر کان رکھ دیئے ہوں۔

بے چینی اور اضطراب کے اس عالم میں ڈھارس بندھاتی ہوئی ایک آواز آئی۔ "یاد کرو، لوسی نے اپنے پرچے میں کیا لکھا تھا؟"

"کیا لکھا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"اُس نے لکھا تھا کہ اُس کی روح کبھی کبھی گھومنے پھرنے بھی چلی جاتی ہے۔" میں نے خود ہی جواب دیا۔

"نہیں........اُس نے لکھا تھا، رات کو بارہ بجے سے دو بجے تک گھومنے پھرنے چلی جاتی

ہے۔ ابھی تو شام ہی ہے۔"

"ہوسکتا ہے، آج کچھ پہلے ہی چلی گئی ہو۔"

کاش! ایسا ہی ہو۔" میں نے اپنے آپ سے کہا۔ "اب کیا کرنا چاہیے؟"

"اب اُس کی آمد کا انتظار کرنا چاہیے۔"

"نہیں آئی تو کیا ہوگا؟"

دل پر گھونسے سے لگنے لگے۔ "کیا ہوگا؟......کیا ہوگا؟"

میں نے جھک کر اُسے اُٹھایا اور کندھے پر لاد کر کٹیا کی طرف جاتے ہوئے ایک یاتری سے
سے ملاقات ہوئی، جو امریتا کو ڈھونڈتا ہوا اِدھر آرہا تھا۔

"کیا بات ہے، سائیں!" اُس نے پوچھا۔ "دیوی کو اس طرح کیوں لے جا رہے ہو؟"

"طبیعت ٹھیک نہیں ہے......نبض نہیں مل رہی ہے۔"

"میں وید ہوں۔ اگر اعتراض نہ ہو تو ایک نظر دیوی کو چیک کرلوں؟"

"بڑی مہربانی ہوگی۔" میں نے کہا۔ "میری کٹیا زیادہ دور نہیں ہے۔ پیچھے پیچھے چلے آؤ۔"

کٹیا پہنچ کر اُس نے بغور فضیلہ کو دیکھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اُس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔

"صبر کرو، سائیں!" اُس نے کہا۔

میرے دل پر ہتھوڑے سے برسنے لگے۔ "تمہارا مطلب ہے، یہ مر چکی ہے؟"

وہ ایک بار پھر فضیلہ کی نبض دیکھنے میں مصروف ہوگیا۔

"زندگی میں پہلی بار اتنا حیرت انگیز کیس دیکھا ہے۔" وہ بولا۔ "اگر میں نے اپنی آنکھوں
سے تمہاری دھرم پتنی کو تم سے باتیں کرتے اور امریتا کے ساتھ سیتا کے روپ میں ناچتے نہ دیکھا
ہوتا تو سوگند کھا کر کہہ سکتا تھا کہ یہ مُردہ کم از کم چار پانچ مہینے پرانا ہے اور کسی وجہ سے گلنے سڑنے
سے اور خراب ہونے سے بچ گیا ہے۔"

وہ مجھے حیران و پریشان چھوڑ کر جانے کے لیے کھڑا ہوگیا۔ "میں کسی عورت کو یہاں آنے
کے لیے کہتا ہوں۔ دراصل امریتا کی وجہ سے سب پریشان ہیں۔ کوئی سمبندھی رشتے دار ہو تو
اسے بلالو۔"

اس کے جانے کے بعد میری وہاں سے اُٹھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ کچھ عجیب گوگو کے عالم
میں تھا۔ میں اگر لوسی کا خط پڑھ نہ چکا ہوتا تو عجیب ہی حالت ہوتی۔ رنج و غم کے ان لمحات میں
ایک ڈھارس سی بندھی ہوئی تھی۔ رہ رہ کر ایک ہی خیال آرہا تھا کہ کسی بھی لمحے وہ روح، جو فضیلہ کا
جسم چھوڑ کر کہیں چلی گئی ہے، واپس آجائے گی اور فضیلہ ہنستی ہوئی اُٹھ کر بیٹھ جائے گی۔

میں فکر میں ڈوبا فضیلہ کے بے جان ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیے بیٹھا تھا کہ لوسی گھبرائی ہوئی

کٹیا میں پہنچی۔

"یہاں بیٹھے ہوئے کیا کر رہے ہو، سکندر؟" اُس نے فضیلہ کے مُردہ جسم سے آنکھیں
چراتے ہوئے پوچھا۔

میں نے کہا۔ "فضیلہ کی روح اس کے جسم کو چھوڑ گئی ہے۔"

"یہ کیسے ہوسکتا ہے؟" وہ تجاہل عارفانہ کے ساتھ بولی۔ "تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ آج
فضیلہ نے تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک ڈانس کیا ہے، اس کی وجہ سے تھک کر لیٹ گئی ہے۔"

"تمہارا کیا خیال ہے، کیا اس کی روح واپس آجائے گی؟"

"میں ایسی باتیں سوچنے کی عادی نہیں ہوں، جو ناممکن ہوتی ہیں۔"

"مگر تم نے تو......"

میرا جملہ نامکمل رہ گیا۔ لوسی آنکھ مار کر مجھے خاموش رہنے کے لیے کہہ رہی تھی۔ ایسا معلوم
ہوتا تھا، جیسے روح وہیں منڈلا رہی ہو۔

"باہر چلو۔" لوسی نے سختی سے کہا۔ "یاتریوں کے ساتھ آئی ہوں۔ ایک معصوم بچی کھو گئی
ہے۔ جزیرے پر اسے تلاش کرنا ہے، اس میں یاتریوں کی مدد کرو۔ فضیلہ آرام سے سو رہی ہے،
اسے سونے دو۔"

"فضیلہ مر چکی ہے۔" اُس نے زور سے جواب دیا۔ "میں اسے چھوڑ کر کہیں نہیں جاسکتا۔
جب تک اس میں زندگی کے آثار نظر نہیں آئیں گے، میں اسی طرح بیٹھا رہوں گا۔"

"فضیلہ مری تو نہیں ہے۔ لیکن اگر تم یہاں بیٹھے رہے تو ضرور اسے مار دو گے۔" لوسی بگڑ کر
بولی۔ اور میرے ہاتھ سے فضیلہ کا ہاتھ چھڑا کر باہر کھینچنے لگی۔

جب میں اسکول کی آٹھویں یا نویں کلاس میں پڑھتا تھا تو اُس چڑیل نے تعلیمی تاشوں کی
مدد سے مجھے مشورہ دیا تھا کہ تکیے کی مدد سے نورین کو قتل کر کے کمرے سے باہر نکل جاؤں اور چند
سیکنڈ تک نہ خود آؤں اور نہ کسی کو اندر آنے دوں۔ گویا کسی رُوح کا کسی مُردہ جسم میں داخلہ اس
صورت میں ممکن تھا کہ دونوں کو تنہائی میں چھوڑ دیا جائے۔ لوسی نے کہا۔

"تم یہاں بیٹھے رہے تو اسے ضرور مار ڈالو گے۔" اُس کا یہ جملہ سن کر مجھے پچھلی باتیں یاد آ
گئیں۔ فوراً جانے کے ارادے سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

"کیا خیال ہے تمہارا؟" میں نے باہر نکل کر لوسی سے پوچھا۔ "میرے باہر آجانے سے
روح واپس آجائے گی۔"

اُس نے مجھے آنکھ ماری اور سر ہلا کر اپنی پشت کے پیچھے اشارہ کیا کہ ہم اکیلے نہیں ہیں، کوئی
اور بھی ہماری باتیں سن رہا ہے۔

"میں نہیں جانتی، تم کیا سمجھ رہے ہو۔" اُس نے بات بناتے ہوئے کہا۔ "تمہاری فضیلہ زندہ ہے۔ یہ بات اس لیے کہہ رہی ہوں کہ پہلے بھی دو تین مرتبہ اسی طرح بے حس و حرکت ہوتے ہوئے دیکھ چکی ہوں۔ بالکل دھان پان سی تو ہے۔ کبھی تھک جاتی ہے تو اس کا یہی حال ہوتا ہے۔ لیکن تھوڑا سا آرام کرے، جیسا کہ اس وقت کر رہی ہے تو آہستہ آہستہ توانائی بحال ہو جاتی ہے۔"

اصل بات نہ بتاتے ہوئے بھی اشاروں میں لوسی مجھ سے کہہ رہی تھی کہ تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ روح گھومنے پھرنے گئی ہے۔ فضیلہ بہت جلد آنکھیں کھول دے گی۔ اسی اثناء میں دو یاتری یہاں سے گزرے۔ وہ ان مقامات پر، جہاں امریتا کو کئی بار تلاش کیا جا چکا تھا، ایک بار پھر تلاش کر رہے تھے۔

"بچی نہیں ملی؟" لوسی نے پوچھا۔

"خیال ہے کہ کنارے سے پھسل کر پانی میں جا گری ہے۔" ایک یاتری نے جواب دیا اور دریا کی لہریں اُسے بہا لے گئی ہیں۔"

دوسرا بولا۔ "غوطہ خوروں کی خدمات حاصل کر لی گئی ہیں اور بیراج کے پھاٹک بند کرا دیے گئے ہیں، تاکہ اس کی لاش بہتی ہوئی کہیں دُور نہ نکل جائے۔"

"حقیقت میں تو اب اُسے دریا میں تلاش کیا جا رہا ہے۔" پہلے نے کہا۔ "لوگ تو محض خانہ پُری کے لیے اسے ڈھونڈ رہے ہیں۔"

"کتنی پیاری بچی ہے۔" میں نے آہستہ سے کہا۔ "کاش وہ یہیں کہیں ڈوبی نہ ہو۔"

دونوں سر ہلاتے ہوئے چلے گئے۔ میری نظروں میں برسوں پہلے کا منظر گھوم گیا۔ رخسانہ بھی تو اسی طرح ہنستی کھیلتی کھو گئی تھی۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئی تھی۔

کم و بیش یہی حال امریتا کا ہونا تھا۔ غوطہ خور اُس کی لاش دریا کے کسی نہ کسی حصے میں سے نکالنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اس حال میں کہ اُس کا ایک ہاتھ غائب ہوگا۔"

مگر یہ ناممکن تھا۔ فضیلہ نے کہا تھا کہ اس ترشول کا، جو انسانوں کے ہاتھوں کو پاپڑ کی طرح کھا جاتی ہے، میرے گلے میں جنتر پڑتے ہی وجود ختم ہو چکا تھا، تو امریتا کے بازو غائب ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ دوسرا امکان اس بات کا تھا کہ فضیلہ اور سادھو نے جھوٹ بولا ہو۔ لیکن یہ بھی تو ممکن نہیں تھا۔ میرا تجربہ محدود تھا۔ اس کے باوجود یقین سے کہہ سکتا تھا کہ دونوں جھوٹے اور مکار نہیں تھے۔

لوسی نے کہا۔ "میں نے یہ سوچ کر تمہارے اور فضیلہ کے رات کے کھانے کا انتظام نہیں کیا کہ یاتریوں کے پرشاد سے کام چل جائے گا۔ لیکن گمشدہ بچی کے باعث معلوم ہوتا ہے کہ پرشاد تقسیم نہیں ہو سکے گا۔ جا کر تم دونوں کے کھانے پینے کا بندوبست کرتی ہوں۔"

"اپنی کٹیا میں جا سکتا ہوں؟" میں نے پوچھا۔

"کیوں نہیں جا سکتے۔ فضیلہ کے لیے اتنا آرام کافی ہے۔"

ذہن میں عجیب عجیب اشکالات اور سوالات اُبھر رہے تھے، جن کی تشریح لوسی ہی کر سکتی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس قسم کی باتیں وہاں کھڑے ہو کر کی جائیں۔ وہ چلی گئی تو میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اُمید و بیم کی حالت میں اپنی کٹیا کا رخ کیا۔ یہ تصور کہ روح واپس نہ آئی تو کیا ہوگا، میرے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔

مجنوں کو لیلیٰ کا کتا پیارا تھا تو مجھے وہ جسم جو فضیلہ کا تھا، دل و جان سے زیادہ عزیز تھا۔ کٹیا میں پہنچ کر میرا کلیجہ منہ کو آ گیا۔ ہم نے روح کی واپسی کے لیے مُردہ جسم کو پندرہ منٹ سے زیادہ تنہائی کا عرصہ دیا تھا لیکن جسم جوں کا توں پڑا تھا۔

راج کنڈل میں آ کر جب سے یہ معلوم ہوا تھا کہ فضیلہ کا جسم تو باقی ہے، خود فضیلہ باقی نہیں ہے، میں ہنسنا اور رونا بھول گیا تھا۔ حالانکہ مجھ پر ایک دور ایسا بھی گزرا تھا کہ انتہائی مصائب اور آلام میں بھی کوئی نہ کوئی ہنسی کا پہلو ضرور نکال لیتا تھا، اب کتنی بھی ہنسی کی بات کیوں نہ ہو، میری ہنسی مسکراہٹ سے تجاوز نہیں کرتی تھی۔ اور وہ مسکراہٹ بھی دوسروں پر اپنی مسرت کا اظہار کرنے کے لیے ہوتی تھی۔ ورنہ مسکرانے تک کو جی نہیں چاہتا تھا۔ یہی حال رونے کا تھا۔ دل کو ذرا سی ٹیس پہنچتی تھی تو آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی تھی اور سسکیاں بند ہو جاتی تھیں۔ اب اندر ہی اندر تو دل اُداس ضرور رہتا تھا لیکن آنکھوں میں آنسو نہیں آتے تھے۔

میں اُس کے پاس جا کر بیٹھ گیا اور اس خوب صورت چہرے کو دیکھنے لگا، جسے دس بارہ گھنٹوں بعد ارتھی کی صورت میں نذرِ آتش ہو جانا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے میں اچانک اُچھل پڑا۔ وہ سانس لے رہی تھی۔ رخساروں پر زندگی بخش سرخی دوڑی ہوئی تھی۔ میں نے بے اختیار ہو کر اُس کے سینے پر سر رکھ دیا۔ باقاعدہ دل دھڑک رہا تھا اور گھڑی کے پنڈولم کی طرح اس میں سے کھٹ کھٹ کی آوازیں آ رہی تھیں۔

فضیلہ نے آنکھیں کھول دیں۔ اپنے واحد ہاتھ سے میرا سر اُوپر اُٹھایا اور میری آنکھوں میں دیکھتی ہوئی بولی۔

"آپ نے جگا دیا....... میں بڑا سندر سپنا دیکھ رہی تھی۔"

میں نے گہری سانس لی۔ اُس کو کس طرح بتاتا کہ مجھے ہر بات معلوم ہو چکی ہے۔ وہ سوئی نہیں تھی بلکہ جسم کو چھوڑ کر سیر و تفریح کرنے چلی گئی تھی اُس نے کوئی سندر سپنا نہیں دیکھا تھا، بلکہ جو کچھ دیکھ کر آئی تھی، وہ حقیقت پر مبنی تھا۔

اچانک وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی اور کٹیا کی دیواروں کو دیکھنے لگی۔

"میں تو......." اُس نے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "میں تو شاید اس مقام پر تھی، جہاں کرشن کی مورتی ہے۔ یہاں کیسے آ گئی؟"

"تم ناچتے ناچتے تھک کر گر گئی تھیں۔ میں سمجھا کہ آرام کر رہی ہو۔ اسی اثناء میں سارے یاتری امریتا کی تلاش میں نکل گئے۔ میں نے تمہیں اُٹھانا چاہا تو پتہ چلا کہ تم گھوڑے بیچ کر سو رہی ہو۔ بس میں نے تمہیں کندھے پر لادا اور یہاں کٹیا میں اُٹھا لایا۔"

"یہ تو آپ نے بہت اچھا کیا۔" وہ بولی۔ "لیکن میری سمجھ میں ایک بات نہیں آئی۔ آپ کہہ رہے ہیں کہ یاتری، امریتا کی تلاش میں نکل گئے۔ کیا وہ کھو گئی تھی؟"

"ابھی تک کھوئی ہوئی ہے۔" میں نے کہا۔ "جزیرے کا کوئی چپہ ایسا نہیں بچا، جہاں اُسے کئی بار نہ دیکھا گیا ہو۔ اب تو اُسے دریا میں ڈھونڈا جا رہا ہے۔ غوطہ خوروں کی خدمات حاصل کی گئی ہیں۔ بیراج کے سارے پھاٹک گرا دیے گئے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ کچھ دیر بعد اس کی لاش مل جائے گی۔ مگر کندھے کے پاس سے اُس کا ہاتھ کاٹا جا چکا ہوگا۔"

جملہ مکمل کر کے میں نے فضیلہ کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ اُس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔ کشادہ پیشانی پر کئی شکنیں اُبھر آئی تھیں اور آنکھوں سے پریشانی کا اظہار ہو رہا تھا۔ اگر وہ ایکٹنگ کر رہی تھی تو بلاشبہ بڑی شاندار ایکٹنگ تھی۔

دوسری صبح فضیلہ نے دریا کی سحر انگیز ہواؤں سے متاثر ہو کر میرے سینے پر اپنا سر رکھ لیا اور آنکھوں میں آنکھیں ڈالتی ہوئی بولی۔ "میں آپ سے ایک خاص بات کا اعتراف کرنا چاہتی ہوں، سکندر!....... سسٹر کے بارے میں، میں نے اب تک آپ کو اندھیرے میں رکھا ہے۔"

میں نے اُس کی سنہری زلفوں سے کھیلتے ہوئے جواب دیا۔ "مجھے پہلے ہی اندازہ ہو گیا کہ وہ، وہ نہیں ہے، جو وہ خود کو ظاہر کرتی ہے۔"

"نہیں.....آپ کا اندازہ غلط ہے۔" فضیلہ نے کہا۔ "وہ، وہی ہے جو خود کو ظاہر کرتی ہے۔"

"پھر ایسی کون سی بات ہے، جو تم مجھ سے چھپاتی رہی ہو؟"

"سسٹر میری ملازمہ نہیں ہے۔"

"پھر کون ہے؟"

"قیدی ہے۔"

میں اچھل پڑا۔ "کیا ہے؟"

وہ بولی۔ "وہ میری قید میں ہے۔"

میری سمجھ میں پھر بھی کچھ نہیں آیا۔ میں نے کہا۔ "یہ کیسی قید ہے؟ اپنی مرضی سے جب ہے، جہاں چاہتی ہے، آتی جاتی رہتی ہے۔"

"اپنی مرضی سے نہیں، میری مرضی سے آتی جاتی ہے۔ قید میں نہ ہوتی اپنی مرضی کی مالک ہوتی تو کب کی فرار ہو چکی ہوتی۔"

"تم ہر وقت اسے اپنی نظروں کے سامنے تو نہیں رکھ سکتیں۔"

"نہیں۔" فضیلہ نے بتایا۔ "لیکن جب چاہوں، اُسے نظروں کے سامنے طلب کر سکتی ہوں۔ چاہے وہ ہزاروں میل دور ہو، سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر میرے سامنے آنے پر مجبور ہو جائے گی۔"

"تم نے اُسے کیوں قید کیا ہے؟"

"اُس کا جرم ایسا ہے کہ اگر جان سے مار دیا جائے، تب بھی کم ہے۔ وہ مجھے اپنے قبضے میں کرنے کے لیے جاپ کر رہی تھی۔"

مجھے وہ ٹکلا یاد آ گیا، جو خود کو عامل کہتا تھا۔ اپنا دایاں ہاتھ ضائع کرانے کے باوجود رانی کو قبضے میں کرنے کا ارادہ ترک نہیں کیا تھا۔ یہاں تک کہ مجھے قبر میں دفن کر دینا چاہتا تھا۔ اور تب رانی نے اُسے اتنی بے دردی سے ختم کیا تھا کہ قبرستان میں اُس کی چند ہڈیاں ہی باقی بچی تھیں۔

"جاپ کامیاب ہو جاتا تو کیا تم سچ مچ اُس کے قبضے میں چلی جاتیں؟"

"آپ کو فضیلہ نہ ملتی اور میں اُس کی باندی بن کر اشاروں پر ناچنے اور جائز اور ناجائز ہر قسم کے مطالبات پورے کرنے پر مجبور ہو جاتی۔"

"اچھا، تو یہ بات ہے۔" میں نے دل ہی دل میں کہا۔ لوسی اس لیے اپنے ڈیڈی کی کتابوں کو دیکھنا چاہتی تھی۔ فضیلہ کی قید میں ہونے کے باوجود اُس نے ابھی تک اپنی شکست قبول نہیں کی تھی۔

"اگر میں تمہیں قبضے میں کرنے کے لیے وظیفہ پڑھوں یا جاپ کروں، تو کیا ناراض ہو کر لوسی کی طرح مجھے بھی تم اپنا غلام بنا لو گی؟" میں نے پوچھا۔

"میں تو جاپ اور وظیفے کے بغیر ہی آپ کے قبضے میں ہوں، سکندر!" اُس نے ہنس کر جواب دیا۔ "قبضہ تو اس پر کیا جاتا ہے، جس پر کوئی بس نہ چلے۔"

"یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "میں پوچھ رہا ہوں کہ اگر کوئی وظیفہ پڑھوں یا جاپ کروں تو تم مجھ سے بھی ناراض ہو جاؤ گی؟"

وہ بھیگی بھیگی آنکھوں سے کئی سیکنڈ تک مجھے دیکھتی رہی۔ "اگر آپ نے کوئی وظیفہ یا جاپ کیا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ کو میری محبت پر اعتبار نہیں ہے۔ میری وفا پر شک کیا جائے گا تو مجھے لازمی طور پر غصہ آئے گا اور اپنی خفگی کا اظہار کیا جائے گا۔ میں مجبور ہو جاؤں گی کہ اس جسم کو، جو آپ کو دنیا کی ہر شے سے زیادہ عزیز ہے، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ دوں گی۔ میں سمجھتی ہوں کہ اس سے بڑی سزا کوئی اور نہیں ہو سکتی۔"

میں نے اپنے دل کو ٹٹولا۔ بلاشبہ اس سے بڑی کوئی دوسری سزا نہیں ہو سکتی تھی کہ فضیلہ کا جسم مجھ سے چھن کر منوں مٹی کے نیچے دبا دیا جائے۔ اس جسم کی مثال ایک ہیرے جیسی تھی، جو اصل زیور سے نوچ کر دوسرے زیور میں جڑ دیا جائے۔ لیکن ہیرے کی آب و تاب میں تو کوئی فرق نہیں آتا۔ میں کس دل سے گوارا کر سکتا تھا کہ اُس ہیرے کو میرے پاس سے کہیں دور پھینک دیا جائے۔

"سنو، فضیلہ!" میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ "جس طرح الف لیلیٰ کے شہزادے کی زندگی میں ایک مینا کی زندگی بڑی اہمیت رکھتی ہے، اسی طرح میری زندگی تمہارے جسم سے وابستہ ہے۔ تمہارا جسم نہ رہا تو میں بھی نہیں رہوں گا۔ اس جسم کو چھوڑنے کا خیال بھی دل میں نہ لانا۔"

"آپ بھی وعدہ کیجیے کہ آئندہ کبھی میری محبت پر شک کر کے کوئی وظیفہ پڑھنے یا جاپ کرنے کے بارے میں نہیں سوچیں گے، جس سے میری آزادی خطرے میں آجائے۔ میں آپ کو چاہتی رہوں گی۔ جب تک آپ مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔"

پجاریوں کا تیار کردہ کھانا سادہ ہونے کے باوجود پُر ذائقہ تھا۔ اس کے لیے ہمیں مندر کے اس حصے میں لے جایا گیا، جہاں سنگِ مرمر کے تخت پر راج کنڈل آنے کے بعد مہاراج وشیا بھگت کو چار زانو بیٹھے، موٹی سی مالا پر شری وشیا کا نام جپتے دیکھا تھا۔ آٹے کے گولے بنا کر مٹی کے پیالوں میں بند کر دیئے گئے اور ان پیالوں کو اُپلوں کے درمیان دبا دیا گیا تھا۔ اس طرح آلو بھی گرم بھوبھل میں دبائے گئے تھے۔ پیالوں کو توڑ کر آٹے کے گولے نکالے گئے، آلوؤں کو چھیل کر نمک مرچ چھڑکا گیا۔ ہم نے روٹی کے طور پر ان گولوں کو اور سالن کے طور پر آلوؤں کو استعمال کیا۔ پانی کے طور پر ہمیں ٹھنڈائی دی گئی، جس میں چاروں مغزیات کے ساتھ بھنگ کو گھوٹا گیا تھا۔

کھانے کے دوران میں نے لوسی کے بارے میں دریافت کیا۔

"کیا بات ہے.......؟" فضیلہ نے ہنستے ہوئے طنزیہ انداز میں کہا۔ "آج مسٹر کی بہت یاد آ رہی ہے۔"

"اس لیے یاد آ رہی ہے کہ وہ ہمارے ساتھ آئی ہے۔ اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ ہم پیٹ بھر کر کھانا کھالیں اور اُسے کچھ بھی نہ ملے۔"

"وہ ہم سے بھی اچھا کھانا کھا رہی ہے۔ اُس کی فکر نہ کریں۔"

"ہم سے بھی اچھا؟"

"جی ہاں!"

"وہ کیسے؟"

"ہاں، ہم سے بھی اچھا ہے۔" فضیلہ نے کہا اور بات ختم ہو گئی۔ بھنگ میں یوں تو

خوبیاں ہیں، گرمی کو مارتی ہے، بات بے بات ہنسنے پر آمادہ کرتی ہے، غموں کو بھلاتی ہے، ہر شے میں چھپے حُسن کو اجاگر کرتی ہے، لیکن ان سب سے بڑھ کر ایک خوبی اور بھی ہے، وہ اچھے بھلے انسان کو بھکّی بنا دیتی ہے۔

میں زیادہ تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ پڑھنے والے خود سمجھ سکتے ہیں کہ میری رات کس طرح گزری ہو گی۔ دن بھر گھوڑے بیچ کر سوتا رہا تھا، اس لیے رات بھر خود بھی جاگا اور فضیلہ کو بھی جگایا۔ کٹیا میں بند ہو کر محبوس ہونے کے بجائے راج کنڈل کا کون سا حصہ تھا، جہاں ہم دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر نہ گئے ہوں اور اس حصے کو ہم نے اپنی محبت کا گواہ نہ بنایا ہو۔

اگلے روز معمول کے مطابق لوسی ناشتہ لے کر آئی۔ راج کنڈل کی آب و ہوا کا اثر تھا یا کوئی اور بات تھی، اُس کے حُسن میں روز بروز نکھار آتا جا رہا تھا۔ لڑکپن میں، میں نے ٹیک کیئر کلینک میں جس لوسی کو نرس کی حیثیت سے دیکھا تھا، یہ اس سے بہت مختلف تھی۔ اپنی عمر سے دس سال چھوٹی نظر آنے لگی تھی۔ اور یہ بھی شاید راج کنڈل ہی کی حیات بخش ہوا کا اثر تھا کہ جب بھی لوسی پر نظر پڑتی تھی، دل چاہتا تھا کہ فضیلہ سے بے وفائی کی جائے۔ میرے پاس محبت کا اتنا ذخیرہ تھا کہ فضیلہ تھوڑی معلوم ہونے لگی تھی۔

پہلے بتا چکا ہوں کہ راج کنڈل میں داخل ہونے کے بعد میری بھوک میں کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا۔ اس لئے جب لوسی ناشتے کا تھال لے کر آئی تو میں لوسی کی دلکشی اور فضیلہ کی رعنائی کو بھول بھال کر کھانے پر ٹوٹ پڑا۔

ناشتے کے دوران دونوں سرگوشیوں میں باتیں کرنے لگیں۔ لیکن سرگوشیاں ایسی تھیں کہ بار بار میرے کانوں کو ایک نام سنائی دے رہا تھا، ڈاکٹر۔ یعنی کوئی ڈاکٹر اُن کی گفتگو کا موضوع بنا ہوا تھا۔ اُن کے لہجے سے یہ بھی محسوس ہو رہا تھا، جیسے وہ اس نام والے شخص کی جانب سے کچھ سراسیمہ ہوں۔

لوسی کی عادت تھی کہ وہ ہمیشہ ادھورا ناشتہ لے کر آتی تھی۔ چائے ہمیشہ اُس وقت لاتی تھی، جب میں اور فضیلہ تھال کی پوریوں اور کچوریوں کو ختم کر چکے ہوتے۔

اس روز فضیلہ سے گفتگو ختم کرنے کے بعد جب وہ چائے لینے گئی تو فضیلہ میرے ساتھ ناشتے میں شریک ہوتے ہوئے بولی۔

"مسٹر کہہ رہی تھی کہ راج کنڈل میں پڑے پڑے دل اُکتا سا گیا ہے۔ کیوں نہ آج کے دن جزیرے سے باہر نکلا جائے۔"

"تمہارے ہوتے ہوئے ویرانے میں بہار آجاتی ہے۔ یہ تو پھر سر سبز و شاداب جگہ ہے۔" میں نے کہا۔ "دل اُکتانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن جزیرے سے باہر چلنے کا خیال اچھ

ہے۔ کہاں چلو گی؟"

"یہاں سے کچھ فاصلے پر ایک وادی ہے۔ آج کی دوپہر ہم لوگ وہیں ہومیو پیتھک کے ایک کلینک میں گزاریں گے۔"

"ہومیو پیتھک کے کلینک میں؟ اس سے تو بہتر ہے کہ تم اور لوسی ہو آؤ۔ مجھے یہیں تنہا چھوڑ دو۔ شہر چلتیں، تاریخی اور تفریحی مقامات پر جاتیں تو کچھ اور بات تھی۔"

"مصیبت تو یہ ہے کہ آپ کو تنہا نہیں چھوڑا جا سکتا۔" فضیلہ نے کہا۔ "آپ نے شاید اس حقیقت کو فراموش کر دیا ہے کہ ہمارا قیام اُن لوگوں کے درمیان ہے جو ویشیا بھگت کے دشمن ہیں۔ وہ آپ کو نقصان پہنچا سکتے ہیں۔"

میں نے اپنے گلے میں پڑی سونے کی ڈبیا پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "اس جنتر کے ہوتے ہوئے کوئی بھی مائی کا لال مجھے نقصان نہیں پہنچا سکتا۔"

"ہاں...... یہ بات تو درست ہے۔ لیکن آپ یہاں کے پجاریوں سے واقف نہیں ہیں۔ وہ چکنی چپڑی باتوں سے آپ کو گلے سے جنتر اُتارنے پر مجبور کر دیں گے۔ اور جونہی آپ نے جنتر اُتارا، دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت بھی آپ کو پجاریوں کے حملے سے نہیں بچا سکتی۔"

لگ بھگ دس بجے میں نے اشنان کیا۔

یہاں پر میں نے جان بوجھ کر غسل کی جگہ اشنان کا ذکر کیا ہے۔ کیونکہ غسل اور اشنان میں تھوڑا سا فرق ہے۔ سر سے پاؤں تک پانی بہا لینے کو، چاہے جسم کا کچھ حصہ خشک ہی کیوں نہ رہ جائے حد یہ کہ اگر دانتوں میں کوئی چیز پھنسی رہ جائے تو اسے بھی نہ نکالا جائے۔ اور کم از کم تین مرتبہ اس طرح غرارہ کیا جائے کہ حلق کا آخری حصہ تک دُھل جائے۔ فضیلہ کہتی تھی کہ پاکی اور ناپاکی دل کی ہوتی ہے، جسم کی نہیں ہوتی۔ اُس کے کہنے کے مطابق ناک میں پانی ڈالنا اور کلی کرنا اشنان کے لیے بالکل غیر ضروری تھا۔ اس کے علاوہ ایک خطرہ یہ بھی تھا کہ اگر میں نے اشنان کے بجائے غسل کر لیا تو گلے میں پڑے ہوئے جنتر کا اثر کم ہو جائے گا۔

لوسی نے ایک چھوٹی سی لانچ کا انتظام کیا تھا۔ اشنان سے فارغ ہو کر ہم تینوں لانچ کے ذریعے ساحل پر پہنچے۔ سڑک تک جانے کے لیے اُس ڈھلوان حصے پر چڑھے جس پر اتنی ریت تھی کہ پاؤں ٹخنوں تک اس میں دھنس جاتے تھے۔ سڑک پر جا کر وادی جانے کے لیے کرایہ پر تانگہ لیا اور روانہ ہو گئے۔ سیمنٹ فیکٹری تک پختہ سڑک تھی، اس سے آگے چند میل کے بعد کچی سڑک شروع ہو جاتی تھی، لیکن وہ بالکل ہی کچی نہیں تھی، کسی زمانے میں وہاں کنکر ڈال کر کوٹے جاتے تھے۔ لیکن اس پر تارکول نہیں ڈالی گئی تھی۔ سڑک پر جگہ جگہ گڑھے پڑے ہوئے تھے۔ ہومیو پیتھک کے کلینک تک پہنچتے پہنچتے بارہ بج گئے۔

ہم تینوں کلینک میں داخل ہوئے تو باریش ڈاکٹر، مریضوں کو دیکھنے کے بجائے ایک مریض کے ہاتھوں کو پکڑ کر اس کے جسم اور چہرے پر زوردار تھپڑ لگا رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ پوچھتے جا رہے تھے۔ "دوبارہ آؤ گے؟"

"نہیں......" مریض رو رو کر کہہ رہا تھا۔ "اب کبھی نہیں آؤں گا۔"

"جھوٹ بولتے ہو تم۔ تم نے پہلے بھی وعدہ کیا تھا۔" ڈاکٹر صاحب نے مریض کے منہ پر اتنی زور سے گھونسا رسید کیا کہ اُس کی باچھوں سے خون ٹپک پڑا۔ "تم جھوٹے، مکار اور فریبی ہو۔"

"نہیں سائیں! میں سچا وعدہ کرتا ہوں۔"

ڈاکٹر نے اُس کے منہ پر اُلٹا ہاتھ رسید کیا۔ "اب بھی فریب دینے سے باز نہیں آیا؟"

"اب تو قسم بھی کھالی...... اب تو رحم کرو۔"

"نامکمل قسم کھائی ہے۔ قسم کھا کر کہو کہ اب کبھی نہیں آؤ گے۔"

"جمعرات، جمعرات کو آنے کی اجازت دے دو۔"

"ہرگز نہیں۔"

"اچھا، مہینے میں ایک بار۔"

"نہیں۔"

"سال کے سال۔"

"لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔" ڈاکٹر وحشیوں کی طرح اُس پر ٹوٹ پڑا۔ "رمضان! ذرا وہ بوتل تو دینا۔ اگر میں نے اسے بوتل میں بند کر کے کسی اندھے کنوئیں میں دفن نہیں کیا تو میرا نام قاسم جیلانی نہیں۔"

"نہیں، نہیں۔" مریض ہاتھ جوڑ کر بولا۔

"میں قسم کھاتا ہوں، سلیمان علیہ السلام کی..... قسم کھاتا ہوں، اب دوبارہ کبھی نہیں آؤں گا۔"

"تین بار قسم کھاؤ۔"

مریض نے تین بار قسم کھا کر نہ آنے کا وعدہ کیا۔ ڈاکٹر ہانپتا ہوا کرسی پر جا بیٹھا۔

اچانک مریض فرش پر گر گیا۔

"پانی چھڑک کر اسے ہوش میں لاؤ۔" ڈاکٹر نے مطب میں کھڑے ہوئے لوگوں سے کہا۔

"آج ہمیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس بدمعاش جن سے نجات مل گئی ہے۔ ان شاءاللہ! اب یہ کسی کو تنگ نہیں کرے گا۔"

مریض پر پانی چھڑکا گیا۔ کچھ دیر بعد اس نے آنکھیں کھول دیں۔ پہلے اپنے بھیگے ہوئے جسم کو دیکھا اور پھر مطب کا جائزہ لیا، پھر ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔

"ارے، میں یہاں کیسے آیا؟"

اُس کے ساتھی ہنسنے لگے۔

"ڈاکٹر صاحب کو سلام کرو، عاشر! اور ان کے پاؤں چھوؤ اور گھر چلو۔"

دوسرا بولا۔ "ڈاکٹر صاحب کی مہربانی سے تمہیں نئی زندگی ملی ہے۔"

پھر ڈاکٹر، فضیلہ کی طرف متوجہ ہوا۔ "ہاں جی، آپ کون؟"

"میں......میں......"

"م گر مگر چھوڑو، بی بی! اصل بات بتاؤ، یہاں کیوں آئی ہو؟"

"آپ کے پاس لوگ کیوں آتے ہیں؟"

"میں ہومیو پیتھک کا ڈاکٹر ہوں۔ اکثر لوگ جاڑے، نزلہ زکام کا علاج کرانے آتے ہیں۔"

"اس کے علاوہ جن اُتروانے بھی تو آتے ہیں۔"

"جن اُتروانے کا کیا معاوضہ لیتے ہیں؟"

"یہ کام تو بالکل مفت، اللہ کے واسطے کرتا ہوں۔"

"کسی پر جن چڑھانا ہو، تو کیا وہ بالکل مفت چڑھا دیتے ہیں؟"

"نعوذ باللہ!" ڈاکٹر نے کہا۔ "تم کون ہو؟ آخر تم چاہتی کیا ہو؟"

فضیلہ چند لمحوں تک ڈاکٹر کا چہرہ دیکھتی رہی، پھر میری طرف اشارہ کر کے بولی۔

"یہ میرے شوہر ہیں۔ میرے مجازی خدا ہیں۔ اور ان کا نام سکندر ہے"

ڈاکٹر نے کہا۔ "ٹھیک ہے، آگے بتایئے۔"

"ماں کے پیٹ سے آتے ہی ان پر ایک روح سوار ہو گئی۔" فضیلہ نے کہا۔ "وہ دن ہے اور آج کا دن ہے، ابھی تک اس نے ان کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ آپ کے پاؤں پکڑتی ہوں، انہیں اس روح سے نجات دلا دیجیے۔"

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ ایکا ایکی کیا ہونے لگا ہے۔ حیرت سے فضیلہ اور لوسی کے چہروں کو تکنے لگا۔ کیا انہیں واقعی میرا علاج مقصود تھا؟ اور کیا جنتر پہننے اور مرگھٹ کی ہڈیاں چبانے کے باوجود مجھے ترشولی سے چھٹکارا حاصل نہیں ہوا تھا؟

اچانک ڈاکٹر نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے اپنی طرف کھینچتا ہوا بولا۔ "روح کے بچے! مخلوق خدا کس کو کہتے ہیں؟ بہروپ میں دھوکا دے گا؟" اور اس سے پہلے کہ میں خود کو سنبھالتا، اس کا گھونسا میرے پیٹ پر پڑا۔ میری آنکھوں کے سامنے رنگ برنگے ستارے ناچنے لگے۔

ظالم کی گرفت اتنی سخت تھی کہ میں بالکل بے بس سا ہو کر رہ گیا۔ حالانکہ جنتر کی بدولت مجھ میں درجنوں غنڈوں بدمعاشوں کی شکتی تھی، مگر ڈاکٹر کی طاقت کے سامنے سب دھری کی دھری رہ گئی تھی۔ وہ میرے ہاتھ مروڑتا ہوا پیٹھ کے پیچھے لے گیا۔ ہر ممکن صبر و ضبط کے باوجود میرے منہ سے چیخیں نکلنی شروع ہو گئیں، کنپٹیوں کی رگیں اُبھر آئیں اور دماغ میں شدید قسم کی ٹیسیں اُٹھنے لگیں۔

فضیلہ اور لوسی مجھ سے الگ تھلگ خاموش بیٹھی تھیں اور میری درگت بنتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔ ڈاکٹر نے یکے بعد دیگرے میرے دونوں کان پکڑے اور ان پر پھونک ماری۔ مجھے ایسا محسوس ہوا، جیسے کسی لق و دق صحرا میں پہنچ گیا ہوں، جہاں تیز ہواؤں کے جھکڑ چل رہے ہوں۔ ڈاکٹر نے زور سے ہنکارا بھر کر پھر کچھ پڑھا اور میرے کانوں میں پھونکا۔ ہواؤں کے جھکڑ طوفان کی صورت اختیار کر گئے اور مجھے صحرا کی تپتی دھوپ اور ریت میں اپنا توازن برقرار رکھنا مشکل ہو گیا۔

چند ثانیوں کے ناقابل برداشت انتظار کے بعد ڈاکٹر نے میرے بازو کو مزید مروڑا اور گردن کے نیچے ایک بھرپور مکا رسید کیا اور میں درد اور تکلیف سے بلبلا کر دوہرا ہو گیا۔ تیسری بار اُس نے کچھ پڑھ کر کانوں پہ پھر پھونک ماری۔ یوں محسوس ہوا، جیسے ہواؤں کے تھپیڑوں نے مجھے ایک سوکھے پتے کی طرح زمین سے اُٹھا لیا ہو۔ اور روشنیوں کی تیز آوازوں کے ساتھ قلابازیاں کھاتے ہوئے خلاء کی جانب لیے جا رہے ہوں۔

میں فضا میں کئی منٹ تک کسی فٹ بال کی طرح قلابازیاں کھاتا رہا۔ اچانک ڈاکٹر نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا اور میں اگلے ہی لمحے ایک کٹے ہوئے درخت کی مانند زوردار آواز کے ساتھ منہ کے بل کلینک کے فرش پر جا گرا۔

حلق میں تازہ تازہ خون اُترتا محسوس ہونے لگا۔ جیسے تیسے فرش سے سر اُٹھایا۔ میرے کئی دانت ہل گئے تھے اور ان سے خون رس رہا تھا۔ ڈاکٹر اپنی کرسی پر جا بیٹھا تھا۔ فضیلہ اور لوسی کو اسی طرح گھور رہا تھا، جیسے انہیں کچا چبا جائے گا۔ وہ دونوں مجوب سی نظر آ رہی تھیں۔

"بیبیو!" ڈاکٹر نے کہا۔ "کسی کا امتحان نہیں لینا چاہئے۔ تمہیں نہیں معلوم کہ جنات کو بلانے کے لیے کتنی مشقت جھیلنا پڑتی ہے۔ خون پانی ہو جاتا ہے۔"

"ہم امتحان لینے نہیں آئی ہیں۔" لوسی بولی۔

فضیلہ نے کہا۔

"میں تو اس اُمید سے آئی تھی کہ آپ اپنی جھاڑ پھونک سے میرے شوہر کو اس مرض سے چھٹکارا دلا دیں گے، جو انہیں شیر خوارگی کے زمانے سے لاحق ہے۔ مگر آپ کے لہجے سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یا تو ان کا مرض لاعلاج ہے، یا آپ ان کا علاج کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔"

"تمہارے شوہر کو کوئی بیماری نہیں ہے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"ممکن ہے، انہیں وہم اور مراق کی بیماری ہو۔"

"نہیں ڈاکٹر! وہم اور مراق کی بدصورت شکل نہیں ہوتی۔ دراصل یہ ایک ایسی عورت کو دیکھتے ہیں، جو بہت بدصورت اور خوف ناک ہے۔ جس نے ان کا دلی سکون چھین لیا ہے۔"

"بچپن میں ہلکا خون ہونے کے باعث بچوں کو ایسی بہت سی شکلیں نظر آ جاتی ہیں، جن کو ہم عام لوگ نہیں دیکھ سکتے۔ میں نے تمہارے شوہر کا اچھی طرح معائنہ کیا ہے۔ عالم بالا کی ساتوں اقلیموں میں ہو آیا ہوں۔ بار بار آوازیں دی ہیں۔ ساتوں جہانوں میں کوئی ایسا گوشہ نہیں بچا، جہاں میری آواز نہ گئی ہو۔ اگر تمہارے شوہر پر کوئی مرد جن سوار ہوتا یا کوئی عورت جن انہیں تنگ کر رہی ہوتی، تو اس وقت وہ یہاں پابۂ زنجیر موجود ہوتی۔"

"آپ نے جنوں کو آوازیں دے کر خواہ مخواہ اپنے آپ کو زحمت دی۔" فضیلہ نے کہا۔ "ان پر جن نہیں، روح سوار ہے۔"

میں سنبھل چکا تھا، لیکن فرش سے اُٹھنے کی جرأت نہیں تھی۔ سکون سے بیٹھا اُن تینوں کے درمیان ہونے والی گفتگو سن رہا تھا۔

"آپ سخت قسم کی غلط فہمی کا شکار ہیں، بی بی!" ڈاکٹر نے جواب دیا۔ "الحمدللہ! ہم مسلمان ہیں اور ہمارا عقیدہ ہے کہ روحیں........"

"اپنا عقیدہ اپنے پاس رکھیے۔" فضیلہ نے بگڑ کر کہا۔ "صاف صاف کیوں نہیں کہہ دیتے، میرے شوہر کا علاج آپ کے اختیار سے باہر ہے؟"

"علاج مریض کا کیا جاتا ہے۔ اچھے بھلے لوگوں کا نہیں۔ آپ کے شوہر نامدار اگر واقعی ہیں تو ان کے مرض کا نام وہم ہے۔ اور آپ نے یہ مقولہ ضرور سنا ہوگا کہ وہم کا علاج تو حکیم لقمان کے پاس بھی نہیں تھا۔"

"آئیے واپس چلیں۔" فضیلہ نے مجھے مخاطب کر کے کہا۔ "ڈاکٹر صاحب کے پاس کتنی آس لے کر آئے تھے، انہوں نے ہمیں مایوس کر دیا۔"

"ایک چھوٹی سی کہانی سنتی جاؤ، بی بی!" ڈاکٹر بولا۔ "کتابوں میں لکھا ہے کہ ایک زمانہ ایسا بھی گزرا ہے، جب یونان کے باشندے دنیاوی اور روحانی علوم سے اس قدر مالا مال تھے کہ فرشتوں تک کو ان کے کمال پر حیرت ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے بہ اذن الٰہی کہ ان کی عقل و دانش کو آزمانا چاہئے، وہ یونان کے کسی خطے میں اُترے۔ دس گیارہ سال کا ایک لڑکا کمر پر بستہ لٹکائے مدرسے جا رہا تھا۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے اُسے روک کر پوچھا۔

"میاں صاحبزادے! یہ تو بتلاؤ کہ اس وقت جبرائیل امین کہاں ہیں؟"

لڑکے نے آنکھیں بند کیں، چند لمحوں تک خاموش، بے حس و حرکت کھڑا رہا، پھر اچانک آنکھیں کھول کر بولا۔ "سارے آسمانوں پر دیکھ آیا ہوں، حضرت جبرائیل علیہ السلام ایک آسمان پر بھی نہیں ہیں۔"

"آسمان پر نہیں ہیں تو پھر کہاں ہیں؟"

لڑکے نے دوبارہ آنکھیں بند کر کے مراقبہ کیا، پھر بولا۔ "ساری زمینوں پر تلاش کر لیا۔ لیکن حضرت جبرائیل کہیں نظر نہ آئے۔"

"نہ آسمانوں میں ہیں، نہ زمینوں میں۔ پھر کہاں جا سکتے ہیں؟"

"سنو اجنبی!" لڑکے نے مسکرا کر کہا۔ "آسمانوں اور زمینوں کی ساری مخلوق کا مشاہدہ کرنے کے بعد میں یہ پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ہم دونوں میں سے کوئی ایک حضرت جبرائیل ہے۔"

لوسی نے ناک بھوں چڑھا کر کہا۔ "اس کہانی کا کیا مطلب ہوا؟"

"مطلب تو آپ بھی سمجھ گئی ہوں گی اور آپ کے ساتھ والی بی بی بھی۔ مزید وضاحت کیے دیتا ہوں کہ اگر ان صاحب کو وہم کی بیماری نہیں ہے تو ہم تینوں میں سے کسی نے انہیں تنگ کر رکھا ہے........ نور دین!" ڈاکٹر نے دروازے کی طرف منہ کر کے آواز دی۔ "پیاز کی ایک اچھی سی گٹھی چھیل کر لانا۔ ابھی دودھ کا دودھ، پانی کا پانی ہو جاتا ہے۔"

"ابھی لایا، ڈاکٹر صاحب!" باہر سے آواز آئی۔

فضیلہ مسکراتی ہوئی اُٹھی اور ڈاکٹر کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ لوسی نے جلدی سے دروازہ بند کر دیا۔

"جتنی آپ کی تعریف سنی تھی۔" فضیلہ نے کہا۔ "اس سے کہیں زیادہ پایا۔ آپ نے اپنے

گرد حصار کھینچا ہوا ہے، اس لیے میں آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکوں گی۔ مجھے آپ کا امتحان ہی مقصود نہیں تھا، بلکہ ایک سودا بھی کرنا تھا۔"

"کیسا سودا؟"

"ہم سے مل جائیے۔ اور دنیا میں ویشیا راج قائم کرنے کی کوشش کیجیے۔"

"ویشیا راج؟......استغفر اللہ! اب معلوم ہوا کہ تم کس شیطان کی ذریّت ہو۔"

"ٹھیک ہے۔ ہم سے نہ ملئے، لیکن اپنی حرکتوں سے باز آ جائیے۔ آپ کو روزانہ تکیے کے نیچے سے ایک ہزار کا نوٹ ملتا رہے گا۔"

"میں بکاؤ مال نہیں ہوں۔ مرتے دم تک خلقِ خدا کی خدمت کرتا رہوں گا۔"

"ایسی صورت میں اپنی نسل ختم کرانے کے لیے تیار ہو جائیے۔" فضیلہ نے آنکھیں نکال کر کہا۔ "اگر آپ ہم سے نہیں ملے یا اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے تو آپ کو، آپ کی اولاد کو اور اولاد کی اولاد کو ایک ایک کر کے ختم کر دیا جائے گا۔ آپ کس کس کے گرد حصار کھینچیں گے اور کب تک کھینچیں گے؟"

ڈاکٹر کی ساری اکڑفوں ختم ہو گئی، چہرہ اتر گیا، آنکھوں سے خوف چھلکنے لگا۔

"بی بی!" اُس نے لجاجت آمیز لہجے میں کہا۔ "مجھے کچھ سوچنے کی مہلت دو۔"

"ایک شرط پر مہلت مل سکتی ہے۔" فضیلہ بولی۔ "ہمارے درمیان جو گفتگو ہوئی ہے، اس کا ذکر کسی سے نہیں کریں گے۔ نہ اپنے شیخ سے، نہ اپنی بیوی سے، نہ کسی اور سے۔"

ڈاکٹر نے بے چارگی سے سر ہلایا۔ "نہیں کروں گا۔"

باہر سے آواز آئی۔ "پیاز لے آیا ہوں، ڈاکٹر صاحب! دروازہ کھولیے۔"

"پیاز، رمضان خان کو دے دو۔" ڈاکٹر نے باآواز بلند کہا۔

"کسے دے آؤں؟......رمضان خان کو؟"

"ہاں، ہاں......رمضان خان کو۔" ڈاکٹر بولا۔ "اُس سے کہنا، شہر جائے تو پیاز کو جیب میں رکھ کر جائے۔ اس بلا سے محفوظ رہے گا، جسے لوگ لُو کہتے ہیں۔"

"لُو تو ایک قسم کی گرم ہوا ہوتی ہے، ڈاکٹر صاحب!" آواز آئی۔

"تم مجھ سے زیادہ جانتے ہو؟ جو کہا گیا ہے، اُس پر عمل کرو۔" ڈاکٹر نے کہا۔ پھر لوسی سے مخاطب ہوا۔ "مجھے کب تک کی مہلت دی گئی ہے؟"

"میں کیا جانوں؟" لوسی سوکھے منہ سے بولی۔ "میری اور سکندر کی حیثیت ایک جیسی ہے۔"

فضیلہ نے کہا۔ "آپ کو منگل وار تک مہلت دی جاتی ہے۔ منگل وار کو اس جزیرے میں جسے راج کنڈل کہا جاتا ہے، ہم سے آ کر ملیے۔ اگر منگل وار کی شام وہاں نہیں پہنچے تو ہم یہ

میں حق بجانب ہوں گے کہ آپ ہم سے جنگ کرنے پر آمادہ ہیں اور آپ کو اپنی اولاد اور اولاد کی اولاد سے محبت اور لگاؤ نہیں ہے۔ جانتے ہیں، راج کنڈل کہاں واقع ہے؟"

"اس علاقے کا ایسا کون سا شخص ہے، جو راج کنڈل سے واقف نہ ہو؟"

"دروازہ کھولو، سسٹر!" فضیلہ نے کہا۔

ہم تینوں ڈاکٹر کو حیران و پریشان چھوڑ کر مختصر سے کلینک سے باہر نکلے، تانگے پر سوار ہوئے اور اسی راستے پر چل پڑے، جس سے آئے تھے۔

فضیلہ نے میرے سینے پر سر رکھ لیا اور ہلکی سی گنگناہٹ کے ساتھ بولی۔

"بے وقوف ڈاکٹر سمجھ رہا تھا کہ دنیا میں صرف جنّ ہی پائے جاتے ہیں، ایسی روحوں کا کوئی وجود ہی نہیں، جو مُردہ جسموں کے اندر داخل ہو سکتی ہوں۔ حالانکہ سب سے بڑی مثال تو میری اپنی ہے۔ اگر میں فضیلہ کے جسم میں نہ آتی تو فضیلہ تو کب کی مرکھپ گئی ہوتی۔"

"جذبات کو مجروح نہ کرو۔" میں نے پُر درد لہجے میں کہا۔ "بھول جانا چاہتا ہوں کہ ایک زندہ لاش سے محبت کر رہا ہوں۔ لیکن جب بھی موقع ملتا ہے، تم مجھے یاد دہانی کرا کے میری زندگی میں کڑواہٹ گھول دیتی ہو۔ آئندہ کبھی مت کہنا کہ فضیلہ مر چکی ہے۔"

"مجھے غلط مت سمجھئے۔ میں تو صرف یہ کہنا چاہتی تھی کہ روحوں کا وجود ہے۔ انسان مر جاتا ہے۔ جسم کی دیکھ بھال نہ کی جائے یا کوئی دوسری روح اسے حاصل نہ کر سکے تو وہ مٹی میں مل کر مٹی ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر اپنی کم علمی، ناسمجھی اور تعصب کے باعث اس ناقابلِ تردید حقیقت سے بے بہرہ ہے۔ حالانکہ ہر کم و بیش دوسرے تیسرے ہفتے اس کا سابقہ ان روحوں سے پڑتا رہتا ہے جنہیں وہ جن سمجھ کر اپنے عمل سے اتارتا ہے۔ اگر وہ ہم سے آ ملا تو اسے بھی بینائی مل جائے گی۔ ورنہ اندھیرا اس کا مقدر بن چکا ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ وہ شخص جو خود کو ڈاکٹر کہتا ہے، انتہائی چالاک انسان ہے۔ اور جن اتارنے کا بہانہ بنا کر لوگوں کو دھوکا دے رہا ہے۔"

"آپ کا خیال درست نہیں ہے۔" فضیلہ نے کہا۔ "وہ اپنے فن کا ماہر ہے۔ البتہ تھوڑا سا بے وقوف ہے۔ جنوں اور روحوں میں کوئی امتیاز نہیں کر سکتا۔ سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکتا ہے۔"

⊛

"بھلا ہو ڈاکٹر کا، اُس کے کلینک میں جا کر کم سے کم یہ تو معلوم ہو گیا کہ جسم پر جو قابض ہو، چوٹ بھی اسی کو لگتی ہے۔ رہی یہاں کے مقامی لوگوں کی بات، کوئی شک نہیں کہ عورتوں کا بے حد احترام کرتے ہیں، لیکن جھوٹی، فریبی اور دغا باز بیویوں کو کسی طرح بھی برداشت نہیں کرتے۔ انہیں مطمئن کرنے کے لیے اتنا کہنا کافی ہو گا کہ تم میری بیوی ہو اور مجھ سے بے وفائی کی مرتکب

ہوتی رہی ہو۔ سارے لوگ کائی کی طرح چھٹ جائیں گے۔ ان کی ہمدردیاں مجھ سے وابستہ ہو جائیں گی۔ اور بہت ممکن ہے، کوئی شریف آدمی مجھے اچھی سی کلہاڑی بھی پیش کر دے، کہ لو سائیں! اپنی بے حیا بیوی پر اسے آزماؤ۔ مگر میں تمہیں قتل نہیں کروں گا، ایک ایک عضو کو قطع کر کے تڑپاؤں گا۔ ہاتھ جوڑ جوڑ کر معافی مانگو گی اور موت کے بجائے چاقو کے کچوکے نصیب ہوں گے۔ کیونکہ جانتا ہوں، تمہاری موت تمہاری زندگی ہے، مرتے ہی تم آزاد ہو جاؤ گی اور آزاد ہوتے ہی کسی بدنصیب لڑکی کے متناسب جسم کی تلاش میں ہواؤں اور فضاؤں میں منڈلانا شروع کر دو گی۔"

لوسی کی پیشانی عرق آلود ہو گئی۔

"تمہارا خیال اس حد تک درست ہے کہ میں لوسی نہیں ہوں۔" اُس نے دھیمی آواز میں کہا۔ "وضاحت بعد میں کروں گی، پہلے تمہارے سوالوں کا جواب دوں گی۔ پوچھو، کیا پوچھنا چاہتے ہو؟"

"رخسانہ اور فضیلہ کے بازوؤں کو تم نے قطع کیا ہے؟"

"نہیں۔" وہ بولی۔ "آنکھیں مت نکالو، حقیقت بیانی سے کام لے رہی ہوں۔ اور فیصلہ کر چکی ہوں کہ کچھ بھی نہیں چھپاؤں گی۔ میں خود کئی دنوں سے موقع کی تلاش میں تھی۔ اور چاہتی تھی کہ تم سے کھل کر گفتگو کروں۔"

"رانی کے روپ میں تم ہی تھیں؟"

"ہرگز نہیں۔"

"تمہیں علم ہے کہ فضیلہ کی قاتل کون ہے؟"

"فضیلہ کی قاتل، ترشولی ہے۔"

"کون ترشولی؟"

"کون سے تمہاری کیا مراد ہے؟ کیا تمہیں یہ باور کرا دیا گیا ہے کہ کئی روحیں ہیں، جو تمہارے پیچھے پڑی ہیں؟"

اس کے اس سوال پر مجھے تھوڑی سی حیرت ہوئی، لیکن میں نے چہرے یا لہجے سے اس کا اظہار نہیں ہونے دیا اور بات بدل کر پوچھا۔ "تم کون ہو؟"

"کہہ چکی ہوں کہ اس کی وضاحت بعد میں کروں گی۔ کیا تمہارے سوالات ختم ہو گئے؟"

"رانی کے جسم پر کس کا قبضہ تھا؟"

"مجھ سے زیادہ بہتر طور پر تم جانتے ہو کہ اس جسم پر ترشولی نام کی بدروح قابض ہے۔"

"مگر وہ، جو فضیلہ کے جسم کو تمام تر کافر سامانیوں کے ساتھ اپنائے ہوئے ہے، کہتی ہے کہ ترشولی ہے۔"

"اس جھوٹی نے پہلی بار سچ بولا ہے۔ وہ ترشولی ہی ہے۔"

"اور تم کہتی ہو کہ ترشولی کی دو یا دو سے زیادہ روحیں نہیں ہیں۔"

"میرا مطالعہ، تجربہ اور مشاہدہ تو یہی ہے۔ اور اسی کی بناء پر پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ یہ بتا کر کہ یہ اس نام کی دو یا دو سے زیادہ روحیں ہیں، تمہیں فریب دینے کی کوشش کی گئی ہے۔"

"گویا ترشولی تو صرف ایک ہی ہے؟"

"ہاں......ترشولی تو صرف ایک ہی ہے۔"

"میں جانتا تھا۔" میں نے بگڑ کر کہا۔ "سوالات دریافت کرنے سے پہلے ہی سمجھ گیا تھا کہ تم مجھے چکمہ دینے کی کوشش کرو گی۔ کسی نے سچ کہا ہے، جھوٹ وہ ہے جو سر چڑھ کر بولے۔ رانی اور فضیلہ ایک دوسرے کی ہم عصر ہیں۔ ایک ہی ترشولی بیک وقت دو جسموں پر قابض نہیں ہو سکتی کہ ایک طرف فضیلہ بن کر مجھ سے ملے اور دوسری طرف رانی بن کر بھائی جان کے ساتھ گلچھرے اڑائے۔ اتنی جلدی بھول گئیں کہ میری شادی کے دن رانی خاص طور پر فضیلہ سے ملنے آئی تھی۔ اور اُس کے پاس جا کر اُسے گلے سے لگا لیا تھا۔ دو جسموں میں دو مختلف روحیں تو ہو سکتی ہیں، ایک روح کبھی نہیں ہو سکتی۔"

"رانی کے جسم کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑنے سے قبل وہ اسی لیے فضیلہ سے ملنے آئی تھی کہ تمہیں دو یا دو سے زیادہ ترشولی ہونے کے فریب میں مبتلا کر سکے۔"

"اس فریب میں تو وہ اُس وقت مبتلا کرتی جب مجھے علم ہوتا کہ فضیلہ مر چکی ہے اور اس کا جسم کسی اور کے قبضے میں ہے۔"

"پیش بندی اسی کو کہتے ہیں۔ اسے معلوم تھا کہ راج کنڈل پہنچ کر تمہیں اصل بات کا پتہ چل جائے گا۔ پس اس جنم جنم کی مکار نے دھوکا دینے کی پہلے ہی تیاری کر لی تھی۔"

میں کچھ نرم پڑنے لگا۔ ذہن میں متعدد سوالات اُبھر آئے۔ مجھے لگا تار دھوکوں پر دھوکے دیئے جا رہے تھے۔ اندھیروں سے نکلنے کے لیے میں نے خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔ لیکن روشنی نظر آنے کے بجائے اندھیرے بڑھتے ہی چلے گئے تھے۔ یہ معمہ کہ اگر ترشولی ایک ہی روح تھی، تو وہ دو جسموں میں کس طرح پہنچ گئی؟ اور ایک ہی وقت میں کس طرح دونوں کو زندہ رکھے ہوئے تھی؟ حل ہونے کے بجائے، مزید پیچیدہ اور گنجلک ہو گیا تھا۔ ایک بات بہرکیف یقینی تھی، لوسی اور فضیلہ دونوں میں سے ایک ضرور جھوٹی تھی۔

"تم سمجھتی ہو کہ جھوٹ بول کر مجھ سے جان چھڑانے میں کامیاب ہو جاؤ گی؟" میں نے مصنوعی غصے کے ساتھ کہا۔

"میں جھوٹ بول رہی ہوں تو تم خود بتا دو کہ سچ کیا ہے؟"

سچ کیا تھا؟ کیا رانی کے روپ میں دیگر افراد کی طرح اُس نے بھائی جان کو بھی اپنا دیوانہ بنا لیا تھا؟ لیکن یہ ناممکن تھا۔ کیونکہ رانی، لوسی اور فضیلہ، تینوں ایک ہی دور میں پائی جاتی تھیں۔ گویا روحوں کی ایک مثلث تھی، جس کا کوئی زاویہ بھی درست نہیں تھا۔ یا کم از کم ناقابلِ فہم تھا۔

میں نے کہا۔ ”میں ابھی تک جھوٹ اور سچ کو الگ الگ نہیں کر سکا ہوں۔ بہتر ہوگا کہ تم اپنا تعارف بھی کرادو۔ تاکہ مجھے کسی نتیجے تک پہنچنے میں آسانی ہو جائے۔“

”تمہارے سوالات ختم ہو گئے؟“

”فی الحال تو ختم ہی سمجھو۔ تاہم کچھ سوالات ایسے ہو سکتے ہیں، جو تمہارے تعارف کے بعد دریافت کیے جائیں۔“

”میں لوسی نہیں ہوں۔“ اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”لوسی کی جڑواں بہن نینسی ہوں۔“

”لوسی کی کوئی جڑواں بہن نہیں تھی۔ ہوتی تو وہ مجھ سے اس کا ذکر ضرور کرتی۔“

”اگر اس نے تم سے اس کا ذکر نہیں کیا تو اس کی ذمہ داری مجھ پر عائد نہیں ہوتی۔ میں جو کچھ بتا رہی ہوں، وہ حقیقت پر مبنی ہے۔ پیدائش و اموات کا ریکارڈ اس بات کا گواہ ہے کہ ہم دو بہنیں ایک ہی دن پانچ پانچ منٹ کے وقفے کے بعد پیدا ہوئی تھیں۔ جب چاہو وہاں سے میرے بیان کی تصدیق کر سکتے ہو۔“

”جب تک تصدیق نہیں کر لوں گا، اس وقت تک اعتبار نہیں کروں گا۔“ میں نے کہا۔ ”آگے بتاؤ، تم کہاں تھیں؟ اور اچانک کس نے تمہیں لوسی بنا دیا؟“

”میں نے اور لوسی نے ایک ساتھ نرسنگ کا کورس کیا تھا۔ انہی دنوں اخبار میں اشتہار چھپا۔ میں نے درخواست دی اور مجھے منتخب کر لیا گیا۔ لوسی نے درخواست نہیں دی۔ اُس نے کہا، ڈیڈی کے پاس بھی تو کوئی ہونا چاہیے۔ میں بیرونِ ملک چلی گئی۔ اسی اثناء میں ڈیڈی کا ایک حادثے میں انتقال ہو گیا اور اس کے کچھ ہی دنوں بعد لوسی نے جان نامی ایک لڑکے سے شادی کر لی اور دوسرے شہر منتقل ہو گئی۔ میں نے جان کی تصویر تو دیکھی تھی لیکن کبھی آمنے سامنے نہیں دیکھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں اُسے پہچان نہیں سکی۔ لیکن لوسی سے بہت زیادہ مشابہت ہونے کے سبب، جب جان کی نظر مجھ پر پڑی تو وہ مجھے لوسی سمجھ کر حیرت زدہ ہو گیا۔ کیونکہ لوسی کو تو اس نے خود اپنے ہاتھوں سے قبر میں اتارا تھا۔

”کیا لوسی نے جان کو نہیں بتایا تھا کہ بیرونِ ملک اُس کی ایک جڑواں بہن موجود ہے؟“

”یقیناً بتایا ہوگا۔ لیکن مجھے دیکھ کر اُسے لوسی یاد آ گئی۔ اس کے علاوہ اُسے کچھ یاد نہیں رہا۔“

وہ بولی۔ ”میں سمجھتی تھی کہ کچھ دیر سکون سے بیٹھے گا تو ذہن کی دُھند اُتر جائے گی اور وہ سمجھ جائے گا کہ جسے اس نے لوسی سمجھا تھا، وہ دراصل لوسی کی جڑواں بہن نینسی ہے۔“

”میرے سوال کا دوسرا حصہ ابھی تک تشنہ جواب ہے۔ تم بیرونِ ملک سے اپنے وطن کب آئیں؟ کیوں آئیں؟ اور لوسی کس طرح بن گئیں؟“

”میرا وطن آنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ کم و بیش چھ ماہ قبل اس نے مجھے لکھا کہ اس کی زندگی کو خطرہ لاحق ہے اور کسی بھی وقت اسے موت کے گھاٹ اتارا جا سکتا ہے۔“

”اس کا جان سے جھگڑا ہو گیا تھا؟“

”نہیں، اُن دونوں کا کبھی جھگڑا نہیں ہوا۔ اُن کا جوڑ مثالی تھا۔ لوگ تعجب کیا کرتے تھے کہ کیسے میاں بیوی ہیں۔ شادی کو اتنے دن ہو گئے، لیکن ابھی تک لیلیٰ مجنوں بنے عشق و عاشقی کیے جا رہے ہیں۔ اسے اصل خطرہ ترشولی سے تھا۔“

”تم ترشولی کو پہلے سے جانتی تھیں یا تمہیں لوسی کے خط کے ذریعے اس کے بارے میں معلوم ہوا؟“

”ہم بچپن ہی سے ترشولی کا نام ڈیڈی کے منہ سے سنتی چلی آ رہی تھیں۔ کبھی کبھی موڈ میں آ کر وہ ہم سے کہا کرتے تھے، کہ جس روز بھی ترشولی اُن کے قبضے میں آ گئی، اُس روز سے ہمارے سارے دلدر دُور ہو جائیں گے۔ اُن کے پاس ایسی کتابیں تھیں، جن میں ترشولی کو قابو کرنے کی ترکیبیں درج تھیں۔ مگر ڈیڈی کی مصروفیات ایسی تھیں کہ وہ ان ترکیبوں پر عمل نہیں کر سکتے تھے۔ لوسی نے مجھے لکھا کہ اسے ترشولی سے خطرہ لاحق ہے تو میں نے فوراً تحریر کیا کہ وہ ڈیڈی کی کتابوں سے کوئی ترکیب ڈھونڈے، جس پر عمل کر کے ترشولی کو دُور رکھا جائے۔“

”اُس نے وجہ نہیں بتائی کہ ترشولی بیٹھے بٹھائے اس کی دشمن کیوں بن گئی تھی؟“

”ڈیڈی کی کتابوں میں درج اُس نے ایک آسان سا وظیفہ لکھ لیا تھا۔ پانچ دن کا وظیفہ تھا۔ جان کسی کام سے ایک ہفتے کے لیے شہر سے باہر گیا ہوا تھا۔ لوسی نے سوچا کہ گھر میں خالی پڑے پڑے چارپائی توڑنے سے تو اچھا ہے کہ وظیفہ پڑھ کر ترشولی کو اپنے قبضے میں کر لے اور بے انتہا دولت اور طاقت کی مالک بن جائے۔ لیکن جان چوتھے دن ہی واپس آ گیا۔ پرہیز ٹوٹ گیا۔ وظیفہ جاری نہیں رہ سکا۔ اس کے بعد ترشولی اُسے وقتاً فوقتاً نظر آنے لگی۔

جب اُس نے تفصیل لکھی تو میں نے، جیسا کہ پہلے کہہ چکی ہوں، اُسے ڈیڈی کی کتابیں دیکھنے کا مشورہ دیا۔ لوسی اپنی زندگی سے مایوس ہو چکی تھی۔ اُس نے لکھا کہ چند روز کی مہمان ہے۔ ترشولی کی حرکات و سکنات سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی بھی روز اس کا گلا دبا سکتی ہے۔ اور ڈیڈی کی کتابوں کے بارے میں تحریر کیا کہ اس نے ساری کتابیں سکندر نامی ایک ایسے لڑکے کو بھجوا دی ہیں، جو بچپن سے ہی ترشولی کے ظلم و ستم کا شکار ہے۔ میں بہن کو ترشولی سے نجات دلانے اور ڈیڈی کی کتابیں حاصل کرنے یہاں پہنچی۔ مختلف ذرائع سے تمہارے گھر کا پتہ معلوم کیا۔

اتفاق سے فضیلہ کے ابو، نرس کی تلاش میں پہنچ گئے اور پھر فضیلہ کی دیکھ بھال کے لیے
ازمت کی پیش کش کی۔ مجھے ملازمت نہیں کرنا تھی۔ مگر یہ سوچ کر کہ تم سے ملنے اور کتابیں وصول
لرنے میں آسانی ہو گی، میں فضیلہ کے ابو کے ساتھ ان کی بیٹی کو دیکھنے کے بہانے ان کے گھر
بلی گئی۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ تم ذہنی ہسپتال میں ہو۔ پس میں نے ان کے ہاں ملازمت کر لی
کہ ہسپتال سے واپس آؤ گے تو تم سے کتابیں مانگوں گی۔ فضیلہ ہی کے گھر سے میں نے لوسی کو فون
کیا تو فون جان نے اُٹھایا۔ میں لوسی کو سرپرائز دینا چاہتی تھی، اس لیے نام بتائے بغیر جان سے
کہا کہ وہ فون اپنی بیوی کو دے۔ جان نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا کہ لوسی تو تین روز قبل اچانک
دل کا دورہ پڑنے سے ختم ہو چکی ہے۔ اُس نے میرا نام پوچھا۔ مجھ پر سکتہ سا طاری ہو گیا تھا۔ نام
بتائے بغیر میں نے ریسیور رکھ دیا اور دیر تک فون کے پاس اسی کیفیت میں گم سم سی کھڑی رہی۔ اور
تب فضیلہ نے مجھے دیکھا اور آواز دے کر اپنے پاس بلا لیا۔"

"فضیلہ اور اس کے امی ابو تمہیں لوسی کے نام سے جانتے ہیں۔ جب تک تم ان کے گھر نہیں
آئیں اور تم نے اپنی بہن کے گھر فون نہیں کیا، اس وقت تک تمہیں لوسی کی موت کا علم نہیں ہوا۔
آخر وہ کیا وجہ تھی، جس کے باعث تم خود کو نینسی کہلانے کے بجائے، لوسی کہلاتی رہیں؟"

"دراصل اس ہسپتال والے، جس میں لوسی کام کرتی تھی، مجھے لوسی سمجھ بیٹھے تھے۔" اُس نے
بتایا۔ "میں وہاں دوستی یا رشتے طے کرنے نہیں گئی تھی۔ مجھے صرف تمہارے گھر کا پتہ معلوم کرنا تھا۔
فضیلہ کے ابو نے براہِ راست مجھ سے میرا نام پوچھا۔ ہسپتال والوں نے جو نام بتایا، وہی نام ذہن
نشین کر لیا اور سارا عرصہ مجھے بیٹی کہہ کر مخاطب کرتے رہے۔ گھر پہنچ کر بھی انہوں نے میرے
سامنے کبھی کسی کو میرا نام نہیں بتایا جو تردید کرنے کی ضرورت پیش آتی۔

سب سے پہلے فضیلہ کو میرے نام کا علم اس وقت ہوا، جب میں نے اس سے لوسی کے
انتقال کا ذکر کیا۔ اس کو پہلے ہی لوسی کے انتقال کا پتہ تھا۔ اس لیے پتہ تھا کہ لوسی کی موت میں اس
کا ہاتھ تھا۔ اس نے کہا۔ "جو ہوا، سو ہوا۔ یہاں کے لوگ تمہیں لوسی سمجھ رہے ہیں۔ اس لیے خود
لوسی ہی کہلاتی رہو۔"

"اور تم خود کو لوسی کہلوانے پر راضی ہو گئیں؟"

"مجھے راضی ہونا پڑا۔" وہ بولی۔ "اُس نے ایسے چمتکار دکھائے کہ میں سمجھ گئی کہ اگر میں
اُس کی بات نہ مانی تو اپنی بہن کی طرح مجھے بھی اپنی زندگی سے ہاتھ دھونا پڑیں گے۔"

"چمتکار سے تمہاری کیا مراد ہے؟"

"اُس نے اپنے واحد ہاتھ سے میرے کندھے کو دبایا تو مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے مجھے
پورے جسم کو دہکتی بھٹی میں ڈال دیا ہو۔ لباس جھلس کر میری جلد سے چمٹ گیا۔ کئی منٹ تک

ایسی حالت رہی کہ مرنے والے کی جان کنی کے وقت بھی نہیں ہوتی ہو گی۔ پھر اس نے وہی ہاتھ
دوبارہ میرے کندھے پر رکھا تو ٹھنڈک سی دوڑ گئی اور جان میں جان آ گئی۔ میں نے اسی وقت
فیصلہ کیا کہ جس وقت بھی موقع ملے گا، فرار ہو جاؤں گی۔ رات کو جب گھر کے تمام افراد سو گئے تو
میں دبے قدموں گھر سے باہر نکل گئی۔ میدان پار کر کے مسلمانوں کی عبادت گاہ تک پہنچی تھی کہ
میں کار کی طرح ریورس میں چلنے لگی۔ قدم آگے اُٹھاتی تھی لیکن پڑتے پیچھے تھے۔ کچھ ہی دیر میں
اُلٹی چلتی ہوئی گھر میں واپس پہنچ گئی۔ اپنے گھر کے دروازے پر فضیلہ کھڑی تھی اور میری
زبوں حالی سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ اُسی رات میں نے ایک گھوس بھی کھایا۔"

"کیا کھایا؟"

"گھوس۔" لوسی نے بتایا۔ "بڑا والا چوہا۔ نہ جانے کہاں سے گٹر کے راستے ایک بڑا سا چوہا
نکل کر اس کے کمرے میں آ گیا۔ اس وقت وہ مجھے نصیحت کر رہی تھی کہ اس کا کہنا نہیں مانوں گی تو
مجھے کبھی آزادی نہیں ملے گی۔ چوہا آیا تو اُس کی طرف نظریں گاڑے دیکھنے لگی۔ چوہے نے وہاں
سے بھاگنے کی بڑی کوشش کی اور بل کی تلاش میں دیواروں سے ٹکراتا رہا۔ ایسا لگ رہا تھا، جیسے وہ
اندھا ہو گیا ہو۔ پھر نظروں کی تاب نہ لا کر پیٹھ کے بل فرش پر بیٹھ گیا اور ہوا میں ہاتھ پاؤں
چلانے لگا۔ فضیلہ اس کے جسم سے نظریں ہٹائے بغیر آگے بڑھی، اُسے ہاتھ میں اُٹھایا۔ میں سمجھی،
چوہے کا جائزہ لے رہی ہے۔ اچانک ایسی آواز آئی، جیسے سیب کاٹنے کی ہوتی ہے۔ میں نے
پلٹ کر دیکھا تو وہ مزے لے لے کر چوہے کو کھا رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اُس نے دُم اور ٹانگوں
کے علاوہ پورے چوہے کو اپنے حلق میں اُتار لیا اور مجھ سے کہا کہ فرش پر پڑی ہوئی دُم اور ٹانگوں کو
کوڑے کے ڈبے میں ڈال آؤں۔"

لوسی نے کہا کہ فضیلہ نے اُس کے کندھے کو دبایا تو وہ دہکتی ہوئی بھٹی میں جا گری اور بری
طرح جلنے اور جھلسنے لگی۔ میں نے یقین کر لیا۔ کیونکہ فضیلہ سے پہلی بار مل کر میری بھی کچھ ایسی ہی
کیفیت ہوئی تھی۔ پھر اُس نے کہا کہ اُس نے فرار ہونے کی کوشش کی، لیکن کچھ فاصلہ طے کرنے
کے بعد اُلٹی چلتی ہوئی واپس آ گئی۔ میں نے تردید نہیں کی۔

اگرچہ میرے ساتھ کوئی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا تھا، پھر بھی اتنا جانتا تھا کہ ترشولی پراسرار
اُتوں کی مالک ہے۔ وہ لوسی کو واپس بلا سکتی تھی۔ لیکن چوہے کو کھانے والی بات کسی بھی طرح حلق
سے نہیں اُتری۔ اس کے برعکس متلی سی ہونے لگی۔

"تم نے فضیلہ سے نہیں پوچھا کہ تمہیں لوسی کہنے اور کہلوانے پر اتنا اصرار کیوں کر رہی ہے۔
سے خادمہ کی ضرورت تھی۔ خادمہ کا نام لوسی ہو یا نینسی، اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟" میں نے
ہے والے گھناؤنے موضوع کو بدلتے ہوئے کہا۔

"اس کے پے در پے چینکاروں نے مجھے اتنا خوفزدہ کر دیا تھا کہ میں کچھ بھی معلوم نہیں کر سکی۔ لیکن بعد میں اندازہ ہوا کہ دراصل مجھے لوسی بنا کر تمہیں اندھیرے میں رکھنا چاہتی تھی۔ میر نے کئی بار کوشش کی کہ تمہیں حقیقت سے آگاہ کر دوں، لیکن تمہارے نام پرچہ بھی تحریر کیا اور فضیلہ کے خوف کے باعث اس پرچے میں یہ لکھنے سے بھی قاصر رہی کہ میں لوسی نہیں ہوں۔"

"تم نے اپنے پرچے میں لکھا تھا کہ مجھے مرعوب کرنے کے لیے فضیلہ نے وہ جل پری وا ڈرامہ رچایا تھا؟"

"جس حد تک میں فضیلہ کو سمجھ سکی ہوں، اس بناء پر یہ کہہ سکتی ہوں کہ یا فضیلہ کے اندر شکتی ہے کہ وہ جب چاہے خود کو دوسرے جسم اور دوسری شکل میں تبدیل کر سکتی ہے، یا اس پاس کچھ ایسے جسموں کا محفوظ ذخیرہ ہے، جن میں وہ موجودہ جسم کو چھوڑ کر منتقل ہو جاتی ہے۔ نے عموماً اسے رات کے بارہ بجے سے دو بجے تک غیر حاضر پایا تھا۔ مگر مندر والے اس واقعے بعد جب تمہیں نہ تو اس کی نبضیں ملی تھیں اور نہ تم دل کی دھڑکنیں سن سکے تھے، مجھے اپنے انداز میں ترمیم کرنا پڑ گئی۔ جسم کو چھوڑنے کے لئے وہ زمان و مکاں کی پابند نہیں ہے۔

سکندر! درحقیقت ترشولی ایک ایسے سمندر کی طرح ہے، جس کی گہرائی تک جانا میر تمہارے لیے ناممکن ہے۔ اسے سمجھنے کے لیے ہمیں ڈیڈی کی وہ کتابیں پڑھنا پڑیں گی، جنھ مدرسے میں اپنے دوست کے پاس رکھوا آئے ہو۔ شہر پہنچتے ہی پہلا کام تم کتابوں کو حاصل کا انجام دینا۔"

"یہ مت سمجھنا کہ مجھے تمہاری باتوں پر یقین آ گیا ہے۔" میں نے کہا۔ "مجھے اتنے اور فریب دیئے گئے ہیں کہ اب سچ کو سچ کہتے ہوئے بھی ڈر لگنے لگا ہے۔ اس سے پہلے ک واپس آئے، اتنا اور بتا دو کہ ویشیا بھگت والا معاملہ کیا ہے؟ کیا واقعی کچھ طاقتیں ویشیا بھگ قائم کرنے کے بارے میں سنجیدہ ہیں؟"

"پہلے تم یہ بتاؤ کہ کیا تم یہ نہیں چاہتے کہ دنیا میں ویشیا بھگت راج قائم ہو؟"

میں نے اپنے دل کو ٹٹولا۔ "پتھر اور دھات کے زمانوں سے لے کر اب تک بے وجود میں آ چکے ہیں، مگر انسانیت جوں کی توں دکھی اور غمزدہ ہے۔ میں سمجھتا ہوں، تجر پر ویشیا بھگت راج قائم کیا جا سکتا ہے۔ شاید اسی طرح انسان کو اس کے ازلی اور ابدی دکھ نجات دلائی جا سکے۔"

"اس ضمن میں، میں بھی تم سے متفق ہوں۔" وہ بولی۔ "دنیا کی بے چینی کا سب سبب وہ امتیاز ہے، جو انسانوں پر زبردستی ٹھونس دیا گیا ہے۔ جب تک امتیازات ختم گے، بے چینی باقی رہے گی۔ ویشیا بھگت کا قول ہے کہ دولت پر کسی ایک شخص کا، یا

اشخاص کا قبضہ نہیں ہونا چاہئے، بلکہ سارے انسانوں کو مساوی حقوق ملنا چاہئیں۔ تمہارے پاس چار پیسے ہیں اور میرے پاس ایک پیسہ ہے تو لازمی طور پر مجھے تم سے حسد ہو گا۔ اور دکھ ہو گا کہ میرے پاس چار پیسے کیوں نہیں ہیں؟...... تم مغرور اور خود پسند ہو جاؤ گی۔ میں پسماندہ اور کچلی ہوئی کہلاؤں گی۔ ویشیا بھگت دولت ہی کے نہیں، دوسرے امتیازات کے بھی قائل نہیں ہیں۔ فرماتے ہیں کہ مرد صرف مرد ہے۔ اسے باپ، بیٹا یا بھائی یا کچھ اور کہہ کر تعصب کی تخم ریزی نہ کرو۔ اسی طرح عورت صرف عورت ہے۔ اسے ماں، بیٹی، بہن یا اور کچھ مت سمجھو۔ ورنہ خلیج برقرار رہے گی۔ اضطراب اور بے چینی کو دور کرنے کا ویشیا بھگت کا سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ کسی بھی قسم کی بھوک، تشنگی ہو، سارے تعصبات اور امتیازات کو بالائے طاق رکھ کر سب سے پہلے اس کا ازالہ کرنا چاہئے۔"

"بہت خوب۔" میں تعریف کرنے پر مجبور ہو گیا۔ "ہر قسم کی بھوک اور تشنگی کو مٹا دو۔ بے چینی اور پریشانی خود بخود دور ہو جائے گی۔ تم نے ویشیا بھگت راج کو اچھی طرح سمجھا ہے۔ پہلے میرا خیال تھا کہ اس نظام کو تجربے کے طور پر اپنایا جا سکتا ہے، مگر تمہاری زوردار تقریر سن کر اپنا خیال بدلنے پر مجبور ہو گیا ہوں۔ تم نے میری آنکھیں کھول دی ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ویشیا بھگت راج اس دنیا کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔"

لوسی ہنسنے لگی۔ "میں کیا اور میری تقریر کیا۔ یہ باتیں تو فضیلہ کے ذریعے معلوم ہوئی ہیں۔ اس کی کچھ حرکات ایسی ہیں، جن کی بناء پر وہ مجھے بہت بری لگنے لگتی ہے۔ لیکن جب اس سے لہو کو گرما دینے والی ویشیا بھگت کی باتیں سنتی ہوں تو سوچتی ہوں کہ وہ زیادہ بری نہیں ہے۔"

"فضیلہ......" میں نے بے چینی سے کرسی پر پہلو بدلا۔ "وہ پلیٹ فارم پر گئی ہے، یا اس معصوم بچی کے پیچھے یاترا پر روانہ ہو گئی ہے۔ اب تک تو اُسے آ جانا چاہئے تھا۔ دو چائے اور چند سموسے منگوا لو۔ انہیں کھا پی کر پلیٹ فارم پر چلتے ہیں۔ ہو سکتا ہے، وہ وہیں بیٹھی ہمارا انتظار کر رہی ہو۔"

لوسی نے بیرے کو بلا کر چائے اور ایک درجن سموسوں کا آرڈر دیا۔ بیرے نے سہمی سہمی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ اُسے حیرت ہو رہی تھی کہ کئی آدمیوں کا کھانا کھانے کے باوجود میرے پیٹ میں ابھی تک کچھ گنجائش باقی ہے۔

"ایک درجن میں کیا ہو گا؟" میں نے بیرے کی بدحواسی کا لطف لیتے ہوئے کہا۔ "ڈیڑھ درجن لے آنا۔"

"ڈیڑھ درجن؟" اس نے آنکھیں پھاڑ کر کہا اور جواب کا انتظار کیے بغیر کاؤنٹر کی طرف اس طرح لپکا کہ اُس کی ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں۔

لوسی پورا ایک سموسہ بھی نہ کھا سکی تھی۔ میں نے ساڑھے سترہ سموسے کھائے۔ اس دو
متعدد لوگ ریستوران کے دروازوں پر آ کھڑے ہوئے اور مجھے سموسے کھاتے اس طرح د
لگے، جیسے کسی کرتب کا مظاہرہ دیکھ رہے ہوں۔ غالباً بیرا باہر جا کر اپنے واقف کاروں سے یہ کہ
تھا کہ ایک عالم چنا تو وہ ہے، جو دنیا کا سب سے طویل قامت انسان ہے، دوسرا عالم چنا وہ
جو دنیا کا سب سے بڑا پیٹو ہے۔ پانچ آدمیوں کا کھانا کھانے کے بعد اب وہ چورن کے طو
ڈیڑھ درجن سموسے اپنے حلق سے نیچے اُتار رہا ہے۔"

کاؤنٹر پر جا کر لوسی نے بل ادا کیا۔ میری میز پر آئی تو میں کھا پی کر فارغ ہو چکا تھا۔

"ایک بار فضیلہ نے بتایا تھا......" لوسی نے میرے ساتھ باہر کی جانب قدم اُٹھاتے ہو
کہا۔ "اپنے زمانے میں ویشیا بھگت جی بھی بڑے خوش خوراک ہوا کرتے تھے۔ صرف ناشتے
پندرہ سیر آٹے کی پوریاں بنتی تھیں۔ ترکاری، بھاجی اور پھل اس کے علاوہ ہوتے تھے۔"

مجھے عجیب سی خوشی ہوئی۔ میں ویشیا بھگت کا مقابلہ تو نہیں کر سکتا تھا۔ تاہم ان کے قد
قدم ضرور چل رہا تھا۔ ہمیں باہر جاتے دیکھ کر سارے تماشائی اِدھر اُدھر ہو گئے۔ تین لڑکے تا
بجانے لگے۔ ایک آدمی نے دوسرے آدمی کے کان میں تیز سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔

"اللہ سائیں کی قسم! زندگی میں پہلی بار ایسا عجیب و غریب بندہ دیکھا ہے۔"

تعجب تو مجھے بھی ہو رہا تھا۔ راج کنڈل آنے کے بعد میری بھوک میں روز افزوں اضافہ
ہوتا جا رہا تھا۔ مگر اس روز تو میں نے حد کر دی تھی۔ کھانے کا اثر تھا یا لوسی کے اس سانولے ہاتھ
کا، جو اس نے میرے کندھے پر رکھا تھا۔ مجھ پر عجیب سی بے خودی طاری تھی۔ کچھ دیر پہلے میں
نے لوسی پر جس خفگی کا اظہار کیا تھا، اس کے اثرات ختم ہو چکے تھے۔ اس کی جگہ محبت نے لے لی
تھی۔ اس نے جو کہانی سنائی تھی، وہ حرف بہ حرف درست تھی۔

جس طرح ترشولی مجھے دھوکے پر دھوکا دیتی چلی آئی تھی، اسی طرح اس نے اس بھولی بھالی
لڑکی کو، جو لوسی نہیں تھی، لوسی بننے پر مجبور کر دیا تھا۔ اگر وہ فضیلہ کے جسم میں نہ ہوتی تو کسی طرح
بھی میرے انتقام کا نشانہ بننے سے نہ بچتی۔

"کیا سوچ رہے ہو، سکندر......؟" اس نے چبوترے پر چڑھتے ہوئے کہا، جو پُل کی
رہنمائی کرتا تھا۔

میں نے کہا۔ "نینسی......!"

اس نے جلدی سے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "ویشیا بھگت کے لیے، سکندر! اس نام کو
دوبارہ اپنے منہ سے ادا مت کرنا۔ تمہیں صحیح طور پر علم نہیں ہے کہ فضیلہ کتنی ظالم ہے۔ اسے پتہ چل
گیا کہ میں نے تمہیں ساری باتیں بتا دی ہیں تو تمہیں تو شاید وہ کچھ نہ کہے کہ ہر صدی میں اس
نے تم سے پیار کیا ہے۔ مگر مجھے زندہ نہیں چھوڑے گی۔

"ہر صدی میں؟" اُس نے حیرت سے پوچھا۔ "میں تو اس صدی کی پیدائش ہوں۔"

"نہیں۔" وہ بولی۔ "آج سے دس صدی قبل تمہاری پیدائش ہوئی تھی۔ اس کے بعد تم ہر
صدی میں پیدا ہوتے رہے ہو اور ہر صدی میں ترشولی تمہیں حاصل کرنے کی کوشش کرتی رہی
ہے۔ اور بالآخر اس صدی میں اُس نے فضیلہ بن کر تمہیں اپنا بنا لیا ہے۔"

کہیں دُور سے بادلوں کے غلاف میں لپٹی لپٹائی آواز آئی۔ "یہ جھوٹ ہے۔ بالکل جھوٹ
ہے۔"

میں نے کہا۔ "تمہارا مطلب ہے کہ ترشولی کا اور میرا ہر صدی میں جنم ہوتا رہا ہے؟"

"ہاں......اور ترشولی ہر جنم میں تم پر دیوانہ وار فریفتہ ہوتی رہی ہے۔"

"تمہیں کیسے معلوم؟"

"پچھلے تو جنم تم نے میرے ساتھ گزارے ہیں۔" پل کی سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے وہ رک اور میرے سینے پر سر رکھ کر بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "میں تمہاری محبت اور وفا پر ناز کرتی ہوا مگر اس جنم میں تم مجھ سے دور ہو گئے قصور تمہارا نہیں، قسمت کی لکیروں کا ہے۔"

ایک مرتبہ پھر آواز آئی۔ اس مرتبہ قدرے واضح تھی۔ "اس کی باتوں کا اعتبار نہ کیجیے۔ عورت جھوٹ بول رہی ہے۔ جنم تو صرف ایک بار ہوتا ہے۔"

"فضیلہ......" مجھے اپنی سانس رکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ "تم فضیلہ ہو؟"

"فضیلہ یہاں نہیں ہے۔" لوسی نے میرے سینے سے سر اُٹھا کر کہا۔ "تمہیں تو ہر وقت فضیلہ کی یاد ستاتی رہتی ہے۔ جاگتے میں بھی اسی کے خواب دیکھتے ہو۔"

میں نے آہستہ سے کہا۔ "ابھی وہ یہیں تھی اور مجھ سے کچھ کہہ رہی تھی۔"

"کاش میں تمہارے دل سے فضیلہ کی محبت نکال سکتی۔" لوسی نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "اٹھاؤ۔ ہم پلیٹ فارم کی طرف چل رہے ہیں۔ کم بخت مر گئی مگر اپنا جسم یہیں چھوڑ گئی۔ تا کہ تر... اس پر قبضہ کر کے تمہیں ہتھیا سکے۔"

میں کھوئے کھوئے انداز میں اُس کے ساتھ پل پر چڑھنے لگا۔

میری یہ کیفیت زیادہ دیر تک برقرار نہ رہ سکی۔ لوسی کے ہاتھ کے خوش گوار لمس نے اس کو، جو میں نے نہ جانے کتنے طویل عرصے کے بعد سنی تھی، میرے ذہن سے نکال دیا۔

"تھوڑی دیر کے لیے اپنی سرگزشت سے ہٹ کر آپ سے ایک چھوٹا سا سوال کرتا ہوں۔ اپنی آواز سے کون واقف نہیں ہوتا۔ یقیناً آپ بھی واقف ہوں گے۔ لیکن کیا کبھی نے ریکارڈ کر کے اپنی آواز سنی ہے؟ بے شک وہ آواز بھی آپ کی ہوتی ہے۔ اور اس کا لہجہ بھی آپ ہی کا ہوتا ہے۔ پھر بھی تھوڑی سی تبدیلی محسوس ہوتی ہے، آپ کی اصل آواز میں ریکارڈ کی ہوئی آواز میں جو معمولی سا فرق ہوتا ہے، وہی فرق خلا سے آنے والی اور موجودہ کے منہ سے ادا ہونے والی آوازوں میں تھا۔ میں نے جو آواز دی تھی، وہ ہو بہو فضیلہ کی آواز اس میں کسی قسم کی کوئی ملاوٹ نہیں تھی۔ جبکہ وہ فضیلہ، جو درحقیقت فضیلہ نہیں تھی۔ بولتی یکساں آواز اور یکساں لہجہ ہونے کے باوجود بہت ہی معمولی سی تبدیلی کا احساس ہوتا تھا احساس بھی مجھے اس وقت ہوا، جب اصل حقیقت کا پتہ چلا تھا، ورنہ پہلے تو ان آوازوں کے گمان بھی نہیں تھا۔"

فضیلہ اسٹیشن کے کسی پلیٹ فارم پر نہیں تھی۔ ہم نے وہاں کا چپہ چپہ چھان مارا۔ لوسی۔

"تمہارا خیال درست معلوم ہوتا ہے۔ شاید وہ یاتریوں کے ساتھ چلی گئی ہے۔"

جلد ہی اس بات کی تصدیق ہو گئی۔ مختلف خوانچے والوں سے پوچھ گچھ کے بعد برتنوں کی ریڑھی والے ایک معمر شخص نے بتایا کہ جس حلیے اور شکل و صورت والی لڑکی کے بارے میں ہم لوگ پوچھتے پھر رہے ہیں، وہ تو یاتریوں کی ٹرین میں سوار تھی اور ٹرین میرے سامنے روانہ ہوئی ہے۔

"اُس لڑکی کے گلے میں موتیوں کا ہار تھا اور ایک آستین اس طرح جھول رہی تھی، جیسے اس کا ہاتھ کٹا ہوا ہو۔" معمر شخص نے کہا اور ریڑھی کو دھکیلتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

"کیا ضرورت تھی اسے جانے کی؟" میں نے بگڑ کر کہا۔

"اس معصوم سی لڑکی، کیا نام تھا اُس کا؟"

"اس کا نام جو کچھ بھی ہو، میں تو اسے امریتا ہی کہوں گا۔ اتنی معصومیت اور امریتا تھی اُس کے چہرے میں کہ جو بھی دیکھتا تھا، دیوانہ ہو جاتا تھا۔"

"چلو، امریتا ہی سہی۔ امریتا کی خاطر وہ دنیا کے آخری سرے تک جا سکتی ہے۔"

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔ "ایسی کیا خوبی ہے اس لڑکی میں؟"

لوسی کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ دوڑ گئی۔ "کبھی کسی ایسی بچھیا کا گوشت کھایا ہے، جس کو خوب اچھی طرح پالا پوسا گیا ہو اور جس کے صحت مند، توانا اور گدرائے ہوئے جسم کو دیکھ کر خود بخود منہ میں پانی آ جاتا ہو؟"

"میں کسی بچھیا کی نہیں، امریتا کی بات کر رہا ہوں۔"

"میں بھی اسی کے بارے میں بتا رہی ہوں۔ اگر کسی اچھی سی بچھیا کو دیکھ کر تمہاری رال ٹپک سکتی ہے، تو فضیلہ بھی کسی متناسب اور گٹھے ہوئے گوشت والی لڑکی کو دیکھ کر قابو میں نہیں رہ سکتی۔"

میں سر سے پاؤں تک لرز گیا۔ "کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"وہی، جو تم سمجھ رہے ہو۔" لوسی نے کہا۔ پھر قدرے سنجیدہ ہو کر بولی۔ "سکندر! تمہیں یاد ہے وہ بچہ، جسے تمہاری شادی سے ایک رات قبل کسی انجانی مخلوق نے مُلا جی کے گھر سے نکل کر ماں کی گود سے چھیننے کے فوراً بعد اُس کے نرخرے پر دانت گاڑ کر پہلے اُس کا خون پیا تھا اور پھر اُس کے جسم کو چبا گئی تھی؟ وہ فضیلہ تھی۔"

میرے لیے کھڑے رہنا دوبھر ہو گیا۔ لوسی سہارا لے کر مجھے قریبی بنچ پر لے گئی۔ میں بیٹھ گیا تو اُس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ لیا۔ "معاف کرنا، سکندر! میں تمہارے دل کو دکھ دینا نہیں چاہتی تھی۔ مگر اس شخص سے، جو تو صدیوں تک میرا ہم دم اور میرا ہم راز رہا ہو، جھوٹ نہیں بول سکتی۔ باقی نصف بچہ، فضیلہ نے آرام آرام سے کھایا۔ صرف اس کے ایک ہاتھ کا پنجہ چھوڑ دیا

تا کہ اسے تمہاری اور اس کی شادی کے حیلے کے طور پر استعمال کیا جا سکے۔ پنجے کو میرے حوالے کر کے ضروری ہدایات کے بعد وہ دیوار پر چڑھ گئی اور تمہارے پاس پہنچ گئی۔ اور صبح کو جب تم نے واپس جانے کے لیے کہا تو اس نے صاف انکار کر دیا کہ وہ اس گھر میں ہرگز نہیں جائے گی، جہاں اسے بری بری شکلیں نظر آتی ہیں۔ رہی سہی کسر ہاتھ کے پنجے نے دور کر دی، جو میں نے فضیلہ کی ہدایات کے بموجب ٹھیک اس وقت پیش کیا، جب لوہا گرم تھا۔ پنجے نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ دلاور صاحب کو فضیلہ کی ضد کے سامنے ہتھیار ڈالنا پڑے اور اس طرح تم دونوں دنیا والوں کی نظروں میں میاں بیوی بن گئے۔"

آخری جملہ اُس نے بطور طنز بتانے کے لیے ادا کیا تھا کہ وہ کنفتی ہی نہیں، نا کنفتی باتور سے بھی اچھی طرح واقف ہے۔ مگر میں نے اس کے طنز کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ میرے سینے میں لاوا اُبل رہا تھا۔ کوئی شک نہیں کہ مجھے فضیلہ پیاری تھی، فضیلہ کا جسم پیارا تھا، فضیلہ کی ادائیں پیاری تھیں۔ وہ ہنستی تھی تو چمنستان کھل اُٹھتے تھے، کلیاں چٹک چٹک کر پھول بننے لگتی تھیں۔ اُداس ہوتی تو خزاں آ جاتی تھی۔ اندر ہی اندر کوئی دل مسوسنے لگتا تھا۔ یہ معلوم ہو جانے کے باوجود کہ وہ فضیلہ نہیں تھی، فضیلہ کا سایہ تھی، میں اُسے دل کی گہرائیوں سے چاہتا تھا اور ڈرتا رہتا تھا کہ کہیں یہ سایہ بھی چھن گیا تو میرے پاس کچھ بھی باقی نہیں بچے گا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ اس کے وحشیانہ اور بہیمانہ فعل کو آسانی سے نظر انداز کر دیا جاتا۔

"کوئی......" میں نے کپکپاتی آواز میں کئی مرتبہ لفظ کوئی کی گردان کرتے ہوئے کہا۔ "کوئی ایسی ترکیب نہیں کہ اس معصوم سی امریتا کو فضیلہ کے لقمۂ تر ہونے سے بچایا جا سکے؟"

"کس کس کو بچاؤ گے اور کہاں تک بچاؤ گے؟" فضیلہ کے منہ کو خون لگ چکا ہے۔ اب تک نہ جانے کتنے لوگوں کو ہڑپ کر چکی ہے۔ اور نجانے کتنے بدنصیب لوگوں کو اس کی غذا بننا ہے۔ امریتا کو بچانے کا خیال اپنے دل سے نکال دو۔ اپنی خیر مناؤ۔ کسی روز اس کے دانت تمہارے نرخرے میں بھی پیوست ہو سکتے ہیں۔"

رانی نے قبرستان میں انکشاف کیا تھا کہ اُس کی زندگی کا دار و مدار انسانی بازو پر ہے۔ چند روز سے زیادہ بازو کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ مگر فضیلہ تو اس سے بھی دو ہاتھ آگے تھی، صرف بازو پر انحصار نہیں کر سکتی تھی۔

"کیوں نہ ہم اسی ڈاکٹر قاسم جیلانی کے پاس چلیں اور اس سے درخواست کریں کہ وہ اس معصوم امریتا کو بچانے کے سلسلے میں ہماری مدد کرے؟" میں نے تجویز پیش کی۔

"جس طرح اندھا کسی کو راستہ نہیں دکھا سکتا، اسی طرح ڈاکٹر بھی ہماری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ وہ روحوں کی آمد و رفت کا قائل نہیں ہے۔ اُسے قائل کرنے کے لیے راج کنڈل آنے کی دعوت

دی گئی ہے۔"

"پھر کیا، کیا جائے؟" میں نے ہاتھ مسلتے ہوئے دریافت کیا۔

"تمہارے سوال کے جواب میں، میں تمہیں ایک چھوٹی سی کہانی سناتی ہوں۔ اسے سن کر تم مناسب قسم کا فیصلہ کر سکو گے۔" فضیلہ نے کہا۔ "کسی ملک کا راجہ علم نجوم میں بہت ماہر تھا۔ ایک رات وہ ستاروں کو دیکھ رہا تھا کہ اچانک اُسے اُن کی چال ڈھال اور رفتار سے پتہ چلا کہ کچھ ہی دیر بعد گھرے بادل گھر آئیں گے اور تین روز تک مسلسل پورے ملک پر برستے رہیں گے۔ ان بادلوں سے جو بارش ہو گی، اس میں یہ تاثیر ہو گی کہ جو شخص بھی بارش کا پانی پیئے گا، وہ دیوانہ ہو جائے گا۔

اتنا وقت نہ تھا کہ ملک میں ڈھنڈورا پٹوا کر عام منادی کی جاتی اور لوگوں کو بارش کا پانی پینے سے منع کیا جاتا۔ راجہ نے سب سے پہلے اپنے آپ کو اور رانی کو بچانے کی کوشش کی اور تین روز کے لیے مٹکوں میں پانی بھر کر رکھ لیا۔ حساب کے مطابق تھوڑی دیر بعد بارش شروع ہو گئی، جو لگاتار تین دن تک ہوتی رہی۔ راجہ اور رانی کے علاوہ ملک کا ایک فرد بھی ایسا نہ بچا، جس نے بارش کا پانی نہ پیا ہو۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ساری رعایا پاگل ہو گئی۔ راجہ اور رانی بہت خوش تھے کہ حکمت عملی سے پاگل ہونے سے بچ گئے۔

مگر نتیجہ اُلٹا نکلا۔

رعیت نے راجہ اور رانی کو پاگل سمجھنا شروع کر دیا۔ ملک میں بغاوت پھوٹ پڑی۔ پاگل رعیت کا ایک ہی مطالبہ تھا کہ ہمیں دیوانے راجہ اور رانی کی ضرورت نہیں۔ لوگوں کا احتجاج حد سے بڑھا تو راجہ رانی سر جوڑ کر بیٹھ گئے کہ پاگلوں کو کس طرح سمجھایا بجھایا جائے۔ بالآخر رانی اس نتیجے پر پہنچی کہ اسے اور اس کے شوہر کو بھی بارش کا پانی پی لینا چاہیے۔ پانی پیتے ہی وہ دونوں بھی پاگل ہو گئے۔ رعیت خوش ہو گئی کہ راجہ رانی کی دیوانگی ختم ہو گئی۔ اب دونوں ہماری طرح عقل مند اور باشعور بن چکے ہیں۔ اس لیے اب احتجاج، جلسوں اور جلوسوں کی کوئی ضرورت نہیں...... یہی تمہارے سوال کا جواب ہے۔ فضیلہ کا علاج تو ناممکن ہے، تم خود اس کی طرح پاگل بن جاؤ۔"

مجھے لوسی کی نیت پر شبہ ہونے لگا۔ وہ مشورے دے رہی تھی کہ اس معصوم بچی کو کھانے میں فضیلہ کا ہم نوالہ، ہم پیالہ بن جاؤں۔ بظاہر وہ فضیلہ کی محبت کا دم بھرتی تھی اور اس کے حکم کو وِشیا بھگت سمجھ کر بجا لاتی تھی۔

لیکن جیسا کہ اس نے اعتراف کیا تھا کہ اسے فضیلہ سے شدید ترین نفرت تھی، فضیلہ نے اس کے محبوب کو اس سے چھین لیا تھا، جو پچھلی نو صدیوں سے فضیلہ کو دھتکارتا اور لوسی کو پیار کرتا آیا تھا۔

"لوسی!" میں نے کہا۔ "تمہارا دعویٰ ہے کہ مجھے سینکڑوں سال سے چاہتی ہو اور سینکڑوں

سال تک اسی طرح چاہتی رہو گی۔ میں تمہیں تمہاری چاہت کا واسطہ دیتا ہوں، اگر تمہیں کوئی طریقہ معلوم ہے، جس پر عمل کر کے فضیلہ کو اس بری اور گندی غیر انسانی عادت سے نجات دلا سکے تو بتا دو۔ میں ساری زندگی تمہارا احسان مند رہوں گا۔"

"تم نے مجھے چاہت کا واسطہ دے کر مجھے ترکیب بتانے پر مجبور کر دیا ہے۔" وہ بو

"بے شک ایک ترکیب ہے۔ لیکن تم اس پر عمل نہیں کر سکو گے۔"

"میرے عمل سے فضیلہ کو کوئی نقصان تو نہیں پہنچے گا؟"

"ہرگز نہیں۔" اس نے کہا۔ "فضیلہ کا بال بھی بیکا نہیں ہوگا۔"

"ٹھیک ہے، ترکیب بتاؤ۔ میں عمل کرنے کے لیے تیار ہوں۔" میں نے جوشیلے انداز کہا۔ "ساری دنیا تہ و بالا ہو جائے، لیکن فضیلہ کو نقصان نہ پہنچے تو میں بخوشی ہر کام انجام دے تیار ہوں۔"

لوسی نے پیار سے میرے کندھے کو تھپکی دی۔ "پچھلی نو صدیوں میں تم نے مجھے اتنی محبت دی، جتنی فضیلہ کو دے رہے ہو۔ اُٹھو، راج کنڈل چلتے ہیں۔ وہاں کا پوشیدہ تہہ خانہ دیکھ حیرت زدہ رہ جاؤ گے۔ فضیلہ کتنی ہی عجلت سے کام کیوں نہ لے، کل صبح سے پہلے واپس نہ سکے گی۔"

اُس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔

میں نے آنکھیں چراتے ہوئے کہا۔ "ترکیب بتاؤ۔"

"ترکیب راج کنڈل پہنچ کر ہی بتائی جا سکتی ہے۔ وہ وہی ایک ایسی جگہ ہے، جہاں ترکیب پر عمل کیا جا سکتا ہے۔"

میں کھڑا ہو گیا اور بے بسی سے بولا۔ "یقین کر لوں کہ تم چھل اور فریب سے کام نہیں رہی ہو؟"

"میں ترشولی نہیں ہوں، سکندر! چھل اور فریب اسی کو زیب دیتا ہے۔ تم میرے قول و میں کوئی تضاد نہ پاؤ گے۔"

لوسی یقین دہانی نہ بھی کرواتی، تب بھی میں اُس کی باتوں پر یقین کرنے کے لیے مجبور تھا رہ کر اُس معصوم بچی کا بھولا بھالا چہرہ میری نظروں کے سامنے گھوم رہا تھا۔ کرشن کنہیا بن کر تو نے کمال کر دکھایا تھا۔ کون کہہ سکتا تھا کہ اتنی چھوٹی سی بچی رقص کے فن میں اتنی مہارت رکھتی گی۔ اُسے بچانے کے لیے مجھے جان کی بازی لگانا پڑتی، تب بھی گریز نہ کرتا۔ کھدر کی دھوتی ململ کے کُرتے میں میک اپ کیا ہوا اُس کا نیلگوں جسم ستارے کی طرح چمک رہا تھا۔ بہ لوگ اس حقیقت سے واقف ہوں گے کہ کرشن کنہیا کا جسم سیاہی مائل نیلا تھا۔ وہ ہمیشہ سے ا

نہیں تھے، بلکہ بچپن میں بڑے گورے چٹے ہوا کرتے تھے۔

ایک دن سمندر کے کنارے گیند سے کھیل رہے تھے کہ گیند سمندر میں جا گری۔ اور سمندر کی لہریں گیند کو کہیں سے کہیں لے گئیں۔ کرشن کنہیا اُداس ہو گئے۔ سمندر کے دیوتا سے اُن کی یہ اُداسی دیکھی نہ گئی۔ اُس نے ایک طاقت ور، تیز رفتار اژدھے کو حکم دیا کہ پلک جھپکتے میں کرشن کنہیا کی گیند ان تک پہنچا دی جائے۔

اژدھا حکم بجا لایا۔ کرشن کنہیا کو گیند تو مل گئی، لیکن اژدھے کی زہریلی سانس ان کے کومل جسم پر پڑی اور ان کا جسم نیلا ہو گیا۔ کوئی عام انسان ہوتا تو زہریلی سانس کی تاب نہ لا کر فوراً ہی ختم ہو جاتا اور میلوں دُور تک سارے درخت اور پودے جل کر راکھ ہو جاتے۔ مگر کرشن کنہیا نے بالک ہونے کے باوجود سارے زہر کو اپنے جسم میں جذب کر لیا۔

میں اس معصوم بچی اور کرشن کنہیا کے خیال میں ایسا ڈوب گیا تھا کہ کچھ پتہ ہی نہیں چلا کہ کب ریل پر چڑھا، کب اُترا اور کب اسٹیشن کے باہر پہنچا۔ خیالات کی رو اس وقت ٹوٹی، جب لوسی نے کندھا ہلایا اور مجھے تانگے پر سوار ہونے کے لیے کہا۔ کچھ سفر تانگے میں اور کچھ ایک چھوٹی سی کشتی میں طے ہوا۔ ہم دونوں جس وقت راج کنڈل پہنچے تو اس وقت سورج دیوتا کا رتھ نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا اور اچھی خاصی تاریکی پھیل گئی تھی۔

وہ مجھے تہہ خانے میں لے گئی۔ تہہ خانے میں اتنی تاریکی تھی کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ نہ جانے کس طرح ڈھونڈ کر لوسی نے موم بتی جلائی، پھر کونے میں رکھا ہوا پیٹرومیکس اُٹھا لائی۔ پیٹرومیکس کی روشنی سے پورا تہہ خانہ جگمگا اُٹھا۔ دیواروں پر برس زدہ وشیا بھگت کی فریم شدہ تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ ایک جانب مٹی کے دو چولہے رکھے ہوئے تھے۔ چولہوں کے قریب چند دیگچیاں تھیں۔ وہیں دیوار میں ایک چھوٹی سی بغیر دروازوں کی الماری تھی، جس میں قرینے سے چھوٹے بڑے ڈبے رکھے ہوئے تھے اور ہر ڈبے پر ان کا نام لکھا ہوا تھا۔ سب سے زیادہ حیرت مجھے فوم کا وہ گدا دیکھ کر ہوئی، جس پر لوسی آرام کیا کرتی تھی۔ کٹیا کے مقابلے میں تہہ خانہ لاکھ درجے بہتر تھا۔ لوسی خادمہ ہوتے ہوئے بھی عیش کر رہی تھی۔ جبکہ مجھے اور فضیلہ کو کٹیا کی سخت اور کھردری چٹائی پر لیٹنا پڑتا تھا۔ غالباً اس میں کوئی مصلحت تھی۔

"اب بتاؤ۔" میں نے گدے پر بیٹھ کر انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔ "وہ کون سی ترکیب ہے، جس کے ذریعے معصوم سی امرتا کو لقمۂ فضیلہ بننے سے بچایا جا سکتا ہے؟"

چولہوں کی طرف جاتے جاتے وہ رک گئی، پلٹی اور وشیا بھگت کی قدِ آدم تصویر کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ ہاتھ جوڑ کر تصویر کو پرنام کیا، اس پر لگی ہوئی برائے نام گرد صاف کی اور اس گرد کو اپنی گردن، پیشانی اور ہاتھوں پر خوب اچھی طرح مل لیا۔

"میں نے جب کسی مشکل اور کٹھنائی میں ویشیا بھگت کو آواز دی ہے، انہوں نے مجھے مایوس نہیں کیا ہے۔" اُس نے ادب کے ساتھ تصویر کو اتار کر دیوار کے سہارے کھڑا کر دیا۔ پھر اس کے قدموں کو چوم کر ایک جانب ہٹتے ہوئے بولی۔ "اس معصوم بچی کو بچانے اور فضیلہ کو آدم خوری سے روکنے کی بس ایک ہی ایسی ترکیب ہے، جس پر عمل کر کے کامیابی حاصل کی جا سکتی ہے...... تعجب سے کیوں دیکھ رہے ہو؟ ویشیا بھگت کی شکتی پر شبہ کرنا حرام ہے۔ اٹھو!...... سنسار کے سب سے بڑے شکتی مان کے سامنے سر جھکاؤ۔ جو مانگنا چاہو، سو مانگ لو۔"

"نہیں۔" تہہ خانے کی گھٹی ہوئی فضا میں نہ جانے کہاں سے وہی جانی پہچانی آواز آئی، جس میں کسی قسم کی رکاوٹ یا ملاوٹ نہیں تھی۔ "نہیں...... نہیں...... نہیں۔ ایسا نہ کیجیے۔"

کچھ تو فضیلہ اور لوسی کی صحبت کا اثر تھا اور کچھ اس جنتر کا، جو سونے کے تعویذ میں بند میرے گلے میں پڑا تھا، اپنی آنکھوں سے ویشیا کی درگت بنتے ہوئے دیکھنے کے باوجود، سر پر طلباء کے جوتے پڑنے کے باوجود بھی وہ کچھ نہیں کر سکا تھا، بلکہ اُلٹا طلباء کو نوٹوں کی صورت میں انعام اکرام سے نوازتا رہتا تھا، میرے دل میں اُس کی بڑائی ایسے بیٹھ گئی تھی کہ لوسی نے جو کچھ کہا، اس پر مجھے فوراً ہی یقین آ گیا۔

بلاشبہ یہی ایک ترکیب تھی، جو تیر بہدف ثابت ہو سکتی تھی۔

میں نے ایک سحر زدہ انسان کی طرح دونوں ہاتھ جوڑ کر انتہائی احترام کے ساتھ تصویر کی جانب قدم اُٹھانا شروع کر دیے۔

"نہیں۔" بغیر رکاوٹ کے آواز لحظہ بہ لحظہ قریب سے قریب تر ہوتی گئی تھی۔ "آپ نہیں جانتے کہ آپ کیا کر رہے ہیں...... رک جایئے۔ میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں... انگاروں کو پھول نہ سمجھیے۔"

وہ آواز مجھے روک رہی تھی۔ مجھ سے کہہ رہی تھی کہ میں کچھ نہیں جانتا۔ حالانکہ خود وہ ناواقف تھی کہ میرا مقصد کتنا عظیم ہے۔ میرے سامنے ایک مشن تھا۔ ایک معصوم کی زندگی بچانا تھی، دوسری حُسن و رعنائی کی دیوی کو ایک عادتِ بد سے چھٹکارا دلانا تھا۔

آگے بڑھتے ہوئے قدم دلخراش منت و سماجت سے نہ رک سکے۔ میں تصویر کے سامنے گیا۔ یوں لگا، جیسے میرے برابر کوئی اور بھی کھڑا ہو اور اُس کی گرم سانسیں میرے رخساروں سے ٹکرا رہی ہوں۔ پلٹ کر دیکھا، واہمے کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ البتہ دیوار سے پیٹھ لگائے لوسی کھڑی تھی۔

"شاباش، سکندر!" اُس نے میری ہمت بندھائی۔ "چرنوں میں سر رکھ دو۔ منجدھار میں پھنسا بیڑا پار ہو جائے گا۔"

وہ ہمت نہ بھی بندھاتی تو مجھے یہی کرنا تھا۔ سارے سہارے ٹوٹ چکے تھے۔ صرف ویشیا کا سہارا ہی باقی تھا۔ میں نے دھڑکتے دل اور پُرنم آنکھوں کے ساتھ اپنے آخری سہارے کے آگے سر جھکانا شروع کیا۔ اس سے پہلے کہ میں سر جھکاتا، ہوا کا ایک تیز تھپیڑا اتنی قوت کے ساتھ میرے سینے پر پڑا کہ میرے قدم ڈگمگا گئے اور میں پیٹھ کے بل فرش پر جا گرا۔ میرے پیروں کے گرد آلود بوٹ تصویر کے چہرے پر پڑے۔ شیشہ ایک چھناکے کے ساتھ ٹوٹ گیا اور اگلے ہی لمحے ٹوٹے ہوئے شیشے والی تصویر اوندھے منہ قدموں میں اس طرح آ گری، جیسے میرے بوٹ چاٹ رہی ہو۔

میں گھبراہٹ اور پریشانی میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ وحشت کے باعث یہ بھی نہ دیکھ سکا کہ تصویر کے چہرے پر کھڑا اپنے بوٹوں سے روند رہا ہوں۔ لوسی کے منہ سے چیخ نکلی۔ دیوانوں کی مانند بھاگتی ہوئی وہ میرے پاس آ گئی اور میرے سینے پر گھونسے مار مار کر مجھے تصویر پر سے ہٹانے لگی۔ میں نے دیکھا کہ ویشیا بھگت کا چہرہ میرے جوتوں تلے ہے، تو فلانچ لگائی اور مٹی کے تیل کے چولہوں کے قریب پہنچ کر ویشیا کی دشا دیکھی۔ شیشیوں کی کرچیوں نے جگہ جگہ اس کا جسم کاٹ دیا تھا۔ ایک آنکھ غائب تھی، ناک کٹ کر آنکھوں پر لگ گئی تھی اور وہ دونوں پاؤں، جن کو چھوڑ کر اور ان کے آگے جھک کر مرادیں مانگی جاتی تھیں، بوٹوں کے تلووں سے اس طرح روندے گئے تھے کہ بائیں پیر کی چھنگلی کے علاوہ ان کا کوئی وجود ہی نہیں رہا تھا۔ تصویر کا پیروں والا حصہ پھٹ کر میرے جوتوں میں یوں چپک گیا تھا، جیسے ایلفی لگا کر ایڑیوں اور تلووں سے جوڑا گیا ہو۔

اور تب میں نے ہنسی کی آواز سنی۔

کانوں میں رس گھولنے والی، ہنسی کی وہی آواز، جس کے سامنے ساری سکون بخش دوائیں اور سارے مشروب ہیچ تھے، مدھم ہوتی ہوئی معدوم ہو گئی۔

لوسی تصویر پر جھکی اسے صاف کر رہی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ لہولہان ہو چکے تھے۔ آنکھوں سے تربوز جتنے موٹے موٹے آنسو بہہ رہے تھے اور منہ سے سسکیوں کے ساتھ ٹوٹے ہوئے جملے نکل رہے تھے۔

"شما کر دینا پربھو! میں نے کوئی اپرادھ نہیں کیا ہے۔ میں تو سدا کی تمہاری ہوں۔ تم اب بھی اتنے ہی پیارے ہو، جتنے اس وقت تھے، جب تمہاری آنکھ سلامت تھی، اور جب تمہاری ناک نہیں کٹی تھی۔ اور جب تمہارے سینے پر گھاؤ نہیں آئے تھے۔ اور جب تمہارے وہ چرن موجود تھے، جن کے آگے جھک کر سنسار کی خوشیاں سمیٹی جاتی تھیں۔ میں بے قصور ہوں، پھر بھی بنتی کرتی ہوں کہ میرا قصور معاف کر دو۔"

تصویر کو خون رستے ہوئے ہاتھوں سے اس طرح اُٹھا کر، جیسے وہ اُس کے اکلوتے بچے کی

لاش ہو، اُس نے قوم کے گدے پر رکھ دیا، اُس کی پیشانی کو چوما جو شیشے کی کرچیوں سے محفوظ گئی تھی، پھر تصویر پر چادر ڈالی اور ساڑھی کے پلو کو کمر میں اڑستی ہوئی، آنسو خشک کر کے مخاطب کر کے بولی۔

"مجھے معلوم تھا...... اچھی طرح معلوم تھا۔" بے انتہا غصے کی وجہ سے اُس کی آواز لرز رہی تھی۔ "تم میری بات ہرگز نہیں مانو گے۔ کیونکہ نہ تمہیں فضیلہ سے کوئی محبت ہے، نہ امریتا سے لگاؤ ہو۔ تم ہوس کے بندے اور روپ کے لوبھی ہو۔ مگر یہ نہیں معلوم تھا کہ ویشیا بھگت کی نفرت میں اس حد تک آگے نکل جاؤ گے کہ ان کا اپمان تک کرنے سے نہیں چوکو گے۔ دعا دو ویشیا بھگت کو کہ انہوں نے تم سے خود اپنے اپمان کا بدلہ نہیں لیا، ہمارے حوالے کر دیا۔ اگر وہ بدلہ لیتے تو آکاش ٹوٹ کر تمہارے سر پر آ گرتا۔ دھرتی پھٹ جاتی اور تم اس میں سما جاتے۔"

میں نے پشیمان ہوتے ہوئے کہا۔ "جو کچھ ہوا ہے، وہ بالکل بے اختیاری طور پر ہوا۔ میرا اس گندے فعل میں کوئی عمل دخل نہیں۔ میں تو پورے وشواس کے ساتھ ویشیا بھگت کے قدموں میں سر جھکانے گیا تھا۔ مگر کسی نے مجھے دھکا دے دیا اور میں توازن برقرار نہ رکھ سکا۔"

"آنکھوں میں دھول جھونکنا اسی کو کہتے ہیں۔ میرے اور تمہارے علاوہ یہاں کوئی تیسرا نہیں ہے، نہ آسکتا ہے۔ پھر بھی اپنے گھناؤنے جرم کی پردہ پوشی کے لیے کسی اور کو مورد الزام ٹھہرا رہے ہو۔" دانت تو وہ پہلے ہی پیس رہی تھی، اچانک ہی اُس کا لہجہ بھی بدل گیا۔ "مہاراج بھگت کی آمد تک تم یہیں قید رہو گے۔ وہی فیصلہ کریں گے کہ ایسے شخص کے ساتھ، جو جس تھالی میں کھاتا ہے، اسی میں چھید کرتا ہے، کیا سلوک کیا جائے؟"

"تم حد سے بڑھتی جا رہی ہو، لوسی!" مجھے بھی غصہ آ گیا۔ "ویشیا بھگت کی جو عزت تمہارے دل میں ہے، وہی میرے دل میں بھی ہے۔ میں ان کا اپمان کرنا نہیں چاہتا تھا۔ تم سے زیادہ یہ بات کو وہ جانتے ہیں۔ نہ جانتے تو جیسا کہ تم نے کہا تھا، آسمان میرے سر پر گر چکا ہوتا، دھرتی پھٹ کر مجھے اپنی آغوش میں لے چکی ہوتی۔ اگر تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں ہے تو میں مزید کوشش نہیں کروں گا، بلکہ صحیح معنوں میں بے اعتبار بن جاؤں گا۔ اور فضیلہ کو بتا دوں گا صرف یہ کہ تم مجھے لوسی اور نینسی والے راز سے آگاہ کر چکی ہو، بلکہ اسے جھوٹی، مکار اور کہتی رہی ہو۔"

میری دھمکی کارگر ثابت ہوئی۔ اُس کا غصہ دھیما پڑ گیا، چہرے اور آنکھوں سے خوف ظاہر ہونے لگا۔

"مجھے شروع سے بتاؤ، کیا ہوا تھا؟" اُس نے قدرے نرم لہجے میں کہا۔

"تم سے کوئی بات چھپی ہوئی نہیں ہے۔ سارا منظر تمہاری نظروں کے سامنے تھا۔

میرے دل میں ویشیا بھگت کی محبت اور عقیدت نہ ہوتی تو میں ہاتھ جوڑ کر ان کی تصویر تک نہ جاتا۔ تم نے خود اپنی آنکھوں سے مجھے لڑکھڑاتے اور گرتے ہوئے دیکھا ہے۔ میرا خیال ہے، مجھے دھکا دیا گیا ہے۔"

"نہیں...... دھکا نہیں دیا تھا۔ بلکہ جہاں تک میں نے اندازہ لگایا ہے، تم پھسل گئے تھے۔ دراصل میں نے ایک روز قبل ہی یہاں کے فرش کو دھو کر موم سے چمکانے کی کوشش کی تھی اور تمہیں جوتے پہن کر چلنے سے منع کرنا بھول گئی تھی۔ ساری بات اب سمجھ میں آ رہی ہے۔ فرش کو موم سے چمکایا گیا ہو تو کتنی ہی احتیاط سے کیوں نہ کام لیا جائے، جوتے پہننے والوں کے پیر ضرور پھسلتے ہیں۔"

"شاید یہی ہوا ہو۔" میں نے کہا۔ "اور میں سمجھ بیٹھا ہوں کہ کسی کے دھکا دینے سے میرے قدم لڑکھڑا گئے ہیں۔"

وہ جھینپے ہوئے انداز میں ہنسنے لگی۔ "ایک طرح سے دیکھا جائے تو غلطی میری اپنی تھی۔ نہ میں فرش پالش کرتی، نہ تم لڑکھڑا کر گرتے اور نہ ویشیا بھگت کی تصویر کو نقصان پہنچتا۔"

"شکر ہے کہ تم بہت جلد اصل بات تک پہنچ گئیں۔"

"یہ بھی ویشیا بھگت کا چمتکار ہے کہ انہوں نے صحیح اور سچی بات میرے دل میں ڈال دی۔" اس نے کہا اور آگے بڑھ کر میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بالکل ہی مختلف لہجے میں بولی۔ "ریستوران میں اور پلیٹ فارم پر میرے اور تمہارے درمیان جو گفتگو ہوئی تھی، مجھے یقین ہے کہ تم اس کا ذکر فضیلہ سے یا کسی اور سے نہیں کرو گے۔"

"ایک شرط پر۔" میں نے کہا۔ "میں فضیلہ سے تھوڑی سی بے وفائی کرنا چاہتا ہوں۔"

لوسی بے اختیار ہنس پڑی۔ اسے کوئی اعتراض نہیں تھا۔ وہ تو دل سے چاہتی تھی کہ اس سے بے وفائی کی جائے۔ شاید اسی وجہ سے وہ مجھے فضیلہ کے عیب گنواتی رہتی تھی۔

رات میں نے تہہ خانے میں گزاری۔ صبح سے کچھ پہلے لوسی نے مجھے کٹیا میں منتقل کر دیا اور خود ایک چھوٹی سی کشتی میں بیٹھ کر ناشتے کا انتظام کرنے چلی گئی۔

فضیلہ دوپہر کے بعد آئی۔ اس لیے صبح کا ناشتہ میں نے لوسی کے ساتھ کیا اور ناشتے کے دوران میں نے شہر کے کثیر الاشاعت روزنامے کا مطالعہ کیا۔

شہر کے اخبارات وہاں دس بجے کے بعد پہنچتے تھے۔ اخبار کی خبروں کے مطابق شہر کے حالات معمول پر آ چکے تھے۔ دن کا کرفیو ختم کر دیا گیا تھا۔ صرف رات رات کا کرفیو باقی تھا اور توقع کی جا رہی تھی کہ اگلے جمعے کو حالات کا جائزہ لینے کے بعد اسے بھی ختم کر دیا جائے گا۔ اسکول اور کالج کھلے دو دن ہو چکے تھے۔ پہلے دن حاضری کم تھی، لیکن دوسرے دن اس میں اچھا

خاصا اضافہ ہو گیا تھا۔

"کاش!" میں نے مکمل پوری کا بڑا سا نوالہ بنا کر منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔ "یہاں آ... سے قبل تم نے میرے کالج اور اسکول میں فون کر دیا ہوتا کہ چند مجبوریوں کے تحت مجھے مزید دو چھٹی لینا پڑے گی اور یہیں قیام کرنا پڑے گا اور بدھ کے دن کالج میں پڑھنے اور اسکول پڑھا آ سکوں گا۔"

"میں نے آج تک اپنے کام سے غفلت نہیں برتی۔" وہ بولی۔ "جس طرح کہہ رہے... اس طرح تو نہیں، البتہ تمہاری خواہش پوری کی جا چکی ہے۔ فون پر فضیلہ کے ابو سے کہہ د... ہے کہ کالج اور اسکول میں منگل وار تک تمہاری چھٹی کی درخواست بھیج دیں۔"

"تم تو واقعی جینئس ہو۔" میں نے تعریفی انداز میں کہا۔ اور ایک پوری منہ میں ٹھونس لی۔

"ایک اور بات بتاؤں؟" وہ بولی۔ "منگل وار کی صبح فضیلہ کے ابو یہاں آ رہے ہیں۔"

"یہ کوئی اچھی خبر نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "یہاں آ کر میری طرح انہیں بھی علم ہو جا... کہ فضیلہ مر چکی ہے۔ میں سخت دل تھا، اس صدمے کو برداشت کر گیا۔ مگر وہ برداشت نہیں کر... گے۔ ناشتے کے فوراً بعد شہر واپس جاؤ اور کوئی اچھا سا بہانہ بنا کر انہیں دوبارہ فون کر دو کہ... آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مثلاً یہ کہہ دو کہ آج شام ہم سیر و سیاحت کے لیے پہاڑی علاقو... جا رہے ہیں۔ پیر اور منگل کے دن سیر کر کے بدھ کی صبح گھر پہنچ جائیں گے۔ اس دوران اگر... کے ابو یہاں آئے تو پریشان ہوں گے اور مایوسی کے علاوہ کچھ بھی ہاتھ نہ آئے گا۔"

"انہیں فون کرنا بے سود ہے۔ کیونکہ اب تو وہ اپنے بزنس کے سلسلے میں ٹور پر نکل چکے... گے۔ حقیقت میں انہیں ایجنٹوں سے مل کر آرڈر لینا تھے۔"

فضیلہ کے ابو الیکٹرونکس کا کام کرتے تھے۔ اور کچھ فرموں کی طرف سے انہیں... صوبے کا ڈسٹری بیوٹر مقرر کیا گیا تھا۔ وہ سال میں کم سے کم دو کاروباری دورے ضرور کیا... تھے اور جب بھی دورے پر جاتے تھے، اپنے ایجنٹوں کے لیے بیش قیمت تحائف بھی لے... تھے۔ یہی وہ کاروباری راز تھا، جس کی بناء پر دوسری کمپنیوں اور فرموں کے ڈسٹری بیو... مقابلے میں پورے علاقے میں ان کا طوطی بول رہا تھا۔

پوری کا نوالہ میرے حلق میں اٹکنے لگا تھا۔

"کوشش کر دیکھو۔ ہو سکتا ہے کہ وہ ابھی روانہ نہ ہوئے ہوں۔ براہِ راست ان سے... ہو سکے تو فضیلہ کی امی کو مطلع کر دینا۔ انہیں ان ایجنٹوں کے فون نمبر معلوم ہوں گے، جن... صاحب ملنے گئے ہیں۔"

"ٹھیک ہے، تم ناشتہ کر لو۔ میں شہر جا کر فضیلہ کے گھر فون کرتی ہوں۔" وہ بولی۔...

اب آتی ہی ہو گی۔ اُس سے گفتگو کرتے ہوئے بہت احتیاط سے کام لینا۔ اُسے ان باتوں کا علم نہ ہونے پائے، جو ہم دونوں کے درمیان ہوتی رہی ہیں۔ یہ بھی مت بتانا کہ تمہیں یہاں کے تہہ خانے کے بارے میں پتہ چل چکا ہے۔ وہ اُڑتی چڑیا کے پَر گنتی ہے۔ ہر بات سمجھ جائے گی۔"

یہ کہہ کر لوسی کٹیا سے روانہ ہو گئی۔

❁

فضیلہ، جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں، دوپہر کے بعد اس وقت آئی، جب میں ریڈیو پر ایک معلوماتی پروگرام سن رہا تھا۔

لوسی اس کے آنے سے قبل ہی فضیلہ کی امی کو پیغام پہنچا کر واپس آ چکی تھی۔ لوسی سوا دس بجے جزیرے پر واپس آئی۔ اس کی آمد کے تقریباً پندرہ منٹ بعد، جب میں دریا کے کنارے آنکھیں بند کیے نیم دراز تھا اور بھیگی ہوئی ٹھنڈی ہوا سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ کنارے پر ایک کشتی کے رُکنے، کشتی پر وہ تختہ رکھنے، جس کے ذریعے خشکی پر آیا جاتا تھا اور ایک ملاح کے بولنے کی آوازیں میرے کانوں میں پڑیں۔ میں اسی طرح آنکھیں بند کیے بے نیازی سے پڑا رہا۔ راج کنڈل کا جزیرہ چھوت چھات اور بھید بھاؤ کے عیب سے پاک تھا، اس لئے ہندو ہی نہیں، ہر مذہب کے لوگ وہاں تفریح کرنے اور پکنک منانے آتے جاتے رہتے تھے۔ میں سمجھا کہ وہی لوگ آئے ہوں گے۔

اسی اثناء میں ریت پر کسی کے چلنے کی آواز سنائی دی۔ یہ آواز میرے قریب آ کر رک گئی۔ میں نے ایک آنکھ کھول کر دیکھا۔ سامنے جان کھڑا تھا۔ میرے اور اُس کے درمیان بمشکل ایک گز کا فاصلہ ہو گا۔

"تم......؟" میں اُچھل کر بیٹھ گیا۔ آنکھیں کھول کر اس کے سیاہی مائل سانولے چہرے پر نظریں جمائیں۔ "تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

وہ سکون سے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ "پورنما کہاں ہے؟ میں اُس سے ملنا چاہتا ہوں۔"

میں نے ہی اسے لوسی کا نام پورنما بتایا تھا۔

"تم سے کس نے کہا کہ پورنما یہاں مقیم ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کل میں ایک ریستوران سے نکل کر ایک جنرل اسٹور پر جا بیٹھا۔ اور اس وقت تک وہیں بیٹھا رہا، جب تک پورنما واپس نہیں آئی۔ آپ نے کہا کہ وہ پولیس کو بلانے گئی تھی، مگر وہ پولیس کے بغیر آئی تھی۔ کچھ دیر بعد آپ دونوں ریستوران سے نکل کر اسٹیشن کے ایک بنچ پر جا بیٹھے۔ میں ... اسٹور سے اُٹھ کر پلیٹ فارم پر چلا گیا اور بک اسٹاپ پر رک کر آپ دونوں کو دیکھتا رہا۔"

"کیوں؟" میں نے کہا۔ "تم نے یہ غیر اخلاقی حرکت کیوں کی؟"

"میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ پورنما کی شکل میری آنجہانی بیوی کی شکل سے بہت مشا
رکھتی ہے۔ دونوں میں کوئی فرق نہیں کیا جا سکتا۔ اسے دیکھ کر میری پچھلی یادیں تازہ ہو گئیں۔

"یہاں کس طرح پہنچ گئے؟" میں نے قدرے تلخ لہجے میں کہا۔

"میں نے آپ دونوں کے تانگے کا پیچھا کیا تھا، پھر کشتی میں بیٹھ کر جزیرے تک
ہوئے دیکھا تھا۔ ایک کشتی بان سے درخواست کی کہ وہ مجھے جزیرے پر چھوڑ دے۔ مگر ا
پچاس روپے مانگ لیے۔ میری جیب میں اس وقت صرف چار روپے تھے۔ اب کرائے کا
کر کے آیا تو دوسرے کشتی بان نے صرف دس روپے میں پہنچا دیا۔ اب تو بتا دیجیے کہ پورن
ہے؟"

"کیا کرو گے اس سے مل کر؟"

"اس کی سریلی آواز سنوں گا اور اس کے دیدار سے اپنی آنکھیں سینکوں گا۔ اور اگر ا
وہ غیر شادی شدہ ہے تو ہاتھ جوڑ کر درخواست کروں گا کہ میری بن جائے۔ اور کسی وجہ
نہ بن سکے تو کم از کم ہر دوسرے تیسرے روز مجھے اپنا چاند سا چہرہ دیکھنے کی اجازت تو دے

"مسٹر جان!" میں نے اس کے والہانہ جذبے سے متاثر ہو کر کہا۔ "میں نہیں جا
تمہاری درخواست قبول کرے گی یا نہیں، تاہم مجھے تم سے ہمدردی ہو گئی ہے۔ یہاں کئی
کی مورتیاں ہیں۔ وہ ان ہی میں سے کسی کے قدموں میں سر جھکائے بیٹھی ہو گی۔ جا
تلاش کر لو۔"

آخری جملہ میں نے اسے ٹالنے کے لیے کہا تھا۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ لوی تہہ خ
آرام کر رہی ہو گی اور جان کا اسے تہہ خانے تک، جہاں پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا تھا، گز
سکے گا۔ اُسے بے نیل و مرام واپس جانا پڑے گا۔

جان کے جانے کے بعد مجھے نیند آ گئی۔ نیند آئی تو خواب آیا۔ خواب میں خوب صـ
تراشے گئے، سنہرے بالوں والی ننھی سی، پیاری سی فضیلہ کاپی پر نظریں جمائے بیٹھی تھی۔

"بھائی جی!" اچانک اُس نے کاپی سے نظریں ہٹا کر میری طرف دیکھتے ہوئے کہ
کتنی اچھی ہوتی اگر اس میں جیومیٹری نہ پائی جاتی؟"

"جیومیٹری نہ ہوتی تو یہ دنیا چوپٹ ہو جاتی۔ یہ بڑی بڑی عمارتیں، بڑے بڑ
بڑی بڑی ایجادات جیومیٹری ہی کی بدولت ہیں۔ زاویہ قائمہ کی تعریف یاد ہوئی یا نہیں؟"

"اللہ، بھائی جی!" وہ تقریباً چیخ پڑی۔ "آپ کی تو مونچھیں نکل رہی ہیں۔ ناک
کیسے موٹے موٹے بال نظر آ رہے ہیں۔ آئینہ لاؤں؟"

"فضول باتیں نہ کرو۔ زاویہ قائمہ کی تعریف سناؤ۔"

"جب ایک صراطِ مستقیم، دوسری صراطِ مستقیم پر........"

"کیا بکواس ہے؟........ صراطِ مستقیم کہاں سے آ گئی؟"

"میں تو خطِ مستقیم کہہ رہی ہوں۔ ویسے بھائی جی! ایک بات بتائیں گے؟"

"پہلے زاویہ قائمہ۔"

"بس یہ بتا دیجیے کہ جب مر جائیں تو بولتے کیوں نہیں؟"

"مجھے نہیں معلوم۔"

"شاید سب سے رُوٹھ جاتے ہیں؟"

"ہاں۔" میری آنکھوں میں رخسانہ اُبھر آئی۔ "ساری دنیا سے روٹھ جاتے ہیں۔"

"مگر بھائی جی! مجھے تو رُوٹھنا ہی نہیں آتا۔ میں مروں گی تو کسی سے بھی نہیں رُوٹھوں گی۔
سب کہیں گے چھی، چھی، چھی! کیسی بے وقوف لڑکی ہے۔ ٹھیک سے مرنا بھی نہیں جانتی۔ ہم سے
رُوٹھنے کے بجائے دانت نکال رہی ہے۔"

"بس فضیلہ! اب چھٹی کرو۔ تمہاری کھوپڑی میں بھُس بھرا ہوا ہے۔ ساری زندگی تمہیں
جیومیٹری یاد نہیں ہو سکتی۔"

"کلاس کے ٹیسٹ میں میرے دس میں سے نو نمبر آئے ہیں۔" وہ بولی۔ "نورین باجی کی
ایک بات بتاؤں؟"

"بتاؤ۔" میں ہمہ تن گوش ہو گیا۔

"کل بتاؤں گی۔ آج تو آپ چھٹی کے لیے کہہ رہے ہیں، اور میں بھی زاویہ قائمہ یاد کرتے
کرتے تھک گئی ہوں۔"

"نورین کی بات بتاؤ، فضیلہ! نورین کی بات بتاؤ۔"

منظر پلٹ گیا........ فضیلہ کا سبق مثلث تک پہنچ گیا تھا اور وہ لہک لہک کر یاد کر رہی تھی۔

"مثلث کے تینوں زاویوں کا مجموعہ ہمیشہ ایک سو اسّی ہوتا ہے........ مثلث کے تینوں
زاویوں کا مجموعہ ہمیشہ ایک سو........"

اچانک اُس نے خاموش ہو کر میری طرف دیکھا۔

"بھائی جی!" وہ بولی۔ "اگر کسی مثلث کے زاویوں کا مجموعہ ایک سو اسّی ہو جائے، تو؟"

"یہ ناممکن ہے۔"

"ابو کہتے ہیں، دنیا میں کچھ بھی ناممکن نہیں ہوتا؟"

"جیومیٹری میں ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔ "تم یہاں پڑھنے آتی ہو یا باتیں بنانے؟"

"آتی تو پڑھنے ہی کے لیے ہوں، پر کیا کروں، باتیں خود بخود بننے لگتی ہیں۔ کبھی کبھی تو ایسا

معلوم ہوتا ہے، جیسے آپ سب کو جانتے ہیں۔ جی چاہتا ہے، آپ سے ہر بات پوچھ کر آپ
طرح عالم فاضل بن جاؤں۔"

"سبق یاد کر کے پوچھ لیا کرو۔" میں نے خوش ہو کر جواب دیا۔ "اسلامیات کی مس
ہیں، جو طالب علم خاموش بیٹھا رہتا ہے اور کوئی سوال نہیں کرتا، وہ بدھو ہوتا ہے۔"

"جبھی تو کوئی نہ کوئی بات پوچھتی رہتی ہوں۔ اچھا یہ بتائیے، شہید لوگ تو زندہ ہوتے
ناں؟"

"ہاں! ہمارا ایمان ہے کہ شہید زندہ ہوتے ہیں۔ اللہ کی طرف سے انہیں باقاعدہ رزق
جاتا ہے۔ جس کا یہ عقیدہ نہ ہو، وہ کافر ہے۔"

"آپ بڑے ہو کر کیا بنیں گے، بھائی جی؟" اُس نے پوچھا۔

میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "ڈاکٹر یا انجینئر بننے کا ارادہ تھا۔ مگر اس کے لیے سا
پڑھنا پڑتی ہے۔ سوچ رہا ہوں کہ بڑا ہو کر ڈپٹی کمشنر بن جاؤں گا۔"

"میں بتاؤں، میں بڑی ہو کر کیا بنوں گی؟"

"کسی دُولہا کی دُلہن۔"

وہ شرمائی نہیں، منہ بنا کر بولی۔ "اونہہ...... دُلہن تو سبھی لڑکیاں بنتی ہیں اور دُولہا ہر
لڑکے کو بننا پڑتا ہے۔ آپ بھی دُولہا بنیں گے اور دُولہا بننے کے علاوہ ڈپٹی کمشنر بھی بنیں گے
طرح میں بھی دُلہن بننے کے علاوہ......" فضیلہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گئی اور اپنی
بڑی آنکھوں سے میرے چہرے کی طرف دیکھا، پھر ایک عجیب سی ملکوتی مسکراہٹ کے ساتھ
مکمل کر دیا۔ "شہید بھی بنوں گی۔"

"بے وقوف......" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "شہید ہونے کے لیے اللہ کی راہ میں قتل
پڑتا ہے۔"

"ہمیشہ ہمیشہ زندہ رہنے کے لیے میں اللہ کی راہ میں قتل ہو جاؤں گی۔ اور جب قتل ہو
گی تو زندہ ہو جاؤں گی اور بار بار آپ کے پاس جیومیٹری پڑھنے آؤں گی۔"

"ایسی باتیں مت کرو، فضیلہ!"

"پھر کیسی باتیں کروں؟ کیا شہید بننے کی تمنا نہیں کرنی چاہیے؟"

منظر بدل گیا۔ فضیلہ خون میں لت پت پڑی تھی۔ کار ہسپتال کی جانب دوڑ رہی تھی
پوری قوت سے چلا رہا تھا۔ "مرنا نہیں، فضیلہ!...... مرنا نہیں۔"

اس کے ساتھ ہی میری آنکھ کھل گئی۔ بغل میں پاکٹ ریڈیو پڑا تھا، جسے چلتا چھوڑ کر
گیا تھا۔ یہ وہ وقت تھا کہ اناؤنسر ایک پروگرام کا اعلان کر رہی تھی۔ میرا دل زور زور سے

رہا تھا۔ اسی عالم میں، میں نے ہاتھ بڑھا کر ریڈیو آف کر دیا اور اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

کنارے پر ایک کشتی آ کر رکی تھی۔ اور کشتی سے اُتر کر تختے پر احتیاط سے قدم اُٹھاتی ہوئی
فضیلہ، خشکی پر آ رہی تھی۔ اور وہ بچی اُس کے ساتھ نہیں تھی۔ کشتی میں صرف ملاح تھا، جو واپس
جانے کے لیے چپو کی مدد سے کشتی کا رُخ موڑ رہا تھا۔

میری نظریں فضیلہ پر مرکوز ہو کر رہ گئیں۔ یہ بات تو علمائے دین ہی بتا سکتے تھے کہ اسے
شہادت کا درجہ حاصل ہوا تھا یا نہیں، تاہم ایک بات یقینی تھی کہ فضیلہ مر کر بھی مری نہیں تھی۔

"اچھا...... تو جناب یہاں گیلی ریت پر پڑے آرام فرما رہے ہیں؟" وہ مسکراتی ہوئی
میرے پاس بیٹھ گئی۔

"کہاں غائب ہو گئی تھیں؟" میں نے شکایت کی۔ حالانکہ مجھے معلوم تھا کہ وہ کہاں گئی تھی
اور کیوں گئی تھی؟ فضیلہ کو دیکھ کر تھوڑی سی خوشی بھی ہوئی تھی کہ وہ خالی ہاتھ واپس آئی ہے۔ اور وہ
معصوم بچی ایک بار پھر اس کا شکار ہونے سے بچ گئی ہے۔"

"یاترا پر آئی ہوئی لڑکی کہاں ہے؟" میں نے فضیلہ سے ذرا انجان بن کر پوچھا۔

"وہ بچی...... وہ بیچاری سی معصوم بچی۔ اُس کے ماتا پتا اُس کو زبردستی لے کر واپس جا رہے
تھے۔ اتنی مہلت ہی نہیں ملی کہ آپ کو اطلاع دیتی۔ دوسرے یہ اطمینان بھی تھا کہ آپ کی دیکھ
بھال کے لیے سنتر موجود ہے۔ اور میری روانگی کے بارے میں آپ کو اسٹیشن پر پوچھ گچھ کے
دوران کسی نہ کسی سے ضرور پتہ چل جائے گا۔ کیا کسی نے آپ کو کچھ نہیں بتایا؟"

"ایک برتن بیچنے والے نے بتا دیا تھا۔ لیکن جب تک اس نے نہیں بتایا، طبیعت پریشان
رہی۔ تمہیں اس طرح اطلاع دیئے بغیر اجنبیوں کے ساتھ نہیں جانا چاہیے تھا۔"

"غلطی ہو گئی...... آئندہ نہیں ہو گی۔"

اس نے کچھ ایسے ساجت آمیز لہجے میں کہا کہ میں متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ غلطی اس سے
نہیں، مجھ سے بھی ہوئی تھی۔ میری غلطی اس کی غلطی سے زیادہ بڑی تھی۔ وہ تو صرف یاتریوں کے
ساتھ جانے کی مجرم تھی، جبکہ میں نے تہہ خانے میں رات گزارنے کا ناقابلِ معافی جرم کیا تھا۔
ایک بڑے مجرم کو چھوٹے مجرم سے جواب دہی کا حق نہیں پہنچتا تھا۔ خصوصاً ایسی صورت میں،
جب کہ چھوٹا مجرم نادم ہو اور وعدہ کر رہا ہو کہ دوبارہ جرم کا ارتکاب نہیں کرے گا۔

"تمہیں یہ سن کر حیرت ہو گی کہ جسے ہم لوسی سمجھتے آئے ہیں۔" میں نے موضوع بدلتے
ہوئے کہا۔ "وہ لوسی نہیں، لوسی کی بہن نینسی ہے۔"

پھر میں نے فضیلہ کو وہ واقعات سنائے، جو اُس کے جانے کے بعد پیش آئے تھے۔ اُس نے
تسلیم کیا کہ وہ لوسی نہیں، وہ اس کی جڑواں بہن نینسی ہے۔

پہلی بار میں نے فضیلہ کی آنکھوں میں آنسو دیکھے۔ اُس کے گلابی ہونٹوں کے گوشے رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے وہ انتہائی صبر و ضبط سے کام لے کر اپنے آپ کو رونے روک رہی ہو۔ میں نے کوئی ایسی بات تو نہیں کہی تھی، جو اس کے دل پر اثر انداز ہوتی۔

''رو رہی ہو، فضیلہ؟''

میرا پوچھنا قیامت ہو گیا۔ صبر و ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے۔ وہ ننھی سی بچی کی میرے سینے سے چمٹ گئی اور بلک بلک کر رونے لگی۔ میں حیرت سے اُس کی پیٹھ کو تھپتھپانے سمجھ میں نہیں آیا، ایکا ایکی اس کے اس طرح رونے کا سبب کیا ہے۔ اس سے بھی زیادہ حیرت وقت ہوئی، جب اچانک اس نے میرے سینے سے سر ہٹا کر اپنے واحد ہاتھ سے خوف زدہ میں آنسو خشک کر کے، گھبرا کر چاروں طرف دیکھا، جیسے کسی نے اُس کی اس حرکت کو دیکھ نہ لیا

''آیئے!'' اس نے میرا ہاتھ تھام کر کہا۔ ''کٹیا میں چلیں۔''

''بہت سے سوال تھے، جو میرے ذہن میں گردش کر رہے تھے۔ وہ، جو ترشولی تھی، جس سے ساری دنیا ڈرتی تھی، جس نے نہ جانے کتنے سہاگ لوٹ لیے تھے، کتنے بچوں، بچیوں کو بازو سے محروم کر دیا تھا اور کتنوں کو اپنے پیٹ میں اتار چکی تھی، ایک چھوٹی سی کہانی سن پریشان کیوں ہو گئی تھی؟

مگر میں جانتا تھا کہ اس سے کچھ پوچھنا بے سود ہو گا۔ وہ فضیلہ نہیں تھی کہ ہر بات دیتی۔ ترشولی سے سچ کی توقع کرنا ایسا ہی تھا، جیسے کسی بیل سے دودھ دوہنے کی کوشش کرنا نے ہمیشہ دھوکے دیئے تھے، ہمیشہ غلط بیانی سے کام لیا تھا اور ہمیشہ نقصان ہی پہنچایا تھا۔ ا وجہ تھی کہ راج کنڈل پہنچ کر اور حقیقت سے آگاہ ہو کر میں نے خود کو ترشولی کے رحم و کرم دیا تھا۔ ایسا نہ کرتا تو ڈھول کی کھال کی طرح رہی سہی فضیلہ سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتا۔ و ضرورت تھی۔

کٹیا کی طرف جاتے ہوئے میں نے تلخی دور کرنے کے لیے ایک بار پھر موضوع بد

''لوی نے تمہارے گھر فون کیا تھا۔ سب خیریت سے ہیں۔ اور تمہارے ابو نے کہا ہے کے دن یہاں راج کنڈل آ رہے ہیں۔''

''ابو، راج کنڈل آ رہے ہیں؟'' اُس نے خوشی سے کسی چڑیا کی طرح چہک کر کہا۔ اگ ہاتھ ہوتا تو شاید وہ خوشی سے تالیاں بجانے لگتی۔

''تمہیں خان صاحب کے آنے کی خوشی ہو رہی ہے؟''

اُس کی خوشی کافور ہو گئی۔ اُس کے چہرے کا رنگ بدل گیا، آنکھیں شعلے برسانے لگیں

''گیدڑ کی موت آتی ہے تو شہر کی طرف بھاگتا ہے۔'' اُس نے بدلے ہوئے لہجے

''بڑے میاں آئیں گے تو زندہ نہیں جائیں گے۔ اور اگر بچ جائیں گے تو اپنے ہاتھ سے ضرور ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔''

''فضیلہ!'' میں نے مدھم لہجے میں کہا اور اس بات کا خیال رکھا کہ مزید برہم نہ ہونے پائے۔ ''یہ درست ہے کہ تم ان کی بیٹی نہیں ہو۔ مگر اس بیٹی کا جسم تو ہو، جو ان پر جان چھڑکتی ہے۔ خان صاحب کی شان میں اس منہ سے ایسے الفاظ اچھے نہیں لگتے۔ ویسے وہ یہاں آئیں گے نہیں۔ اب تک لوی نے فون کر کے انہیں یہاں آنے سے منع کر دیا ہو گا۔''

کٹیا میں پہنچتے ہی وہ یہ کہتی ہوئی لیٹ گئی کہ اسے نیند آ رہی ہے اور باقی باتیں اس وقت ہوں گی جب وہ سو کر اُٹھے گی۔

سورج دیوتا کا رتھ مغرب کی طرف رواں دواں تھا کہ لوی کٹیا میں آئی۔ وہ فضیلہ کی آمد کے بارے میں دریافت کرنے آئی تھی۔ فضیلہ کو دیکھ کر اُس نے اطمینان کا سانس لیا۔

''میں تو ڈر ہی گئی تھی کہ مہارانی صاحبہ ہمیں چھوڑ کر یاتریوں کے ساتھ ہی نہ چلی گئی ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''شکر ہے کہ واپس آ گئیں۔ مجھے مطلع کیے بغیر کتنے آرام سے پیر پسارے سو رہی ہیں۔''

میں، لوی کے پیچھے چلتا ہوا کٹیا سے باہر نکل آیا۔

''جان سے ملاقات ہوئی؟''

''کون جان؟......اچھا، جو میری بہن کا شوہر ہوا کرتا تھا؟ وہ یہاں آیا تھا؟''

''آیا نہیں تھا، آیا ہوا ہے۔ تعجب ہے، تمہاری اس سے ملاقات نہیں ہوئی۔''

''کس وقت کی بات ہے؟''

''تقریباً ساڑھے نو، دس بجے صبح کو۔''

''اب تو شام ہو رہی ہے۔ میرے خیال میں وہ مجھے تلاش کر کے واپس چلا گیا ہو گا۔ یہاں ہوتا تو اب تک اس سے مڈبھیڑ ہو گئی ہوتی۔''

''میں کم از کم اتنی توقع کر سکتا ہوں کہ وہ تم سے ملاقات کیے بغیر نہیں جا سکتا۔ اسے تم سے......میرا مطلب ہے، تمہاری آنجہانی بہن سے بے انتہا محبت تھی۔ وہ تمہارا چہرہ دیکھنے، تم سے باتیں کرنے اور شادی کرنے کے لیے آیا ہے۔''

''اگر وہ یہاں ہے، تو کہاں ہے؟''

''پجاریوں کے ساتھ کسی مورتی کے سامنے بیٹھا ہو گا۔''

''میں یکے بعد دیگرے تینوں پجاریوں کے پاؤں چھو کر اور ساری مورتیوں کو پرنام کر کے کٹیا میں آئی تھی۔ نہ کسی پجاری نے اس کا ذکر کیا، نہ وہ کسی مورتی کے سامنے نظر آیا۔''

"کچھ بھی ہو، وہ ہے یہیں۔ واپس جانے کے لیے کشتی کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اور تک مجھے علم ہے، یہاں صرف دو کشتیاں آئی تھیں۔ ایک وہ، جس پر وہ بیٹھ کر آیا تھا اور دوسر جس میں فضیلہ آئی تھی۔ دونوں ہی کشتیاں یہاں سے خالی گئی تھیں۔"

میں نے اس چھوٹی کشتی کا ذکر نہیں کیا، جسے راج کنڈل آنے جانے والے، شہر آنے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ آج کل وہ کشتی لوسی کے استعمال میں تھی۔ وہ اسی پر جا کر شہر سودا سلف اور کھانے پینے کی اشیاء لایا کرتی تھی۔ کشتی بان کا نام گوپی تھا۔ جو جزیرے کے حصے میں نیم کی چھاؤں میں پڑا اونگھتا رہتا اور چلم پیتا رہتا تھا۔ اُسے صبح شام مندر سے پرشاد ملتا ہے۔ اکثر یاتری اُسے دکشنا یعنی خیرات کے طور پر بڑی رقمیں دے جاتے تھے، جنہیں وہ سود پر شہر میں اناج کے بیوپاری کے پاس جمع کرا دیتا تھا۔ راج کنڈل کے پجاریوں یا لو ایماء کے بغیر گوپی کسی کو نہیں لے جا سکتا تھا۔

"ٹھیک ہے۔" لوسی نے کہا۔ "تم کٹیا میں فضیلہ کے پاس جا کر بیٹھو، میں اس احمق کرتی ہوں۔"

"ایک منٹ۔" میں نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "میرے اور تمہارے درمیان انسانیت ہے۔ اسی رشتے کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں کہ فضیلہ سوتی کیوں ہے؟"

لوسی نے غور سے میرا چہرہ دیکھا، چند لمحوں کے لیے حیرت زدہ سی رہی اور پھر مسکرا۔

"میں سمجھ گئی کہ تم نے یہ سوال کیوں کیا ہے۔ شروع شروع میں اس سوال نے مجھے بھی بہ کیا تھا۔ بلکہ شبہ ہوا تھا کہ فضیلہ نے ڈھونگ رچایا ہے۔ روح ہے تو کھاتی پیتی کیوں ۔ کیوں ہے، عام انسانوں کی طرح دوسرے کام کیوں کرتی ہے؟ مگر جلد ہی معلوم ہو گیا بات کچھ اور ہے۔ تم نے جیسا دیس، ویسا بھیس والا مقولہ ضرور سنا ہو گا۔ بس یہی معاملہ ہے۔ روح کتنی ہی آزاد کیوں نہ ہو، جب کسی جسم میں جاتی ہے تو اس کے تابع ہو جاتی . ایسا نہ ہو تو اچھا بھلا جسم دو دن میں گل سڑ کر برابر ہو جائے۔"

وہ ہاتھ چھڑا کر رات کے کھانے کا انتظام کرنے چلی گئی اور میں تھکے تھکے انداز میں جانب قدم اُٹھانے لگا۔ فضیلہ کی جادوکاریوں اور ماورائی قوتوں کا مشاہدہ کرنے کے باوجو کیوں، اُسے سوتے دیکھ کر ایک چھوٹی سی آس بندھ گئی تھی کہ شاید وہ فضیلہ ہی ہو۔ درجنوں بار فضیلہ کو سوتے دیکھ چکا تھا۔ لیکن پہلے کبھی ایسا خیال ذہن میں نہیں آیا تھا۔ تا بندھی تھی، لوسی کی وضاحت کے بعد کچے دھاگے کی طرح ٹوٹ گئی تھی۔

رات کا کھانا بھنے گوشت پر مشتمل تھا۔ دو تھال لبالب بوٹیوں سے بھرے تھے۔ حساب سے بوٹیاں تھیں، جن کی گرم خوشبو سے پوری کٹیا مہک اُٹھی تھی۔ کوئی ایسا شخص،

تک پیٹ بھرا ہوتا، ان بوٹیوں کو دیکھتا تو اس کی رال بھی ٹپک پڑتی۔ مگر جب فضیلہ کو جگا کر کھانے کے لیے کہا گیا تو اُس نے بڑی بے اعتنائی سے کروٹ بدل کر کہا۔ "سونے دیجیے۔ مجھے بھوک نہیں ہے۔"

"تکے ہیں، فضیلہ!" لوسی نے کہا۔ "تمہاری پسندیدہ ڈش۔ یاد ہے، تم ابو سے کتنی ضد کر کے منگوایا کرتی تھیں؟"

"اس وقت میں کچھ بھی نہیں کھا سکتی۔ مجھے سونے دو، پلیز!"

"بدنصیب ہو۔" میں نے مسکرا کر کہا اور تھالوں پر ٹوٹ پڑا۔ نصف تھال صاف کر چکا تو سانس لینے کے لیے رکا۔ "اتنی سواد والی بوٹیاں میں نے پہلی بار کھائی ہیں۔" میں نے مزید بوٹیاں اُٹھا کر اپنے منہ میں ڈال لیں۔ "یہ گائے کا گوشت تو معلوم نہیں ہوتا۔"

"اندازہ لگاؤ۔" لوسی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"مرغابی کا گوشت ہے۔" میں نے کہا، پھر خود ہی اس کی تردید کر دی۔ "نہیں، مرغابی کے گوشت کی ایسی بوٹیاں کیسے بن سکتی ہیں؟ ہو نہ ہو، یہ ہرن کا گوشت ہے۔"

جواب میں لوسی نے کہا۔ "نہیں......یہ مور کا گوشت ہے۔"

"مور کا گوشت ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔ مگر بوٹیاں کھانا بند نہیں کیں۔ مور ہندوؤں کا مقدس پرندہ تھا۔ اس کی خاطر وہ اپنا سر کٹا دیتے تھے۔ عام موروں کو اتنی عزت دیتے تھے تو راج کنڈل کے مور کو جتنی عزت دیتے، کم تھی۔ "کسی پجاری کو پتہ چل گیا تو ہم میں سے کوئی بھی یہاں سے زندہ سلامت واپس نہیں جا سکے گا۔"

"ویشیا بھگت کی اِچھا یہی تھی۔"

میں ایک تھال کی بوٹیاں ختم کر چکا تو دوسرا تھال اپنے سامنے کھینچتے ہوئے بولا۔ "معاف کرنا، لوسی! ہر فعل میں ویشیا بھگت کو مت کھینچ لیا کرو۔ کیا وہ تم سے کہنے آئے تھے کہ مور کو پکڑ کر اس کے تکے بوٹیاں بنا ڈالو؟"

"تمہارا دل ابھی ڈانواں ڈول ہے۔ تم نے آج تک ویشیا بھگت کی برتری کو دل سے تسلیم نہیں کیا ہے۔" اس نے بگڑ کر جواب دیا۔ "عقل سے کام لو تو کبھی احمقانہ باتیں نہ کرو۔ دنیا کا کوئی کام ویشیا بھگت کے حکم اور اِچھا کے بغیر نہیں ہو سکتا۔"

"میں شری ویشیا بھگت کا اپمان نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ورنہ پوچھا جا سکتا تھا کہ ان کے چہرے پر میرے بوٹوں کی جو ٹھوکریں پڑی ہیں، کیا ان میں بھی ان کی اِچھا شامل تھی؟ بہتر یہ تھا کہ میں چٹ پٹی بوٹیوں سے لطف اُٹھاتا رہوں اور خاموشی سے لوسی کی تقریر سنتا رہوں۔

"مور میرے عقب میں چلتا ہوا تہہ خانے تک پہنچ گیا۔" لوسی کہہ رہی تھی۔ "میں اندر کا

دروازہ بند کرنے کے لیے مڑی تو وہ میرے سامنے کھڑا تھا۔ میں نے کہا۔ وشیا بھگت کی اچھ
ہوتی تو تم یہاں ہرگز نہ آتے۔ اب آ ہی گئے ہو تو کبھی باہر نہ جانے کے لیے اندر آ جاؤ.......
اندر داخل ہو گیا۔ تقریباً پون گھنٹے کے بعد اُس کا سر اور دھڑ الگ پڑا ہوا تھا اور میں اس کی بو
بنا رہی تھی اور خوش ہو رہی تھی کہ کھانے کا انتظام کرنے کے لیے شہر جانے کی زحمت سے بچ گئی
میں نے کہا۔ "میں تو صرف ایک بات جانتا ہوں۔ اگر میں نے مور کا گوشت نہ کھایا ہو
ہمیشہ کے لیے ایک بڑی نعمت سے محروم رہ جاتا۔ حقیقت یہ ہے کہ لاجواب گوشت ہے۔
تھال شروع کر چکا ہوں، پیٹ حلق تک بھر گیا ہے، لیکن طبیعت سیر نہیں ہوئی۔ جی چاہتا ہے کہ
ہی رہوں۔"

"تمہاری تعریف سے میری محنت سوارت ہو گئی۔" وہ بولی۔ "دل کھول کر کھاؤ۔ کڑاہی
اب بھی اتنی بوٹیاں پڑی ہیں کہ ایک تھال بھر سکتا ہے۔"

اچانک فضیلہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی۔ "مجھے تو شمشان جانا تھا۔"

بوٹیاں میرے حلق میں اٹکنے لگیں۔ میں نے سر اُٹھا کر لوسی کی طرف دیکھا کہ وہ شم
جانے کی وجہ پوچھے گی۔ مگر اس نے کہا۔

"اکیلی تو ہرگز نہیں جا سکو گی۔"

"میں کب اکیلی جاؤں گی؟" فضیلہ نے جواب دیا۔ "جلدی سے تیار ہو جاؤ، میں ا
کرنے جا رہی ہوں۔ اشنان کرتے ہی چل دوں گی۔ اب تک تو مجھے وہاں پہنچ جانا چاہیے تھا
"فضیلہ کا جو کام بھی ہوتا ہے، جلدی کا ہوتا ہے۔" فضیلہ اشنان گھر چلی گئی تو لوسی ۔
بناتے ہوئے کہا۔ "اسے آتے ہی بتانا چاہیے تھا۔"

لوسی کٹیا سے باہر جانے کے ارادے سے کھڑی ہو گئی تھی۔ میں نے ہاتھ پکڑ کر آ
آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ "شمشان کیوں جا رہی ہو؟"

"یہ بات تو فضیلہ ہی بتا سکتی ہے۔ میرا کام تو اس کا حکم ماننا ہے۔ ہاتھ چھوڑو۔ اس کے
سے پہلے تیار نہ ہوئی تو وہ ناراض ہو جائے گی۔"

"تم اس سے خوف زدہ کیوں رہتی ہو؟"

"اگر تم نے اس جنگلی بلی کو کسی بچے کا جسم بھنبھوڑتے دیکھا ہوتا تو یہ سوال ہرگز نہ پو
لوسی نے جھٹکا دے کر اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور تیز تیز قدم بڑھاتی ہوئی باہر نکل گئی۔

مجھے تھوڑی سی تشویش ہوئی، مگر تھال بوٹیوں سے بھرا ہوا تھا اور اس پر نظر پڑتے ہی
ساری تشویش رفع ہو گئی۔ سوچا کہ جلدی کیا ہے۔ فضیلہ شمشان سے واپس آئے گی تو ا
دریافت کر لوں گا۔ فی الحال تو مور کے تکوں سے لطف اُٹھانا چاہیے۔

دوسرے تھال کی نصف سے زیادہ بوٹیاں پیٹ میں اتار کر بیٹھا ہی تھا کہ فضیلہ دودھ جیسی کھدر کی سفید ساڑھی پہنے، گیلے سنہرے بالوں کو جھٹکتی ہوئی کٹیا میں داخل ہو گئی۔ ماتھے پر خون کے رنگ کی بندیا لگی ہوئی تھی۔ یوں تو وہ ہر لباس اور ہر روپ میں بے حد پیاری معلوم ہوتی تھی، لیکن سفید ساڑھی میں اُس کا حُسن اتنا نکھر گیا تھا کہ ساڑھی میلی لگنے لگی تھی۔

"مسٹر ابھی تک تیار نہیں ہوئی؟" اُس نے مجھ سے پوچھا۔

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا، کٹیا کے دروازے پر لوسی کا سر اُبھرا۔ "تم سے پانچ منٹ پہلے تیار ہو چکی ہوں۔" اور اگلے ہی لمحے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ "گوپی سے کشتی تیار کرنے کو کہنے چلی گئی تھی۔"

اُس نے بھی ویسی ہی کھدر کی سفید ساڑھی پہن رکھی تھی اور پیشانی پر ویسی ہی سرخ بندیا لگا رکھی تھی۔ فضیلہ وہاں نہ ہوتی تو اس کے حُسن کا بھی کوئی جواب نہیں تھا۔ جس طرح سورج کے سامنے چاند ماند پڑ جاتا ہے، اسی طرح فضیلہ کے سامنے وہ پھیکی پھیکی سی معلوم ہو رہی تھی۔

"آپ حیران ہو رہے ہیں کہ میں شمشان بھومی کیوں جا رہی ہوں۔" فضیلہ نے میرے بالوں سے کھیلتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔" میں نے منہ میں بوٹی رکھ کر کہا۔ "اب میں حیران ہونے کی کسی بات پر حیران نہیں ہوتا۔"

"یہ تو بڑی خوش آئند بات ہے۔" وہ بولی۔ "ایسے میں آپ کو اندھیرے میں نہیں رکھوں گی۔ واپس آ کر سب کچھ بتا دوں گی۔"

"واپسی کب ہو گی؟"

"دو گھنٹے آنے جانے کے اور ایک گھنٹہ شمشان گھاٹ کا۔" اس نے جواب دیا۔ "تین گھنٹوں سے زیادہ نہیں لگیں گے۔"

"چلو، فضیلہ! ایسا نہ ہو کہ ہمارے پہنچتے پہنچتے سب کچھ راکھ ہو جائے۔" لوسی نے کہا۔

پیٹ بھر چکا تھا، طبیعت سیر ہو چکی تھی۔ تھال میں رکھی ہوئی بوٹیاں ٹھنڈی ہو گئی تھیں۔
نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور منہ ہاتھ دھونے کے لیے سیڑھیوں کی طرف چل دیا۔ کھلے ہوئے حصے
ایک مورنی بے چینی سے اِدھر اُدھر گھومتی پھر رہی تھی اور تھوڑی دیر بعد منہ سے عجیب عجیب آواز
نکالنے لگتی تھی۔ شاید وہ اپنے مور کی تلاش میں تھی، جس کے تکے لوسی نے بنا ڈالے تھے۔
ہاتھ منہ دھو کر میں چہل قدمی کرنے لگا۔ مہینے کی آخری تاریخوں کا چاند تھا، جو ہلال
صورت میں گھٹتا جا رہا تھا۔ پھر بھی اس کی روشنی میں وہاں کا منظر بڑا بھلا معلوم ہو رہا تھا۔ پانی
لہریں جھلملا رہی تھیں۔ ان کی ترتیب کو کبھی کبھی کوئی بڑی مچھلی سطح آب سے کئی فٹ بلند ہو کر
چھپاکے کی تیز آواز کے ساتھ پانی میں گر کر توڑ دیتی تھی۔ عمارت کے گہرے سایوں نے دریا
ایک حصے کو اپنی لپیٹ میں اس طرح لے رکھا تھا کہ دور تک خشکی کا گمان ہوتا تھا۔
میں دن میں اتنا سو چکا تھا کہ نیند اُڑ چکی تھی۔ ٹہلتے ہوئے لطف آ رہا تھا۔ نصف چا
چاندنی نے سنگ مرمر کی دیواروں اور فرش کو ایک نیا حُسن عطا کیا تھا۔ تقریباً بیس منٹ
جزیرے کا پورا چکر لگا کر کھلے ہوئے حصے میں پہنچا تو وہی مورنی جو کچھ دیر پہلے بے چینی کے
منہ سے آوازیں نکال رہی تھی، ایک مور کی بغل میں بیٹھی تھی۔ مور اور مورنی دونوں کی آنکھیں
تھیں۔ یا تو مور اس کا جوڑا تھا یا پھر اس نے کسی دوسرے مور سے رشتہ قائم کر لیا تھا۔ انسانو
جانوروں میں بھی فرق نمایاں ہوتا ہے۔ شریک حیات کے بچھڑنے پر جانور جنم روگ لگا
بیٹھ جاتے بلکہ جلد از جلد تنہائی کے ساتھی کو تلاش کر لیا کرتے ہیں۔
میں نے جزیرے کا دوسرا چکر لگایا۔ دوسرے چکر کے دوران اچانک خیال آیا کہ تہہ خ
معائنہ کرنا چاہیے۔ لوسی کی موجودگی میں تہہ خانے کو اچھی طرح دیکھنے کا موقع نہیں ملا تھ
اسے راجہ داہر نے بنوایا تھا تو اس میں یقینی طور پر بہت سی قابل دید چیزیں موجود ہوں گی۔
بات کا بھی امکان تھا کہ کوئی ایسی سرنگ موجود ہو، جو براہ راست راجہ کے محل سے نکلتی ہو۔
لوسی کے بتائے ہوئے طریقے پر عمل کر کے میں تہہ خانے میں پہنچا۔ یہ وہی کمرہ تھ
میں، میں نے گزشتہ رات گزاری تھی۔ کمرہ اتنا تاریک تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ تک سجھائی نہیں

تھا۔ مگر مجھے اندازہ تھا کہ ماچس کہاں ہے، موم بتیاں کدھر ہیں اور گیس کی لالٹینیں کدھر رکھی
ہیں۔ اندازے سے چلتا اور درمیان میں آنے والی چیزوں سے ٹکراتا ہوا ماچس تک پہنچا۔ ماچس
کی تیلی جلا کر قریبی اسٹینڈ پر رکھی ہوئی موم بتی روشن کی۔ موم بتی کی پیلی روشنی چاروں طرف
پھیل گئی۔

اور تب میری نظر جان پر پڑی۔
اُس کی آنکھیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ منہ حیرت سے اس طرح کھلا ہوا تھا کہ سارے دانت
دکھائی دے رہے تھے۔ لیکن وہ مکمل جان نہیں تھا، گردن کٹا ہوا جان تھا۔ اُس کی گردن کو بڑی
خوب صورتی سے اس میز پر جمایا گیا تھا، جو مٹی کے تیل کے چولہے کے پاس رکھی تھی۔ تکلے کے
نیچے باقی جسم تھا، جس پر تکلے کا پانی ٹپک رہا تھا۔ وہیں قصائیوں والے دو چھرے پڑے تھے۔
ایک وہ چھرا جس سے گوشت کی بوٹیاں بنائی گئی تھیں اور دوسرا وہ، جس سے ہڈیاں توڑتے ہیں۔
جسم کی رانوں تک بوٹیاں کی جا چکی تھیں۔ صرف ہڈیاں اور پسلیاں باقی بچی تھیں۔ مٹی کے تیل
کے چولہے پر کڑاہی رکھی تھی اور کڑاہی میں کم و بیش دو ڈھائی سیر بوٹیاں پڑی ہوئی تھیں۔ بوٹیاں
بالکل ویسی تھیں، جیسی میں کٹیا میں کھا کر آیا تھا۔
میں نے پھٹی پھٹی نظروں سے دوبارہ جان کو دیکھا۔ یہ تھا وہ مور، جو محبت کے ہاتھوں مجبور ہو
کر لوسی کے پیچھے چلتا ہوا تہہ خانے تک پہنچ گیا تھا۔ اسی سے لوسی نے کہا تھا کہ تمہیں ویشیا بھگت
نے میرے پاس بھیجا ہے۔ ان کی اچھا ہے کہ یہاں آنے کے بعد تم کبھی واپس نہ جاؤ۔ اس پر قابو
پانے کے لیے لوسی کو زیادہ جدوجہد نہیں کرنا پڑی ہو گی۔ دس پندرہ منٹ پیار بھری باتیں کی ہوں
گی۔ اور جب جان از خود رفتہ ہو گیا ہو گا تو ایک ہی وار میں اُس کا سر تن سے جدا کر دیا ہو گا۔ کم و
بیش وہی سیمسن اور ڈیلائیلا والی کہانی دہرائی گئی ہو گی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ ڈیلائیلا نے سیمسن
کے بال کاٹ کر اس کی غیر معمولی قوت کو ختم کر دیا تھا، تاکہ درندہ صفت یہودی اسے اپنے انتقام
کا نشانہ بنا سکیں۔ جبکہ لوسی نے جان کی بوٹیاں بنا ڈالی تھیں، تاکہ مجھے اور فضیلہ کو چٹ پٹے تکے
کھلائے جا سکیں۔ فضیلہ خوش نصیب تھی کہ اُس نے ایک بھی بوٹی نہیں چکھی تھی۔ جبکہ مجھے میری
اشتہا نے ڈیڑھ تھال سے زیادہ بوٹیاں کھانے پر مجبور کر دیا تھا۔
ایکا ایکی میرے پیٹ میں گڑبڑ ہونے لگی۔ ایسا معلوم ہوا، جیسے حلق تک دہکتے انگارے
بھرے ہوئے ہوں۔ ابکائیاں آنے لگیں۔ دہشت اور غصے کے باعث جسم پر کپکپی طاری ہو گئی۔
سارا قصور میرا تھا کہ میں نے شکست قبول کر کے خود کو حالات کے حوالے کر دیا تھا۔ زندگی کے کچھ
دن باقی تھے کہ گزشتہ رات تہہ خانے میں گزارنے کے باوجود بچ گیا۔ مگر جلد یا بدیر، یہی حشر میرا
بھی ہونا تھا۔ ویشیا کی ذریت سے رحم اور ہمدردی کی توقع کرنا فضول تھا۔ میں نے سوچا بھی نہیں

تھا کہ اٹھتے بیٹھتے اپنی معصومیت کا ڈھنڈورا پیٹنے والی لوسی اتنی جلاد ہو سکتی ہے۔

اتنا وقت نہیں تھا کہ سوچنے اور ڈرنے میں ضائع کرتا۔ میرے سر پر تلوار لٹک رہی تھی۔ کیسے فضیلہ اور کہاں کی لوسی؟...... سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں اور کیا نہ کروں۔ گرتا پڑتا ہوا وہاں سے بھاگا۔ تہہ خانے سے باہر نکلا، کنارے پر پہنچا۔ دریا حسب معمول سکون سے بہہ رہا تھا۔ دُور دُور تک کوئی کشتی نظر نہیں آ رہی تھی، نہ لانچ۔ میں پلٹا، پجاریوں کی کٹیاؤں کا رُخ کیا اور پہلی کٹیا نظر آئی، اسی میں گھس گیا۔ دھوتی باندھے ہوئے ایک ننگے بدن کا پجاری فرش پر لیٹا گہری نیند سو رہا تھا۔

"شریمان......!" میں نے اُسے جھنجوڑتے ہوئے کہا۔ "یہاں خون ہو گیا ہے شریمان جی جلدی اُٹھو۔"

وہ بوکھلا کر اُٹھا۔ "کیا ہو گیا؟"

"خون ہو گیا ہے۔ ایک بے گناہ اور بے قصور آدمی کا قتل کر دیا گیا ہے۔"

"رام رام........ ہتیا ہو گئی؟........ کہاں؟"

"یہیں، راج کنڈل میں۔"

"ہتیا اے دیا۔" پجاری چلا کر دوسری کٹیاؤں کی طرف بھاگا۔ "ہتیا ہو گئی ہے....... راج کنڈل میں ہتیا ہو گئی ہے۔"

چند ہی لمحوں میں تینوں پجاری گھبرائے ہوئے، سنگ مرمر کے چبوترے پر کھڑے تھے دہشت زدہ انداز میں ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر رام رام کر رہے تھے۔

میں نے کہا۔ "یہاں کھڑے کیا ہو گا۔ میرے ساتھ چلو اور دیکھو کہ ایک بے گناہ کتنے وحشیانہ طریقے سے قتل کر کے بوٹیاں بنائی گئی ہیں۔"

تینوں پجاریوں میں سے ایک بھی میرے ساتھ جانے پر رضامند نہیں ہوا۔ دھرم کرم لوگ تھے، پوجا پاٹ کرتے تھے، اُبلے ہوئے چاول، اُبلی ہوئی دال میں اچار چٹنی ڈال کر کھاتے تھے۔ جزیرے میں ننگے پاؤں چلتے تھے کہ پیروں کے نیچے آ کر کسی چیونٹے یا چیونٹی کی ہتیا نہ ہو جائے۔ وہ، جو کسی کیڑے مکوڑے کی لاش نہیں دیکھ سکتے تھے، انسان کی لاش دیکھنے کی ہمت کیسے کر سکتے تھے؟

ایک پجاری، جو باقی دو کی نسبت باہمت تھا، میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔ "یہ کام پولیس کا ہے۔"

"معلوم ہے مجھے۔" میں نے جواب دیا۔ "مگر پولیس تک پہنچنا مشکل ہے۔"

"کچھ بھی مشکل نہیں۔"

"تم شاید اس خوش فہمی میں ہو کہ گوپی موجود ہے، اسے بھیج کر پولیس کو بلایا جا سکتا ہے۔ لیکن گوپی دونوں لڑکیوں کو لے کر شمشان گیا ہوا ہے۔"

ان تینوں نے بڑے دھیان سے میری بات سنی۔ کسی نے یہ نہیں پوچھا کہ لڑکیاں شمشان کیوں گئی ہیں۔ اس کے برعکس اسی باہمت اور بہادر پجاری نے سب سے معمر پجاری کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ "ٹارچ کہاں ہے؟"

"ہنومان جی کے چرنوں میں رکھی ہے۔"

بہادر پجاری لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اس طرف گیا، جہاں ہنومان کی مورتی تھی اور ایک ہی منٹ بعد تقریباً چار فٹ لمبی ٹارچ لے آیا۔ تینوں پجاری چھت پر چڑھ گئے اور ٹارچ کا رُخ بے ستون پلوں کی جانب کر کے اسے جلدی جلدی جلانے بجھانے میں مصروف ہو گئے۔

بہادر پجاری نے مجھے بتایا کہ تقریباً ایک سال پہلے کچھ ڈاکو لوٹ مار کا سامان لے کر راج کنڈل میں آ چھپے تھے۔ رات بھر انہوں نے خوب رنگ رلیاں منائیں اور صبح سے پہلے پہلے اپنی بیڑی میں بیٹھ کر کمجی کے باغات کی طرف بھاگ گئے۔ پولیس ان کے جانے کے بعد آئی۔ انہیں معلوم ہوا کہ ڈاکو یہاں پینے پلانے کا شغل کرتے رہے ہیں۔ اور ہم ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے، تو انہوں نے ہمیں اگلے دن یہ ٹارچ بھجوا دی کہ آئندہ اس قسم کا کوئی واقعہ پیش آئے تو پلوں کی جانب رخ کر کے اسے جلایا بجھایا جائے۔ وہاں کا حفاظتی عملہ فوراً پولیس اسٹیشن پر فون کر دے گا اور ہم لوگ دوڑے چلے آئیں گے۔

وہ درست کہہ رہا تھا۔ ابھی اُس کی بات ختم نہیں ہوئی تھی کہ تین تیز رفتار لانچیں جزیرے کی طرف دوڑتی نظر آئیں۔ لانچوں نے جزیرے کو گھیرے میں لے لیا۔ ہر لانچ سے تین تین رائفل بردار تختوں پر چل کر راج کنڈل میں داخل ہو گئے اور کم و بیش اتنے ہی رائفل بردار لانچوں میں اپنی رائفلیں جزیرے کی سمت تان کر بیٹھ گئے۔

ہم نے چھت سے اُتر کر جزیرے پر آنے والے رائفل برداروں کا استقبال کیا۔ میں نے اُن کے افسر کو بتایا۔

"مجھے یہاں، اس علاقے میں دو بدروحیں لے آئی ہیں۔ ان میں سے ایک میری بیوی ہے، جبکہ دوسری بدروح یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتی رہی ہے کہ وہ بدروح نہیں ہے۔ مگر اب وہ مجھے دھوکا نہیں دے سکتی۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ وہ بدروح ہے۔"

افسر نے بگڑ کر کہا۔ "ہمیں بدروحوں کی کہانی سنانے کے لیے بلایا گیا ہے؟"

"جی نہیں۔ میں اصل واقعے کی طرف آ رہا ہوں۔ تمہید اس لیے ضروری تھی کہ اس کے بغیر آپ کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔" میں نے کہا۔

"جان نام کا ایک شخص دوسری بدروح کی تلاش میں آج صبح دس گیارہ بجے کے درمیان یہاں پہنچا۔ اس وقت وہ بدروح یہاں نہیں تھی، کھانے پینے کا انتظام کرنے، ایک دو ضروری فون کرنے شہر گئی ہوئی تھی۔ میں نے جان سے کہا کہ وہ کسی مورتی کے سامنے بیٹھ کر اس کا انتظار کرے۔ پھر مجھے نیند آ گئی۔ اور اس وقت، جب میری آنکھ کھلی تو میری بیوی، جو کہ خود بھی ایک بدروح ہی ہے، جزیرے پر پہنچ گئی۔ کیونکہ سفر کے دوران اُسے ایک لمحے بھی سونے کا موقع نہیں ملا تھا۔ آپ کو تعجب ہو رہا ہو گا کہ جب وہ بدروح تھی تو سوئی کیوں؟...... مجھے بھی تعجب ہوا تھا. لیکن حقیقت یہ ہے کہ بدروح جس جسم میں ہوتی ہے، اسی کے تابع ہو جاتی ہے۔ جیسا دیس ویسا بھیس۔"

"اوہ......" افسر نے اُکتا کر کہا۔ "کیا حماقت ہے؟" پھر وہ پجاری سے مخاطب ہو کر بولا "یہ پاگل تو مجھے بھی پاگل کر دے گا۔ تم بتاؤ کہ ہمیں یہاں کیوں بلایا ہے؟"

ایک پجاری نے میری طرف اشارہ کر کے کہا۔ "یہ صاحب جی کہتے ہیں کہ یہاں کسی منتر خون ہو گیا ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے، کسی کو قتل کر دیا گیا ہے؟"

"جی ہاں۔" میں نے پجاری اور پولیس افسر کے درمیان ہونے والی گفتگو میں دخل د ہوئے کہا۔ "دوسری بدروح نے جان کو قتل کر دیا۔ صرف قتل ہی نہیں کیا، بلکہ اُس کی بوٹیاں بنائیں اور ان بوٹیوں کو تلا اور وہ بوٹیاں مجھے کھلا دیں۔"

"پھر وہی بکواس۔"

"جی نہیں، یہ بکواس نہیں، یہ حقیقت ہے۔ میں نے آج تک اتنا مزیدار...... میرا ا ہے، اتنا بے ہودہ گوشت کبھی نہیں کھایا۔ آدھے سے زیادہ جان کی لاش ابھی تک وہیں پڑ ک جہاں اسے قتل کیا گیا تھا اور کڑاہی میں اُس کی تلی تلائی بوٹیاں بھی موجود ہیں۔"

"لاش کہاں ہے؟"

"تہہ خانے میں۔"

"تہہ خانے میں؟" پجاریوں نے حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر ا پولیس سے مخاطب ہو کر کہا۔ "یہاں تو کوئی تہہ خانہ نہیں ہے۔"

"تہہ خانہ ہے۔" میں نے زور دے کر کہا۔ "اسے راجہ داہر نے بنوایا تھا۔ مگر ا میرے اور ان دونوں بدروحوں کے علاوہ کسی کو نہیں۔ مجھے بھی اس کے بارے میں کوئی علم لیکن دوسری بدروح نے، جو جان کی قاتل ہے، کل رات......"

پولیس آفیسر نے درمیان سے میری بات کاٹ دی اور گرج کر کہا۔ "ہمیں تہہ خا

لے چلو۔"

میں نے لوسی کے بتائے ہوئے طریقے پر عمل کر کے تہہ خانے کا دروازہ کھولنے کی کوشش کی، لیکن ساری ترکیبیں بے کار گئیں۔ دروازہ نمودار نہیں ہوا۔

"کہاں ہے تہہ خانہ؟" افسر نے پوچھا۔

"یہیں کہیں تھا۔ ترکیب بھی ٹھیک ٹھاک ہے۔ پر نجانے کیوں اس کا دروازہ اُبھر کر اوپر نہیں آ رہا۔ شاید بدروح نے اس کے میکنزم کو گڑبڑ کر دیا ہے۔"

افسر نے ایک قدم آگے بڑھ کر میرے چہرے پر اتنا زوردار ہاتھ رسید کیا کہ میری چیخ نکل گئی۔ "اگر تم راج کنڈل میں نہ ہوتے تو مار مار کر تمہارا حلیہ بگاڑ دیتا۔"

پجاریوں کے چہروں پر بحالی آ گئی تھی۔ ایک نے کہا۔ "شاید صاحب جی نے کوئی سپنا دیکھا تھا اور سپنا دیکھ کر سیدھے ہمارے پاس دوڑے چلے آئے۔ سات پشتوں سے یہاں کا انتظام ہمارے پاس ہے۔ اگر یہاں کوئی تہہ خانہ ہوتا تو سب سے پہلے ہمیں اس کے بارے میں معلوم ہوتا۔"

پولیس افسر نے گھوم کر اپنے آدمیوں سے کہا۔ "چلو!"

"ٹھہریے۔" میں نے چیخ کر کہا۔ "دوسری بدروح میری کٹیا میں دو تھال بھر کر جان کی بوٹیاں لے کر آئی تھی۔ اس وقت بھی ان بوٹیوں سے بھرا ہوا آدھا تھال موجود ہے۔ میرے ساتھ چل کر ان بوٹیوں کو ملاحظہ فرمایئے اور کسی بھی لیبارٹری سے ان کا معائنہ کرا لیجیے۔ آپ کو پتہ چل جائے گا کہ میں غلط بیانی نہیں کر رہا۔ وہ بوٹیاں جان کی ہی ہیں۔ اُس جان کی بوٹیاں ہیں، جو بے چارہ محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر......"

"آؤ۔" اُس نے میرا بازو پکڑ کر کہا۔ "اگر کٹیا میں بوٹیاں نہیں ملیں تو میں مار مار کر تمہیں ادھ موا کر دوں گا۔"

کٹیا میں دونوں تھال بالکل ویسے ہی رکھے تھے، جیسے میں چھوڑ کر گیا تھا۔ تھالوں کے سامنے ایک عدد لومڑی جھکی بیٹھی تھی اور اپنی زبان نکالے تھالوں کو چاٹنے میں مصروف تھی۔ بوٹیاں پہلے ہی اس کے پیٹ میں اتر چکی تھیں۔

لومڑی راج کنڈل کی تھی۔ اسے پالتو تو نہیں کہا جا سکتا تھا، لیکن وہ جنگل میں بھی نہیں تھی۔ راج کنڈل میں درجنوں انسان آتے جاتے تھے۔ اس لیے وہ انسانوں سے مانوس ہو گئی تھی۔ اس نے ہمیں کٹیا میں داخل ہوتے دیکھا تو اپنی مخمور آنکھیں اوپر اُٹھائیں، دوبارہ تھالوں پر جھک کر زبان پھیری، اُٹھی، موٹی سی دُم ٹانگوں میں دبائی اور ٹہلتی ہوئی باہر نکل گئی۔

"کہاں ہیں بوٹیاں؟" افسر نے پوچھا۔

میں نے ندامت سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "لومڑی کے پیٹ میں۔"
افسر نے میرے پیٹ کے نیچے کہنی رسید کی۔ میں درد سے دوہرا ہو گیا۔ دوسرے ہی لمحے اُس نے میری گردن کے نیچے ہاتھ ڈال کر مجھے سیدھا کیا۔
"سچ سچ بتاؤ، کس کے لیے کام کر رہے ہو؟"
"کسی کے لیے نہیں، جناب! میری گردن ٹوٹ جائے گی۔ رحم کیجیے مجھ پر۔"
اُس نے جھٹکا دے کر اس طرح میری گردن چھوڑی کہ میں دیوار سے جا ٹکرایا۔ جو سنبھلا، اُس نے میرے بال پکڑ لیے۔
"زندگی عزیز ہے تو سچ سچ بتا دو۔ تم نے ہمیں یہاں کیوں بلایا ہے؟...... کیا اس لیے کہ سے ہماری توجہ ہٹائی جائے اور خانہ جنگی کے لیے اندرون ملک اسلحہ اسمگل ہو جائے؟"
"کیسی باتیں کر رہے ہیں، جناب......؟" میں نے منت ساجت سے کہا۔ "یہاں ایک ہو گیا تھا اور ایک اچھے اور سچے محب وطن ہونے کی حیثیت سے میرا یہ فرض تھا کہ میں قاتل کو کردار تک پہنچانے کی کوشش کرتا۔ میں نے اپنا فرض ادا کیا ہے، جس کی آپ مجھے اتنی سخت دے رہے ہیں۔"
"اصل سزا تو تھانے چل کر ملے گی۔ جب تمہیں اُلٹا لٹکایا جائے گا۔ ابھی بھی وقت ہے بات بتا دو، تم کس کے آدمی ہو؟"
اُلٹی آنتیں گلے پڑنا اسی کو کہتے ہیں۔ یہ معلوم ہوتے ہوئے بھی کہ میرا سابقہ کن ہستیوں سے ہے، میں نے پولیس کی مدد حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔ مدد تو درکنار، ہمدردا دلجوئی کے دو لفظ تک سننے کو نہیں ملے تھے۔ اُلٹا شبہ کیا جا رہا تھا کہ میں ہتھیاروں کے کسی آ آلہ کار ہوں اور اس کے اشارے پر میں نے دریا کی نگرانی کرنے والی پولیس کو راہ سے کرنے کی کوشش کی ہے۔
"میں شریف آدمی ہوں، جناب!" میں نے کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا۔
افسر نے اپنا پستول والا ہاتھ بلند کیا۔ شاید وہ اس کے دستے کو میرے سر پر مارنا چاہتا اُس کا ہاتھ ہوا میں رُک گیا اور آنکھیں کٹیا تک رہنمائی کرنے والی راہداری پر جم گئیں۔ ڈرتے ڈرتے نظریں اُٹھائیں۔ دودھ جیسی ساڑھیوں میں ملبوس فضیلہ اور لوسی ہنستی ہوئی جانب آ رہی تھیں۔ گویا بگلوں کا جوڑا آپس میں اٹھکیلیاں کرتا چلا آ رہا ہو۔
"وہ دونوں بدروحیں ہیں۔" میں نے سرگوشی کی۔ "ان میں جو زیادہ خوب صورت میری بیوی ہے اور بالکل بے قصور ہے۔ جو کم خوب صورت ہے، وہ آپ کی مجرم ہے۔ جان کو قتل کر کے اس کی بوٹیاں تلی تھیں۔ وہ بوٹیاں ابھی تک میرے پیٹ میں کلبلا رہی ہیں

افسر نے مجھے اپنے سامنے سے ہٹایا اور مبہوت سا ہو کر کٹیا سے باہر نکل گیا۔ دونوں لڑکیاں رُک گئیں۔ افسر اُن سے ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگا۔ تقریباً تین چار منٹ بعد وہ اُن کے ساتھ کٹیا میں واپس آیا۔ فضیلہ کہہ رہی تھی۔
"کئی مہینوں سے ان کی یہی حالت ہے۔ تین چار مہینے پاگل خانے میں بھی گزار چکے ہیں۔ ایک سادھو نے مشورہ دیا تھا کہ انہیں راج کنڈل لے جاؤ۔ بڑے بڑے پاگل راج کنڈل پہنچ کر بغیر علاج و معالجے کے ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ لیکن ان پر تو اُلٹا ہی اثر ہوا ہے۔"
"میں پاگل نہیں ہوں...... بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ پاگل خانے والوں سے تصدیق کر سکتے ہیں۔"
"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔" افسر نے کہا۔ پھر اپنے ساتھیوں اور تینوں پجاریوں سے مخاطب ہو کر بولا۔ "آپ لوگ باہر جائیے۔"
سب باہر چلے گئے تو میں نے لوسی سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ "کیا تم اس بات سے انکار کرتی ہو کہ آج رات تم نے مجھے جان کی بوٹیاں کھانے کو دی تھیں؟"
لوسی نے مسکرا کر افسر کی طرف اس طرح دیکھا، جیسے کہہ رہی ہو۔ "بس اسی طرح کی بہکی بہکی باتیں کرتے ہیں۔" پھر مجھ سے مخاطب ہوئی۔ "بے شک میں نے تمہیں بوٹیاں کھلائی تھیں۔ لیکن اچانک وہ بوٹیاں جان کی کیسے بن گئیں؟"
"میں نے خود اپنی دونوں آنکھوں سے بہ ہوش و حواسِ خمسہ کڑاہی میں جان کی بوٹیاں دیکھی ہیں اور اُس کا کٹا ہوا سر دیکھا ہے، جسے تم نے ٹرافی کی طرح سجا کر میز پر رکھ چھوڑا تھا۔"
فضیلہ میرے پاس آن کھڑی ہوئی اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "بس کیجیے۔ ایسی باتوں کا کیا فائدہ، جن کا آپ کے تصور کے علاوہ کہیں اور کوئی وجود نہیں۔"
"جان کا وجود ہے۔ اگر تہہ خانے تک میری رسائی ہو جائے تو میں اپنے دعوے کو ثابت کر سکتا ہوں۔"
"آپ کے تخیل نے یہاں تہہ خانہ بھی تعمیر کر لیا؟"
"میں نے نہیں، راجہ داہر نے تعمیر کرایا تھا۔"
افسر نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ پھر لوسی اور فضیلہ سے مخاطب ہوا۔ "آپ دونوں دو منٹ اور نہ آتیں تو اس وقت یہ حضرت تھانے میں بند ہوتے۔ ان کی دماغی کیفیت ایسی ہے تو انہیں تنہا نہ چھوڑا کیجیے۔ آپ دونوں میں سے کم از کم ایک کو ہر وقت ان کے پاس رہنا چاہیے۔"
"آج کئی روز بعد انہوں نے بہکی بہکی باتیں کی ہیں۔ ہم تو یہ سمجھ رہے تھے کہ راج کنڈل آ کر ان کی دماغی کیفیت درست ہو چکی ہے۔"

"آپ غلط جگہ آئی ہیں۔" افسر بولا۔ "ایسے مریضوں کو ایسی کھلی جگہوں پر نہیں رکھتے۔ انہیں ہسپتال لے جایا جائے تو زیادہ بہتر رہے گا۔ آگے آپ کی مرضی۔ اچھا، اب اجازت دیجیے۔"

جانے سے پہلے وہ میرے پاس آیا اور پیار سے میرے کندھے کو تھپکا۔

میں نے کہا۔

"میں اپنے فرض سے بری الذمہ ہو چکا ہوں۔ مگر ان دونوں بدروحوں کی باتوں میں آ کر آپ اپنے فرائض منصبی سے غفلت برتنے کے مرتکب ہو رہے ہیں۔"

اس نے دوبارہ میرے کندھے کو تھپکا، گھوما اور کھٹ کھٹ کرتا ہوا کٹیا سے باہر نکل گیا۔ لوسی اور فضیلہ اُس کی طرف لپکیں۔ وہ لیفٹ رائٹ کے انداز میں چلتا چلتا رک گیا اور فضیلہ سے مخاطب ہو کر بولا۔

"اپنے شوہر کے پاس رہیے۔ انہیں ایک لمحے کے لیے بھی تنہا نہ چھوڑیے۔"

فضیلہ واپس آ گئی۔

"بیٹھ جائیے۔" وہ میرا ہاتھ پکڑ کر بیٹھتی ہوئی بولی۔

میں بیٹھ گیا تو اُس نے میرے کندھے پر اپنا سر رکھ لیا اور سسکیاں لینے لگی۔

"میں تو سمجھتی تھی کہ آپ مجھے بے انتہا چاہتے ہیں۔ یہ نہیں جانتی تھی کہ اتنی جلدی آپ کا دل مجھ سے بھر جائے گا۔"

"لوسی نے جو حرکت کی ہے، اس پر میرا دل خون کے آنسو رو رہا ہے۔" میں نے کہا۔ "تم بھی اس کی ہم نوا ہو گئیں اور پولیس افسر کے سامنے مجھے پاگل ظاہر کرنے لگیں۔ مجھے تم سے اُمید ہرگز نہیں تھی۔"

"آپ چاہتے ہیں کہ اپنی فضیلہ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محروم ہو جائیں؟"

"تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ میں تمہارے بغیر ایک دن بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔"

"اگر واقعی آپ کو مجھ سے محبت ہے تو پولیس کو کیوں بلایا؟ ان لوگوں سے کیوں کہا کہ بیچارا ایک شخص کو قتل کر کے آپ کو ساری بوٹیاں کھلائی گئی تھیں؟"

میں دھڑکتے دل سے اُس کا تمتماتا ہوا چہرہ دیکھنے لگا۔ کیا جان کے قتل میں وہ بھی برابر شریک ہے؟ نہیں، وہ تو سو رہی تھی۔ اسے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ جان، جزیرے پر آیا ہوا ہے۔

"تمہارا خیال ہے کہ میں نے لوسی پر جھوٹا الزام عائد کیا ہے؟"

"آپ کو یاد ہے، جب آپ ذہنی ہسپتال سے واپس آئے تھے، اُس وقت آپ کی صحت کیسی تھی۔ خوراک بھی کتنی تھی۔ سوکھ کر ہڈیوں کا ڈھانچہ ہو گئے تھے۔ مشکل سے ایک سموسہ کھاتے تھے۔ پیٹ اتنا بھر جاتا تھا کہ اگلے روز تک بھوک نہیں لگتی تھی۔ میں ہر وقت آپ کے لیے پریشا

رہتی تھی۔ وشیا بھگت سے میری یہ پریشانی نہیں دیکھی گئی اور ایسے سالن کھلائے گئے، جن میں شوربہ برائے نام ہوتا تھا اور بوٹیاں افراط کے ساتھ۔ آج آپ کی صحت اتنی اچھی ہے اور بھوک اتنی کھل گئی ہے کہ کم و بیش چار اور پانچ صحت مند آدمی اتنی خوراک نہیں کھا سکتے۔ میں ہاتھ سے محروم ہوں، صحیح طور پر خدمت نہیں کر سکتی، آپ کی بہترین صحت اور بہترین خوراک لوسی کی مرہون منت ہے۔ اس نے صحیح معنوں میں ملازمہ ہونے کا حق ادا کر دیا ہے۔"

"مجھے اس کی خدمات سے انکار نہیں۔ لیکن جان کو قتل کر کے اس نے جس گھناؤنے جرم کا ارتکاب کیا ہے، اسے کسی طرح بھی معاف نہیں کیا جا سکتا۔"

"قصوروار لوسی نہیں ہے، میں ہوں۔ اس نے میرے حکم پر عمل کیا ہے۔"

"کیا؟" میں تقریباً اُچھل پڑا۔ "جان کو تمہارے حکم پر قتل کیا گیا ہے؟ تمہیں تو اُس کی آمد کا علم تک نہیں تھا۔"

"جان تو خوامخواہ بیچ میں آ گیا۔ میں نے کسی ایک پجاری کی بوٹیاں بنانے کے لیے کہا تھا۔"

"تم نے ایسا کیوں کیا، فضیلہ؟" میں نے اُسے جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا۔ "بتاؤ، تم نے ایسا کیوں کیا؟"

"کیونکہ......" فضیلہ نے خود کو میرے ہاتھوں سے چھڑا کر جواب دیا۔ "کیونکہ لوسی قبرستان میں جا کر تازہ قبروں کو کھولتے کھولتے اور مُردوں کے اعضاء کاٹتے کاٹتے تھک چکی تھی۔ اور ایک گورکن نے اُسے قبر سے باہر نکلتے ہوئے بھی دیکھ لیا تھا۔ یخنی اور بوٹیاں آپ کی زندگی اور صحت کے لیے بہت ضروری ہیں۔ اتنی ضروری کہ اس کے لیے پوری دنیا کے انسانوں کو قتل کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا میں نے کہا کہ یہیں کسی پجاری کو مار کر......"

دل چاہا کہ فرش پر اپنا سر دے پٹکوں۔ جسم کا ایک ایک جوڑ چیخ اُٹھا تھا۔

"تف ہے ایسی زندگی اور صحت پر۔" میں نے بے چینی سے دونوں ہاتھ مسلتے ہوئے کہا۔ "کاش! مجھے معلوم ہوتا کہ تم دونوں میرے ساتھ کیسا سلوک کرتی رہی ہو...... آج کے اس واقعے نے میری آنکھیں کھول دی ہیں۔ میں لعنت بھیجتا ہوں ترشولی پر، ترشولی کے وشیا بھگت پر، اور......" میں نے گلے میں ہاتھ ڈال کر سونے کی ڈبیہ میں پڑا ہوا جنتر ایک جھٹکے سے کھینچا اور اُتار کر فرش پر دے مارا۔ "اور لعنت بھیجتا ہوں، اس بے ہودہ جنتر پر۔"

اگلے ہی لمحے ایسا معلوم ہوا، جیسے دھوپ سے تپتے ہوئے صحرا سے نکل کر کسی سرسبز و شاداب، ٹھنڈے اور سایہ دار مقام پر پہنچ گیا ہوں۔

پہلی بار میں نے اس کے چہرے پر نفرت اور حقارت کے آثار اُبھرتے دیکھے۔ وہ
سے تم پر اُتر آئی۔ فرش پر بالکل چت ہو کر لمبی لیٹ گئی اور کہنے لگی۔

"میں نے ہمیشہ سے تمہارا دل رکھنے کی کوشش کی ہے، ہمیشہ احساسِ محرومی سے بچایا۔ لیکن قدر کرنے کے بجائے تم نے کبھی میرے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ میں جا رہی ہوں۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اچھا یہی تھا کہ وہ کچھ دنوں کے لیے میری نظروں سے ا ہو جائے۔ میں مزید کسی زندہ انسان کا گوشت کھانے یا یخنی پینے کے لیے تیار نہیں تھا۔

"میں جا رہی ہوں، سکندر!" اس نے دوبارہ کہا۔ "اس جسم کو چھوڑ کر جا رہی ہوں، جسے کر تم چیتے ہو۔ یہ جسم یہیں پڑا رہے گا، ایک بے گور و کفن لاش کی طرح۔ اگر فوری طور پر اس کفن دفن کا انتظام نہ کیا گیا تو یہ خراب ہونا شروع ہو جائے گا۔ جزیرے کے کیڑے مکوڑے کھانے کے لیے دوڑ پڑیں گے۔ تم ہمیشہ ہمیشہ کے لیے فضیلہ سے محروم ہو جاؤ گے۔"

اچانک مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ میں نے کہا۔ "تم ایسا نہیں کر سکتیں۔"

"تمہاری خواہش ہے کہ جسم ضائع نہ ہونے پائے؟" اس نے پوچھا۔ پھر میرے جو انتظار کیے بغیر بولی۔ "فی الحال تو میں اس جسم کو چھوڑنے کا تہیہ کر چکی ہوں۔ اور اگر واقعی تم صحیح سلامت دیکھنا چاہتے ہو تو جنتر کو اُٹھا کر دوبارہ اپنے گلے میں ڈال لو۔ کچھ دیر بعد تمہارے لیے جان کی بوٹیوں سے بھرا ہوا تھال لے کر آئے گی۔ رغبت کے ساتھ ان بو کھانا۔ اگر تم نے یہ دو کام کر لیے تو میں صبح ہونے سے پہلے اس جسم میں واپس آؤں گی او اتنی محبت دوں گی کہ تم نے کبھی اس کا تصور بھی نہیں کیا ہوگا۔ منگل وار کی شام لوسی تمہاری تندرستی کی خاطر تمہارے لیے ڈاکٹر قاسم جیلانی کے سیخ کباب تیار کرے گی۔ اور اگر فضیلہ یہاں پہنچ گئے تو سیخ کباب کی ضیافت میں وہ بھی تمہارے ہم نوالہ، ہم پیالہ ہو جائیں گے۔"

میں نے چیخنا چاہا، اُس کا واحد ہاتھ پکڑ کر اُسے روکنے کی کوشش کی، لیکن دیکھتے دیکھتے اُس کا جسم ساکت و جامد ہو گیا۔ نبضیں ڈوب گئیں۔ سینے پر سر رکھ کر دل کی دھڑکنیں سننا لیکن وہ ایک ایسی گھڑی کی طرح خاموش تھا، جس کی چابی ختم ہو گئی ہو۔

میں کئی سیکنڈ تک خاموش بیٹھا رہا اور اس کے جسم کو تکتا رہا۔ ذہن میں مختلف النوع خیالات آتے رہے تھے۔ آخری فیصلہ مجھے کرنا تھا۔ میرے سامنے دو راستے تھے۔ ان کے علاوہ کوئی تیسرا راستہ نہیں تھا۔

کم و بیش نصف گھنٹے تک اسی عالم میں بیٹھا پیچ و تاب کھاتا رہا۔ کسی قطعی فیصلے پر نہیں پہنچ سکا تھا۔ لوسی، بوٹیوں سے بھرا ہوا تھال لے کر آئی۔ اُس نے خاموشی سے میرے سامنے تھال رکھ دیا اور جھک کر فضیلہ کا معائنہ کیا۔

"ناراض ہو کر گئی ہے؟" لوسی نے مجھ سے پوچھا۔

میں رونا چاہتا تھا، لیکن ایسا لگتا تھا، جیسے کسی نے دل پر بڑا سا پتھر رکھ دیا ہو۔ آنکھوں کے آگے بند باندھ دیے ہوں۔

"نہیں۔" میں نے ایسی آواز میں جواب دیا، جو میرے لئے خود بھی اجنبی تھی۔ "فضیلہ کو ناراض ہونا نہیں آتا۔"

کٹیا میں چند لمحوں کے لیے خاموشی رہی۔ شاید لوسی سوچ رہی تھی کہ کس موضوع پر گفتگو کی جائے۔ اور اس کی ابتداء کس طرح ہو۔ اس سے پہلے کہ وہ کسی نتیجے پر پہنچتی، میں نے اُس کے چہرے پر نظریں جما کر کہا۔

"جان کو تم نے قتل کیا تھا؟"

اُس نے ندامت سے سر جھکا لیا۔ "تم میری مجبوری کو سمجھ نہیں سکو گے، سکندر! اگر میں جان کو قتل نہ کرتی تو خود مجھے اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑتے۔"

"مجھ سے اتنا جھوٹ بولا گیا ہے کہ اب کوئی سچ بھی بولتا ہے تو تب بھی مجھے یقین نہیں آتا۔" میں نے کہا۔ "میں نہیں جانتا کہ در حقیقت تم حضرت عیسیٰؑ کو اپنا پیغمبر مانتی ہو، یا دیشیا کو اپنا نجات دہندہ سمجھتی ہو؟ تاہم ان دونوں میں سے جو بھی تمہیں عزیز ہے، اس کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں کہ تم نے پولیس کی مدد کیوں حاصل نہیں کی؟ اگر تم سچی ہو، تو فضیلہ کے ہاتھوں میں کھلونا کیوں بنی ہوئی ہو؟ کم از کم مجھے تو بتانا چاہئے تھا کہ یخنی کے نام پر مجھے کیا پلایا جا رہا ہے۔ اور کس کس کی بوٹیاں کھلائی جا رہی ہیں۔"

لوسی کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

"تم نے مجھے قسم دلائی ہے، اس لیے بتا رہی ہوں کہ یہ حرافہ......" اس نے فضیلہ کی طرف اشارہ کیا۔ "میری کمزوری کا فائدہ اُٹھا رہی ہے۔ میں نے کینیڈا میں ایک ڈاکٹر کو ضرورت سے زیادہ نیند کی گولیاں دے کر ہلاک کر دیا تھا۔ کسی کو مجھ پر رتی برابر بھی شبہ نہیں ہوا۔ یہ سمجھ لیا گیا کہ ڈاکٹر نے اپنی گھریلو پریشانیوں سے تنگ آ کر خودکشی کی ہے۔ اپنے وطن آ کر جب میں فضیلہ کے

پاس نرس کی حیثیت سے گئی تو اس نے پہلی ہی خلوت میں بتا دیا کہ میرے ہاتھ ڈاکٹر کے خ
سے رنگے ہوئے ہیں۔ یہی نہیں، بلکہ اس نے مجھے وہ خط بھی دکھایا، جو میں نے اپنی بہن کو
تھا۔ اس خط میں ڈاکٹر کی کارستانیوں کا تفصیل سے ذکر کر کے میں نے صاف طور پر لکھا تھا کہ
موقع ملتے ہی خواب آور گولیوں کی مدد سے ڈاکٹر کو ہمیشہ کے لیے موت کی نیند سلا دوں گی۔"

"فضیلہ تک وہ خط کس طرح پہنچا؟"

"جب تک مجھے حقیقت کا علم نہیں تھا، مجھے بھی اس بات پر تعجب ہوا تھا۔ لیکن بعد میں ت
جاتا رہا اور اس کی جگہ خوف نے لے لی کہ روح کے لیے کوئی کام مشکل نہیں ہے۔" اُس
دوبارہ فضیلہ کی طرف اشارہ کیا۔ "اس وقت اس کی روح آزاد ہے۔ وہ جہاں چاہے، جا
ہے۔ اور جو چاہے، حاصل کر سکتی ہے۔"

لوسی غلط نہیں کہہ رہی تھی۔ اُس کی آنسو بھری آنکھوں اور ندامت بھرے لہجے سے
اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ چاہے زندگی بھر جھوٹ بولتی رہی ہو، مگر اس وقت حقیقت بیانی ہی س
لے رہی ہے۔

"کبھی سوچا ہے کہ اگر تم اسی طرح فضیلہ کے اشاروں پر ناچتی رہیں تو نجانے ابھی
کتنے اور لوگوں کے خون سے ہاتھ رنگنا پڑیں گے؟"

"فضیلہ نے وعدہ کیا ہے کہ مجھے ایک شخص کو قتل کر کے اُس کے سیخ کباب بنانا ہوں
اس کے بعد وہ مجھے آزاد کر دے گی۔"

"جسے تم فضیلہ کہہ رہی ہو، وہ فضیلہ نہیں، ترشولی ہے۔ اور اس کرۂ ارض پر اس سے
مکار، جھوٹی اور وعدہ خلاف اور کوئی شے نہیں پائی جاتی۔" میں نے کہا۔ "وہ تمھیں ہرگز آ
کرے گی، تم سے قتل پر قتل کراتی رہے گی۔"

"میں جانتی ہوں، جسے ہم فضیلہ کہتے ہیں، وہ فضیلہ نہیں ہے۔ یہ بھی جانتی ہوں کہ
نامی گرامی بدمعاش اس کی مکاریوں کے سامنے گرد ہیں۔ پھر بھی نہ جانے کیوں مجھے ا
وعدے پر اعتبار آ گیا ہے۔"

"گویا تم اس ہومیو پیتھک ڈاکٹر، جس کا نام قاسم جیلانی ہے، سیخ کباب بنانے
ذہنی طور پر آمادہ ہو چکی ہو؟"

"اس کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہیں ہے۔"

"قاسم جیلانی کے قتل کے بعد اس نے تمھیں کسی اور کو قتل کرنے کا حکم دیا تو اس
کوئی چارۂ کار نہیں ہوگا۔" میں نے کہا۔ "احمق مت بنو، لوسی! قاسم جیلانی کو قتل کرنے۔
خود کو پولیس کے حوالے کر دو۔ سرکاری گواہ بن جاؤ۔ پولیس کو ہر بات صاف صاف

سرکاری گواہوں کے ساتھ سزا کے سلسلے میں خاصی رعایت کی جاتی ہے۔"

"کہتے تو ٹھیک ہو۔" وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ "یہ جانتے ہوئے بھی کہ پولیس
فضیلہ کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتی، پھر بھی قاسم جیلانی کے سیخ کباب بنا کر اس کے بعد فضیلہ نے اگر
اپنے وعدے سے روگردانی کی اور مجھے آزاد نہیں کیا تو میں تمہارے مشورے پر عمل کر کے ہر بات
صاف صاف پولیس کو بتا دوں گی۔"

کچھ دیر تک مزید بحث ہوئی۔ میں بضد تھا کہ وہ فوراً پولیس تک پہنچ جائے۔ اور وہ مُصر تھی کہ
وہ قاسم جیلانی کے سیخ کباب بنا کر فضیلہ کو وعدہ ایفا کرنے کا موقع ضرور دے گی۔ آزادی مل گئی تو
جہاں سینگ سمائیں گے، خاموشی سے چلی جاؤں گی۔ آزادی نہیں ملی تو اپنے آپ کو پولیس کے
حوالے کر دوں گی۔ پولیس کی قید بہرصورت فضیلہ کی قید سے اچھی تھی۔

"سب سے زیادہ مجھے تمہاری فکر ہے۔" وہ بولی۔ "مجھ پر جو کچھ گزرے گی، میں اسے کسی نہ
کسی طرح برداشت کر لوں گی۔ لیکن تم اس کی گرفت سے کبھی نہیں نکل سکو گے۔"

"میرا خیال ہے کہ میں اس کی گرفت سے نکلنے میں ایک حد تک کامیاب ہو گیا ہوں۔ ایک
کچا دھاگا ہے، جس نے مجھے باندھ رکھا ہے۔ ہلکا سا جھٹکا دوں گا تو دھاگا ٹوٹ جائے گا اور اس
حصار سے میں نکل جاؤں گا۔"

"یہ تمہاری بھول ہے، سکندر! تم اس حصار سے کبھی نہیں نکل سکو گے۔ تمہیں ایسی دلدل میں
بند کر دیا گیا ہے کہ اس سے نجات حاصل کرنے کی جتنی کوشش کرو گے، اتنا ہی زیادہ پھنستے چلے
جاؤ گے۔ شاید تمہیں یہ علم نہیں ہے، ترشولی تمہیں خرید چکی ہے۔"

"خرید چکی ہے؟...... مجھے خرید چکی ہے؟" اُس سنجیدہ ماحول میں بھی مجھے بے اختیار ہنسی آ
گئی۔ "فضیلہ کے مُردہ جسم میں حلول کر کے وہ یہ سمجھتی ہے کہ اس نے مجھے خرید کر اپنا بندۂ بے دام
بنا لیا ہے؟"

"پوری بات تو نہیں معلوم، بس ایک روز باتوں باتوں میں فضیلہ نے بڑے غرور و تکبر کے
ساتھ بتایا تھا کہ اس نے پورے پچیس لاکھ روپے دے کر تمہیں خریدا ہے۔" لوسی نے کہا۔
"کیوں، کیا اُس جنم جنم کی جھوٹی، مکار نے یہ جھوٹا دعویٰ کیا ہے؟...... کیا اُس نے پچیس لاکھ
روپے ادا نہیں کیے؟"

میرا سر چکرانے لگا۔ نظروں میں گھر کا وہ کمرہ گھوم گیا، جس کے گڑھے سے نوٹوں کی وہ
گڈیاں برآمد ہوئی تھیں۔ کمرے میں فضیلہ کے ابو تھے، بھائی جان تھے اور میں تھا۔ اور بے انتہا
خوشی کے باعث ہم تینوں کے چہرے چمک رہے تھے۔ بھائی جان نے تو اس رقم کے حصے بخرے
بھی کرنے شروع کر دیے تھے۔

"پانچ لاکھ خان صاحب کے اور پانچ لاکھ میرے اور باقی پندرہ لاکھ اباجی کے۔ میں تو پا
لاکھ این۔ڈی۔ایف۔سی میں جمع کرادوں گا۔ مہینے کے مہینے پابندی سے سود کے پانچ ہزار رو
ملا کریں گے۔ اور اصل رقم جوں کی توں باقی رہے گی۔"

"سکندر!" لوسی پوچھ رہی تھی۔ "کیا تم نے پچیس لاکھ روپے وصول نہیں کیے؟" اُس
ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔

میں انکار نہیں کر سکا۔ اثبات میں سر ہلاتا ہوا بولا۔ "کیا گھڑے سے جو رقم برآمد ہوئی تھی،
میری قیمت تھی؟"

"میں نہیں جانتی، رقم کہاں سے برآمد ہوئی تھی۔ تاہم وہ رقم اگر پچیس لاکھ کے نوٹوں
مشتمل تھی تو یقیناً تمہاری قیمت ہی ہوگی۔ تم بک چکے ہو۔ تم نے اس رقم کو حاصل کر کے خود ا
پیروں پر کلہاڑی ماری ہے۔ کتنی کوشش کیوں نہ کرو، تمہیں ترشولی کے چنگل سے چھٹکارا نہیں
سکتا۔ دنیا بھر کے عامل کامل، سادھو سنت، بشت اور پادری یک جا ہو کر بھی ترشولی کو اس کی ملکیہ
سے الگ نہیں کر سکتے۔ یہ دنیا ہو، یا کوئی دوسری، ہر جگہ کا قانون ایک ہی ہے۔ مال اسی کا
ہے، جو مال کی قیمت ادا کرتا ہے۔"

مدرسے میں ایک مولوی تھے، جو بچوں کو ناظرہ قرآن شریف پڑھایا کرتے تھے۔ کبھی
لوگ اپنے کسی بچے یا بچی کو ان کے پاس علاج کی غرض سے لایا کرتے تھے۔ علاج سے قبل
مولوی صاحب پوچھتے تھے۔

"تم نے اپنے بچے یا بچی کو قوالی تو نہیں سنوائی تھی؟ اس سے الائچیاں اور مٹھائیاں تو
منگوائیں؟ مالی پریشانیوں سے چھٹکارا پانے کے لیے رقم تو نہیں مانگی تھی؟" سوالات کے جواب
میں ملتے تو وہ آسیب زدہ کا علاج کرنے پر تیار ہو جاتے۔ جوابات اثبات میں ہوتے تو ع
کرنے سے صاف انکار کر دیتے اور کہتے۔ "بچے یا بچی کو کہیں اور لے جاؤ۔ اس کا علاج میر
بس کا نہیں ہے۔"

لوسی نے کہا تھا، مال اسی کا ہوتا ہے، جو اس کی قیمت ادا کر دیتا ہے۔ ناظرہ پڑھانے وا
مولوی صاحب کی بات اب سمجھ میں آئی۔ وہ اس مریض کا کس طرح علاج کر سکتے تھے، جسے
ہی طرح طرح کی فرمائشیں کر کے اور تفریح طبع کے لیے قوالیاں کرا کے آسیب کے ہاتھ
جاتا تھا۔

میں بھی ایک ایسا ہی لاعلاج مریض تھا۔ ترشولی میری قیمت ادا کر چکی تھی۔ یہی وجہ
اپنی سی ساری کوششیں کرنے کے باوجود مجھے اس سے نجات نہیں ملی تھی۔ دل نہ چاہنے کے
میں ترشولی کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بننے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اس نے مجھے اپنی مرضی کے

استعمال کرنے کے تمام حقوق حاصل کر لیے تھے۔

لوسی دیر تک میرے چہرے کے اُتار چڑھاؤ دیکھتی رہی، پھر جانے کے ارادے سے کھڑی ہوتی ہوئی بولی۔

"بوٹیاں واپس لے جاؤں یا کھانے کے لیے چھوڑ دوں؟"

میں نے ایک نظر بوٹیوں پر ڈالی اور دوسری نظر فرش پر پڑی بے حس و حرکت فضیلہ پر۔ روح نکل جانے کے باوجود وہ کھدر کی سفید ساڑھی میں پرستان کی ایسی پری معلوم ہو رہی تھی، جو فضا کی پہنائیوں میں اُڑتے اُڑتے تھک گئی ہو اور آرام کرنے کے لیے زمین پر اُتر آئی ہو۔

"بوٹیاں یہیں چھوڑ جاؤ۔" میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

وہ مسکراتی ہوئی کٹیا کے دروازے کی طرف بڑھی، رُکی، مجھے مخاطب کیا۔

"عقل مند اور باشعور انسان وہی ہے، جو یہ اظہار کیے بغیر کہ وہ بے دست و پا ہو چکا ہے، عزت و آبرو کی خاطر اپنے حالات سے سمجھوتہ کرنے پر تیار ہو جائے۔ مجھے خوشی ہے کہ تم نے انتہائی مناسب فیصلہ کیا ہے۔ تمہیں کبھی اپنے فیصلے پر ندامت نہیں ہوگی۔"

لوسی چلی گئی۔ میں کئی منٹ تک تھال کے سامنے بیٹھا رہا اور سوچتا رہا۔ میں نے واقعی فیصلہ کر لیا تھا۔ لیکن لوسی کی توقعات کے خلاف بالکل نامناسب فیصلہ کیا تھا۔

بوٹیوں سے بھرے ہوئے تھال کو کپڑے سے ڈھک کر کٹیا سے باہر نکلا۔ کٹیا کا دروازہ باہر سے بند کیا تاکہ بلی یا لومڑی یا کوئی دوسرا گوشت خور وہاں آ کر ان بوٹیوں کو ضائع نہ کرے۔ باہر نکل کر مندر کی طرف بڑھا۔ راج کنڈل میں آنے والے عقیدت مند ہندو دوسری چیزوں کے علاوہ مورتیوں کے چرنوں پر پرشاد کے طور پر چڑھانے کے لیے پلاسٹک کی تھیلیوں میں لپٹے ہوئے مٹھائی کے ڈبے بھی لے کر آتے تھے۔ پرشاد پجاریوں اور عقیدت مندوں میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ خالی ڈبوں اور تھیلیوں کو باہر پھینک دیا جاتا تھا۔ ڈبے رُلتے رہتے تھے اور پلاسٹک کی تھیلیاں ہوا سے اُڑتی ہوئی دریا تک پہنچ جاتی تھیں۔ چند لہریں انہیں اُڑا کر کہیں سے کہیں لے جاتی تھیں۔ ان تھیلیوں میں دو چار ایسی بھی ہوتی تھیں، جو گھنے درختوں کی شاخوں میں اٹک جاتی تھیں اور ہوا کے تھپیڑوں کو برداشت کرتی رہتی تھیں۔

میں نے باہر پڑے ہوئے مٹھائی کے ڈبوں میں سے ایک مضبوط سا ڈبہ منتخب کیا، پھر جھاڑیوں میں پھنسی ہوئی پلاسٹک کی ایک ایسی تھیلی نکالی، جسے کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا۔ ان دونوں چیزوں کو لے کر میں کٹیا میں گیا۔ اندر داخل ہوتے ہی مجھے سونے کی وہ ڈبیہ نظر آئی، جسے میں نے فضیلہ سے گفتگو کرتے ہوئے فرش پر دے مارا تھا۔ ڈبے اور تھیلی کو بوٹیوں والے تھال کے پاس رکھ کر میں نے طلائی ڈبیہ اُٹھائی۔ فرش پر گرنے کے باعث اس کا ایک کونہ پچک گیا تھا۔ اور گلے

میں ڈالنے والی زنجیر کا ایک حلقہ ٹوٹ گیا تھا۔ ڈبیہ کو کھولنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ کھولا تو ا
میں نہ کوئی جنتر تھا، نہ منتر۔ ویشیا کی ایک مورتی رکھی ہوئی تھی، جو اُنگلی کی ایک پور سے بھی بڑی
تھی۔

ویشیا کو پہچاننے میں مجھ سے اس لیے غلطی نہ ہوئی، کیونکہ اس سے پہلے میں اُس کی مو
دیکھ چکا تھا، جسے اسکول کے شریر بچوں کے جوتوں کا نشانہ بننا پڑتا تھا۔ اور میرے ذہن میں و
کی وہ تصویر بھی تھی، جس کے سامنے سجدہ کرنے کے لیے مجھے مجبور کیا گیا تھا۔ مگر سجدہ کرنے
بجائے نہ جانے کس طرح فرش پر گر کر میرے بوٹ کی نوک نے تصویر کے شیشے کو توڑ دیا تھا
ٹوٹے ہوئے شیشے نے تصویر میں پیوست ہو کر سارے چہرے کو بگاڑ دیا تھا۔ میں نے ڈبیہ
رکھی ہوئی مورتی ہی کو نہیں پہچانا، ایک اور بات بھی محسوس کی۔ اُس کے بدصورت چہرے اور
سے نظر آنے والی ترشولی کے چہرے میں کچھ ایسی مشابہت تھی، جیسے دونوں سگے بہن بھائی ہوا
شاید کہیں پڑھا تھا یا کسی سے سنا تھا کہ یوں تو ویشیا کی بہت سی بیویاں تھیں، لیکن ان
سب سے زیادہ بااثر اُس کی بہن تھی۔ گویا ویشیا نے سگی بہن کو اپنی بیوی بنا لیا تھا۔ ایک لحاظ
یہ بات درست ہی معلوم ہوتی تھی۔ کیونکہ لوسی اور فضیلہ نے جس ویشیا بھگت کا نقشہ کھینچا تھا
میں عورت صرف عورت تھی۔ ماں، بہن، بیٹی نہیں تھی۔ اور مرد صرف مرد تھا۔ باپ، بھائی
نہیں تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ میں بہت جذباتی ہوں۔ لیکن مجھ میں ایک خوبی اور بھی ہے۔
جذبات پر قابو پانا آتا ہے۔ اُس وقت میرا دل چاہ رہا تھا کہ طلائی ڈبیہ سے برآمد ہونے
مورتی پر دل کھول کر تھوکوں، پھر پتھر مار مار کر ایسا کچومر نکالوں کہ وہ ایک چھوٹے سے ڈھی
تبدیل ہو جائے۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ ویشیا کی شکتی کا صرف ڈھونگ ہی ڈھونگ ہے۔ اگ
میں ذرا بھی شکتی ہوتی تو وہ خود کو شریر لڑکوں کے جوتوں کی ضرب سے بچاتا، یا مجھے اپنی تصویر
بگاڑنے کی سزا دیتا۔ البتہ یہ ضرور کہا جا سکتا تھا کہ ترشولی اگر اس کی بہن یا بیوی ہے تو ا
تھوڑی بہت شکتی ضرور پائی جاتی ہے۔ اور ویشیا بھگت غالباً اپنی بیوی اور بہن پر ہی اکڑتا تھا۔
بہر کیف، میں نے مورتی پر تھوکنے اور پتھر مارنے والے جذبات کو دبا دیا اور ایک
اخبار میں اُسے لپیٹ کر جان کی بوٹیوں کے درمیان رکھ دیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر
درست کیا اور گلے میں ڈال لیا۔ پھر ساری بوٹیوں کو مٹھائی کے خالی ڈبے میں ٹھونسا۔
پلاسٹک کی تھیلی میں اچھی طرح جکڑا کہ چیونٹی تک اندر نہ جانے پائے۔ باہر مغرب ک
میں زمین اتنی نرم تھی کہ اسے انگلیوں سے کھودا جا سکتا تھا۔ میں نے ڈیڑھ فٹ کھدائی کی
میں پلاسٹک کی تھیلی میں لپٹے ہوئے اس ڈبے کو، جس میں جان کی بھنی ہوئی بوٹیاں تھیں،

مورتی سمیت زمین میں دفن کر دیا اور احتیاط سے زمین کو برابر کر دیا۔

اس جگہ کو یاد رکھنے کے لئے کنارے پر پڑی ہوئی ایک کھوکھلی سیپ جمادی اور سیپ پر ریت
بکھیر دی۔ صرف اسی پر بس نہیں کی، اس مقام سے قریب اُگی ہوئی جنگلی بیروں کی جھاڑی تک کا
فاصلہ بالشت سے ناپا۔ گیارہ بالشت کا فاصلہ تھا۔

سمجھنے والے سمجھ گئے ہوں گے کہ میں فضیلہ اور لوسی ہی کو بوٹیاں کھانے اور ویشیا کی مورتی کو
گلے میں ڈالنے کا دھوکا نہیں دینا چاہتا تھا، بلکہ پولیس کو بھی اس بات کا ثبوت فراہم کرنا چاہتا تھا
کہ جان کے بارے میں، میں نے جو کچھ کہا تھا، وہ کسی دیوانے کی بڑ نہیں تھی۔ اُسے قتل کر کے
بڑی مہارت کے ساتھ بوٹیاں بنائی اور بھونی گئی تھیں۔ محکمے کی کسی بھی لیبارٹری سے معلوم کیا جا
سکتا تھا کہ وہ بوٹیاں انسان کی تھیں یا کسی جانور کی۔ اس کے بعد باقی سارے کام آسان تھے۔
میرے مشورے پر عمل کر کے لوسی خود کو پولیس کے حوالے نہ کرتی اور سرکاری گواہ نہ بنتی، تب بھی
اُسے جیل جانے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ خود سے جاتی تو عزت سے
جاتی اور پولیس کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہو جاتی کہ فضیلہ نے اُسے قتل کرنے پر مجبور کیا تھا۔

پولیس پکڑتی تو قاتل کی حیثیت سے پکڑتی اور اُسے فضیلہ کو مجرم ثابت کرنا مشکل ہو جاتا۔
فضیلہ تو حقیقت میں ایک لاش تھی۔ اور بحیثیت لاش اُس کا اصل ٹھکانہ قبرستان تھا۔ شروع میں،
میں نے یہ سوچ کر اسے گوارہ کر لیا تھا کہ سینے پر جو گھاؤ لگا ہے، وہ اس کے قرب سے مندمل ہو
جائے گا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس گندی روح نے میرے ساتھ ہمدردی اور خلوص کے نام پر جو
سلوک کیا، وہ سب کو معلوم ہے کہ انسانیت سے کس قدر گرا ہوا اور گھناؤنا تھا۔ مجھے بھی معلوم تھا کہ
فضیلہ کے جسم کو چھوڑنے کے بعد ترشولی تمام تر بہیمیت اور حیوانیت کے ساتھ مجھ پر حملہ آور ہو گی۔
اور سب سے پہلے اپنے انتقام کا نشانہ نورین کو بنائے گی۔ سب کچھ جانتے بوجھتے بھی میں اس سے
فیصلہ کن جنگ لڑنا چاہتا تھا۔ دوسرے الفاظ میں اس بات کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ میں مرنا
چاہتا تھا۔ کیونکہ کتے جیسی زندگی گزارنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔

اُس رات میں نے غسل کیا۔ اشنان نہیں کیا۔ غسل کے تینوں فرائض ادا کیے۔ یعنی کلی کرنا،
ناک میں پانی ڈالنا اور پورے جسم کو اس طرح دھونا کہ ایک رواں بھی خشک نہ رہنے پائے۔ غسل
سے فارغ ہو کر میں بہت مطمئن ہو گیا اور بے اختیار میری زبان سے کلمہ شہادت جاری ہو گیا،
جسے بھولے ہوئے ایک طویل عرصہ گزر گیا تھا۔ وہ دعا بھی یاد آ گئی، جو عموماً غسل اور وضو کے بعد
پڑھی جاتی ہے۔ ”اے اللہ! مجھے اپنے توبہ کرنے والے بندوں میں اور ان بندوں میں جو پاک و
صاف رہتے ہیں، شامل کر دے۔“

مدرسے میں ایک بار ہمارے صدر مدرس کے دفتر میں ایک کافر مشرف بہ اسلام ہوا تھا۔ کلمہ

پڑھتے ہی اس پر بے اختیار رقت طاری ہو گئی۔ بار بار ایک ہی بات کہتا تھا کہ زندگی کا بڑا حصہ کفر کی ظلمتوں میں ضائع ہو گیا۔ ایک طالب علم نے پوچھا۔

"اس وقت کیسا محسوس کر رہے ہو؟"

اس نے کہا۔ "ہر طرف نور ہی نور اور روشنی ہی روشنی نظر آ رہی ہے۔"

کچھ طالب علم ہنسنے لگے کہ ہم تو پیدائشی مسلمان ہیں۔ ہمیں اس نور اور روشنی کا احساس کیوں نہیں ہوتا؟ اس کا جواب صدر مدرس صاحب نے دیا۔ انہوں نے فرمایا۔

"اس لیے احساس نہیں ہوتا کہ تم شروع ہی سے سراپا نور ہو۔ روشنی میں نہائے ہوئے ہو۔ تم نے اس ظلمت اور اندھیرے کا مشاہدہ نہیں کیا، جو کفر میں پایا جاتا ہے۔ جسے پہلے ہی روشنی میں ہو، اسے اس کا بہت کم ادراک ہوتا ہے۔ لیکن جو شخص اندھیرے سے نکل کر روشنی میں آئے، اس نومسلم کی طرح بے اختیار کہہ اُٹھتا ہے کہ اسے نور ہی نور...... روشنی ہی روشنی نظر آ رہی ہے۔"

اس وقت تو معلم صاحب کی بات صحیح طور پر سمجھ نہیں آ سکی تھی، لیکن اس چھوٹے جزیرے پر غسل کر کے کلمہ شہادت پڑھا اور پاک، مطہر رہنے کی دعا مانگی تو ایسا معلوم ہوا، جیسے وچیش میں پھیلی ہوئی تاریکی کو کسی تیز قینچی نے کاٹ کر دولخت کر دیا ہو اور ہلکے سبز رنگ کے انوار چاروں طرف پھیل گئے ہوں۔

انوار میں ڈوبا ہوا واپس کٹیا میں پہنچا۔ فضیلہ بدستور بے حس و حرکت پڑی تھی۔ میں خاموشی سے اس کے پاس لیٹ گیا اور اس کا واحد بے جان اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ وہ وقت دور نہیں جس اس مرمریں ہاتھ کو اپنے خوب صورت جسم کے ساتھ قبر میں دفن ہو جانا تھا۔ جدائی کے تصور سے آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ سینے میں کوئی دل کو مسلنے لگا۔ میں نے اس ہاتھ کو سینے پر رکھ لیا آنکھوں سے لگا لیا۔ اور آخر میں ہونٹوں سے لگا کر زیر لب دعا پڑھی۔ وہ دعا جو کسی کے انتقال کے وقت پڑھی جاتی ہے۔

"ہم سب اللہ ہی کے ہیں۔ اور اسی کے پاس پلٹ کر جانا ہے۔"

اور تب اسی عالم میں غنودگی طاری ہو گئی۔ ایسی اچھی نیند آئی کہ پہلے کبھی نہیں آئی تھی۔ آنکھ کھلی تو صبح ہو چکی تھی۔ فضیلہ اور لوسی ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھیں۔ انہوں نے کہ میں جاگ گیا ہوں تو باتیں ختم کر کے مجھ سے مخاطب ہو گئیں۔

"مجھے معلوم ہے کہ تمہیں بہت زیادہ بھوک لگ رہی ہو گی۔" لوسی نے کہا۔ "میں نے سویرے ہی گوپی کو پوریاں اور کچوریاں لانے شہر بھیج دیا تھا، ابھی تک واپس نہیں آیا۔"

میں اُٹھ کر بیٹھ گیا اور ہلکی سی انگڑائی لے کر بولا۔ "نہیں، کچھ زیادہ بھوک تو نہیں لگ رہی۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" فضیلہ نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ "اچھا، ذرا جلدی سے ضروریات سے

فارغ ہو کر اور ہاتھ منہ دھو کر آ جائیے۔ اتنی دیر میں گوپی پوریاں اور کچوریاں لے کر آ جائے گا۔"

اُن کے چہروں سے میں نے اندازہ لگا لیا کہ میں انھیں فریب دینے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ میرے گلے میں پڑی ہوئی سونے کی ڈبیہ اور جان کی بوٹیوں والا خالی تھال دیکھ کر دونوں مطمئن ہو چکی تھیں کہ میں نے فضیلہ کی ساری شرائط مان لی ہیں۔ سب سے زیادہ خوشی مجھے اس بات کی تھی کہ میں نے اس دھوکے باز کو دھوکا دیا تھا، جو ہمیشہ مجھے دھوکا دیتی آئی تھی۔

اُس صبح میں نے سیڑھیوں پر پہنچ کر معمول کے مطابق ہاتھ منہ دھونے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ باقاعدہ وضو کیا۔ گزشتہ رات سے رہ رہ کر معلم صاحب کی باتیں یاد آ رہی تھیں۔ وہ طلباء کو ہمیشہ باوضو رہنے کا مشورہ دیا کرتے تھے۔ ایک بار ارشاد فرمایا تھا۔

"وضو کی یوں تو بے شمار خوبیاں ہیں، جسم تروتازہ ہو جاتا ہے، گناہ ڈھل جاتے ہیں، روز قیامت اعضائے وضو سورج کی طرح چمکیں گے۔ لیکن اس وقت روز افزوں حادثات کو دیکھ ایک خاص خوبی یہ بھی ہے کہ جو لوگ باوضو رہتے ہیں، انہیں اللہ تعالیٰ بلاؤں، وباؤں اور حادثات سے محفوظ رکھتے ہیں۔

میں وضو کر کے کٹیا میں پہنچا۔ لوسی جا چکی تھی۔ فضیلہ بالکل تنہا تھی۔ اُس نے مسکراتی نظروں سے میرا استقبال کیا۔ اور جب میں چٹائی پر بیٹھ گیا تو اپنی جگہ سے اُٹھ کر وہ بھی میرے پاس آ بیٹھی اور میرے کندھے پر اپنا سر رکھ دیا۔

دائمی جدائی کے تصور سے ایک بار پھر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ فضیلہ نے کہا۔

"آج تو آپ بہت ہی پیارے معلوم ہو رہے ہیں۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور ہاتھ بڑھا کر ان سنہری زلفوں سے کھیلنے لگا، جن سے کچھ دنوں میں مجھے ہمیشہ کے لیے محروم ہونا تھا۔

فضیلہ پھر بولی۔ "ابھی تک ناراض ہیں، مجھ سے؟"

"نہیں......." میں نے کہا۔ "میں تم سے نہیں، اپنے آپ سے ناراض ہوں۔"

"کل رات میرے منہ سے چند نازیبا کلمات ادا ہو گئے تھے۔ اور میں آپ کی شان میں گستاخی کر بیٹھی تھی۔ یقین کیجیے، میں ابھی تک اپنی اس حرکت پر نادم ہوں۔"

میں نے اس حسین چہرے کو، جو چند روز کا مہمان تھا، گھما کر اپنی طرف کر لیا اور ان آنکھوں میں، جنہیں بالآخر مٹی میں مل کر مٹی ہو جانا تھا، جھانکتا ہوا بولا۔

"کیسے مان لوں کہ تم نادم ہو؟ خوشی تو تمہارے روئیں روئیں سے پھوٹی پڑ رہی ہے۔"

"خوشی تو اس بات کی ہے کہ آپ واقعی مجھ سے محبت کرتے ہیں۔" اُس نے اٹھلا

"میں تو ڈر رہی تھی کہ اگر آپ نے جنتر نہ پہنا اور بوٹیاں نہیں کھائیں تو مجھے ویشیا بھگت کی اِچھا پر عمل کر کے آپ کو چھوڑنا پڑے گا۔"

میں نے طویل اور گہری سانس لی۔

"میری اِچھا، ویشیا کی اِچھا پر غالب آ گئی تھی۔ میں پہلے ہی اس سے دستبردار ہونے کا فیصلہ کر چکا تھا۔"

"اب تو غصہ تھوک دیجیے۔" اُس نے خوشامدانہ انداز میں کہا۔ "گزشتہ رات کی باتوں پر شرمندہ ہوں اور سچے دل سے معافی چاہتی ہوں۔"

"ترشولی!" میں نے دل ہی دل میں کہا۔ "تیرے کاٹے کا علاج نہیں ہے۔" پھر فضیلہ سے مخاطب ہو کر کہا۔

"یہ بتاؤ کہ کل رات لوسی کے ساتھ شمشان بھومی کیوں گئی تھیں؟"

"اوہو.......اس چھوٹی سی بات پر ناراض ہو رہے ہیں۔ یہ تو میں خود ہی آپ کو بتانے والی تھی۔" اُس نے لیٹ کر میری گود میں سر رکھ لیا۔ "ہومیو پیتھک کے اُس ڈاکٹر نے، جس کا نام قاسم جیلانی ہے، عرصۂ دراز سے ہم لوگوں کو تنگ کر رکھا ہے۔ یوں نہیں، میں آپ کو بالکل شروع سے بتاتی ہوں۔ اس دنیا میں کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ کسی بے قصور اور بے گناہ کو مار دیا جاتا ہے۔ مرنے والے کی روح انتظار کرتی ہے، قاتل شاید قانون کی گرفت میں آ جائے اور اسے اس کے کیے کی سزا مل جائے۔ قاتل کی ذہانت اور چالاکی کی وجہ سے اسے قانون سزا نہیں دے پاتا تو روح خود انتقام لینے کی کوشش کرتی ہے۔ ایسی روح کو بھٹکتی ہوئی روح کہا جاتا ہے۔ ایک دو نہیں، دنیا کی ہواؤں میں، پنہائیوں میں، فضاؤں میں اور خلاؤں میں بے شمار روحیں بھٹکتی پھر رہی ہیں۔ انتقام لینے کے لیے انہیں انسانی جسم کی ضرورت ہوتی ہے۔ مُردہ جسموں تک ان کی رسائی اس لیے نہیں ہو پاتی کہ انہیں یا تو دفن یا نذرِ آتش کر کے ضائع کر دیا جاتا ہے۔ اس لیے وہ مجبور ہو جاتی ہیں کہ کسی زندہ انسان پر سوار ہو جائیں اور اس سے اپنی مرضی کے کام کروائیں۔"

میں نے کہا۔

"تم بھی ایک بھٹکتی ہوئی روح ہو۔ تمہیں اپنی مرضی کے مطابق ایک خوب صورت مگر مُردہ جسم بھی حاصل ہو چکا ہے۔ یقین تو نہیں کہ درست جواب دو گی، پھر بھی اتنا ضرور پوچھوں گا کہ تم سے کس بات کا انتقام لیا جا رہا ہے؟"

وہ بے اختیار ہنسنے لگی۔ "آپ یقین کریں یا نہ کریں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ کچھ روحیں ایسی بھی ہوتی ہیں، جو محبت کی خاطر ایسا کرتی ہیں۔ اور جس طرح بن پڑے، اپنے محبوب کا قرب حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ مجھے اس جسم میں دیکھ رہے ہیں، جو آپ کو دنیا میں

سب سے زیادہ پیارا ہے۔"

بحث کرنا تو اس نے جو جواب دیا تھا، اس میں بہت سے ایسے پہلو تھے، جو تشریح
تھے۔ مگر میں نے بات کو آگے بڑھانا مناسب نہیں سمجھا۔ اصل موضوع پر آتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے، اتنی بات میری سمجھ میں آگئی کہ بھٹکی ہوئی روحیں، مُردہ جسم نہ ہونے کی صو
میں بسا اوقات زندہ انسانوں پر بھی سوار ہو جاتی ہیں۔ اس کے آگے بتاؤ۔"

"پھر ہوتا یوں ہے کہ ڈاکٹر قاسم جیلانی اپنے عمل سے روحوں کو جسم چھوڑنے پر مجبور
ہے اور ان سے ایسی قسمیں لے لیتا ہے کہ وہ روحیں دوبارہ اس جسم پر قابض ہونے کی کوشش
کر سکتیں۔ یہ بے انصافی نہیں تو اور کیا ہے؟ دنیا کا قانون ظالم اور قاتل شخص کو سزا نہیں د
تو روح خود بدلہ لینے پر آمادہ ہو جاتی ہے۔ لیکن قاسم جیلانی جیسے لوگ اُسے خود بھی بدلہ نہیں
دیتے۔ ہم اس ظلم اور ناانصافی کو ختم کر دینا چاہتے ہیں۔ اور یہ اس طرح ممکن ہے کہ جتنی
قاسم جیلانی جیسے لوگوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا جائے۔

میں خاموشی سے اسے دیکھنے لگا۔ کتنا پیارا، بھولا بھالا سا معصوم چہرہ تھا۔ لیکن اس
سے کس قدر ہیبت ناک جملے ادا ہو رہے تھے۔

"اب آیئے، اپنے اصل سوال کی طرف کہ ہم لوگ مرگھٹ کیوں گئے تھے؟ قا
دیکھنے میں جتنا کمزور نظر آتا ہے، اتنا ہی طاقت ور بھی ہے۔ اس کی طاقت کو ختم کرنے
ضروری ہے کہ اسے کوئی ایسی چیز کھلائی جائے، جو اس کے مذہب میں حرام ہو۔ ہمارا
ہے کہ ایسے شخص کو اگر کسی انسان کا دل مرگھٹ کی آگ میں بھون کر کھلایا جائے تو وہ کمز
بالکل ناکارہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس کی قوتِ مزاحمت ختم ہو جاتی ہے اور اس کے سارے
جان اور بے اثر ہو جاتے ہیں۔ میں لوسی کے ساتھ جان کا دل لے کر شمشان گئی تھی، تا
کی آگ پر بھونا جا سکے۔"

"گویا، قاسم جیلانی جب یہاں آئے گا تو تم اُسے جان کا بھنا ہوا دل کھلا کر اپنے
لوگی؟" میں نے پوچھا۔ "تمھیں یقین ہے کہ وہ ہنسی خوشی اسے کھانے پر تیار ہو جائے گا

"آپ کی یہی ادا تو مجھے پسند ہے کہ جب تک بال کی کھال نہ اُتار لیں، آپ کو
ملتا۔" وہ بولی۔ "ڈاکٹر قاسم جیلانی کو مٹھائی بہت اچھی لگتی ہے۔ چمن سویٹ کا تو وہ د
گوپی کو تو آج ناشتہ لانے میں اسی لیے دیر ہو رہی ہے کہ پہلے وہ ایک کلو مٹھائی خرید
اس مٹھائی میں جان کے بھنے ہوئے دل کا سفوف ملائے گا، اس کے بعد ایک عقید
حیثیت سے ڈاکٹر کے پاس جائے گا اور ڈاکٹر کو وہ مٹھائی پیش کرے گا۔ ان کاموں
جائے گا تو ناشتہ لے کر یہاں آجائے گا۔"

میں بے اختیار ہنسنے لگا۔ حالانکہ اندر ہی اندر میرا دل رو رہا تھا۔ ایسا کوئی طریقہ نہیں تھا کہ جس سے قاسم جیلانی کو مٹھائی کھانے سے روکا جا سکتا۔ مکار ترشولی نے بے چارے ڈاکٹر کے سیخ کباب بنانے کی ساری تیاریاں مکمل کر لی تھیں، تب مجھے حقیقت سے آگاہ کیا گیا تھا۔ اگر گزشتہ رات بتا دیتی تو چاہے مجھے جان کی بازی ہی کیوں نہ لگانا پڑتی اور چاہے کسی مٹکے کے سہارے دریا کو عبور کرنا پڑتا، میں ڈاکٹر کو آگاہ کر دیتا کہ ویشیا کے پجاری کس قسم کے منصوبے بنا رہے ہیں۔

گوپی تقریباً دو گھنٹے بعد اُس وقت ناشتہ لے کر آیا، جب فضیلہ اشنان کرنے گئی ہوئی تھی۔

"ڈاکٹر کو مٹھائی دے آئے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں سائیں!" اُس نے بتایا۔ "دیوی نے جو دوا دی تھی، اس کو اچھی طرح ملا دیا تھا۔ مٹھائی کو دیکھ کر اُس کی رال ٹپک پڑی تھی۔ اب تک تو وہ آدھی سے زیادہ کھا چکا ہو گا۔"

"تم نے ساری دوا مٹھائی میں ملا دی تھی؟" میں نے شکایت کے انداز میں کہا۔ "یہ نہیں کیا کہ ان چھولوں اور کچوریوں میں بھی ملا دیتے، جو ساتھ لے کر آئے ہو۔"

"تھوڑی سی نہیں، آدھی ملائی ہے۔" گوپی نے کہا۔ "ہم تو سائیں! حکم کے غلام ہیں۔ دیوی جی نے یہی حکم دیا تھا۔" پھر اُس نے اپنا چہرہ میرے کانوں کے پاس لا کر کہا۔ "ایک بات بتاؤ، صاحب جی!"

"کیا؟"

"کیا اس دوا کو کھا کر ہاتھی جیسی طاقت آجاتی ہے؟"

"دو ہاتھیوں جیسی۔" میں نے بھی اُس کی طرح سرگوشی میں کہا۔ سرگوشی تو ایک طرح کا بہانہ تھا، میں جھک کر یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اس کی جیب کیوں پھولی ہوئی ہے۔ جیب میں بھورے رنگ کا ایک لفافہ تھا اور صاف ظاہر تھا کہ اس لفافے میں فضیلہ اور لوسی کا دیا ہوا وہ سفوف تھا، جس کو کھانے سے انسان ہاتھی کی طرح طاقت ور ہو جاتا تھا۔ اور گوپی نے مٹھائی اور چھولوں سے بچا کر اپنے استعمال کے لیے محفوظ کر لیا تھا۔

میں نے زندگی کے کسی حصے میں کسی کی جیب نہیں کاٹی، نہ کسی جیب کترے کو کسی کی جیب کترتے ہوئے دیکھا۔ پھر بھی اُس روز میں نے ماہر جیب کتروں کی طرح گوپی کی جیب سے وہ لفافہ معمولی سی ٹکر کے بعد اس طرح صاف کر دیا کہ اُسے اُس کے نکالے جانے کا احساس تک نہیں ہوا۔ بعد میں وہ اس وقت کٹیا میں آیا، جب فضیلہ اشنان کر چکی تھی اور میں گوپی کا لایا ہوا سارا ناشتہ دریا میں بہا چکا تھا اور بھورے رنگ کے لفافے والے سفوف کو اس مٹکے میں ڈال چکا تھا، جس میں فضیلہ اور میں پانی پیا کرتے تھے۔

"کیا تلاش کرتے پھر رہے ہو، گوپی؟" فضیلہ نے اُسے فرش کا جائزہ لیتے دیکھ کر پوچھا۔

"میرا نوٹ کہیں گر گیا ہے۔"

"کتنے کا نوٹ تھا؟"

"پانچ روپے کا نوٹ۔"

"پانچ روپے کا نوٹ؟"

"جی ہاں!"

"یہ لو، پانچ کا نوٹ۔" فضیلہ نے گریبان سے نوٹ نکال کر اُس کی طرف بڑھاتے کہا۔ "آئندہ اجازت لیے بغیر کبھی کٹیا میں نہ آنا۔"

"ٹھیک ہے، دیوی جی!" گوپی نے بے چارگی سے کہا اور کٹیا کے کونوں کو چور نظروں سے دیکھتا ہوا باہر نکل گیا۔

"کل کا دن۔" فضیلہ نے جھومتے ہوئے کہا۔ "ہماری زندگی کا سب سے بڑا دن ہوگا"

جس وقت فضیلہ اشنان کر کے آئی تھی، میں نے اسی وقت اس سے معذرت چاہ لی تھی انتہا بھوک کے باعث اس کے آنے کا انتظار کیے بغیر سارا ناشتہ ہضم کر گیا ہوں۔ میں جانتا اس نے اپنے ناشتے کا علیحدہ انتظام کیا ہوگا۔ سفوف ملا ہوا ناشتہ وہ ہرگز نہ کھاتی، مگر ضروری تھی، جسے اُس نے یہ کہہ کر قبول کر لیا تھا۔

"بہت اچھا کیا۔ میرے پیٹ میں بھی کچھ اینٹھن سی ہو رہی ہے۔ اس وقت کچھ نہ بہتر ہے۔"

"کیا ہو گیا ہے، مجھے......؟" میں نے دوبارہ معذرت چاہتے ہوئے کہا۔ "کھا ہوں تو کھاتا ہی چلا جاتا ہوں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ساری دنیا کو کھا جاؤں گا، تب کہیں بھرے گا۔"

"اچھی صحت و تندرستی کی یہی علامت ہے۔"

نہیں، یہ صحت و تندرستی کی بات نہیں تھی۔ اصل بات مجھے اس وقت یاد آ گئی تھی، ج نے صبح کے وقت وضو کر کے کلمہ شہادت اور وضو کی دعا کو اپنی زبان سے ادا کیا تھا۔ "مسلما آنت سے کھاتا ہے اور کافر بائیس آنتوں سے۔" شاید یہی وجہ تھی کہ کلمہ پڑھتے ہی میرا ختم ہو گئی تھی۔

کچھ دیر بعد لوسی آ گئی۔ ان دونوں کو اگلے دن یعنی منگل وار کو کچھ ضروری انتظامات ک ایک چھوٹا سا جشن منانے کی تیاریاں کی جا رہی تھیں۔ لوسی، فضیلہ کو اپنے ساتھ لے گئی تم اس کی نگرانی میں جزیرے کو سجایا جا سکے۔ میں کچھ دیر تک کٹیا میں بیٹھا رہا، پھر ان سیڑ بیٹھا، جو دریا میں اُترتی تھیں۔

میں سیڑھیوں پر بیٹھا دریا کی خوب صورت لہروں اور مچھلیوں کی اُچھل کود سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ سانپ جیسی ایک مچھلی اُچھل کر میرے قدموں میں آ گری۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اُسے دریا میں پھینک دیا۔ چند لمحوں بعد وہ دوبارہ تڑپی اور میری گود میں آ گئی تو میں نے اسے امداد غیبی سمجھ کر ہاتھ میں اُٹھا لیا۔ کوئی دوسری مچھلی ہوتی تو پانی سے نکل کر بری طرح تڑپتی، ہاتھ سے نکل جاتی۔ لیکن اس مچھلی نے اس قسم کی کوئی کوشش نہیں کی۔

میں اسے کٹیا میں لے کر آ گیا۔ چاقو کی مدد سے اسے چیرا، آلائش نکالی، ٹکڑے بنائے اور ایک اخبار میں لپیٹ کر دوبارہ دریا پر پہنچ گیا۔ تھوڑا سا جھاڑ جھنکاڑ جمع کیا، پتھروں کو رگڑا، آگ تیار کی اور اس آگ پر مچھلی کے ٹکڑوں کو بھونا۔ قتلے کچھ بھنے، کچھ کچے رہے۔ نمک مرچ لگانے کی زحمت بھی نہیں کی اور ان قتلوں سے، جو اس وقت میرے لئے من و سلویٰ سے کم نہیں تھے، دل کھول کر صبح کا ناشتہ کیا۔

ناشتے سے فارغ ہو کر میں نے کچھ دیر تک سیڑھیوں پر نیم دراز ہو کر آرام کیا۔ خوبی مچھلی کی تھی یا میرے پریشان خیالات کا کرشمہ تھا، اچانک ایسا معلوم ہوا، جیسے فضیلہ کی روح میرے پاس آ کھڑی ہوئی ہو اور جلترنگ جیسی مسحور کن آواز میں کہہ رہی ہو۔

"دل سے التجا کی جائے تو وہ سب کی سن لیتے ہیں۔ انہوں نے میری بھی سن لی اور دیکھ لیجیے، مجھے دوبارہ آپ کے پاس بھیج دیا۔"

میں نے جلدی سے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ ایک بگولا سا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے دریا کی لہروں میں تحلیل ہو گیا۔ ان دونوں پلوں کے عقب میں، جو ستونوں کے بغیر تعمیر کیے گئے تھے، آسمان پر گہری سرخی چھائی ہوئی تھی۔ عموماً شام کے وقت سرخی نظر آتی تھی، دن میں وہاں کا آسمان سلگتے ہوئے ایک اُپلے کی طرح ہوتا تھا، جس سے مسلسل چنگاریوں کی بوچھاڑ ہوتی رہتی تھی۔ دریا اپنی معمول کی رفتار کے ساتھ بہہ رہا تھا اور دُور مسافروں سے بھری ہوئی ایک لانچ سست رفتاری کے ساتھ شہر کی جانب رواں دواں تھی۔

ٹانگوں کو کچھ اور پھیلا کر میں نے سیڑھی سے ٹیک لگا لی اور ایک بار پھر اس توقع میں آنکھیں بند کر لیں کہ شاید فضیلہ کی آواز سنائی دے۔

کئی منٹ تک انتظار کیا، پھر جھنجھلا کر اُٹھ بیٹھا اور جزیرے کے اُس حصے کی طرف چل دیا، جو کسی بادشاہ یا راجہ کے دربار سے مشابہہ تھا۔ فضیلہ اور لوسی لباس کو گھٹنوں تک چڑھائے بڑی بڑی فرش کو دھونے میں مصروف تھیں۔ گوپی دریا سے پانی کی بالٹیاں بھر بھر کر لا رہا تھا۔ ان دونوں کو اتنی فرصت نہیں تھی کہ میری طرف دھیان دیتیں۔ اور خود میں بھی اُن کی حرکتوں سے اتنا پشیمان ہو چکا تھا کہ زیادہ دیر وہاں نہیں رُکا، کٹیا میں واپس پہنچا، کٹیا کے گوشے میں ٹماٹر کی چٹنی کی

خالی شیشی پڑی تھی، جو پچھلے دنوں لوسی شہر سے لے کر آئی تھی۔ پتہ نہیں، چٹنی کے نام پر اس مجھے کیا چیز کھلائی تھی۔

بہر حال میں نے اس بوتل کا اچھی طرح جائزہ لیا، پھر ایک مختصر سا پرچہ لکھا۔

"جس شخص کو یہ بوتل اور پرچہ ملے، اس سے درخواست ہے کہ وقت ضائع کیے بغیر اپنے قریبی پولیس اسٹیشن پر پہنچا دے۔ پولیس سے التماس ہے کہ منگل کے دن راج کنڈل پہنچ جائے۔ کیونکہ یہاں ایک بے گناہ کو قتل کرنے کی تیاریاں کی جارہی ہیں۔ اس کے علاوہ اس نے ایک ایسے انسان کی بوٹیاں بھی محفوظ کر لی ہیں جو اس جزیرے پر کسی سے ملنے آیا تھا۔ لیکن ان لڑکیوں کی بھینٹ چڑھ گیا۔"

پرچے کو بوتل کے اندر ڈال کر لہروں کے سپرد کر دیا۔ پلوں کے عقب میں نظر آنے والی مزید پھیل گئی اور عقب کے بجائے عین پل کے اوپر تک چھا گئی۔ دھوپ کے رنگ میں غالب ہوتی جارہی تھی۔

مگر لوسی اور فضیلہ دنیا و مافیہا سے بے خبر جزیرے کو سجانے میں مصروف تھیں۔ دریا کی طرف انہوں نے رنگ برنگی جھنڈیاں لگائی تھیں۔ سنگ مرمر کی دیوار پر وشیا بھگت کی آویزاں کر کے اس پر پھولوں کے گجرے ڈالے گئے تھے۔ جگہ جگہ لوبان سلگانے کے برتن ہوئے تھے۔

حیرت اس بات کی تھی کہ پجاری کہاں غائب ہو گئے تھے؟ انہوں نے اپنے بھگوان میں بھگوان کے دشمن کی تصویر کو کس طرح گوارہ کر لیا؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ سیخ کباب بنا۔ لیے ان تینوں کو بھی منتخب کر کے اس تہہ خانے میں منتقل کر دیا گیا ہو، جس کے میکنزم کو تم کے میری نظروں سے اوجھل کر دیا گیا تھا۔ لیکن جلد ہی اصل بات معلوم ہو گئی۔ تینوں پجاری کے ایک مندر کی تقریب میں شرکت کے لیے گئے تھے۔ وہاں وشیان کنھیا جنم لینے وا۔ کوپی بھی شام تک کا مہمان تھا، کیونکہ وہ بھی وشیان کنھیا کے جنم کا چمتکار اپنی آنکھوں۔ چاہتا تھا۔ گویا فضیلہ اور لوسی دونوں کو وقتی طور پر پورے جزیرے کا مالک بنا دیا گیا تھا۔

سہ پہر ہوتے ہی سارا آسمان سرخ ہو گیا۔ ہوا کے تیز جھکڑ چلنے لگے۔ جھنڈیاں لہروں سے زیادہ تیزی سے لہرانے لگیں۔ فضیلہ اور لوسی دونوں کی پریشانی قابل دید تھی ساری محنت اکارت جارہی تھی۔

باقاعدہ آندھی اس وقت آئی، جب سورج غروب ہو چکا تھا۔ آندھی کے ساتھ ہوئی۔ میں نے زندگی میں کبھی اتنی تیز بارش اور آندھی نہیں دیکھی تھی۔ دریا کی سطح بلند ہو

کا پانی کئی کئی گز جزیرے میں گھس آیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے دریا کی ناراض لہریں جزیرے کو ڈبو دیں گی، یا ہوا کے تیز جھونکے پورے جزیرے کو اُڑا لے جائیں گے۔ کوپی آندھی آنے سے قبل شہر چلا گیا تھا، لیکن مجھے یقین تھا کہ اُسے شہر جانا نصیب نہیں ہوا ہوگا۔ اُس کی روانگی کے دو منٹ بعد ہی آندھی اور بارش شروع ہو گئی تھی۔ اس آندھی اور بارش میں بہترین سے بہترین ملاح بھی کشتی نہیں چلا سکتا تھا۔ نہ کوئی چھوٹی کشتی بپھری ہوئی موجوں کا مقابلہ کر سکتی تھی۔

ہم تینوں میں فضیلہ اور لوسی ایک ہی کٹیا میں سہمے بند بیٹھے ہوئے تھے اور درختوں کے ٹوٹ کر گرنے، موجوں کے دیواروں سے ٹکرانے، بادلوں کے گرجنے اور ہواؤں کے چنگھاڑنے کی دلخراش آوازیں سن رہے تھے۔ کبھی کبھی ہوا کے تیز جھونکے کٹیا کے بند دروازے سے اس طرح آ کر ٹکراتے تھے، گویا دروازوں کو توڑ ڈالیں گے۔ میں دل ہی دل میں اللہ کو یاد کر رہا تھا۔ جبکہ فضیلہ اور لوسی با آواز بلند اپنے وشیا بھگت کو مدد کے لیے پکار رہی تھیں۔

آندھی اور بارش کا زور نصف شب کے بعد کم ہوا۔ بیک وقت ہم تینوں تباہ کاریوں کو دیکھنے کے لیے باہر نکلے۔ فضیلہ اور لوسی یہ دیکھ کر آنسوؤں سے رونے لگیں کہ اُنھوں نے جزیرے کو جتنا سجایا تھا، وہ اتنا ہی گندا ہو گیا تھا۔ وشیا کی تصویر لاپتہ تھی۔ اسے ہوا کے جھونکے اپنے ساتھ اُڑا لے گئے تھے۔ اور سجاوٹ اور آرائش کی دوسری چیزیں بھی اس طرح غائب تھیں، جیسے ان کا کوئی وجود ہی نہ ہو۔

تکلیف مجھے بھی ہوئی تھی۔ میں نے جان کی بوٹیاں جس جگہ محفوظ کی تھیں، اسے دریا کی تند و تیز لہروں نے کئی گز تک کاٹ ڈالا تھا اور اب وہاں ٹھاٹھیں مارتے ہوئے پانی کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا۔ ان دونوں کو غم زدہ اور پریشان چھوڑ کر میں بجلی کی چمک کے سہارے راستہ دیکھتا ہوا کٹیا میں واپس چلا گیا اور ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ جو ثبوت محفوظ کیا تھا، اس پر محاورے کے طور پر نہیں، بلکہ حقیقت میں پانی پھر گیا تھا۔ میں سونے کے لیے لیٹ گیا۔ تھوڑی سی آنکھ لگ گئی تھی کہ فضیلہ کی روح کا تصور ایک بار پھر بے چین کرنے لگا۔

"اللہ میاں نے مجھے دوبارہ بہت بہت دنوں کے لیے آپ کے پاس بھیج دیا ہے۔"

آنکھیں کھولیں تو کٹیا میں کچھ بھی نہیں تھا۔ صرف بجلی چمک رہی تھی اور بادل گرج رہے تھے۔

"کاش! یہ ممکن ہوتا۔" میں نے کہا اور کروٹ بدل کر گہری نیند سو گیا۔

صبح اٹھا تو طوفانِ بادوباراں مکمل طور پر ختم ہو چکا تھا۔ صرف اس کے آثار باقی تھے۔ برگد کا کئی سو سالہ بوڑھا درخت ٹوٹ کر نصف سے زیادہ دریا میں گر گیا تھا۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی درخت دریا میں گر گئے تھے۔ ایک جانب کی دیوار لہروں کا مقابلہ کرتے کرتے درمیان سے بیچ

گئی تھی۔ بیشتر جھاڑیاں غائب تھیں۔ مشرقی حصے کی جانب چند مرغیاں مری پڑی تھیں، جنہ
لہریں نہ جانے کہاں سے کہاں لے آئی تھیں اور تعفن پھیلانے کے لیے جزیرے پر چھوڑ گئی تھیں
پانی کے چھوٹے بڑے گڑھوں اور دریا کے لائے ہوئے کاٹھ کباڑ سے بچتا ہوا میں فضیلہ
لوسی کی تلاش میں آگے بڑھا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ جزیرے کے اس حصے میں، جو
دربار جیسا تھا، چہرے پر قشقہ لگائے، گلے میں جنیئو پہنے، مختصر سی دھوتی میں ملبوس وشیا سنگ
کے فرش پر براجمان تھا اور دونوں لڑکیاں اُس کے قدموں میں بیٹھی تھیں۔

مجھے اپنے سامنے دیکھ کر وہ وحشیوں کی طرح ہنسنے لگا۔

"ہم نے کہا تھا کہ ہمارا سواگت نہ کیا جائے۔ لیکن ترشولی اور پورنما نہیں مانیں۔" اُس
ہنستے ہوئے کہا۔ "سو ہم نے آندھی اور برسات بھیج کر ان کے سارے پربندھ ختم کر دیے۔"

لوسی نے کہا۔

"مہاراج! میں تو سدا سے آپ کے چمتکار کی قائل ہوں۔"

فضیلہ، سادھو کے قدموں سے اُٹھ کر میرے پاس آ گئی اور میرے کندھے پر اپنا ہاتھ
رکھ کر بولی۔

"یہ آپ کے سچے بھگت بن گئے ہیں، مہاراج!"

"نہیں۔" سادھو نے کہا۔ "ابھی اس کے من میں کھوٹ ہے۔"

"ان کے کھوٹ کو دُور کر دیجیے، مہاراج!"

"دُور ہو جائے گا۔ اس وقت سارا کھوٹ دُور ہو جائے گا، جب یہ تمہارا بازو ٹھیک
دیکھے گا۔"

"میرا ہاتھ ٹھیک ہو جائے گا، مہاراج؟"

"ہاں...... بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔ جیسے کبھی غائب ہی نہ ہوا ہو۔"

لوسی نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔

"تم مہاراج کے چمتکار پر تعجب کر رہی ہو، فضیلہ؟"

"شما چاہتی ہوں، مہاراج!"

"سنو بچہ!" سادھو نے مجھے مخاطب کیا۔ "تمہیں ہی نہیں، ہمیں بھی ایک ہاتھ کی ترش
نہیں لگتی۔ تم ہی نہیں، ہم بھی یہی چاہتے ہیں کہ اسے اس کا کھویا ہوا ہاتھ واپس مل جائے۔"

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہوں۔ مجھے اس فضیلہ کی کوئی پروا نہیں تھی، جس
دنیا کی کمینہ ترین روح قابض تھی۔ میں نے ایک روز پہلے ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ اب ا
صورت جسم کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے قبر میں دفن ہونا ہے۔

"اگر تم کسی لڑکی کا ہاتھ کاٹ لاؤ تو ہم اسے ترشولی کے شریر سے اس طرح لگا دیں گے کہ
کسی کو پتہ تک نہیں چلے گا کہ ترشولی کا ہاتھ کبھی کٹا تھا۔"

"اتنا بڑا ظلم......" میں نے دل ہی دل میں کہا۔ "کیا یہ ممکن ہے؟...... کیا میں اس لڑکی
کے لیے، جو مجھے انسانوں کی یخنی اور گوشت کھلاتی آئی تھی، اُس کی خاطر اتنا بڑا ظلم کر سکتا ہوں؟"

"تم سوچ رہے ہو کہ جس لڑکی کا ہاتھ کاٹا جائے، وہ کہاں سے آئے گی؟"

میں مبہوت سا کھڑا رہا۔

"آج شام کو وہ لڑکی آ رہی ہے، بچہ!" سادھو نے کہا۔

"کون لڑکی؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"اُس کا نام نورین ہے۔ اور اُس کا ہاتھ بالکل ترشولی کے ہاتھ جیسا ہے۔"

"کیا؟" میں تقریباً چیخ پڑا۔ "کون آ رہی ہے؟"

"ہاں بچہ! نورین آ رہی ہے۔"

اسی لمحے ایک شخص ہانپتا کانپتا، ایک چھوٹی سی کشتی سے اُتر کر تقریباً دوڑتا ہوا ہماری طرف
آیا۔ وہ ڈاکٹر قاسم جیلانی تھا۔

"تم......؟"

"ہاں، میں آ گیا ہوں۔"

میں حیران و پریشان یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔

قاسم جیلانی دونوں ہاتھ ہلاتا ہوا کہہ رہا تھا۔ "میں آ گیا ہوں۔ خوب اچھی طرح مطالعہ کر
کے آیا ہوں۔ تم لوگ اس معصوم لڑکے کو زیادہ عرصے تک دھوکہ نہیں دے سکتے۔"

"آؤ، مورکھ!" سادھو نے ہنس کر کہا۔ "ہم بھی تمہارے کباب بنانے کے سارے انتظامات
کر چکے۔"

لوسی اور فضیلہ بھی اُسے للچائے ہوئے انداز میں دیکھ رہی تھیں۔

"قاسم جیلانی صاحب!" میں نے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ "خدا کے لئے یہاں سے فوراً
چلے جائیے۔ ان لوگوں کے ارادے بہت خطرناک ہیں۔"

"مجھے بھی یہی دیکھنا ہے کہ جنات کا یہ باغی گروہ کس حد تک پستی میں گر سکتا ہے؟" قاسم
جیلانی نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔

"ہو سکتا ہے کہ ان لوگوں سے مقابلہ کرتے ہوئے مجھے اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑیں۔ اس
لیے میں تمہیں پہلے ہی خبردار کر دینا چاہتا ہوں کہ اپنی بیوی کو نقصان پہنچانے کی غلطی مت کرنا۔ یہ
بے چاری آسیب زدہ ہے۔"

فضیلہ نے چیخ کر کہا۔ "میں ترشولی ہوں"

"نہیں بی بی!" قاسم جیلانی نے لوسی کی طرف اشارہ کیا۔ "ترشولی یہ عورت ہے۔ اور یہ......" اس نے سادھو کی طرف دیکھ کر کہا۔ "یہ ترشولی کا عاشق ہے۔"

"نہیں۔" فضیلہ چیختی ہوئی سادھو کی طرف بھاگی۔ "میں ترشولی ہوں۔ میں ترشولی ہوں۔"

میں فضیلہ کو پکڑنے دوڑا تو قاسم جیلانی نے میرا راستہ روک لیا۔

"آگ سے ٹکراؤ گے تو جل جاؤ گے۔ ان کا مقابلہ مجھے کرنے دو۔ ان کی شامت آئی تھی انہوں نے مجھے یہاں آنے کی دعوت دی۔ آج یا تو یہ نہیں، یا میں نہیں۔ تم بہرحال اپنی بیوی جب وہ مکمل طور پر ہوش و حواس میں آ چکی ہوگی، یہاں سے لے کر خوش خوش اپنے گھر جاؤ گے۔"

"مورکھ۔" سادھو چلایا۔ "تو نہیں جانتا کہ کس سے ٹکرانے کی بات کر رہا ہے۔"

"خوب اچھی طرح جانتا ہوں۔" جیلانی نے مجھے اپنی پشت کی جانب دھکا دے کر کہا۔ اس کے ساتھ ہی کچھ پڑھ کر سادھو کی طرف پھونک مار دی۔

❁

سچ تو یہ ہے کہ میں غیر معمولی چیخ و پکار اور دھما چوکڑی کے باوجود کچھ بھی نہیں سمجھ پایا۔ کچھ ایسا محسوس ہو رہا تھا، جیسے اسٹیج ڈرامہ کھیلا جا رہا ہو۔ اور ڈرامے کے سارے کردار پوری آواز سے چیخ چیخ کر اپنے مکالمے ادا کر رہے ہوں۔

ڈاکٹر قاسم جیلانی نے، جو ڈاکٹر کم اور اسکول ٹیچر زیادہ نظر آتا تھا، مجھ سے یہ کہہ کر کہ "تمہاری بیوی آسیب زدہ ہے، اسے نقصان نہ پہنچنے پائے" کوئی نیا انکشاف نہیں کیا تھا۔ یہ بات تو مجھے راج کنڈل پہنچتے ہی معلوم ہو گئی تھی۔ ہاں، اس وقت تھوڑی سی پریشانی ضرور ہوئی تھی، جب فضیلہ بے تحاشا "میں ترشولی ہوں، میں ترشولی ہوں" کا ورد کرتی ہوئی سادھو کی طرف بھاگی اور ڈاکٹر قاسم جیلانی نے پُر زور الفاظ میں تردید کرتے ہوئے لوسی کو ترشولی اور سادھو کو اس کا اصل عاشق قرار دیا۔ ڈاکٹر جیلانی کو غلط فہمی ہوئی تھی یا واقعی لوسی ہی ترشولی تھی؟ اگر لوسی، ترشولی تھی تو فضیلہ کیا تھی؟ اور وہ ایک ایسی بچی کی طرح، جس کے جھوٹ کی قلعی کھل گئی ہو، تڑپ تڑپ کر اپنے جھوٹ کو سچ ثابت کرنے کی کوشش کیوں کر رہی تھی؟

ڈاکٹر جیلانی نے زیر لب کچھ پڑھ کر سادھو کی طرف پھونک ماری تو وہ دونوں ہاتھوں سے چہرے کو چھپا کر ایک طرف اتنی تیزی سے ہٹا جیسے آگ کے کسی شعلے سے بچنے کی کوشش کر رہا ہو۔ دوسرے ہی لمحے لوسی اُچھل کر کھڑی ہو گئی۔ اور اس نے نہ جانے کون سا ایسا عمل کیا کہ ڈاکٹر جیلانی پیٹھ کے بل اُلٹا گرا اور قلابازیاں کھاتا ہوا کئی گز دور جا گرا۔ ابھی وہ سنبھلنے نہیں پایا تھا کہ لوسی نے شیرنی کی طرح جست لگائی اور دوڑ کر اس کے سینے پر سوار ہو گئی۔ سادھو اپنی دھوتی سنبھالتا ہوا لوسی کی مدد کو لپکا۔ اُس نے ڈاکٹر جیلانی کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔ ڈاکٹر جیلانی تقریباً بے دم سا ہو گیا۔

"ادھر آؤ، فضیلہ!" لوسی نے چیخ کر کہا۔ "جلدی کرو۔"

ایک ایسی لڑکی کی طرح، جسے ہپناٹائز کر دیا گیا ہو، فضیلہ بالکل بے سدھ سی آگے بڑھی۔ ڈاکٹر قاسم جیلانی باآوازِ بلند آیاتِ قرآنی کی تلاوت کر رہا تھا۔ اور اگر میں نے سمجھنے میں غلطی نہیں کی تھی تو وہ سورۂ مومنون کی آخری آیات تھیں۔

چند ثانیوں کے لیے ایسا محسوس ہوا، جیسے وقت رک گیا ہو۔ جو چیز جہاں ہو، وہیں ساکت گئی ہو۔ فضیلہ کا ایک قدم اٹھا ہوا تھا، دوسرا زمین پر تھا اور وہ بے جان مورتی کی طرح ڈاکٹر قا جیلانی کے سر کے قریب کھڑی تھی۔ سادھو اور لوسی بھی بے جان معلوم ہو رہے تھے۔ دیکھتے دیکھتے ڈاکٹر قاسم جیلانی نے کروٹ بدلی اور وہ دونوں پکے ہوئے پھل کی طرح فرش پر گر گئے ڈاکٹر اُچھل کر دُور جا کھڑا ہوا۔

اچانک وہاں زلزلہ سا آ گیا۔ بے شمار آگ اور خاک کے بگولے تھے، جو آپس میں بر پیکار تھے۔ جزیرے کی زمین لرز رہی تھی۔ نظر نہ آنے والی صورتیں دوبارہ نظر آنے لگی تھیں سنائی نہ دینے والی بھیانک آوازیں، جو آخری بار اس روز سنائی دی تھیں، جب میں منگنی کے فضیلہ کے ساتھ سمندر کی سمت بھائی جان اور نورین کی ہمراہی میں جا رہا تھا، ایک بار پھر سنا دے رہی تھیں۔ جزیرے کا چپہ چپہ ان صورتوں سے، جن میں کسی کا ہاتھ غائب تھا، کسی کا سر کا صرف دھڑ تھا تو کسی کا صرف سر، پٹا پڑا تھا۔ ان کی چیخیں بھیانک ہی نہیں، سیاہی آلود بھی تھیں جنھوں نے سورج کی تیز روشنی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ جس کی وجہ سے وہاں اچھی خا تاریکی پھیل گئی تھی۔ ان کی بھیانک اور سیاہ چیخیں ایسے تماشائیوں کی چیخیں تھیں، جو کسی کانٹے مقابلے میں اپنی پسند کے کھلاڑیوں کی حوصلہ افزائی کر رہے ہوں۔ سادھو، لوسی اور فضیلہ اُن کی کے کھلاڑی تھے۔ اصل داد چیخوں کی شکل میں انھی کو مل رہی تھی۔

آگ اور خاک کے بگولوں سے لڑتے اور بچتے ہوئے سادھو اور لوسی اس بڑے ستون کی میں پہنچ گئے، جہاں میں ہونقوں کی طرح کھڑا تھا اور سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ لڑائی کیوں ہو ہے۔ اور تنہا ڈاکٹر قاسم جیلانی کب تک ان پراسرار ہستیوں کا مقابلہ کر سکے گا؟

"اس کے منتر میں بڑی کاٹ ہے۔" سادھو نے ستون کی آڑ میں پہنچ کر لوسی سے کہا۔ ے کس نے کہا تھا کہ اسے یہاں آنے کی دعوت دو؟"

"میں تو اسے جانتی تک نہیں تھی۔" لوسی بولی اور اس کے ساتھ ہی ہاتھ ہلا کر آگ کا ایسا ڈاکٹر کی طرف پھینکا، جس سے دہکتی ہوئی انگاریاں اُڑ رہی تھیں۔ لیکن ڈاکٹر تک پہنچنے سے پہ بجھ کر زمین پر گر گیا۔

"ہاں...... میں نے کہا تھا۔ مگر یہ بھی تو کہا تھا کہ پہلے اسے آزما لینا۔"

"آزما لیا تھا......" لوسی بولی۔ "نہ صرف آزما لیا تھا بلکہ کل اسے ایسی مٹھائی بھی بھجو تھی، جسے کھا کر اس کی ساری قوت ختم ہو جاتی۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے کھائی نہیں۔ دواری ناتھ!"

دونوں جلدی سے دوسرے ستون کی آڑ میں ہو گئے۔ سیاہ بادل کے ٹکڑے جیسی کوئی چی

جو ہوا میں تیرتی ہوئی آئی اور اُس ستون کے قریب برسنے لگی، جہاں کچھ دیر پہلے وہ دونوں کھڑے تھے۔

"یہ ہمیں بجھائے بغیر نہیں مانے گا۔" سادھو نے مایوسی سے کہا۔

"مجھے نہیں پتہ تھا کہ تم اتنے بزدل ہو۔" لوسی نے ڈاکٹر جیلانی کی طرف دوسرا گولا پھینک کر کہا۔

"میں بزدل نہیں ہوں۔ یہ بات تم اچھی طرح جانتی ہو۔"

"بزدل نہیں ہو تو سامنے جا کر اس کا مقابلہ کیوں نہیں کرتے؟ چھپتے کیوں پھر رہے ہو؟"

"جلد بازی ٹھیک نہیں ہے۔ سوچ سمجھ کر قدم اُٹھانا چاہتا ہوں۔" سادھو نے کہا۔ "تم نے دیکھا نہیں، تھوڑی دیر پہلے اسے کس طرح بالکل بے قابو کر دیا تھا۔"

"تم نے بے قابو کیا تھا، یا میں نے؟"

"کسی نے بھی کیا ہو، ایک بار پھر اسے بے قابو کیا جا سکتا ہے۔" سادھو نے جواب دیا۔ "تم اسے سامنے سے روکو۔ میں پیچھے جا کر حملہ کرتا ہوں۔"

"اپنی آگ کو کیوں بجھانا چاہتے ہو، دواری ناتھ؟" لوسی بولی۔ "اسے بے قابو کرنے کی ایک ہی ترکیب ہے۔ ہمیں ہار مان لینا چاہیے۔"

"پاگل ہو گئی ہو؟"

"ہار کا مطلب ہار نہیں ہوتا، جیت بھی ہوتا ہے۔ وہ ہماری شکست پر بغلیں بجا رہا ہو گا کہ ہم اچانک اسے دبوچ لیں گے۔"

"مگر وہ منتر پڑھ کر دوبارہ آزاد ہو جائے گا۔"

"بشرطیکہ اسے منتر پڑھنے کا موقع ملا۔ میں اس کے منحوس منہ میں کیچڑ ٹھونس دوں گا۔"

"تمہارا جواب نہیں ہے، ترشولی!"

میں چونک پڑا۔ ڈاکٹر قاسم کو کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی تھی۔ فضیلہ، ترشولی نہیں تھی، اسے فرضی ترشولی بنا کر میرے سامنے پیش کیا گیا تھا۔

ڈاکٹر قاسم جیلانی اپنی جگہ حیران و پریشان سا کھڑا تھا۔ وہ حملے جو اُس پر آگ کے گولوں کی صورت میں کیے جا رہے تھے، اچانک رک گئے تھے اور اُسے کوئی علم نہیں تھا کہ دونوں دشمن کہاں چھپے ہوئے ہیں۔

"ادھر آؤ، فضیلہ!" ترشولی نے آہستہ سے کہا۔ آواز اتنی ہلکی تھی کہ میں اسے بمشکل سن سکا۔ لیکن دور کھڑی ہوئی فضیلہ نے نہ صرف اس کی آواز سنی، بلکہ ٹہلتی ہوئی اس کے پاس پہنچ گئی۔

"اس آدمی کے منہ میں کیچڑ ٹھونس دو۔" ترشولی نے فضیلہ سے مخاطب ہو کر کہا۔ "جانتی ہو،

اس کے بعد تمہیں کیا کرنا ہوگا؟"

فضیلہ نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "میں اس کے گلے میں دانت گاڑ دوں گی۔ اور اس کا خون پی جاؤں گی۔"

"شاباش!" ترشولی بولی۔ "اس وقت تک خون چوستی رہنا، جب تک منہ میں خون کے بجائے گوشت کے ریشے نہ آنے لگیں۔ اس کے جسم میں خون کا ایک قطرہ بھی نہیں رہنا چاہیے۔"

"ایسا ہی ہوگا۔" فضیلہ نے کہا۔ پھر پلٹ کر پوچھا۔ "کیا مجھے ہاتھ مل جائے گا؟"

"ہاتھ کا وعدہ، راجہ جی نے کیا ہے۔ تورین آئے گی تو تمہیں ہاتھ ضرور ملے گا۔ راجہ جی کبھی جھوٹا وعدہ نہیں کرتے۔" ترشولی نے جواب دیا۔ پھر سادھو سے مخاطب ہوئی۔ "سامنے نکل کر ڈاکٹر جیلانی کو باتوں میں الجھاؤ۔ اس سے کہو کہ ہم لوگ شکست تسلیم کرتے ہیں اور اس کی ہر شرط ماننے کے لیے تیار ہیں۔"

"اگر اس نے قسم کھانے کے لیے کہا؟"

"آج تمہیں کیا ہو گیا ہے، دواری ناتھ؟ ایک معمولی آدم زاد سے ڈر کر بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو؟ قسم کھانے کی باری بہت دیر میں آتی ہے۔ پہلے شرائط سنی جاتی ہیں، پھر شرائط کو کرانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ تمہاری بحث جاری ہوگی اور ڈاکٹر جیلانی نے نرمی برتنے سے انکار کر دیا ہوگا کہ میں اس پر ٹوٹ پڑوں گی اور اس کے منہ میں کیچڑ بھر دوں گی تاکہ وہ اپنا منتر پڑھ سکے۔ باقی کام فضیلہ کا ہے۔ اور میں سمجھتی ہوں کہ وہ بڑی خوش اسلوبی سے اپنے کام کو دے گی۔"

سادھو نے دونوں ہاتھ بلند کیے اور دھاڑیں مارتا ہوا اور مگرمچھ کے آنسو بہاتا کھلے ہوئے حصے میں پہنچ گیا۔

"معاف کر دو، راجہ جی!" وہ کہہ رہا تھا۔ "ہم سے بڑی بھول ہوئی کہ تم سے ٹکرائے۔ ہمالیہ پربت سے بھی بڑے پہاڑ ہو۔ جو بھی ٹکرائے گا، شیشے کی طرح چور چور ہو جائے گا۔"

ڈاکٹر جیلانی کا سینہ فخر سے تن گیا۔ "فریب دینے کی کوشش کر رہے ہو؟"

"ہرگز نہیں، مائی باپ! ہرگز نہیں۔ تم سے جھوٹ بولنے والا ہمیشہ مار کھائے گا۔ میں گیا ہوں اس پاپی جیون سے۔ اب ایک جگہ آرام سے بیٹھنا چاہتا ہوں۔"

"اگر تم نے مجھ سے جھوٹ بولنے کی کوشش کی تو اس کا نتیجہ اچھا نہیں ہوگا۔" ڈاکٹر نے کہا اور دریا کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ "اس دریا میں ایسی بہت سی بوتلیں دفن ہیں، جن میں تمہارے بھائی بند مقید ہیں۔ یاد رکھو، ایسا ہی حشر تمہارا بھی ہو سکتا ہے۔ اب جو کچھ پوچھو سچ بتاؤ۔ تم کون ہو؟"

"میں دواری ناتھ ہوں، راجہ جی!"

"جنات کی قوم سے ہو؟"

"ہاں راجہ جی! تم نے ٹھیک پہچانا۔"

"روحوں کا کیا چکر ہے؟" ڈاکٹر جیلانی نے پوچھا۔ "اور وشیا سے تمہارا کیا تعلق ہے؟"

"روحیں ہر انسان کی کمزوری رہی ہیں، راجہ جی! ہر آدم زاد کو، چاہے وہ روحوں کا قائل ہو، چاہے نہ ہو، بہت جلدی روحوں کے وجود پر یقین آ جاتا ہے اور خود کو ان کے سامنے کمزور اور بے بس سمجھنے لگتا ہے۔ رہ گیا وشیا، سو جہاں تک ہمیں معلوم ہے، وہ ایک بڑا راجہ تھا۔ اس کے اور ہمارے نظریات میں بڑی حد تک یگانگت ہے۔ دنیا والے بہت تیزی سے اس کے اصولوں کو اپنا رہے ہیں۔ ہم نے سوچا کہ وشیا کے نام سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ بس راجہ جی، ہمارا اور وشیا کا اتنا ہی تعلق ہے۔"

"تمہیں یہ بھی علم ہوگا کہ وشیا نے سگی بہن کو اپنی بیوی بنایا تھا؟"

"اچھا اصول ہے، راجہ جی! اس طرح نسل میں کھوٹ نہیں آتی۔"

"اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو تم ترشولی کے عاشق ہی نہیں، سگے بھائی بھی ہو؟"

"آپ جیسا پڑھا لکھا، عالم فاضل، جنتر منتر جاننے اور ان کی کاٹ کرنے والا کبھی غلطی نہیں کر سکتا، راجہ جی! ترشولی میری ماں جائی ہے اور اس نے وعدہ کیا ہے کہ اِدھر اس کا انتقام پورا ہوگا اور اُدھر وہ شادی کر کے باقاعدہ میری بیوی بن جائے گی۔"

"وہ اُس لڑکے سے، جس کا نام سکندر ہے، انتقام لے رہی ہے؟"

"ہاں، راجہ جی!"

"لڑکے کا کیا جرم ہے؟"

"ایسے سوالات مت پوچھو، راجہ جی! ورنہ میں جھوٹ بولنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔"

"جھوٹ بولو گے تو اس کی سزا بھی بھگتو گے۔"

"نہیں راجہ جی! سزا تو آپ کا مقدر بن چکی ہے۔" سادھو نے قہقہہ لگا کر جواب دیا۔ اُس کا جملہ پورا نہیں ہوا تھا کہ معاً ترشولی نے ایک کوندے کی طرح لپک کر اپنا ایک ہاتھ ڈاکٹر جیلانی کی گردن میں ڈال کر اپنی طرف کھینچا اور دوسرے ہاتھ سے غلاظت بھری ہوئی کیچڑ اُس کے منہ میں ٹھونس دی۔ گندی کیچڑ کے باعث ڈاکٹر جیلانی بالکل گونگا سا ہو گیا۔ وہ کوئی قرآنی آیت نہیں پڑھ سکتا تھا۔

"آؤ فضیلہ!" ترشولی نے چلا کر کہا۔ "اپنا کمال دکھاؤ۔"

اسی اثناء میں دواری ناتھ اپنی محبوبہ بہن کی مدد کے لیے ڈاکٹر جیلانی کو ٹانگوں سے پکڑ کر فرش

پر گرا چکا تھا۔ ڈاکٹر جیلانی ایک ایسے شخص کی طرح، جو ڈوب رہا ہو، انتہائی کسمپرسی کی حالت میں
ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ مجھ سے اُس کی زبوں حالت دیکھی نہیں گئی اور میں ساری احتیاط کو بالائے
طاق رکھ کر بے اختیار فرش پر گرے ہوئے جیلانی کی طرف دوڑ پڑا۔ جزیرے میں اور اس کے گرد
و پیش میں منڈلانے والی بدصورت اور بھیانک شکلیں رونے لگیں اور اُچھل اُچھل کر مجھے روکنے
اور میرے ہاتھ پاؤں پکڑنے کی کوشش کرنے لگیں۔ مگر اُن کی حیثیت سائے سے زیادہ نہ تھی۔
سایہ کتنا ہی مہیب اور ڈراؤنا کیوں نہ ہو، اس میں اتنی طاقت نہیں ہوتی کہ کسی کا ہاتھ پکڑ سکے
راستہ روک سکے۔ میں ان شکلوں کو چیرتا پھاڑتا اور روندتا ہوا ڈاکٹر جیلانی تک پہنچ گیا۔

مجھ سے ایک لمحہ پہلے کسی درندے کی طرح خونخوار اور دانت پیستی ہوئی فضیلہ وہاں پہنچ چکی
تھی اور جھک کر ڈاکٹر جیلانی کے نرخرے میں دانت گاڑنا چاہتی تھی کہ میں نے اسے پوری قوت
سے دھکا دیا۔ فضیلہ کے منہ سے انتہائی گھناؤنی گالی ادا ہوئی اور وہ قلابازیاں کھاتی اور ڈاکٹر جیلانی
کے سر کو کچلتی ہوئی ایک گز دور جا گری۔

شکار کو ہاتھ سے نکلتا دیکھ کر دواری ناتھ اور ترشولی غصے سے پاگل ہو گئے۔ انہوں نے ڈاکٹر
جیلانی کو چھوڑ دیا اور مجھے فرش پر چاروں شانے چت گرا کر میری ٹانگوں اور ہاتھوں کو دبوچ لیا۔
فضیلہ بپھری ہوئی اٹھی اور وہ دانت جو مجھے دنیا کے حسین ترین دانت معلوم ہوتے تھے، مگر اس
وقت ان سے زیادہ بھیانک اور کریہہ دانت کسی اور کے نہیں تھے، نکال کر میری طرف لپکی۔ اُس
کی زبان لپلپا رہی تھی اور آنکھوں سے شعلے نکلتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ میں نے خوف سے
اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

"پہلے اسے پکڑو۔" ترشولی کی دہشت زدہ آواز میرے کانوں میں آئی۔ "وہ بھاگ رہا
ہے۔"

اس آواز کے ساتھ ہی دواری ناتھ اور ترشولی نے مجھے چھوڑ دیا۔ میں نے آنکھیں کھولیں۔
فضیلہ کے دانت نرخرے میں پیوست ہوتے محسوس ہوئے۔ دونوں آزاد ہاتھوں سے میں نے
فضیلہ کے بال پکڑ کر زور سے جھٹکا دیا اور نرخرے کو اُس کے دانتوں کی گرفت سے آزاد کراتے
ہوئے اُچھل کر کھڑا ہو گیا۔ نرخرے سے خون رس رہا تھا۔ مگر میں نے اس کی پروا نہیں کی، گلے پر
ہاتھ رکھ کر تیزی سے ستون کے قریب چلا گیا اور چھپ کر کھڑا ہو گیا۔

فضیلہ فرش پر کھڑی تھی اور خون آلود ہونٹوں پر زبان پھیر رہی تھی۔ اس میں اتنی طاقت نہیں
تھی کہ دوبارہ اُٹھ کر مجھ پر حملہ آور ہوتی۔

دوسری طرف ڈاکٹر جیلانی دریا کے کنارے کی طرف بھاگا چلا جا رہا تھا۔ نظر نہ آنے والی
شکلیں اُس کے تعاقب میں تھیں۔ دواری ناتھ اور ترشولی کے پھینکے ہوئے آگ کے گولے

کی پشت پر گر رہے تھے، یا سر کے اوپر سے گزر رہے تھے۔

"اسے روکو، دواری ناتھ!" ترشولی نے ہانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ "اپنا وہ منتر پڑھو، جو پیروں
کو زمین سے جکڑ دیتا ہے۔"

ان دونوں سے غلطیوں پر غلطیاں سرزد ہو رہی تھیں۔ پہلی غلطی انہوں نے اس وقت کی تھی،
جب ڈاکٹر جیلانی کو چھوڑ کر مجھے دبوچا تھا۔ دوسری غلطی کا ارتکاب اس وقت کیا، جب بہت دیر ہو
چکی تھی اور ڈاکٹر جیلانی، دریا میں چھلانگ لگا چکا تھا۔ اُس نے دواری ناتھ اور ترشولی کے ہاتھوں
مرنے کی بجائے خودکشی کرنے کو ترجیح دی تھی۔

"مجھے جو اخبارات پڑھنے کے لیے دیئے جاتے تھے، ان میں سے کسی ایک اخبار میں چند
روز قبل چھوٹی سی خبر چھپی تھی۔ حوالدار شیر خان، ریٹائرڈ فوجی تھا۔ ملازمت کے زمانے میں اس
نے تین گوروں کو سمندر میں ڈوبنے سے بچایا تھا اور انعام اور سند حاصل کی تھی۔ ریٹائرمنٹ کے
بعد وہ مقامی اسکولوں میں پی ٹی انسٹرکٹر لگ گیا۔ طلباء کا ایک گروپ اس کی نگرانی میں بیگاری بند
کی پکنک پر روانہ ہوا۔ بند پر پہنچے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ ٹوپی کی مدد سے چھوٹی چھوٹی
مچھلیوں کو پکڑنے کی کوشش کرنے والا ایک لڑکا دریا میں جا گرا اور غوطے کھانے لگا۔ دوسرا لڑکا
اسے بچانے کے لیے دریا میں کودا۔ حوالدار شیر خان ان دونوں کو نکالنے کے لیے دریا میں اُترا اور
ان دونوں لڑکوں کے ساتھ وہ بھی دریا میں ڈوب گیا۔

ڈاکٹر جیلانی، حوالدار شیر خان سے زیادہ اچھا پیراک نہیں ہو سکتا تھا۔ جوہڑوں اور تالابوں
میں ہاتھ پاؤں چلا لینے والوں کو پیراک نہیں کہا جا سکتا۔ عموماً دریا بے حس اور بے شعور ہوتے
ہیں۔ یہ خوبی صرف دریائے سندھ کی ہے کہ وہ اپنوں کو پہچانتا ہے اور ان سے ماں باپ جیسا
شفقت آمیز سلوک کرتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جب ڈاکٹر جیلانی نے دریا میں چھلانگ لگائی تو میں
نے خود کو یکہ و تنہا محسوس کر کے آنے والے وقت کے تصور سے کپکپانا شروع کر دیا۔ دواری ناتھ
اور ترشولی اگر قومِ جنات سے تھے تو ان کے سامنے میری حیثیت گھاس کے ایک تنکے سے زیادہ نہ
تھی۔ فضیلہ کے منہ کو بھی میرا خون لگ چکا تھا نہ بھی لگ چکا ہوتا، تب بھی وہ دواری ناتھ اور ترشولی
کے احکامات پر عمل کرنے کے لیے مجبور تھی۔

خوف و دہشت کے عالم میں ایک موہوم سی اُمید میرے ذہن میں کلبلا رہی تھی۔ شاید فضیلہ
مری نہ ہو۔ شاید وہ زندہ ہو۔ شاید کسی آسیبی طاقت نے اسے اپنے شکنجے میں جکڑ رکھا ہو۔ مگر جیسا
کہ میں نے عرض کیا، بالکل موہوم بلکہ فضول سی اُمید تھی۔ فضیلہ زندہ تھی یا مُردہ، ہر حال میں وہ
میرے خون کی پیاسی تھی۔

دواری ناتھ اور ترشولی اس طرح، جیسے کوئی بڑی جنگ جیت کر آئے ہوں، ایک دوسرے

کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر سنگ مرمر کے فرش کی طرف بڑھے۔ دواری ناتھ تخت پر بیٹھ گیا ترشولی اُس کے قدموں میں۔

"سامنے آؤ، بچہ!" دواری ناتھ نے ہوا سے مخاطب ہو کر کہا۔

میں ستون کے پیچھے کھڑے کھڑے سرتاپا لرز گیا۔ دواری ناتھ ہوا سے نہیں، مجھ سے مخا[طب] تھا۔

"سکندر!" لوسی نے اپنی پیشانی کا پسینہ خشک کرتے ہوئے کہا۔ "ستون کے پاس کب [تک] کھڑے رہو گے؟ سنتے نہیں، راجہ جی تمہیں آواز دے رہے ہیں۔"

نظر نہ آنے والی مہیب شکلیں دم بخود تھیں۔ میں انہیں ہاتھوں سے کاٹتا ہوا بڑھا اور دونوں کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

"فضیلہ کہاں ہے؟" دواری ناتھ نے اپنی محبوبہ بہن سے پوچھا۔

"جہاں کہیں بھی ہو، یہاں آ جاؤ، فضیلہ!" ترشولی نے کہا۔

فضیلہ لنگڑاتی اور منہ بناتی ہوئی آئی اور مجھ سے دُور ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔ اُس کی آنکھیں بدستور شعلے برسا رہی تھیں۔

"تم دونوں نے ہمارا چمتکار دیکھا۔" دواری ناتھ بولا۔ "ہم نے اس مورکھ ڈاکٹر کو چیونٹی کی طرح مسل ڈالا۔ بے وقوف ہم سے مقابلہ کرنے کے لیے آیا تھا۔"

ترشولی نے کہا۔

"سکندر! اگر تم اُسے بچانے کی کوشش نہ کرتے تو اس وقت سیخ کبابوں کے لیے اس کا قیمہ بن رہا ہوتا۔ تم نے اتنا بڑا جرم کیا ہے، جس کی جو سزا دی جائے، وہ کم ہے۔ مگر راجہ جی ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ تم خود اپنے لیے سزا مقرر کرو۔"

میں نے کہا۔

"میں اس زندگی سے تنگ آ چکا ہوں۔ مرنا چاہتا ہوں۔ مجھے بھی وہیں پہنچا دو، جہاں جیلانی گیا ہے۔"

"راجہ جی تمہیں زندہ دیکھنا چاہتے ہیں۔" وہ بولی۔ "تم نے اپنی غلطی تسلیم کر لی۔ اس لیے خوش ہو کر انہوں نے تمہیں معاف کر دیا ہے۔ انہیں افسوس ہے کہ تم ڈاکٹر جیلانی کے کباب نہیں کھا سکو گے۔ ڈاکٹر جیلانی کے نہ سہی، تمہیں کسی اور کے سیخ کباب ضرور کھلائے گے۔"

میرا دل چاہا کہ اپنی بے بسی اور بے کسی پر پھوٹ پھوٹ کر رو دوں۔ مگر آنسو خشک ہو [چکے تھے] اور گلے میں کوئی سخت چیز پھنسی ہوئی تھی۔

"فضیلہ کے سیخ کباب کھاؤ گے یا نورین کے یا اپنے بھائی کے؟" ترشولی نے ہنستے ہوئے کہا۔ "تمہارے بھائی اور نورین کے ساتھ فضیلہ کے ابو بھی شام تک یہاں آ رہے ہیں۔ لیکن میں تمہیں ان کے کباب کھانے کا مشورہ نہیں دوں گی۔ بوڑھے گوشت میں جوان گوشت جیسا مزہ نہیں ہوتا۔"

میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ "میں کہہ چکا ہوں کہ مرنا چاہتا ہوں۔ اگر تم نے میری مدد نہیں کی تو میں بھی ڈاکٹر جیلانی کی طرح دریا میں کود کر......."

"نہیں......." وہ بولی۔ "جب تک راجہ جی نہیں چاہیں گے، اس وقت تک تمہیں موت نہیں آئے گی۔"

میں نے کن انکھیوں سے فضیلہ کی طرف دیکھا۔ وہ میری بے چارگی پر مسکرا رہی تھی۔

"تم نے بتایا نہیں، بچہ! کس کے کباب کھانا پسند کرو گے؟" دواری ناتھ نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے سنبھل کر کہا۔ "اگر میری ہی فرمائش پر عمل ہونا ہے تو میری خواہش ہے کہ فضیلہ کے کباب تیار کیے جائیں۔"

میرا فیصلہ انتہائی صائب اور مناسب تھا۔ فضیلہ زندہ تھی تو مُردوں سے بھی بدتر تھی۔ اُسے انسانی خون پینے پر آمادہ کیا گیا تھا۔ اور اگر مُردہ تھی تو مُردوں کے لیے قبر سے اچھا کوئی اور ٹھکانہ نہیں تھا۔

"سن رہی ہو، غزل!" ترشولی نے فضیلہ سے مخاطب ہو کر کہا۔ "سکندر تمہارے کباب کھانا چاہتا ہے۔"

فضیلہ نے سر جھکا لیا۔ دبی زبان سے بولی۔ "تم بھی یہی چاہتی ہو؟"

نہ جانے کیوں، مجھے اُس کی حالت پر بہت ترس آیا۔ مُردہ بدست زندہ والا محاورہ بالکل درست معلوم ہونے لگا۔

"ہاں، میں بھی یہی چاہتی ہوں کہ فضیلہ کی خواہش پوری کی جائے۔"

وہ فضیلہ، جو کچھ دیر پہلے اپنے دانتوں سے میرے نرخرے کو دبائے ہوئے تھی، فوراً زمین پر آنکھیں بند کر کے لیٹ گئی۔ "پھر تو اعتراض کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

میں نہیں جانتا، چھری کا انتظام پہلے سے کیا جا چکا تھا یا کسی چمتکار کے ذریعے اُسی وقت چھری پیدا کی گئی۔ بہرصورت ترشولی نے میری طرف چھری بڑھائی۔

"لو۔ جس طرح بھی مناسب سمجھو، فضیلہ کو کاٹ پیٹ ڈالو۔ یہ اُف تک نہیں کرے گی۔"

مجھے بہت مشکل کام سونپا گیا تھا۔ میری حالت غیر ہو چکی تھی۔ میں نے دل ہی دل میں ایک فیصلہ اور کیا۔ جو چھری فضیلہ کو ختم کرے گی، اسی چھری سے میں بھی اپنی شہ رگ کاٹ ڈالوں گا۔

ان شیطانوں کا آلۂ کار بن کر جینے سے کہیں اچھا تھا کہ اپنے وجود سے دنیا کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پاک کر دیا جائے۔

چھری لے کر فضیلہ کی طرف بڑھا۔ وہ بے سدھ سی پڑی تھی۔ قریب تھا کہ میں چھری کو اُس کے دل میں اُتار کر ایک ہی وار میں اُسے زندگی کے عذاب سے نجات دلا دیتا کہ ترشولی اچانک اُچھل کر کھڑی ہو گئی۔

"وہ آ رہا ہے، دواری ناتھ!" ترشولی نے اُسے جھنجھوڑ ڈالا۔ "ایسا منتر پڑھو کہ وہ اگلا قدم اٹھا پائے۔"

"میرا منتر کام نہیں کر رہا ہے۔"

میں ہاتھ میں چھری پکڑے غزل کے پاس کھڑا تھا اور حیرت سے ڈاکٹر جیلانی کو ادھر آتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اُس کی زبان سے آیات قرآنی ادا ہو رہی تھیں۔ جن کے سامنے دواری ناتھ کا منتر بالکل بے بس ہو کر رہ گیا تھا۔

فضیلہ نے آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھا۔ "کیا بات ہے؟ وار کرنے میں دیر کیوں کر رہے ہو؟"

"دواری ناتھ......!" ترشولی چیخی۔ "وہ ہمیں بوتل میں بند کر کے دفن کیے بغیر نہیں رہے گا۔"

"اس پر آگ کے گولے برساؤ، بے وقوف!"

"تمہارے کہنے سے پہلے برسا چکی ہوں۔ لیکن اس کے منتروں نے ان کی کاٹ کر دی ہے۔ اب نہ آگ ہے، نہ گولے۔ میں جا رہی ہوں۔"

"ٹھہرو ترشولی!"

مگر ترشولی نے یا تو اُس کا جملہ نہیں سنا، یا ان سنا کر دیا۔ وہ برف کی ایک ایسی سل کی طرح جسے بہت تیز درجہ حرارت میں رکھ دیا ہو، پگھلنے لگی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے سنگِ مرمر کے سفید اور فرش پر گر گئی اور تیزی سے بہنے لگی۔ فضا میں سڑے ہوئے گوشت کی بدبو پھیل گئی۔ میں نے بے اختیار اپنی ناک پر ہاتھ رکھ لیا۔

فضیلہ اُٹھ کر بیٹھ گئی اور پریشان نظروں سے پگھلتی اور بہتی ہوئی ترشولی کی طرف دیکھ کر بولی۔ "مجھے کیوں چھوڑے جا رہی ہو، دیدی؟"

منظر اتنا انوکھا اور عجیب و غریب تھا کہ بے انتہا تعفن کے باوجود میری نظریں پانی ہوتی ترشولی سے ہٹائے نہیں ہٹ رہی تھیں۔ آنکھیں اس وقت ہٹیں، جب ڈاکٹر جیلانی وہاں ناک پر رومال رکھ کر گرج دار آواز میں پوچھا۔

"بھاگ گئے دونوں بھگوڑے؟"

میں نے پلٹ کر دواری ناتھ کی طرف دیکھا۔ وہاں بھی تخت پر اور تخت کے نیچے گندا اور بدبودار پانی بہہ رہا تھا۔ فضیلہ کی طرف توجہ مبذول کی تو وہ ہچکیوں سے رو رہی تھی۔

"دیدی!......دیدی!......دیدی!"

"لڑکی کو کسی صاف ستھری جگہ پر لے چلو۔" ڈاکٹر جیلانی نے مجھ سے کہا۔

"میں کہیں نہیں جاؤں گی۔" فضیلہ نے روتے ہوئے کہا۔ "تم ظالم اور جلاد ہو۔ تم نے مجھ سے میری دیدی کو چھین لیا ہے۔"

"بکواس بند کرو۔" ڈاکٹر جیلانی بولا۔

فضیلہ سہم کر خاموش ہو گئی اور ڈری ڈری نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"اس کا ہاتھ پکڑ لو۔" ڈاکٹر جیلانی نے کہا۔ "اب یہ کوئی مزاحمت نہیں کرے گی۔"

میں نے فضیلہ کا ہاتھ پکڑ لیا، اسے کھڑا کیا اور کھلی جگہ پر لے گیا۔ ہم تینوں ریت پر بیٹھ گئے۔ نظر نہ آنے والی شکلیں بدستور وہاں موجود تھیں۔ سب کے چہرے فق تھے۔ جو چہروں کے بغیر تھیں، وہ بھی پریشان معلوم ہو رہی تھیں۔

"لڑکی!" جیلانی نے فضیلہ کو مخاطب کیا۔ "تمہارا نام کیا ہے؟"

"میں ترشولی ہوں۔"

فضیلہ کے جواب کو سنتے ہی جیلانی نے اُس کے چہرے پر اتنی طاقت سے ہاتھ رسید کیا کہ منہ دوسری طرف پھر گیا۔

"کون ہو تم؟"

فضیلہ نے روتے ہوئے کہا۔ "ترشولی ہوں۔"

اُس کی ہمنوائی کرتے ہوئے اطراف و جوانب میں موجود شکلیں اس طرح رونے اور بین کرنے میں مصروف ہو گئیں، گویا ان کے کسی قریبی عزیز کا انتقال ہو گیا ہو۔ کچھ تو ایسی تھیں، جو باقاعدہ پچھاڑیں کھا رہی تھیں۔

"سنو لڑکی!" جیلانی نے کرخت لہجے میں کہا۔ "میں ابھی تک نرمی سے کام لے رہا ہوں۔ ورنہ تم اچھی طرح سے جانتی ہو کہ مجھے ٹیڑھی انگلیوں سے بھی گھی نکالنے کا فن آتا ہے۔ سچ سچ بتا دو تم کون ہو؟"

فضیلہ نے لمبی سی ہچکی لی۔ "ترشولی۔"

"پھر وہی مرغے کی ایک ٹانگ۔" جیلانی نے اُس پر ہاتھ تان لیا۔

"بتاتی ہوں......ابھی بتاتی ہوں۔" فضیلہ نے سہم کر کہا۔ آنکھوں سے آنسوؤں کے دریا

جاری تھے۔ "مجھے ایک اچھے اور خوب صورت جسم کی ضرورت تھی۔ اِدھر اُدھر بھٹکتی پھر رہی تھی کہ یہ جسم نظر آیا۔ جسم خالی تھا اور سکندر ہوش میں نہیں تھے۔ اس لیے میں اس جسم میں منتقل ہو گئی۔ قسم کھا کر کہتی ہوں کہ میں ترشولی ہوں۔ ترشولی کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہوں۔"

جیلانی نے پے در پے دو ہاتھ اس کے چہرے پر جڑ دیئے۔ فضیلہ بلکتی اور چیخیں مارتی ہوئی دوہری ہو گئی۔

"کیا مذاق کر رہے ہو، جیلانی صاحب؟" میں نے غصے میں کہا۔ ہر بات کی ایک حد ہوتی ہے۔ تمہاری حرکتیں میرے لیے ناقابلِ برداشت ہیں۔ ایک نہتی اور کمزور لڑکی پر ہاتھ اُٹھاتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی؟"

جیلانی نے کھا جانے والی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ "خاموش بیٹھے رہو۔"

"نہیں......میں خاموش نہیں بیٹھ سکتا۔"

روتی اور بین کرتی ہوئی شکلیں خوش ہو گئیں اور داد دینے کی صورت میں تالیاں بجانے لگیں۔

"یہ کیا ہے؟" جیلانی نے میرے اس ہاتھ کی طرف اشارہ کیا، جس میں چھری دبی ہوئی تھی۔

"یہ...... یہ چھری ہے۔" میں نے کہا۔ "اگر تم باز نہ آئے تو اسے تمہارے سینے میں بھی اُتارا جا سکتا ہے۔"

فضیلہ نے رحم طلب نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"بچا لیجیے مجھے......اس بے رحم انسان سے بچا لیجیے۔ اس نے مار مار کر میرے دانت [illegible] دیئے ہیں۔"

جیلانی نے کہا۔

"جس وقت تم اس لڑکی کو قتل کرنے جا رہے تھے، اس وقت کیوں نہیں سوچا تھا کہ لڑکی نہ[illegible] اور کمزور ہے؟"

میں ان ارواح کے زیرِ اثر تھا، جو گندے اور بدبودار پانی کی صورت میں بہہ چکی ہیں۔"

"وہ ارواح نہیں تھیں۔ وہ بدمعاش جنوں کا جوڑا تھا۔ اور ان میں سے ایک کا نام ترشو[لی] تھا۔ اگر وہ ترشولی تھی تو یہ لڑکی ترشولی نہیں ہو سکتی۔"

"وہ جھوٹی اور مکار تھی۔ اس نے ہمیشہ مجھے فریب میں مبتلا کیا۔ سچ بولنا تو شاید اسے آتا نہیں ہے۔ اس نے مجھے اور تمہیں فریب دینے کے لیے اپنا نام ترشولی بتایا تھا۔ اور ہم اتنے اح[مق] ہیں کہ اس کی باتوں سے دھوکا کھا گئے۔"

جیلانی ہنس پڑا۔ "تمہارے ہوش ٹھکانے نہیں ہیں، اس لیے بے تکی ہانک رہے ہو۔" پھر

فضیلہ سے مخاطب ہوا۔ "اگر تمہاری خواہش ہے کہ تمہیں جلا دیا جائے تو یہی سہی۔" اُس نے فضیلہ کے دونوں کان پکڑ کر پھونک ماری۔

فضیلہ درد سے چلا اُٹھی۔ "بتاتی ہوں......ابھی بتاتی ہوں۔"

نظر نہ آنے والی شکلوں نے ماتم کرنا شروع کر دیا۔

جیلانی نے دوبارہ اُس کے کانوں میں پھونکا۔

"مر گئی...... ہائے جل گئی......میں جل رہی ہوں...... مجھے چھوڑ دو......وعدہ کرتی ہوں، ہر بات بتا دوں گی۔"

"بس کرو، جیلانی صاحب!" میں نے کہا۔ "وہ بتانے کا وعدہ کر رہی ہے۔"

جیلانی نے میری بات پر کوئی دھیان نہیں دیا اور تیسری بار کچھ پڑھ کر کانوں پر دم کیا۔

"میں بھسم ہو جاؤں گی، ظالم!" فضیلہ نے اپنے واحد ہاتھ سے سینہ کوبی شروع کر دی۔

"ہاں، میں تمہیں بھسم کر دوں گا۔ تم راکھ بن کر اِدھر سے اُدھر اُڑتی پھرو گی۔"

وہ چوتھی بار پھونکنے والا تھا کہ فضیلہ کے منہ سے فلک شگاف چیخ نکلی۔ "میں تسلیم کرتی ہوں کہ میں ترشولی نہیں ہوں۔"

"پھر کون ہو؟"

"ترشولی کی سہیلی ہوں۔ میرا نام دیودھری ہے۔ پہلے سے معلوم ہوتا کہ میرے ساتھ اتنا ظالمانہ سلوک کیا جائے گا تو میں اس جسم پر ہرگز قبضہ نہیں کرتی۔"

"دیودھری!" جیلانی نے کہا۔ "سکندر کو یہ بھی بتا دو کہ تم روح نہیں ہو۔"

"سکندر صاحب! میں روح نہیں ہوں، جن ہوں۔ لیکن ایک بات بتائے دے رہی ہوں، مجھ پر ظلم کے پہاڑ توڑے گئے تو میں یہ جسم چھوڑنے پر مجبور ہو جاؤں گی۔ اگر میں نے جسم کو چھوڑ دیا تو آپ ہمیشہ کے لیے اپنی فضیلہ سے محروم ہو جائیں گے۔ آپ کی فضیلہ بدبودار پانی بن کر بہہ جائے گی۔"

جیلانی نے بالوں سے پکڑ کر اس کے جسم کو فرش پر دے مارا۔

"آخری وارننگ دے رہا ہوں۔ ترشولی اور دواری ناتھ یہاں سے بھاگ چکے ہیں، انہیں تم سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ وہ تمہیں بچانے نہیں آئیں گے......بتاؤ، تم فضیلہ کے سر پر کیوں سوار ہو؟"

"ترشولی کے حکم سے۔ اُس نے کہا تھا کہ زندگی سے لطف اندوز ہونا چاہو تو فضیلہ کے سر پر سوار ہو جاؤ۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ترشولی نے جھوٹ نہیں کہا تھا۔"

کم و بیش ایک گھنٹے تک سوال و جواب ہوتے رہے۔ ان کی تفصیل بتانے بیٹھوں تو اصل

داستان ادھوری رہ جائے گی۔ مختصراً اتنا سمجھ لیجیے کہ کبھی پیار سے، کبھی آنکھیں نکال کر کانوں میں پھونکیں مار کر اور کبھی کچی پیاز کھلانے کی دھمکی دے کر جیلانی نے اُسے فضیلہ کے اوپر سے اُترنے پر راضی کر لیا۔

"وعدہ کرو کہ آئندہ فضیلہ کو یا کسی لڑکے کو تنگ نہیں کرو گی۔"

"وعدہ کرتی ہوں۔"

"حضرت سلیمان علیہ السلام کی قسم کھاؤ۔"

"قسم کھاتی ہوں کہ آئندہ......"

جیلانی نے درمیان ہی میں اس کا جملہ منقطع کر دیا۔

"نام لے کر قسم کھاؤ۔"

"میری زبان گندی ہے۔ میں گندی زبان سے اپنے پیغمبر کا نام نہیں لے سکتی۔"

"پاک نام کی برکت سے زبان کی گندگی دُور ہو جاتی ہے۔"

نظر نہ آنے والی شکلیں، سنائی نہ دینے والی آوازیں چیخنے لگیں۔ "قسم مت کھانا...... سارے عیش ختم ہو جائیں گے۔"

جیلانی نے فضیلہ کے چہرے پر ایک زوردار تھپڑ رسید کیا۔ اُس کی نکسیر پھوٹ گئی۔

"حضرت سلیمان علیہ السلام کی قسم کھا کر وعدہ کرو کہ آئندہ اللہ کی مخلوق کو گمراہ نہیں کرو گی۔"

فضیلہ نے رو کر کہا۔ "میری ناک سے خون بہہ رہا ہے۔"

"میری بات نہیں مانو گی تو تمہارے جسم کے ہر حصے سے خون بہے گا۔ قسم کھا رہی ہو نہیں؟"

"نہیں...... نہیں......" نظر نہ آنے والی شکلیں اودھم مچانے لگیں۔

"میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی قسم کھاتی ہوں کہ اب کبھی فضیلہ کو پریشان نہیں کروں گی۔" نظر نہ آنے والی شکلوں نے آہ و بکا کا بازار گرم کر دیا۔

"قسم ادھوری ہے۔" جیلانی نے کہا۔ "یہ کہو کہ فضیلہ سمیت دنیا میں خدا کی کسی بھی مخلوق کو پریشان نہیں کروں گی۔"

کم و بیش دس منٹ حسب منشا قسم کھلوانے میں لگ گئے۔ وہ جب بھی قسم کھاتی تھی، عہد کے لیے کوئی نہ کوئی پہلو ضرور خالی چھوڑ دیتی تھی۔ لیکن جیلانی نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلی تھیں۔ اُس نے جب تک واضح اور غیر مبہم الفاظ میں عہد و پیمان نہیں کروالیا، اطمینان کا سانس نہیں لیا۔

"جانے سے پہلے ایک بات اور سن لو۔" جیلانی نے کہا۔ "ترشولی چوٹ کھائی ہوئی ہے۔ اسے بہت عجلت میں جانا ہے۔ یہاں کے حالات سے واقف ہونے کے لیے جلد یا بدیر

تم سے ضرور ملاقات کرے گی۔ اس سے کہہ دینا کہ اگر دوبارہ پھر کبھی اس نے خدا کی مخلوق کا جینا حرام کیا تو میں اسے بوتل میں بند کر کے دفن کیے بغیر نہیں مانوں گا۔ خیریت اسی میں ہے کہ وہ اپنے ہم جنسوں میں رہے اور اپنی ہی دنیا میں رنگ رلیاں منائے۔ ہماری دنیا کا رُخ نہ کرے۔"

فضیلہ نے ننھی سی بچی کی طرح منہ بسور کر کہا۔

"کہہ دوں گی۔"

"جاؤ۔" جیلانی نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "پیچھے مڑ کر مت دیکھنا۔"

سروں کو نوچتی، سینوں پر دوہتڑ مارتی، بلک بلک کر روتی ہوئی، نظر نہ آنے والی کچھ شکلیں ہوا میں تحلیل ہو گئیں۔ کچھ دریا کے پانی میں گھل گئیں اور کچھ جزیرے کی زمین کا ایک حصہ بن گئیں۔

اسی لمحے فضیلہ منہ کے بل فرش پر گری اور بے حس و حرکت ہو گئی۔

"سکندر!" جیلانی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "فضیلہ کی واپسی مبارک ہو۔"

میں پتھر سا بنا کھڑا تھا۔ ذہن میں عجیب عجیب سے خیالات آ رہے تھے۔ فضیلہ پر جو شے سوار تھی، وہ پہلے بھی اسے چھوڑ کر جاتی رہی تھی۔ وہ چلی جاتی تھی تو فضیلہ مُردہ ہو جاتی تھی۔ واپس آتی تھی تو دوبارہ زندہ ہو جاتی تھی۔ لیکن اب وہ لوٹ کر نہ آنے کا عہد کر گئی تھی۔ اب کیا ہو گا؟ اب فضیلہ کو نئی زندگی کہاں سے ملے گی؟

دیکھتے ہی دیکھتے فضیلہ کے جسم میں حرکت ہونا شروع ہو گئی۔ یوں لگا، جیسے اسے جھرجھریاں سی آ رہی ہوں۔ پھر وہ اُچھل کر اُٹھ بیٹھی۔ اور وحشت زدہ نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگی۔ میں بھاگ کر اس کے پاس پہنچ گیا۔ مجھے دیکھ کر فضیلہ کی ڈھارس بندھی۔ اُس نے میرے کندھے پر سر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔

"بڑا بھیانک خواب تھا۔" اُس نے کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا۔ "ایک خوف ناک بلا، نورین باجی کو سمندر میں کھینچے لے جا رہی تھی۔ میں نے انہیں چھڑایا تو اس بلا نے مجھے ہاتھ سے محروم کر دیا۔" اگلے ہی لمحے آنکھیں کھول کر اُس نے اپنے بازو کی طرف دیکھا اور چیخ مار کر کہا۔

"ارے، میرا ہاتھ......"

"ہمت سے کام لو، فضیلہ!" میں نے اُسے تھپکتے ہوئے کہا۔ "ابھی کچھ ہی دیر میں تمہیں ساری تفصیل بتا دوں گا۔ تم نے اپنا ہاتھ کھو کر نورین کو بچا لیا ہے اور خدا کا شکر ہے کہ تم بھی محفوظ ہو اور نورین بھی خیریت سے ہے۔"

اُس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ کبھی خوف زدہ نظروں سے دریا کی موجوں کے زیر و بم کو دیکھتی، کبھی اپنے ہاتھ کی طرف۔

"میرے کپڑے......" اُس نے دوسری چیخ بلند کی۔ "یہ میرے کپڑے تو نہیں ہیں۔ میں

نے تو منگنی کا جوڑا پہن رکھا تھا۔"

"حادثے کے بعد تم بے ہوش ہو گئی تھیں۔ کئی ماہ تک تمہارا علاج ہوتا رہا۔ کئی بوتل خون چڑھایا گیا۔ خدا خدا کر کے اب تمہیں ہوش آیا ہے۔"

"اللہ......" فضیلہ نے گہری سانس لی۔ اُس نے دوبارہ میرے سینے پر ہاتھ رکھ لیا اور چھوٹی چھوٹی سسکاریاں بھرنے لگی۔

❁

فضیلہ سسکاریاں بھر رہی تھی کہ اچانک موٹر بوٹ کی آواز سنائی دی اور ہم چونک کر اسے دیکھنے لگے۔ پولیس موٹر بوٹ تھی، جو کنارے آ گئی تھی۔

"پولیس کیوں آئی ہے؟"

"میں نے بلایا ہے۔"

سب سے پہلے دو نوجوان موٹر بوٹ سے اُترے۔ ان کے پیچھے کمر سے ریوالور لٹکائے اور ہاتھ میں بوتل لیے ایک پولیس افسر کنارے پر پہنچا۔ میں اس کے استقبال کے لیے کھڑا ہو چکا تھا اور فضیلہ اپنا واحد ہاتھ میرے کندھے پر رکھے اس طرح کھڑی تھی، جیسے اُسے ڈر ہو کہ ہمیں ایک دوسرے سے الگ کر دیا جائے گا۔

"تمہیں معلوم ہے کہ دریا میں اس بوتل کو کس نے ڈالا تھا؟" پولیس افسر نے میری اور فضیلہ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"اس بوتل میں ایک پرچہ بھی تھا۔" میں نے جواب دیا۔ "جس میں وہ ہولناک واقعات مذکور تھے، جو یہاں ہو چکے تھے اور مزید ہونے والے تھے۔"

"بوتل کے ذریعے وہ پرچہ تم نے بھیجا تھا۔ پرچہ تحریر کرنے والے کا نام سکندر تھا۔ گویا تم سکندر ہو۔"

میری نظریں پولیس والے کے چہرے پر جمی تھیں۔ چہرہ دیکھا بھالا معلوم ہو رہا تھا۔ لیکن یاد نہیں آ رہا تھا کہ اسے کب اور کہاں دیکھا تھا۔

"تمہی سکندر ہو؟" پولیس آفیسر پوچھ رہا تھا۔

میں نے دھیمی آواز میں بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

"فریحہ چھت سے گر گئی ہے اور اس کے پاؤں کی ایک ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔"

پولیس آفیسر کے حلق سے ایک ایسی چیخ نکلی، جیسے کسی نے اُس کا گلا دبا دیا ہو۔

"نہیں......"

"آپ وہی ہیں ناں، جن سے شہر کے پولیس اسٹیشن میں ملاقات ہوئی تھی۔ اور میں نے آپ سے کہا تھا کہ آپ کی بیٹی فریحہ کی ٹانگ ٹوٹ گئی ہے؟"

"ہاں، ہاں....... میں وہی ہوں....... میں نے تمہیں پہچان لیا ہے۔ بالکل بدل گئے ہو مگر یار! میری بیٹی کو کچھ مت کہنا۔ وہ پہلے ہی بہت دُکھی ہے۔"

"میں آپ کی بیٹی کو کچھ نہیں کہہ رہا۔ بس آپ کو دیکھ کر اچانک وہ جملہ یاد آ گیا۔ ویسے دُکھ ہے اسے؟"

پولیس آفیسر نے اطمینان و سکون کی گہری سانس لی۔ "تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔ خاتون تمہاری بیگم ہیں؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ "حال ہی میں ہماری شادی ہوئی ہے۔"

"مبارک ہو۔" وہ بولا۔ "اب بتاؤ، یہاں کیا ہوتا رہا ہے؟"

"گزشتہ رات کی آندھی اور بارش نے سارے ثبوت ختم کر دیئے ہیں اور وہ لوگ، جنہو نے قتل و غارت گری کا بازار گرم کیا تھا، فرار ہو گئے ہیں۔"

"مجھے ان کے نام بتاؤ۔ جہاں کہیں بھی ہوں گے، میں انہیں ڈھونڈ نکالوں گا۔"

"آپ انہیں نہیں ڈھونڈ سکیں گے۔" میں نے کہا۔ "وہ کسی اور ہی دنیا سے تعلق رکھتے تھے وہیں جا چکے ہیں۔"

"تمہاری باتیں کبھی بھی میری سمجھ میں نہیں آئیں۔ شکر کرو، تفتیش کے لیے مجھے بھیجا ہے۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو فریب دہی کے الزام میں تمہارے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال د جب سے ٹرینوں اور سڑکوں پر چیکنگ میں سختی کی گئی ہے، کچھ لوگوں نے ہتھیاروں اور منشیات اسمگلنگ کے لیے دریا کو استعمال کرنا شروع کر دیتا ہے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ تم نے بوتل ذریعے پیغام بھیج کر پولیس کو دریا کی نگرانی سے ہٹانے کی کوشش کی ہے۔"

"میں معذرت خواہ ہوں۔ میں نے انتہائی پریشانی اور مایوسی کے عالم میں اتنا اہم قدم اُ تھا۔ آپ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ مجھے کس کرب و اذیت سے گزرنا پڑا ہے۔"

پولیس آفیسر نے گھوم کر اپنے ساتھ آنے والے کانسٹیبلوں کی طرف دیکھا۔ "تم لوگ بوٹ میں بیٹھو۔ میں دو چار ضروری باتیں دریافت کر کے آتا ہوں۔"

کانسٹیبل چلے گئے تو وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔

"تمہیں میری بیٹی فریحہ یاد ہے؟"

"یاد تو وہ ہوتا ہے، جس سے ملاقات ہوئی ہو۔ میں تو آج تک اس سے نہیں ملا۔"

"ملے تو بے شک نہیں ہو، لیکن ابھی چند لمحے پیشتر تم نے اُس کا نام لے کر اس حاد ذکر کیا تھا، جو اُسے بچپن میں پیش آیا تھا۔"

"جی ہاں....... آپ کو دیکھ کر اچانک وہ واقعہ یاد آ گیا۔ مجھے ابھی تک تعجب ہے کہ مَیں

تھانے میں آپ سے اتنی عجیب بات کیسے کہہ دی تھی۔"

"اس حادثے کے بعد جیسا کہ تم نے کہا تھا، ڈاکٹروں نے فریحہ کے پاؤں کی ٹوٹی ہڈی جوڑ کر پلاسٹر چڑھا دیا اور جب پلاسٹر اُتارا گیا تو ہڈی درست ہو چکی تھی۔" پولیس آفیسر نے اس طرح کہا جیسے اُس نے میرا جواب سنا ہی نہ ہو۔ "ہڈی تو درست ہو گئی، لیکن فریحہ ایک روگ لگا بیٹھی۔ تاریکیوں سے اسے ڈر لگنے لگا۔ پھر نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ وہ ایک بھیانک قسم کی صورت دیکھنے لگی۔ جب بھی تاریکی پھیلتی، فریحہ خوف سے چلّانے لگتی۔"

"ایسا چہرہ، جس کے اگلے دو دانت ٹوٹے ہوئے تھے اور باقی دو دانت اُس کے چہرے کی طرح کالے تھے؟" فضیلہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

پولیس آفیسر اُچھل پڑا۔ "آپ....... آپ اُس سے واقف ہیں، مسز سکندر؟"

"صرف اس حد تک کہ ایک شام سکول سے واپسی پر انہوں نے مجھے اس کا دیدار کرایا تھا۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں بالکل صحیح جگہ اور بالکل صحیح شخص کے پاس آیا ہوں۔ تمہاری بوتل تمہارے لیے تو فائدہ مند ثابت ہوئی، البتہ میرے لیے اور میری فریحہ کے لیے اسے نئی زندگی کے پیغام سے ضرور تعبیر کیا جائے گا۔"

اور تب اُس نے اپنی بیٹی کی کہانی مجھے سنائی۔

"ٹانگ درست ہونے کے کچھ ہی دنوں بعد اس نے ایک بھیانک شکل کی عورت کو دیکھنا شروع کر دیا۔ ڈاکٹروں کے علاج سے کوئی فائدہ نہیں ہوا تو تعویذ گنڈے کرنے والوں سے رجوع کیا گیا۔ مرچوں کی دھونی دی گئی، کالے بکرے کا صدقہ دیا گیا، چیلوں اور کوّوں کو گوشت کھلایا گیا۔ لیکن مرض شدت اختیار کرتا گیا۔ انہی دنوں میری ترقی ہو گئی اور مجھے منتقل ہو کر دوسرے شہر جانا پڑا۔

یہاں آ کر میں لوگوں کے کہنے پر فریحہ کو ایک پیر صاحب کے مزار پر لے گیا۔ خود بھی مزار کا طواف کیا اور فریحہ کو بھی کرایا۔ پھر لوگوں نے فریحہ کو ایک پیر صاحب نور بابا کے مزار پر لے جانے کا مشورہ دیا۔ نور بابا، ننگ دھڑنگ پڑا، فحش گالیاں بکتا رہتا تھا۔ مردوں کے علاوہ عورتوں کی ایک بڑی تعداد بھی شرم و حیاء کو بالائے طاق رکھ کر اس کے پاس مرادیں مانگنے جاتی تھیں۔ میری ہمت اتنی نہیں ہوئی کہ فریحہ کے ساتھ جاتا۔ تنہا گیا، بابا کی گندی گالیاں سن کر واپس آ گیا۔ مگر اُس روز سے فریحہ سنبھل گئی تاریکی میں نظر آنے والی شکل غائب ہو گئی تھی۔

اُس کا تعلیم کا سلسلہ، جو منقطع ہو گیا تھا، دوبارہ شروع کرا دیا گیا۔ یہاں تک کہ اس نے میٹرک پاس کر لیا۔ اس کے لیے ایک بہت ہی اچھے لڑکے کا رشتہ آیا۔ لڑکے کی ماں، بہنیں اپنی پڑوسنوں اور سہیلیوں کے ساتھ پھول، ہار اور مٹھائی لے کر آئیں۔ فریحہ بھی بہت خوش تھی۔ لیکن

ٹھیک اس وقت جب اُسے لڑکے والوں کی طرف سے گجرے پہنائے جا رہے تھے، اچانک فریحہ پر پاگل پن کا دورہ پڑ گیا۔ اُس نے لڑکے کی ماں کا ہاتھ مروڑ دیا، بہن کے منہ پر جوتا دے مارا۔ اسی پر بس نہیں کی، کمرے میں پڑی ہوئی پرانے وقتوں کی یادگار اُٹھالی اور مہمان آئی ہوئی عورتوں اور لڑکیوں کی پیٹھ اور کمر پر برسانے لگی۔ کچھ نے کمروں میں بند ہو کر اور کچھ نے گھر سے بھاگ کر اپنی جان بچائی۔ خوشی کا گھر، جہاں شادی بیاہ کے گیت گائے جا رہے تھے، دیکھتے ہی دیکھتے ماتم کدہ میں تبدیل ہو گیا۔ وہ دن ہے اور آج کا دن، یوں تو فریحہ بالکل بھلی چنگی رہتی ہے، لیکن جہاں کوئی رشتہ لے کر آتا ہے، اُس پر جنون طاری ہو جاتا ہے۔ واہی تباہی بکنے لگتی ہے اور مرنے مارنے پر تیار ہو جاتی ہے۔ اور مردوں جیسی آواز میں کہتی ہے۔

"فریحہ میری ہے۔ اگر کسی نے فریحہ کو مجھ سے چھیننے کی کوشش کی تو میں اسے اور اس کے پورے خاندان کو تباہ و برباد کر دوں گا۔ اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا، اس گھر کی۔"

رشتہ لے کر آنے والے چلے جاتے ہیں تو اسے ہوش آ جاتا ہے۔ حقیقت سے واقف ہو کر رونا شروع کر دیتی ہے۔ غم سے گھل کر بالکل ہڈیوں کا ڈھانچہ ہو گئی ہے۔ رخسار پچک گئے ہیں آنکھیں اندر کو دھنس گئی ہیں۔ دانت باہر نکل آئے ہیں۔ گم صم سی اپنے پلنگ پر پڑی رہتی ہے کوئی کھلا پلا دیتا ہے تو کھا پی لیتی ہے، خود کچھ نہیں مانگتی۔ کسی کے علاج معالجے اور تعویذ گنڈے سے کوئی اثر نہیں ہوتا۔ ہر جگہ سے مایوس ہو کر بے حیا بن کر بیوی کے ساتھ اسی بابا کے پاس بھیجا معلوم ہوا کہ بابا کو مرے ہوئے تو ایک سال ہو گیا ہے۔"

میں نے کہا۔

"آپ نے بالکل درست ارشاد فرمایا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ بالکل صحیح جگہ اور صحیح شخص کے پاس تشریف لائے ہیں۔ شاید قدرت کو یہی منظور تھا کہ میں بوتل بھیج کر آپ کو بلاؤں۔ اگر آپ تشریف نہ لاتے تو شاید آج کی رات گزار کر ہم لوگ سویرے ہی شہر کے لیے روانہ ہو جاتے۔"

"تم......تم سکندر!......تم میری بچی کا علاج کرو گے؟" شدتِ جذبات سے پولیس آفیسر کی آواز کپکپانے لگی۔ "تم اُسے وہ خوشیاں واپس لا دو گے، جو اس سے چھین لی گئی ہیں؟ میری مُردوں سے بدتر فریحہ کے دل میں ایک بار پھر جینے کی اُمنگ اور تڑپ پیدا کر دو گے؟"

"نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "یہ کام میرے بس کا نہیں ہے۔ لیکن میں ایک ایسے شخص کو جانتا ہوں، جو بڑی آسانی سے آپ کی بیٹی کو موجودہ حالات سے نجات دلا سکتا ہے۔ ہومیو پیتھک ڈاکٹر ہے۔ قاسم جیلانی اس کا نام ہے۔ اگر وہ مجھ پر عنایت نہ کرتا تو میں ہمیشہ کے لیے اپنی فضیلہ سے محروم ہو جاتا۔ جی ہاں......فضیلہ میری بیگم کا نام ہے۔ جس عجیب و غریب مخلوق کے بارے میں، میں نے آپ کو بتایا تھا کہ اس نے یہاں قتل و غارت کا بازار گرم کیا ہوا تھا اور فضیلہ کے پورے حواس پر قابض ہو گئی تھی اور اس نے مجھے اس حد تک مجبور کر دیا تھا کہ میں فضیلہ کے خون سے ہاتھ رنگنے پر تیار ہو گیا۔ ڈاکٹر دو منٹ نہ آتا تو اس وقت فضیلہ کے بجائے اس کی لاش پڑی ہوتی۔ ڈاکٹر جیسا بے غرض اور بے لوث انسان میں نے آج تک نہیں دیکھا۔"

"مجھے ڈاکٹر کے پاس لے چلو۔"

"ڈاکٹر میرا محسن ہے۔ اس نے مجھے اور فضیلہ کو بلکہ میرے پورے خاندان کو ان خون آشام بلاؤں سے نجات دلائی ہے، جنہوں نے ہماری زندگی کو جہنم کدہ بنا دیا تھا۔ کچھ دیر قبل کنارے پر بیٹھا میں یہی سوچ رہا تھا کہ اس کے احسان کا شکریہ ادا کیے بغیر گھر جانا مناسب نہیں ہے۔ جی ہاں، میں آپ کو اس کے مطب پر لے چلوں گا۔ البتہ فضیلہ کو سویرے ہی ابا جی کے ساتھ گھر بھیج دوں گا۔"

"میں آپ کو تنہا چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔" فضیلہ نے جلدی سے کہا۔ "میرا مرنا اور جینا آپ کے ساتھ ہے۔"

پولیس آفیسر بولا۔ "خاتون کیا فرما رہی ہیں؟"

"خاتون کے فرمانے کی پروا نہ کیجیے۔ یہ ہمارا آپس کا معاملہ ہے۔ آپ کل نو بجے اپنی بیگم کو لے کر آ جائیں۔ میں ان شاء اللہ! آپ کو یہیں ملوں گا۔"

فضیلہ نے زیرِ لب مسکرا کر کہا۔ "ہم دونوں آپ کو یہیں ملیں گے، ان شاء اللہ!"

ہم نے پولیس افسر کو اُس کی بوٹ میں سوار کرایا اور اسے رخصت کر کے کٹیا کی طرف روانہ ہوئے تو راستے میں نورین نے پکڑ لیا۔

"فضیلہ!" اس نے کہا۔ "وہ چیز جسے شرم و حیا کہتے ہیں، تمہارے قریب سے ہو کر بھی نہیں گزری۔ میں تو تمہیں بہت ہی سیدھی سادی، بھولی بھالی لڑکی سمجھتی تھی۔ یہ نہیں معلوم تھا کہ تمہارے پیٹ میں بھی دانت ہیں۔"

"میں نے کوئی غلطی کی ہے، نورین باجی؟"

"غلطی تو بہت چھوٹا لفظ ہے۔ تم نے جو کچھ کیا ہے، اسے گناہِ عظیم کہا جاتا ہے۔ باپ، سسر، جیٹھ اور ہونے والی جیٹھانی کی موجودگی میں سکندر کا ہاتھ تھامے اِدھر سے اُدھر گھوم رہی ہو۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ ایسا گناہ کیوں کر رہی ہو، جس کا کفارہ نہیں؟"

فضیلہ پہلے تو گھبرا گئی تھی۔ لیکن نورین کی شریر آنکھوں کی طرف دیکھتے ہی سمجھ گئی کہ مذاق کیا جا رہا ہے، بڑی متانت سے بولی۔ "پتہ نہیں، نورین باجی! دنیا والوں کو کیا ہوتا جا رہا ہے۔ اپنی آنکھ کا شہتیر نہیں دیکھتے، دوسروں کی آنکھوں کے تنکے دیکھ لیتے ہیں۔"

”تمہارا اشارہ میری طرف ہے؟“

”میں تو عام سی بات کر رہی ہوں۔ کوئی اپنے سر تھوپنے لگے تو دوسری بات ہے، منگیتر
ساتھ گھومو تو حج اکبر کا ثواب پاؤ۔ شوہر کے ساتھ گھومو تو گناہ کبیرہ کرو۔“

”تمہارا اشارہ یقیناً میری طرف ہے۔“ نورین بولی۔ ”بے وقوف لڑکی! مجھ میں اور تم
زمین آسمان کا فرق ہے۔ میں غیر شادی شدہ ہوں، اس لیے نہ میرا کوئی سسر ہے نہ جیٹھ جیٹھا
جس سے شرمایا جائے۔ تم خیر سے شادی شدہ ہو۔ اور جو لڑکیاں شادی شدہ ہوتی ہیں، اللہ
توفیق دے تو حسب ضرورت سسر سے، جیٹھ سے اور ہونے والی جیٹھانی سے شرماتی ہیں۔ بے
اور بے حیاؤں کی طرح شوہر کی کمر میں ہاتھ ڈال کر سیر سپاٹے نہیں کیا کرتیں۔ ایک ہفتے
یہاں ہو، کم از کم آج کے دن تو لمبا سا گھونگھٹ نکال کر بیٹھ جاتیں۔ مجھے تو یوں معلوم ہوتا
جیسے یہاں آ کر تمہاری آنکھوں کا پانی مر گیا ہے۔“

”جی نہیں۔ میری آنکھوں کا پانی زندہ ہے۔“ فضیلہ نے تڑپ کر کہا۔ ”کچھ کہنا ہے تو
ہونے والے دیور سے کہیے۔ یہ حکم دیں گے تو پیروں میں مہندی لگا کر اور چہرے پر گھونگھٹ
کر کونے میں بیٹھ جاؤں گی۔“

”دو دن میں خوب باتیں بنانا آ گئی ہیں۔“ نورین نے آگے بڑھ کر فضیلہ کو سینے سے لگا
اس کو پیار کرتی ہوئی بولی۔ ”سکندر نے کیا گھول کر پلا دیا ہے؟“

میں ان دونوں کو چھوڑ کر آگے بڑھ گیا اور اس سایہ دار جگہ پر، جہاں تینوں بڑے بیٹھے
جا بیٹھا۔

ابا جی نے پوچھا۔ ”دلہن کہاں ہے؟“

”وہ اور نورین کھڑی باتیں بنا رہی ہیں۔“

”دونوں میں بڑی دوستی ہے۔“ احمد علی صاحب بولے۔ ”تم لوگوں کی غیر موجودگی م
بھی دن ایسا نہیں گزرا، جس میں نورین نے فضیلہ کو یاد نہ کیا ہو۔“

ابا جی بولے۔ ”دونوں بیٹے میرے دست و بازو ہیں تو دونوں بیٹیاں میری آنکھیں
تعالیٰ نے مجھے جن انعامات سے سرفراز فرمایا ہے، ان کا جتنا بھی شکر ادا کیا جائے، کم ہے۔“

فضیلہ کے ابو نے ایک سرد آہ کھینچی۔ ”میرے پاس جو کچھ ہے، سب کچھ اس شخص
کے لیے تیار ہوں، جو میری بچی کے ہاتھ کی کمی کو دور کر سکے۔“

وہ لوگ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، وہاں سیر و تفریح کی غرض سے نہیں آ
بلکہ ان کی اصل خوشی یہ تھی کہ مجھے اور فضیلہ کو اور لوسی کو اپنے ساتھ واپس گھر لے جائیں
پانی بن کر بہہ چکی تھی، اس لیے صرف مجھے اور فضیلہ کو واپس جانا تھا۔ پروگرام یہ تھا کہ

جزیرے پر قیام کریں گے اور صبح سویرے ہی روانہ ہو جائیں گے۔ لیکن ڈاکٹر قاسم جیلانی کا شکریہ ادا نہ کرنا احسان فراموشی تھی۔ اس کے علاوہ میں نے ڈاکٹر سے یہ بھی معلوم کرنا تھا کہ مستقبل میں مجھے اور فضیلہ کو یا ہم سے تعلق رکھنے والے کسی دوسرے فرد کو ترشولی سے اور اس کے بھائی سے تو کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اگر خطرہ تھا تو محفوظ اور مامون رہنے کی کیا ترکیب ہو سکتی تھی۔

میں ان تینوں بزرگوں کو یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ جس وقت میں اور فضیلہ جزیرے پر آئے تو لوسی کے زیر اثر تھے اور لوسی، ملازمہ کے روپ میں دراصل ترشولی تھی۔ ایسی کوئی بات نہیں تھی کہ اگر انہیں بتایا جاتا تو وہ میری بات کا یقین نہ کرتے۔ ہاں، یہ جان کر کے مجھے اور فضیلہ کو کیسی کیسی تکالیف کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ ان سب کو دلی تکلیف ہوتی۔ نہ بتانے کی اصل وجہ یہی تھی، میں انہیں تکلیف نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔

عصر، مغرب اور عشاء کی نمازیں ہم سب نے فضیلہ کے ابو کی امامت میں پڑھیں۔ جزیرے پر مسلمانوں کی کافی تعداد پکنک منانے کے لیے آتی رہتی تھی۔ پجاریوں نے کبھی کسی مسلمان کو وہاں اذان دینے یا نماز پڑھنے سے منع نہیں کیا تھا اور مسلمانوں نے بھی کبھی ان کی مورتیوں کو نہیں چھیڑا تھا۔

میرے قیام کے دوران صرف ایک ایسا واقعہ ہوا تھا، جب اسکول کے کچھ بچوں نے مورتی کی بے عزتی کی تھی اور جوتے مار مار کر اسے دریا میں پھینک دیا تھا۔ لیکن وہ مورتی ہندوؤں کے کسی دیوتا کی نہیں، ویشیا بھگت کی تھی۔ اور وہ راکھشسوں کا ایک ایسا راجہ تھا، جسے جوتے مارنا، جس پر تھوکنا اور غلاظت برسانا اور نذر آتش کرنا بذات خود ہندوؤں کے لیے پُن اور ثواب کا کام تھا۔

دوپہر کے کھانے کے بعد میں نے گوپی کے ذریعہ انتظام کر لیا تھا۔ ایک خوب صورت اور خوش اخلاق لڑکی نادیہ جو خود بھی پکنک منانے کے لیے یہاں آئی تھی، کی مہمان نوازی کے سبب گوپی کا لایا ہوا کھانا شام کو کھایا گیا۔ امریتا اور اُس کے ماتا پتا بھی اپنی مزید یاتراؤں کے بعد اسی جگہ واپس آ چکے تھے۔ فضیلہ جب اپنے ہوش و حواس میں نہیں تھی تو دیوانگی کی حد تک امریتا کی فریفتہ ہو چکی تھی۔ امریتا بھی ہمارے ساتھ کھانے میں شرکت کر رہی تھی۔ وہ تھوڑی دیر بعد فضیلہ کو تعجب سے دیکھنے لگتی تھی۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ فضیلہ اچانک اتنی تبدیل کیوں ہو گئی ہے۔ کبھی کبھی میری اچٹتی ہوئی نظریں امریتا پر پڑ جاتی تھیں تو مکار اور دغا باز ترشولی کے جملے، جو اس نے فضیلہ پر الزام تراشی کرتے ہوئے کہے تھے، یاد آ جاتے تھے۔ اس نے امریتا کو ایک گٹھے ہوئے بدن والی بچھیا سے تشبیہ دی تھی۔ اور کہا تھا کہ فضیلہ اس کا گوشت بڑے شوق اور رغبت سے کھائے گی۔

امریتا کا گوشت کس کو کھانا تھا اور کس کو نہیں کھانا تھا، یہ تو میں آج بھی نہیں کہہ سکتا۔ ا
ایک بات یقینی تھی، مجھے اس کا گوشت ضرور کھلایا جاتا۔ امریتا کو ہی نہیں، نادیہ کو دیکھ کر بھی
ترشولی کی رال ٹپک پڑتی۔ کیونکہ وہ بھی کسی طرح امریتا سے کم نہیں تھی بلکہ زیادہ ہی تھ
ہومیو پیتھک ڈاکٹر نے ترشولی کو شکست دے کر مجھے اور فضیلہ ہی کو نہیں، امریتا اور نادیہ کو بھی
کا شکار ہونے سے بچالیا تھا۔

"دیوی!" کھانے کے دوران امریتا نے فضیلہ سے مخاطب ہو کر کہا۔ "آپ نے وعدہ کیا
کہ جنم اشٹمی کے تہوار پر آپ میرے ساتھ کرشن جی کی رادھا بن کر ڈانس کریں گی؟"

میری ہی نہیں، دسترخوان پر بیٹھے ہوئے ہر فرد کی آنکھیں فضیلہ پر مرکوز ہو گئیں۔ میں
فضیلہ کو اوّل تا آخر ساری داستان سنائی تھی، لیکن یہ بتانا مناسب نہیں سمجھا تھا کہ وہ امریتا
ساتھ ڈانس بھی کر چکی ہے۔

"میں نے وعدہ کیا تھا؟ میں تو یہ جانتی بھی نہیں کہ ڈانس کس چڑیا کا نام ہے؟"

"کیا کہہ رہی ہیں، دیدی! آپ میرے ساتھ ڈانس کر چکی ہیں۔ اور جب ہم دوسرے
سیاحت کے لیے گئے تھے اور تاریخی عمارات کی سیر کر رہے تھے، تب آپ نے میرے ممی ڈ
سے کیا وعدہ کیا تھا؟"

"دوسرے شہر میں؟ .... وعدہ کیا تھا؟" فضیلہ نے تعجب سے کہا۔ "میں نے اپنی زندگی
صرف ایک سفر کیا ہے۔ وہ بھی اپنے گھر سے جزیرے تک کا۔ تم نے کوئی خواب دیکھا ہو گا۔
یہ بھی نہیں معلوم کہ ہمارے اپنے شہر اور اس جزیرے کے علاوہ باہر کی دنیا کیسی ہے؟"

"آپ مذاق کر رہی ہیں؟"

امریتا کے ماتا پتا نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ باتیں کیں، پھر اس کے پتا نے بیٹی کو مخا
کیا۔ "تم بھول رہی ہو، بیٹا! تمہاری دیدی نے تمہارے ساتھ ڈانس نہیں کیا تھا، نہ ہی
کرنے کا وعدہ کیا تھا۔"

"مگر ڈیڈی!"

امریتا کی ماں نے اُسے آنکھ ماری۔

"تمہارے ساتھ جس نے ڈانس کیا تھا، وہ پورنما تھی۔ اور وہی ہمارے ساتھ دوسرے
تھی۔ اُس کی صورت بھی تمہاری دیدی جیسی ضرور تھی، لیکن اتنی بھی نہیں کہ تم ان دونوں میں
فرق نہ کر سکو۔"

"اچھا....... وہ پورنما تھی۔" امریتا نے ماں کی آنکھ کا اشارہ سمجھ کر بات بنائی۔ "اب یا
اُس کے گال پر ایک چھوٹا سا، سُندر سا تِل بھی تھا۔"

فضیلہ کے ابو نے کہا۔ "لاحول ولا قوۃ الّا باللہ۔" پھر مطمئن ہو کر ہلکا سا قہقہہ لگایا اور کھانا
کھانے میں مصروف ہو گئے۔

بھائی جان بولے۔ "پورنما کون تھی؟"

جواب امریتا کے پتا نے دیا۔

"یہیں کی ایک پجارن تھی۔ نہ جانے کہاں چلی گئی ہے۔ پجاری بھی نہیں جانتے کہ وہ کون
تھی، کہاں سے آئی تھی اور اچانک کہاں غائب ہو گئی ہے۔ قد کاٹھ میں وہ بالکل شریمتی فضیلہ کی
طرح تھی۔ بس رنگ میں ذرا سی مات کھا گئی۔ بچی کو اس لیے دھوکا ہوا کہ جس وقت اس نے
ڈانس کیا، وہ میک اپ میں تھی۔"

"سیر و سیاحت کرنے بھی میک اپ میں گئی تھی؟" بھائی جان نے بال کی کھال اُتاری۔

"نہیں۔ اُس لمحے میک اپ میں نہیں تھی۔ میں تو یہی کہوں گا کہ امریتا کی مت ماری گئی ہے
جو وہ شریمتی پورنما کو فضیلہ صاحبہ سمجھ بیٹھی۔"

"کہہ تو دیا، اب مجھے یاد آ گیا ہے۔ دیدی نے میرے ساتھ ڈانس نہیں کیا تھا۔ اور نہ ہی
ڈانس کرنے کا کوئی وعدہ کیا تھا۔" امریتا بولی۔

"کھانا کھاؤ۔" ابا جی نے کہا۔ "کھانے کے دوران فضول باتوں سے گریز کرنا چاہیے۔"

کھانے کے بعد امریتا کے ماتا پتا مجھے برگد کی آڑ میں لے گئے۔

"جب یہاں آئے تھے تو ہم نے آپ کو اور آپ کی شریمتی جی کو اپنا ہم مذہب سمجھا تھا۔ اور
شریمتی جی نے جس جوش و جذبے سے ڈانس میں سنگت کی تھی، اس نے ہمیں بہت متاثر کیا تھا۔
یہی وجہ تھی کہ جب شریمتی جی ہمارے ساتھ سیر و سیاحت کے لیے گئیں تو انہوں نے ہمیں مجبور کیا
کہ ہم ان کے ساتھ راج کنڈل چلیں، تو ہم ان کی بات ماننے پر مجبور ہو گئے۔ ہم نے وعدہ کیا کہ
ہم جنم اشٹمی یہیں آ کر منائیں گے۔ یہاں آئے تو پہلی بار پتہ چلا کہ آپ اور شریمتی مسلمان
ہیں......."

امریتا کی ماتا نے اپنے پتی کی بات کاٹ کر کہا۔ "اور مسلمانوں میں ناچ گانے کو بہت برا
سمجھا جاتا ہے۔"

"دراصل، بات شوق کی ہوتی ہے۔" امریتا کا پتا بولا۔ "آپ کی شریمتی کو ڈانس کا شوق ہے
اور اس میں انہوں نے ایسا کمال حاصل کیا ہے کہ کرشن جی نے ان کا ڈانس دیکھا ہو گا تو لوٹ
پوٹ ہو کر رہ گئے ہوں گے۔"

امریتا کی ماں نے کہا۔ "جب شریمتی جی نے ڈانس کرنے اور سیر و سیاحت پر جانے سے
انکار کر دیا تو ہمیں اصل بات سمجھنے میں دیر نہیں لگی۔ ہمارے ملک میں کچھ ایسی مسلمان لڑکیاں بھی

ہیں جو ماتاپتا سے چھپ کر ڈانس کے شوق کو پورا کرتی ہیں۔ گنتی کی دو چار لڑکیاں ایسی ہوں جو ماں باپ کے سامنے ڈانس کر لیتی ہوں گی۔ اور یہ بھی وہ لڑکیاں ہیں، جن کے لالچی ماں با انہیں فلموں میں کام کرانے کے سپنے دیکھا کرتے ہیں۔"

"اسی کارن ہم فوراً سمجھ گئے کہ شریمتی جی، ڈانس کرنے اور شہر جانے سے کیوں انکار کر ہیں۔" امریتا کے پتا نے کہا۔ وہ اپنے پتا اور پتا سمان سسر کے سامنے بھلا کس پر کار ڈانسر ہونے کا ا کر سکتی تھیں؟ بس ہم نے امریتا کو سمجھا دیا۔ وہ عقل مند لڑکی ہے۔ ہمارے اشارے کو سمجھ گئی ہماری ہاں میں ہاں ملانے لگی۔"

"ویسے شریمان جی!" امریتا کی ماں بولی۔ "ہمیں آپ کی شریمتی کا ڈانس نہ دیکھنے کا افسوس رہے گا۔ اتنا اچھا ڈانس ہم نے آج تک نہیں دیکھا۔ ڈانس دیکھنے کا لوبھ ہی ہمیں دوبارہ کھینچ لایا تھا۔ ورنہ ہم تو یاتریوں کے ساتھ دوسرے پوتر استھانوں کی یاترا کو جانے وا تھے۔"

امریتا کے پتا نے کہا۔

"کبھی موقع ملے تو شریمتی جی کو ہمارے وطن لے کر آیئے۔"

دونوں پتی پتنی نے اتنی تیزی سے گفتگو کی تھی کہ مجھے ایک لفظ بھی بولنے کا موقع نہیں ملا اپنے ملک آنے کی دعوت دے کر جب دونوں خاموش ہو گئے تو میرا منہ تکنے لگے۔ تب میں پہلا اور آخری جملہ ادا کیا۔

"وعدہ نہیں کرتا، لیکن کوشش کروں گا۔ کیونکہ فضیلہ کے ڈانس نے جتنا آپ کو متاثر کیا اس سے کہیں زیادہ امریتا کے ڈانس نے مجھے متاثر کیا ہے۔"

ہم لوگ برگد کی آڑ سے نکل آئے۔ کھا پی کر دوسرے افراد جزیرے کی سیر کو جا چکے چبوترے پر تنہا فضیلہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔ میں امریتا کے والدین کو مندر تک رخصت کر کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔

"نورین کہاں ہے؟"

"کشتی میں بیٹھ کر بھائی جان کے ساتھ ہیراج گئی ہیں۔" فضیلہ نے بتایا۔ "وہ آدمی، لے کر آیا تھا، انہیں اپنی کشتی میں سیر کرانے لے گیا ہے۔"

"تم بھی اُن کے ساتھ چلی جاتیں اور تھوڑی سی سیر و تفریح کر لیتیں۔"

"نورین باجی تو ساتھ چلنے کے لیے کہہ رہی تھیں، مگر لہجے سے یوں لگ رہا تھا، جیسے دل سے کہہ رہی ہوں۔ مجھے بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا کہ ان کی آزادی میں مخل ہوں۔ میں بہانہ بنا دیا کہ میں تو ایک ہفتے سے سیر کر رہی ہوں، آج آپ سیر کیجیے۔"

"مگر میں نے تو تمہیں ایک دن بھی سیر نہیں کرائی۔"

"کراتے، تب بھی کیا فرق پڑتا؟ میں تو اپنے آپ ہی میں نہیں تھی۔"

"تم اُداس ہو، فضیلہ؟"

وہ اچانک ہنس پڑی۔ "ابھی تک فیصلہ نہیں کر سکی ہوں کہ مجھے ان دنوں پر افسوس کرنا چاہیے جو بے ہوشی کے عالم میں گزرے یا آج کے دن پر خوش ہونا چاہیے، جس نے مجھے آپ سے ملوا دیا۔"

"میں خوش ہوں۔ اس لیے تمہیں بھی خوش ہونا چاہیے۔" میں نے کہا۔ "کاش اپنا دل چیر کر دکھا سکتا کہ میرا یہ ہفتہ کتنا روح فرسا گزرا ہے۔ مجھے تمہارا قرب، تمہارا پیار حاصل تھا، پھر بھی یہ سمجھتا تھا کہ میں تم سے نہیں، تمہاری لاش سے محبت کر رہا ہوں۔"

"مجھے بتایئے۔" اس نے لجاجت آمیز لہجے میں کہا۔ "آپ مجھ سے کیا کیا باتیں کرتے تھے؟"

میں نے اُسے کم و بیش محبت کی سبھی باتیں بتائیں۔ وہ باتیں جو گفتنی تھیں اور وہ جو ناگفتنی تھیں۔ باتوں کے دوران ایسا وقت بھی آیا کہ ہمیں گرد و پیش کی کوئی خبر نہیں رہی۔ فضا کو معطر کر دینے والی تیز تیز سانسوں کی خوشبو اطراف میں پھیل گئی۔ بادل کے ایک ٹکڑے نے جھلملاتے ہوئے تاروں پر سیاہ نقاب ڈال دی کہ دو محبت بھرے دلوں کو اپنی جھلملاہٹ سے پریشان نہ کر پائیں۔

کم و بیش ایک گھنٹے بعد ہم دونوں تھکے تھکے قدم اُٹھاتے ہوئے ان سیڑھیوں پر جا بیٹھے، جو دریا میں اُترتی تھیں۔ ریگستان کی وہ مخصوص سرد ہوا، جو عموماً نصف شب کے بعد چلتی تھی، چلنا شروع ہو گئی تھی۔ تارے ایک بار پھر اپنی پوری آب و تاب سے چمکنے لگے تھے۔ دریا میں مچھلیاں اس طرح اُچھل اُچھل کر سطح آب پر آ رہی تھیں، گویا ہمیں مبارک باد دے رہی ہوں۔

سیڑھیوں پر بیٹھے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ احمد علی صاحب ہانپتے کانپتے اُدھر آئے۔

"ارے، تم دونوں یہاں ہو؟" انہوں نے کہا۔ "ابھی دس منٹ پہلے ہی تو میں تمہیں تلاش کر کے گیا ہوں، اُس وقت تو تم یہاں نہیں تھے۔"

"جی ہاں، ہم ابھی دو منٹ پہلے یہاں آئے ہیں۔ اس سے پہلے ہم دوسرے جہاز کی سیر کر رہے تھے۔"

فضیلہ نے زور سے میری کمر پر اپنے واحد ہاتھ کا ٹھوکا دیا۔ احمد علی صاحب نے پوچھا۔

"کہاں کی سیر کر رہے تھے؟"

میں ایک بار پھر ویسا ہی فضیلہ کا ٹھوکا کھا کر جواب دینے ہی والا تھا کہ احمد علی صاحب نے

دوسرا سوال داغ دیا۔

"اس جزیرے پر فون نہیں ہے؟"

"جی نہیں۔" میں نے کہا۔ "آپ اتنی رات گئے کہاں فون کریں گے؟"

"پولیس کو۔" وہ بولے۔ "میرا خیال ہے، یہاں کسی کو قتل کر دیا گیا ہے۔"

فضیلہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔

"ابو کہاں ہیں؟"

"تمہارے ابو اور سکندر کے ابو اپنی کٹیا میں گھوڑے بیچ کر سو رہے ہیں۔"

"اور نورین باجی...... وہ بیراج کی سیر سے واپس نہیں آئیں؟"

"وہ تو بہت دیر پہلے آ چکی ہے۔ اس وقت وہ ہاشم کے ساتھ مندر میں بیٹھی اس لڑکی کا ڈانس دیکھ رہی ہے، جس کا نام...... جس کا نام......"

"امریتا ہے۔" میں نے اُن کا جملہ مکمل کر دیا۔

"ہاں...... اسی کا۔ ہم سب بخیریت ہیں۔ کوئی ایسا شخص قتل ہوا ہے، جو ہم سب کے لیے اجنبی ہے۔ میرے ساتھ آؤ، میں تمہیں اس جگہ لے چلوں، جہاں قتل کیا گیا ہے...... نہیں بیٹی! تم ہمارے ساتھ نہیں چل سکتیں۔ کئی روز تک ڈرتی رہو گی۔ چلو، ہم تمہیں نورین کے پاس مندر میں چھوڑ دیتے ہیں۔ مگر نورین کو قتل کے بارے میں کچھ نہ بتانا۔"

"میں مندر نہیں جاؤں گی، انکل!" فضیلہ نے کہا۔ "اس کے تصور سے ہی مجھے وحشت ہونے لگتی ہے۔ مجھے اپنے ساتھ لے چلیے۔ یقین کیجیے، میں بالکل نہیں ڈروں گی۔"

انجینئر صاحب نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"فضیلہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔" میں نے کہا۔ "اسے کسی چیز سے ڈر نہیں لگتا۔ بلکہ کبھی کبھی تو اُلٹا ڈر اس سے ڈرنے لگتا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں ذمہ دار نہیں ہوں۔ تم اپنی ذمہ داری پر لے جا رہے ہو۔"

قتل کے نام پر شاید ہی ایسا کوئی سنگ دل ہو، جو گھبراتا نہ ہو۔ احمد علی صاحب بھی اچھے خاصے گھبرائے ہوئے تھے۔ لیکن نہ جانے کیا بات تھی، مجھے ایسا لگ رہا تھا، جیسے مذاق ہو رہا ہو۔ دل پر ذرہ برابر بھی پریشانی یا گھبراہٹ نہیں تھی۔ فضیلہ تھوڑی سی سراسیمہ نظر آئی، لیکن اُس کی سراسیمگی پر تجسس غالب آ گیا تھا۔ وہ یہ دیکھنے کے لیے بے چین تھی کہ کس کو قتل کیا گیا ہے اور کیسے قتل کیا گیا ہے۔

"یہ جتنی دلکش جگہ ہے، اتنی ہی پراسرار بھی ہے۔" انجینئر صاحب نے یکے بعد دیگرے کٹیاؤں کی مختلف راہداریوں سے گزرتے ہوئے کہا۔ "تم دونوں کے اباؤں کو لیٹتے ہی نیند آ گئی

اور نورین، ہاشم کے ساتھ مندر میں کیرتن سننے اور لڑکی کا ناچ دیکھنے چلی گئی تو میں نے کچھ دیر تک کروٹیں لیں، اس کے بعد سوچا کہ دوبارہ تو شاید یہاں آنا نصیب نہ ہو۔ کیوں نہ عمارتوں کے ان حصوں کو دیکھ لیا جائے، جو ویران اور سنسان نظر آ رہے ہیں۔ میں ابھی تک نہیں سمجھ سکا ہوں کہ عمارتوں کی بنیاد کس طرح رکھی گئی ہے۔ جزیرے میں کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں ڈیڑھ دو فٹ کی کھدائی کے بعد پانی نہ نکل آتا ہو۔ ظاہر ہے کہ پانی پر بنیاد نہیں رکھی جا سکتی۔ دن میں، میں نے اچھی طرح زمین کا جائزہ لیا تھا۔ چنانچہ یہی سوچ کر میں نے اپنے بیگ سے ٹارچ نکالی اور طرزِ تعمیر کو سمجھنے کے لیے کٹیا سے باہر نکل گیا۔ طرزِ تعمیر تو سمجھ میں نہیں آیا، البتہ اِدھر اُدھر بھٹکتا اور دیواروں کی پختگی کا اندازہ لگاتا ہوا نشیب میں واقع ایک کٹیا میں پہنچ گیا۔ دُور سے دیکھنے میں ایسا لگتا تھا، جیسے وہ کسی تہہ خانے کا دروازہ ہو۔ میں نے دروازہ کھولا تو تہہ خانے میں ایک میز پر کٹی ہوئی گردن کا سر سجایا ہوا تھا۔ پہلے تو میں یہ سمجھا کہ کوئی زندہ آدمی ہے اور مجھ سے مذاق کر رہا ہے۔ لیکن غور کیا تو واقعی کٹا ہوا سر تھا۔ اُسے دیکھتے ہی اور بھاگتے ہی میں وہاں سے تمہاری تلاش میں دوڑ پڑا۔ سب سے پہلے میں نے تمہیں سیڑھیوں پر تلاش کیا، مگر اس وقت تم سیڑھیوں پر نہیں تھے، فضیلہ کے ساتھ سیر کرنے گئے ہوئے تھے۔"

فضیلہ نے معنی خیز انداز میں میرے کندھے پر چٹکی لی۔

انجینئر صاحب اسی طرح کہتے رہے۔

"ہر طرف ڈھونڈ ڈھانڈ کر تقریباً دس بارہ منٹ بعد دوبارہ سیڑھیوں پر پہنچا تو تم نظر آ گئے۔ اب میرے ساتھ چل کر اس کٹے ہوئے سر کو دیکھو اور بتاؤ کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ فون کے علاوہ کوئی ایسا طریقہ نہیں ہے، جس کے ذریعے پولیس کو اطلاع دی جا سکے۔ کیا وہ ملاح، جو ہمارے لیے کھانا لے کر آیا تھا، پولیس تک ہمارا پیغام پہنچا سکتا ہے؟"

میں نے کہا۔

"انجینئر صاحب! اس کٹے ہوئے سر کو تلاش کر کے آپ نے بہت بڑا کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ میں تو یہ سمجھ رہا تھا کہ قتل کے سارے ثبوت گزشتہ روز آنے والے طوفان کی نذر ہو چکے ہیں۔ قاتلوں تک پولیس کی رسائی کبھی نہیں ہو سکے گی۔ تاہم انہیں قتل کا ثبوت فراہم کیا جا سکے گا۔ ایک نظر جان کے کٹے ہوئے سر کو دیکھ لوں، پھر آپ کو وہ طریقہ بتاؤں گا، جس پر عمل کر کے آپ دو منٹ میں پولیس کو یہاں بلا سکیں گے۔"

"جان......" انجینئر صاحب چلتے چلتے رک گئے۔ "جان مقتول کا نام ہے؟ تم جانتے ہو کہ کس شخص کو قتل کیا گیا ہے؟...... کب ہوا یہ قتل؟...... تم قاتل سے واقف ہو؟"

"شاید ہم لوگ اس کٹیا تک پہنچ چکے ہیں۔ بائیں ہاتھ کی جانب ٹارچ کی روشنی ڈالیے۔"

"ارے، یہ کیا؟...... کٹیا کا دروازہ تو کھلا ہوا ہے۔"

"کیا آپ دروازہ کھلا چھوڑ گئے تھے؟...... جان چھوڑ، آپ کو جان کا بال بھی نہیں ملے گا۔" میں نے کہا اور احمد علی صاحب سے ٹارچ چھین کر دروازے کی طرف بھاگا۔ اس وقت ایک عجیب سی دریائی مخلوق، جسے میں نے پہلی بار دیکھا تھا، جان کا سر منہ میں دبائے باہر نکلی، جس کی بوٹیاں بنائی گئی تھیں اور غڑاپ سے دریا میں کود گئی۔

میں نے اس میز کی جانب ٹارچ کا رخ کیا، جس پر جان کا کٹا ہوا سر سجایا گیا تھا۔ سر غائب تھا۔ اور اس کا یہی مطلب تھا کہ دریائی مخلوق کے بھائی بند اس سر کو لے اڑے تھے۔ غراہٹ کی آواز سن کر دوسری جانب ٹارچ کی روشنی ڈالی تو دو لومڑیاں اپنی لمبی لمبی زبان سے کٹیا ہی کو چاٹ رہی تھیں، جبکہ قصائیوں والے اس بڑے چھرے کے پاس، جس سے جان کی بوٹیاں بنائی گئی تھیں، ایک لومڑ بیٹھا غرا رہا تھا۔ اُس نے چاٹ چاٹ کر چھرے کو اس طرح صاف کر دیا تھا، گویا اسے بڑی محنت سے مانجھا گیا ہو۔ جان کی یادگار کے طور پر مٹی کے تیل کے چولہے کے پاس صرف اُس کی ٹائی پڑی تھی۔

میں نے غنیمت سمجھ کر اس کو اٹھانا چاہا، لیکن جونہی آگے بڑھا، لومڑ اور دونوں لومڑیاں یہ سمجھ کر کہ وہ کوئی کھانے کی چیز ہے، بیک وقت اس پر ٹوٹ پڑے اور آپس میں کھینچا تانی کر کے اس کی دھجیاں بکھیر دیں۔ لومڑ تو فوراً ہی بھاگ گیا، لومڑیاں ذرا جی دار تھیں، مجھ پر حملہ آور ہونے کی تیاریاں کرنے لگیں۔ ایک لومڑی نے دانت نکال کر میری پنڈلی پر حملہ کیا۔ میں اُچھل کر ایک طرف ہو گیا۔ مگر وہ پاجامے کو دانتوں سے پکڑ کر پھاڑ چکی تھی۔ اسی لمحے فضیلہ کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ اُس نے فرش پر پڑا ہوا پتھر اُٹھایا اور پوری قوت سے لومڑی کے سر پر دے مارا۔ دونوں لومڑیوں کو بھگانے کے لیے ایک ہی پتھر کافی تھا، وہ میری اور فضیلہ کی ٹانگوں کے درمیان سے انجینئر صاحب کو گراتی ہوئی باہر کی سمت بھاگ گئیں۔

"کوئی زخم تو نہیں آیا؟" فضیلہ نے جھک کر میرے پھٹے ہوئے پائنچے کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"تم نے بروقت پتھر پھینک کر بچا لیا۔ ورنہ لومڑیوں نے تو میری پنڈلی پھاڑ دینے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی تھی۔

"یہ لومڑیاں تھیں؟...... میں نے پہلی بار انہیں دیکھا ہے۔" فضیلہ بولی۔ "میں تو سمجھی تھی، کہ لومڑیاں بڑی معصوم ہوتی ہیں۔"

انجینئر صاحب کھڑے ہو چکے تھے۔ کپڑوں کی ریت جھاڑتے ہوئے بولے۔

"لومڑی کی چالاکی اور عیاری تو ضرب المثل ہے۔ دوسرے جانور شیر کے پاس جاتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ لیکن یہ نہ صرف اس کے قریب پہنچ جاتی ہے بلکہ کبھی کبھی اس پر حملہ آور بھی ہو

بیٹھتی ہے۔ اسے جانوروں کی نقیب بھی کہا جاتا ہے۔ شیر کے آگے آگے چلتی ہے اور اپنی چیخوں سے دوسرے جانوروں کو مطلع بھی کرتی رہتی ہے کہ اِدھر اُدھر بھاگ کر اپنی جان بچا لیں۔"

میں نے انجینئر صاحب سے کہا کہ دروازہ کھلا چھوڑ کر انہوں نے سخت غلطی کی ہے۔ جان کا ایک بال تک نہیں ملے گا۔ حقیقت میں ایسا ہی ہوا۔ جب ہم نے وہاں کا جائزہ لیا تو نک ٹائی کے چیتھڑوں کے سوا ایک بھی چیز ایسی نہیں تھی، جسے جان سے منسوب کیا جاتا۔ لومڑیوں اور دریائی جانوروں نے اس خوبی سے جان کا صفایا کیا تھا، گویا اس کا کوئی وجود نہیں تھا۔ حد یہ کہ چھری اور فرش پر اس کے خون کے جو نشانات تھے، انہیں بھی چاٹ کر صاف کر دیا تھا۔

"اب کیا کریں؟" انجینئر صاحب نے بے بسی سے پوچھا۔

"اپنی کٹیا میں جا کر آرام کی نیند سو جایئے۔"

"لیکن یہاں ایک انسان کو قتل کیا گیا ہے۔ انسانیت کا تقاضا ہے کہ پولیس کو اس واقعہ کی اطلاع دی جائے۔ تاکہ قاتل کو گرفتار کیا جا سکے۔"

"پولیس ثبوت کے بغیر کوئی قدم نہیں اُٹھاتی۔"

انجینئر صاحب گہری سوچ میں ڈوب گئے۔

"کہتے تو ٹھیک ہو۔" انہوں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "مقتول تمہارا دوست تھا؟"

"جی نہیں، مقتول میرا دوست نہیں تھا۔"

"پھر تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ اس کا نام جان تھا؟"

دل چاہا کہ انہیں ساری داستانِ امیر حمزہ سنا دوں اور بتاؤں کہ مجھے اس کی بوٹیاں کھلائی گئی تھیں اور اگرچہ اب اس کے تصور سے ابکائیاں آنے لگتی تھیں اور دل بگڑنے لگتا تھا، لیکن بوٹیاں کھاتے وقت ایسا معلوم ہو رہا تھا، جیسے جنت سے اُترا ہوا کوئی میوہ کھا رہا ہوں۔ جان جتنا بدصورت تھا، اُس کی بوٹیاں اتنی ہی مزیدار تھیں۔

"یہاں، اس جزیرے پر......" میں نے بات بناتے ہوئے کہا۔ "سیر و تفریح کی غرض سے روزانہ لوگ آتے جاتے رہتے ہیں۔ ان کے ساتھ لڑکیاں بالیاں بھی ہوتی ہیں۔ جیسے امریتا اپنے ماتا پتا کے ساتھ آئی ہے اور جیسے نادیہ میڈیکل آفیسر ڈاکٹر کے ساتھ آئی ہے۔ اسی طرح جان اپنی بیوی کو لے کر یہاں آیا۔ یہاں آ کر بیوی سے لڑائی ہو گئی۔ نوبت ہاتھا پائی تک پہنچ گئی۔ انہوں نے سب سے الگ تھلگ اس کٹیا میں قیام کیا تھا۔ ان سے پہلے کچھ شکاری یہاں قیام کر چکے تھے اور اپنا چھرا یہیں بھول گئے۔ اتفاق سے وہ چھرا اس کی بیوی کے ہاتھ لگ گیا۔ اس نے ہاتھ گھما کر شوہر پر ایسا وار کیا کہ اس کا سر دھڑ سے الگ ہو کر دور جا گرا۔ شوہر کو قتل کر کے بیوی کو احساس ہوا کہ وہ یہ کیا کر بیٹھی ہے۔ اُس نے کٹا ہوا سر اُٹھایا، پیار کیا اور میز پر رکھ دیا۔ پھر وہ دروازہ بند کر

کے باہر نکلی اور دیکھتے ہی دیکھتے بہہ گئی۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ اس نے خودکشی کر لی اور پانی کی لہریں اسے بہا کر لے گئیں؟"

انہوں نے پوچھا۔ پھر میرے جواب کا انتظار کیے بغیر اگلا سوال کر ڈالا۔ "مگر سکندر! تمہیں یہ باتیں کیسے معلوم ہوئیں؟"

مجھے نیا بہانہ سوچنا پڑا۔ "دراصل میں اِدھر گھومتا پھرتا آ نکلا تھا۔ دونوں کے لڑنے کی آوازیں سنیں تو کٹیا میں جھانک کر دیکھا۔ بڑا روح فرسا منظر تھا، انجینئر صاحب!...... لوسی چھرا گھما کر جان کی گردن اُڑا رہی تھی۔"

"لوسی......؟"

ایک جھوٹ کو نبھانے کے لیے انسان کو کتنے جھوٹ بولنا پڑتے ہیں۔ "جی ہاں۔ اُس عورت کا نام لوسی تھا۔"

"فضیلہ کی خدمت کے لیے جس نرس کو رکھا تھا، اس کا نام بھی لوسی ہی تھا؟"

"فضیلہ والی لوسی، سادھو کے ساتھ بہہ گئی...... میرا مطلب ہے، فرار ہو گئی۔ جبکہ جان والی لوسی نے بقول آپ کے، دریا میں کود کر خودکشی کر لی۔"

"بقول میرے؟...... کیا بے تکی ہانک رہے ہو؟"

"میں نے جو روح فرسا منظر دیکھا، اس کی وجہ سے میرا دماغ کام نہیں کر رہا ہے۔ مجھے چکر آ رہے ہیں۔"

فضیلہ نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "آیئے واپس چلیں۔"

"ہاں، ہاں......" انجینئر صاحب بولے۔ "واپس چلنا چاہیے۔ اب یہاں کیا رکھا ہے؟"

کچھ دُور چلنے کے بعد انہوں نے کہا۔ "ایک بات سمجھ میں نہیں آئی...... جب تم نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا تو پولیس کو مطلع کیوں نہیں کیا؟"

"پولیس کو اطلاع دی تھی۔" میں نے کہا۔ "آپ لوگوں کی آمد کے تھوڑی دیر پہلے پولیس کی موٹر بوٹ آئی تھی۔ اتفاق سے پولیس آفیسر میرا واقف کار نکلا۔ وہ کل صبح نو بجے مجھے ایک دیہات کی سیر کرانے کے لیے لے جائے گا۔"

"تم نے اُسے جان کی لاش دکھائی تھی؟"

"ہاں۔"

"تعجب ہے۔" نورین کے ابو نے کہا۔

خدا خدا کر کے نورین کے ابو سے جان چھوٹی۔ وہ سر ہلاتے اور خود کلامی کرتے ہوئے سونے کے ارادے سے اپنی کٹیا کی طرف چلے گئے تو فضیلہ نے پوچھا۔

"آپ نے جھوٹ بولنا کب سے شروع کر دیا ہے؟"

"اسے دروغ بر مصلحت کہتے ہیں۔"

"جھوٹ تفریحاً بولا جائے یا کسی مصلحت کے تحت، ہمیشہ جھوٹ ہی رہتا ہے۔ اور جھوٹ بولنے والوں پر قرآن میں لعنت آئی ہے۔"

"ہاں...... آئی تو ہے۔" میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ "مجھے یاد آ گیا۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے سچے جاں نثار اتنی احتیاط سے کام لیتے تھے کہ کبھی مذاق میں بھی جھوٹ نہیں بولتے تھے۔ آئندہ کے لیے وعدہ کرتا ہوں، کبھی جھوٹ نہیں بولوں گا۔"

"چلئے، سیڑھیوں پر چل کر بیٹھتے ہیں۔"

"کیوں...... کیا آج سونے کا ارادہ نہیں ہے؟" میں نے پوچھا۔

اُس نے زبان سے کچھ نہیں کہا، ایک ادا کے ساتھ نفی میں سر ہلا کر میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ میری زندگی میں تو ایسی متعدد راتیں آ چکی تھیں۔ لیکن فضیلہ کی زندگی کی تو یہ پہلی رات تھی۔

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی، باقی رات منٹوں سیکنڈوں میں گزر گئی۔ محویت اس وقت ٹوٹی، جب اذان کی آواز آئی۔ کس قدر حیرت کی بات تھی کہ اذان بھائی جان دے رہے تھے۔

میں نے فضیلہ کو اُس کی کٹیا میں چھوڑا، جہاں نورین نے پُر معنی چٹکلوں کے ساتھ فضیلہ کا استقبال کیا۔ اُسے چھوڑ کر میں بھاگم بھاگ گوپی کے پاس گیا۔ وہ لمبی تانے سو رہا تھا۔ اُسے جگایا، ناشتہ لانے کے لیے کہا اور اس سے نمٹ کر اشنان گھر میں گھس گیا۔

جس وقت میں تیار ہو کر اس مقام پر پہنچا، جہاں نماز کے لیے صف بندی کی گئی تھی، سب لوگ جماعت کے لیے کھڑے ہو چکے تھے اور بھائی جان اقامت کہنے ہی والے تھے کہ مجھے دیکھ کر رُک گئے۔ فضیلہ کے ابو، جو اپنی خوب صورت داڑھی کی وجہ سے ہمیشہ ہی سے امامت کے فرائض انجام دیتے تھے، بھائی جان سے مخاطب ہو کر بولے۔

"ابھی کافی دیر ہے۔ سکندر کو بھی سنتیں ادا کر لینے دو۔"

سارے نمازی دوبارہ اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔ ابا جی نے انجینئر صاحب سے کہا۔

"حدیث شریف میں آیا ہے کہ دنیا میں اور آخرت میں جتنی نعمتیں اور دولتیں ہیں، فجر کی دو سنتیں ان سب سے افضل و اعلیٰ ہیں۔ حساب لگا لیجیے، علی احمد صاحب! وہ شخص کتنا بدقسمت ہے جو نمازِ فجر سے محروم رہ جاتا ہے۔ سنت کا یہ رتبہ ہے تو فرض کا مرتبہ تو نہ جانے کتنا بڑا ہوگا۔"

انجینئر صاحب کے منہ سے ہلکی سی آہ نکلی۔

"میری فجر کی نماز اکثر قضا ہو جاتی ہے۔ دراصل رات گئے سونے کی عادت سی پڑ گئی ہے۔ رات گئے سوتا ہوں تو سویرے آنکھ نہیں کھلتی۔"

ابا جی نے کہا۔ "اللہ نے جو چیزیں فرض کی ہیں، ان کا سیکھنا اور اہتمام کرنا بھی فرض ہے۔ اہتمام کے باوجود آنکھ نہ کھلے تو معذور ہیں۔ اور آپ کے لیے نماز کا وہی وقت، جب نیند ٹوٹے۔ پھر بھی قضا پڑھ کر اپنی تساہلی اور غفلت کے لیے حق تعالیٰ سے معافی ضرور مانگنی چاہیے۔"

فضیلہ کے ابو بولے۔ "میرا بارہا کا تجربہ ہے کہ فجر کے بعد مانگی گئی دعائیں کبھی رد نہیں ہوتیں۔ میں تو ہر نماز کے بعد خاص طور پر فجر کے بعد فضیلہ کے ہاتھ کے لیے دعا مانگتا ہوں۔ یا تو اسے سالم ہاتھ مل جائے، یا کوئی ایسی چیز حاصل ہو جائے، جس سے اس کی محرومی کا احساس مٹ جائے اور وہ عام لڑکیوں کی طرح اپنا سارا کام کاج خود کرنے لگے۔"

میں دنیا و مافیہا سے زیادہ کی نعمتوں اور دولتوں کا ثواب حاصل کر چکا، یعنی سنتیں پڑھ چکا تو سب نماز کے لیے کھڑے ہو گئے۔ بھائی جان نے اقامت کہی۔ سلام پھیرنے کے بعد فضیلہ کے ابو نے ماثورہ دعائیں پڑھیں۔ ہم لوگ آمین کہتے رہے۔ پھر اچانک اُن کی آواز بھرا گئی۔ کہنے لگے۔

"یا اللہ! اپنے حبیب پاک کے صدقے میں، اس سے پہلے کہ ہم لوگ اس جزیرے کو چھوڑ کر اپنے گھروں کو واپس جائیں، میری معصوم بچی کی محرومی دُور کر دے۔ اسے اس قابل بنا دے کہ وہ اپنے کاموں کے سلسلے میں کسی کی محتاج نہ رہے۔ تُو سب کچھ کر سکتا ہے۔ میرے مولا! تُو قادرِ مطلق ہے۔ تیرے لیے کوئی بھی کام مشکل نہیں ہے۔"

وہ ایک انہونی بات کی دعا مانگ رہے تھے۔ اُن کی دُعا اُس بدو جیسی تھی، جو غلطی سے بکری کے بجائے بکرا خرید لایا تھا اور اُٹھتے بیٹھتے دعا کیا کرتا تھا کہ اس کا بکرا دودھ دینے لگے۔

ہم سب جانتے تھے کہ خان صاحب کی دعا قانونِ قدرت کے خلاف ہے۔ کوئی شک نہیں کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ لیکن ہمیشہ کرتا وہی ہے، جس کے بارے میں اس نے قانون مرتب کر دیا ہے۔ پھر یا تو خان صاحب کی آہِ سحرگاہی کا اثر تھا، یا ہم سب کو فضیلہ اتنی عزیز تھی کہ بے اختیار

ہماری زبانوں سے آمین، ثم آمین جاری ہو گیا۔

گوپی نے اُس روز ناشتہ لانے میں غیر معمولی عجلت دکھائی۔ اِدھر ہم لوگ نماز اور دعا سے فارغ ہوئے، اُدھر وہ ناشتہ لے کر پہنچ گیا۔ دسترخوان بچھاتے ہوئے میں نے گوپی سے کہا۔

"امرتا اور اس کے ماتا پتا کو بھی ناشتے پر بلا لائیے۔"

"وہ لوگ تو چار بجے ہی جا چکے ہیں۔" گوپی نے کہا۔ "میں انہیں ساحل تک چھوڑنے گیا تھا۔"

مجھے تھوڑا سا دُکھ ہوا۔ امرتا اور اس کے ماتا پتا کا خلوص ایسا نہیں تھا، جسے نظرانداز کیا جائے۔ اسی جزیرے پر اُن کی بیٹی کو اغواء کیا گیا تھا، بعد میں مصلحت کی بنا پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ پھر بھی فضیلہ کے اصرار پر وہ امرتا کو لے کر وہاں پہنچ گئے تھے۔ اس وقت کی فضیلہ کوئی اور ہی تھی۔ اس کے نزدیک کسی انسان کی اولاد نہیں تھی۔ گلتے ہوئے گوشت والی ایک ایسی بچھیا تھی، جسے لذتِ کام و دہن کے لیے استعمال ہونا چاہئے تھا۔ اسی لیے فضیلہ نے ان کے ساتھ دوسرے شہر تک کا سفر کیا تھا۔ خوشی کی بات یہ تھی کہ جب امرتا دوبارہ جزیرے پر پہنچی تو فضیلہ کی اصل حالت بحال ہو چکی تھی۔ امرتا جس طرح آئی تھی، اسی طرح صحیح و سلامت واپس چلی گئی تھی۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ ترشولی کا پروگرام کیا تھا۔ آیا اُسے صرف امرتا کی بوٹیوں کی ضرورت تھی، یا بیٹی کے ساتھ ساتھ اس کے ماتا پتا کو بھی ختم کر دینا چاہتی تھی۔ کیونکہ یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ بیٹی کی گمشدگی پر ماں باپ خاموش ہو کر بیٹھ جاتے اور چپ کر کے اپنے ملک واپس چلے جاتے۔ ان کا سفارت خانہ ہی نہیں، دونوں ممالک کا پریس بھی اُن کی آہ و بکا میں برابر کا شریک ہو جاتا۔ اس لیے اس بات کا امکان تھا کہ جنم اشٹمی کے بہانے جزیرے پر بلا کر ماں، باپ اور بیٹی تینوں کو ختم کرنے کا منصوبہ بنایا گیا ہو۔

"امرتا نے کہا تھا۔" گوپی کی آواز نے میرے خیالات کے سلسلے کو منقطع کر دیا۔ وہ بتا رہا تھا۔ "امرتا جی نے کہا تھا کہ میں آپ کو اور فضیلہ دیدی کو بہت بہت پرنام بولوں۔ اور یہ بھی کہا تھا کہ وہ آپ دونوں کے بھارت آنے کا بہت بہت انتظار کریں گے۔ اور سائیں! ایک بات اور یاد آ گئی۔ امرتا جی کہہ رہی تھیں کہ دسرے کے دن آئیں تو اور بھی اچھا ہے۔ اُن دنوں وہ پورے ایک ہفتے تک کسی ناٹک میں مرلی دھر کا کام کریں گی۔"

"ٹھیک ہے۔" گوپی سے میں نے کہا۔ "اب تم جا سکتے ہو۔ ایک بات کا خیال رکھنا، شاید آٹھ بجے تک میرے مہمان یہاں آ جائیں۔ ان کے لیے ایک بڑی کشتی کا انتظام کرنا ہوگا۔ اور ٹھیک نو بجے مجھے ساحل پر پہنچنا ہے۔ اس لیے پونے نو تک کشتی تیار رکھنا۔"

"ٹھیک ہے۔" گوپی نے کہا۔

عام ہندوؤں کی طرح گوپی بھی زیادہ چھوت چھات کا قائل نہیں تھا اور گائے کے گوشت کے علاوہ تقریباً ہر وہ چیز کھا لیتا تھا، جسے مسلمان پسند کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ میں جب بھی کھانے پینے کی چیزیں منگواتا تھا، اُسے خاص طور پر ہدایت کر دیتا تھا کہ اپنا حصہ ضرور نکال لے۔ اس کے علاوہ شہر تک آنے جانے کے لیے وہ عام طور پر چار روپے وصول کیا کرتا تھا۔ اکثر دریا دل اُسے پانچ سے دس روپے بھی دے دیا کرتے تھے۔ میری اتنی حیثیت تو نہیں تھی کہ دس روپے دیتا، لیکن اتنا گیا گزرا بھی نہیں تھا کہ پانچ روپے بھی نہ دے پاتا۔ شادی میں فضیلہ کے امی ابو سے سلامی کی جو رقم ملی تھی، میں اسے نیفے میں چھپا کر لے آیا تھا۔ اس ترشولی کو، جو سب کچھ جاننے کی دعویدار تھی، اس کے بارے میں کچھ بھی علم نہیں ہوا تھا۔

"سکندر!" ناشتے کے دوران ابا جی نے کہا۔ "دلہن کہہ رہی تھی کہ تم دونوں ہمارے ساتھ کیوں نہیں چل رہے ہو؟"

میں نے گھوم کر فضیلہ کی طرف دیکھا، جو اپنے ابو اور نورین کے درمیان سمٹی سمٹائی، معصوم سا چہرہ بنائے بیٹھی تھی اور زیرِ لب مسکرا رہی تھی۔ نہا دھو کر اُس نے دودھ جیسا سفید لباس پہن رکھا تھا، جس کے کرتے پر طلائی اور نقرئی تاروں سے پھول پتے بنائے گئے تھے۔ اسے میک اپ کی ضرورت تو نہیں تھی، پھر بھی ہلکا سا میک اپ کر کے نورین نے اس کے حسن کو چار چاند لگا دیئے تھے۔

"جی ہاں......" میں نے جواب دیا۔ "دراصل مجھے اپنے ایک کرم فرما سے ایک بہت ضروری ملاقات کرنی ہے۔ میں دوپہر کی گاڑی سے آ جاؤں گا۔ آپ بے شک فضیلہ کو اپنے ہمراہ لے جائیں۔"

فضیلہ کسمسانے لگی۔ ڈھیر سارے بزرگوں کے سامنے اس کی زبان نہیں کھل رہی تھی نورین سمجھ گئی کہ فضیلہ کے دل پر کیا گزر رہی ہے۔ کہنے لگی۔

"صبح اور دوپہر کے درمیان وقفہ چند گھنٹوں کا نہیں ہے۔ کیوں نہ ہم لوگ بھی دوپہر کی ٹرین سے چلیں۔ اس طرح ہمیں گھومنے پھرنے کا اچھا خاصا موقع مل جائے گا۔"

سب نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

انجینئر صاحب نے کہا۔ "ہاں، ہاں نورین بیٹا! ہم ضرور سیر کریں گے۔"

"مگر میرا خیال ہے کہ اب یہاں ٹھہرنا حماقت ہی نہیں، تضیع اوقات بھی ہے۔" بھائی بولے۔ "ناقابلِ برداشت گرمی کے باعث ہم کچھ بھی نہیں دیکھ سکیں گے۔ اس کے علاوہ اسٹروک کا بھی خطرہ ہے۔"

"ایک مچھیرا میرا واقف کار ہے۔" فضیلہ کے ابو خاموش نہیں رہ سکے۔ "آج کل اُس

شہر کے ہوٹلوں کو میٹھے پانی کی مچھلیاں سپلائی کرتا ہے۔ وہ مچھیرا کہہ رہا تھا کہ شدید دھوپ، بے انتہا گرمی اور جھلسا دینے والی ہوا کے باوجود آج تک اِن شہروں میں کوئی شخص سن اسٹروک کا شکار نہیں ہوا۔ سارا فیض گیلان کے ان بزرگ کا ہے، جن کا مزار شہر کے قدیم حصے میں آج بھی مرجع خاص و عام ہے۔"

"یہ بات تم نے پہلے کیوں نہیں بتائی، خان صاحب؟" ابا جی نے شکایت کی۔

"پہلے یہ ذکر ہی کب چلا تھا؟"

"اخلاق اور تہذیب کا تقاضا ہے کہ ہم لوگ مزار پر حاضری دیں اور فاتحہ پڑھیں اور اس کے بغیر واپس جانے کے بارے میں سوچیں بھی نہیں۔ بزرگوں کے مزاروں پر ہم ہمہ وقت خدا کی رحمت کے انوار نازل ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں۔" ابا جی نے کہا۔ "نورین ٹھیک کہہ رہی ہے۔ صبح اور دوپہر کا درمیانی وقفہ چند گھنٹوں کا ہے۔ ہم لوگ دوپہر کی ٹرین سے گھر واپس چلیں گے۔"

انجینئر صاحب بولے۔ "چاہتا تو میں بھی یہی تھا کہ دوپہر کی ٹرین ٹھیک رہے گی۔ دراصل مجھے بیراج پر جا کر نہروں کا وہ حیرت انگیز جال دیکھنا تھا، جس سے ریگ زار کے ایک بڑے حصے کو سیراب کر کے گلزار بنا دیا گیا ہے۔ مگر آپ لوگوں کی وجہ سے کچھ کہتے ہوئے ڈرتا تھا۔"

"مزار کی زیارت پر نہیں چلیں گے؟"

"بیراج اور اس سے نکلنے والی نہروں کو دیکھ کر مزار پر پہنچ جاؤں گا۔" انجینئر صاحب نے کہا۔ "ہاشم! تم میرے ساتھ چلو گے۔ میں تمہیں دنیا کا سب سے طویل پل دکھاؤں گا۔ اس کی لمبائی ایک میل سے بھی زیادہ ہے۔"

بھائی جان نے ادب سے سر جھکا دیا۔ "ٹھیک ہے، پاپا!"

نورین اپنے ابو کو پاپا کہتی تھی، اس لیے وہ بھائی جان کے بھی پاپا ہو گئے تھے۔

میں نے کہا۔ "ہماری بھابی جان کی خواہش ہے کہ وہ سیر کے لیے جائیں۔ آپ بھائی جان کو دنیا کا سب سے بڑا پل دکھانے لے جائیں گے تو بھابی جان کو سیر کون کرائے گا؟"

نورین نے منہ پر ہاتھ رکھ کر ہلکی سی جمائی لی۔ "یہاں کی گرمی اور دھوپ کا خیال کر کے میں نے سیر کرنے کا پروگرام موسم سرما تک ملتوی کر دیا ہے۔ ویسے بھی مجھے نیند آ رہی ہے۔ جس کو جہاں جہاں جانا ہے، بے شک جائے۔ میں اور فضیلہ یہیں آرام کریں گی۔ کیوں فضیلہ؟"

بھائی جان نے بے بسی سے نورین کی طرف دیکھا اور کہا۔

"میری مانو تو میرے اور پاپا کے ساتھ تم بھی بیراج چلی چلو۔ نیند کا کیا ہے، یہ تو آتی جاتی رہتی ہے۔ ایسے سنہرے مواقع روز روز نصیب نہیں ہوتے۔"

"نہیں جناب! میں تو فضیلہ کے ساتھ یہیں رکوں گی۔ یہاں کی چلچلاتی دھوپ میں خاک و

ڈھول بجانے نہیں جاؤں گی۔"

"بھائی جان کے ساتھ چلی جائیے، نورین باجی! میں تو ان کے ساتھ کہیں اور جاؤں گی۔" فضیلہ نے دبی آواز میں کہا۔

"نہیں......" نورین نے جواب دیا۔ "میں نہیں جاؤں گی تو تم بھی کہیں نہیں جاؤ گی۔ مجھے آرام کرنا ہے۔ اس لیے تم بھی آرام کرو گی۔"

"اچھی زبردستی ہے۔" فضیلہ نے دبی زبان میں کہا۔

لیکن ناشتہ ختم ہونے سے پہلے ہی طے ہو گیا کہ ہم سب ایک ساتھ دوپہر کی ٹرین سے واپس چلیں گے۔ ابا جی اور خان صاحب مزار پر حاضری دیں گے اور وہاں کے خدام نے اجازت دی تو پورے احاطے کی جاروب کشی کریں گے۔ احمد علی صاحب پہلے بیٹی اور داماد کو لے کر ایک مینار پر چڑھ کر شہر کا معائنہ کریں گے، وہاں سے فارغ ہو کر بیراج اور اس سے نکالی جانے والی نہریں دیکھنے جائیں گے، پھر مزار اقدس پر تشریف لے جائیں گے۔ فضیلہ کو میرے ساتھ بھیجنے کا فیصلہ کر لیا گیا اور دونوں کو ہدایت کی کہ ہم بھی مزار پر حاضری دینے ضرور پہنچیں۔

گوپی کی کشتی اتنی بڑی نہیں تھی کہ ہم سب اس میں سا سکتے۔ اس لیے آٹھ بجے کے لگ بھگ گرلز کالج کی طالبات کو لے کر آنے والی کشتی کے ذریعے میں نے سارے مہمانوں کو رخصت کر دیا۔ ابا جی اور خان صاحب اپنے ہمراہ وہ سامان بھی لے گئے، جو ہمیں اپنے ساتھ لے جانا تھا۔ ایک سفری بیگ، جس میں نورین کے چند کپڑے اور میک اپ کا سامان تھا، بھائی جان نے اپنے پاس رکھ لیا تھا۔

کالج کی طالبات، جو اپنی لیکچرار کی زیر نگرانی یہاں آئی تھیں، چھوٹی چھوٹی ٹولیاں بنا کر اِدھ اُدھر بکھر گئیں۔ ایک ٹولی مچھلیاں پکڑنے کے سامان سے لیس تھی۔ وہ سیڑھی پر جا بیٹھی اور ڈوریاں دریا میں ڈال کر مچھلیوں کے پھنسنے کا انتظار کرنے لگی۔ دوسری ٹولی اپنے ساتھ بیڈمنٹن کا ساما لائی تھی۔ انہوں نے اس مقام پر جہاں ہم نماز پڑھا کرتے تھے، جال باندھا اور شلواروں پائنچے گھٹنوں تک چڑھا کر بیڈمنٹن کھیلنے میں مصروف ہو گئیں۔ تیسری ٹولی کو مختلف پکوانوں کا شو معلوم ہوتا تھا، انہوں نے پتھروں اور اینٹوں کی مدد سے چولہے بنائے، لکڑیاں اکٹھی کر کے آگ جلائی اور مختلف چیزیں پکانے اور تلنے میں مصروف ہو گئیں۔ ایک ٹولی کھلنڈری اور ہم جولڑکیوں مشتمل تھی، انہیں گھومنے پھرنے سے دلچسپی تھی۔ وہ تفریح کرتی ہوئی ہماری کٹیا کی طرف آ نکل اور فضیلہ کو ایک نظر دیکھتے ہی اُس پر فریفتہ ہو گئیں۔ ہم دونوں کچھ دیر پہلے تینوں پجاریوں الوداعی ملاقات کر کے اور کاسنا معاف کرا کے کٹیا میں آ کر بیٹھے ہی تھے اور پونے نو بجے کا ا کر رہے تھے کہ پروگرام کے مطابق ہمیں نو بجے تک ساحل پر پہنچنا تھا۔ گوپی نے کہا تھا ک

ہمیں بڑی آسانی سے دس منٹ کے اندر اندر ہماری منزل مقصود تک پہنچا دے گا۔

اسے حُسنِ اتفاق ہی کہیے کہ جن لڑکیوں نے فضیلہ کو اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا، ان میں نوشابہ بھی تھی۔ نوشابہ نے آٹھویں جماعت تک اسی اسکول میں تعلیم پائی تھی، جس میں ہم لوگ پڑھا کرتے تھے۔ پھر اس کے والد کا تبادلہ ہو گیا اور نوشابہ کو ان کے ساتھ اپنے شہر کو خیر باد کہہ کر ایک نئے شہر میں جانا پڑا۔ وہ ہنس مکھ اور شریر لڑکی تھی۔ مجھے اس نے بعد میں دیکھا، پہلی نظر فضیلہ پر پڑی اور اسے دیکھتے ہی پہچان گئی۔

"آپ ماڈل ہائی اسکول میں پڑھتی تھیں؟" اس نے فضیلہ سے سوال کیا۔

فضیلہ نے کہا۔ "آپ کا چہرہ کچھ جانا پہچانا سا معلوم ہوتا ہے......کیا آپ بھی اسی اسکول میں تعلیم حاصل کر چکی ہیں؟"

"آپ مجھ سے بہت جونیئر تھیں، مگر میں آپ کو کبھی نہیں بھول سکتی۔ میں نے اور میری کچھ سہیلیوں نے آپ کو ملکۂ حُسن کا خطاب دیا تھا۔ کچھ یاد آیا؟"

فضیلہ نے نفی میں سر ہلایا۔

"فضیلہ!" میں نے کہا۔ "یہ نوشابہ ہے۔ میری کلاس فیلو ہوا کرتی تھی۔ نورین کو بگاڑنے میں اس کا بڑا ہاتھ ہے۔"

اور تب نوشابہ کی نظر مجھ پر پڑی۔ "اوہو، سکندر!...... تمہیں تو میں نے دیکھا ہی نہیں تھا۔ ملکۂ حُسن کو اغواء کر لائے ہو؟"

میں ہنس پڑا۔ بات کچھ ایسی ہی تھی۔ کلاس میں نوشابہ اکثر اپنی اسی خواہش کا اظہار کیا کرتی تھی کہ کاش کوئی اُسے اغواء کر کے لے جائے۔

میں ہنس پڑا۔

"فضیلہ میری بیوی ہے۔ اور تم کہہ سکتی ہو کہ ہم لوگ یہاں ہنی مون منانے آئے تھے۔" میں نے جواب دیا۔ "اپنی کہو، ابھی تک تمہیں کسی نے اغواء نہیں کیا؟"

نوشابہ کی ساتھی لڑکیاں قہقہے لگانے لگیں۔

"بدقسمتی ہے میری۔" نوشابہ سوکھے منہ سے بولی۔ "حالانکہ صورت شکل بھی ٹھیک ٹھاک ہے اور اغواء کرنے والے کو ڈیڈی سے بڑی اچھی خاصی رقم بھی وصول ہو سکتی ہے۔ پھر بھی مجھے کوئی اہمیت نہیں دیتا۔"

میں نے رسٹ واچ پر نظر ڈالی۔

"ہمارے پاس صرف پانچ منٹ اور ہیں۔ مجھ سے اور فضیلہ سے جتنی باتیں کرنا چاہتی ہو، جلدی جلدی کر ڈالو۔ پانچ منٹ بعد ہمیں یہاں سے روانہ ہو جانا ہے۔"

وہ اور دوسری لڑکیاں دوبارہ فضیلہ کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

"اتنی جلدی شادی کیوں کی؟...... ابھی تو کھیلنے، کھانے اور لڑکوں کو قتل کرنے کے دن تھے...... محبت کی شادی کی ہے؟...... میٹرک کرلیا ہے یا نہیں؟...... اس دور کے لڑکوں کا کوئی اعتبار نہیں، پلک جھپکتے میں طوطے کی طرح نظریں پھیر لیتے ہیں...... سکندر پر گرفت سخت رکھو۔ ذرا سی ڈھیل دو گی، یہ تمہارے ہاتھ سے نکل بھاگیں گے۔"

پھر لڑکیوں کا ہجوم چھوڑ کر نوشابہ میرے پاس آئی اور مجھے کنیا کے باہر لے گئی۔

"میں نے جان بوجھ کر فضیلہ سے اس کے ہاتھ کے بارے میں سوال نہیں کیا اور لڑکیوں کو بھی منع کر دیا کہ وہ ہاتھ کے متعلق کچھ نہ کہیں۔ میں نہیں چاہتی کہ اُس کے زخم تازہ ہوں۔ تم بتاؤ، چاند کو کس طرح گہن لگ گیا؟ میں تو اسے اچھی بھلی چھوڑ کر آئی تھی۔"

"آج کل ہر جگہ حادثات ہونا ایک معمولی بات ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "فضیلہ کو بھی ایک حادثہ پیش آ گیا اور وہ دائیں ہاتھ سے محروم ہو گئی۔"

"تمہاری ایسی بہت سی باتیں ہیں، جو مجھ سے پوشیدہ نہیں ہیں۔" وہ بولی۔ "اسکول کے زمانے میں تمہیں تاریکی سے ڈر لگتا تھا۔ شام کا اندھیرا پھیلتے ہی تم کسی ترشولی کو فضاؤں میں منڈلاتے دیکھنے لگتے تھے۔ فضیلہ کو ہاتھ سے محروم کرنے میں بھی کیا اُسی کا ہاتھ ہے؟"

"تمہارا خیال درست ہے، نوشابہ! اس ترشولی نے نورین پر قاتلانہ حملہ کیا تھا۔ فضیلہ اُسے بچانے کے لیے دوڑی۔ نورین بچ گئی، فضیلہ اپنا ہاتھ ضائع کرا بیٹھی۔"

میں نے رسٹ واچ پر نظر دوڑائی۔ "معاف کرنا، نوشابہ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔"

"ابھی تک اسی گھر میں ہو یا بدل دیا ہے؟"

"تمہیں میرا گھر بھی معلوم ہے۔ میں اسی گھر میں ہوں۔"

"ڈیڈی کے سال میں دو تین چکر لازمی تمہارے شہر کے ہو جاتے ہیں۔ اب کی بار آئیں گے تو ان کے ہمراہ میں بھی آؤں گی۔ اس وقت تفصیل سے گفتگو ہو گی۔ شاید تمہاری اور فضیلہ کی کچھ خدمت کر سکوں۔"

"کیسی خدمت؟"

"میرے انکل یورپ میں ایک پلاسٹک سرجن کے ساتھ پریکٹس کیا کرتے تھے۔ پچھلے دنوں وہ مستقل طور پر وطن واپس آ گئے اور کسی ایسے مقام کی تلاش میں ہیں، جہاں اپنا کلینک قائم کر سکیں۔ میں تم دونوں کو ان سے ملواؤں گی۔ مجھے یقین ہے کہ ان کی مدد سے فضیلہ کو اس کا کھویا ہاتھ ضرور مل جائے گا۔"

"شکریہ، نوشابہ!" میں نے ایک بار پھر رسٹ واچ پر نظر ڈالی۔ نو بج چکے تھے۔ "اگر ایسا

ہو گیا تو میں ساری زندگی تمہارا احسان مند رہوں گا۔"

مجھے اور فضیلہ کو جزیرے سے روانہ ہوتے ہوتے ساڑھے نو بج گئے۔ میرا خیال تھا کہ میں پجاریوں سے آخری ملاقات کر آیا ہوں۔ لیکن جب ہم کالج کی لڑکیوں سے رخصت ہو کر کنارے کی جانب روانہ ہوئے تو تینوں پجاری ضد کر کے ہمیں مندر میں لے گئے۔ انہوں نے راستے میں ہمیں کھانے کے لیے سیروں کے حساب سے ایسی مٹھائیاں دیں، جنہیں بتوں کے چرنوں پر پرشاد کے طور پر چڑھایا گیا تھا۔ وہ خوش تھے کہ مسلمان ہوتے ہوئے بھی ہم نے کوئی ایسا کام نہیں کیا تھا، جس سے انہیں تکلیف پہنچتی۔ انہوں نے یہ بھی تسلیم کیا کہ جب تک ہمیں نماز پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا تھا، وہ ہمیں اپنا ہم مذہب سمجھتے رہے تھے۔ سب سے آخر میں پجاریوں نے اپنی محبت کے اظہار کے طور پر فضیلہ کو ایک پنجرہ پیش کیا، جس میں مور کے بچوں کا جوڑا تھا۔ یہ ان کے خلوص کی انتہا تھی۔ کیونکہ جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں، مور ان کا مقدس پرندہ تھا۔

پجاریوں سے نمٹ کر باہر نکلے تو وہ لڑکیاں، جو بیڈمنٹن کھیل رہی تھیں اور وہ جو مچھلی کے شکار کے لیے سیڑھیوں پر بیٹھی تھیں اور وہ لڑکیاں جو مزے مزے کے پکوان پکا رہی تھیں اور وہ لیکچرار جو جزیرے پر بھی لڑکیوں کو ڈانٹ ڈپٹ کر رہی تھیں، سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ایک جگہ اکٹھا ہو گئی تھیں۔ نوشابہ نے نہ جانے ان سے کیا کہا تھا کہ فضیلہ سب کی نظروں کا مرکز بنی ہوئی تھی۔

"یہ کیا مذاق ہو رہا ہے؟" فضیلہ نے سرگوشی میں پوچھا۔

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا، ایک لڑکی نے آگے بڑھ کر فضیلہ سے پوچھا۔

"نوشابہ نے ہمیں بتایا ہے کہ آپ نعت بہت اچھی پڑھتی ہیں۔ اور اتنی تعریفیں کی ہیں کہ ہم آپ سے یہ درخواست کرتے ہیں کہ ہمیں نعت سنائیں۔"

میں نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ "ہمیں نو بجے ساحل پر پہنچنا ہے۔ کچھ لوگ وہاں بے چینی سے ہمارا انتظار کر رہے ہوں گے۔ سوا نو بج چکے ہیں۔"

نوشابہ جو اس وقت سرغنہ بنی ہوئی تھی، بولی۔ "ہمارے زریں اصول کے مطابق دس بجے سے پہلے کبھی نو نہیں بجتے۔"

لڑکیوں نے یک زبان ہو کر نعرہ لگایا۔ "نعت سنیں گے...... نعت سنیں گے۔"

"کیا کروں؟" فضیلہ نے بے چارگی سے مجھ سے پوچھا۔

"لڑکیوں کے ارادے ٹھیک نہیں ہیں۔ ان سے چھٹکارا حاصل کرنے کی ایک ہی ترکیب ہے۔ کسی نعت کے دو شعر ترنم سے سنا دو۔" میں نے جواب دیا۔

شاید خدا کو بھی منظور تھا کہ جس مقام پر فضیلہ نے کسی کے زیر اثر ہو کر رقص کا مظاہرہ کیا تھا، وہیں اس کی زبان سے اللہ تعالیٰ کے محبوب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعریف و توصیف ادا کرائی

جائے۔

میں نے پہلی بار فضیلہ سے اسکول کے سالانہ جلسے میں نعت سنی تھی اور دوسری بار اس جزیرے پر سنی، جسے راج کنڈل کہا جاتا ہے۔ دونوں بار نعت سن کر مجھ پر بے خودی طاری ہو گئی۔ یہی حال ان لڑکیوں اور لیکچرر کا ہوا، جنہوں نے نوشابہ کے اُکسانے پر فضیلہ سے نعت سنانے کی فرمائش کی تھی۔ سب کو میں نے باقاعدہ پھوٹ پھوٹ کر روتے دیکھا۔ کچھ تو نعت کے الفاظ، اثر آگیں تھے اور کچھ فضیلہ کی آواز کا اثر تھا، جزیرے پر سماں بندھ گیا۔ چند لمحوں کے لیے یوں محسوس ہوا، جیسے چڑیاں چہچہانا بھول گئی ہوں اور دریا کی متلاطم لہریں ساکت و جامد ہو گئی ہوں اور وقت کا تیز رفتار گھوڑا ٹھٹک کر جہاں تھا، رک گیا ہو۔ حد یہ کہ جب ہم ساحل پر جانے لگے تو کشتی میں جاتے ہوئے کوپی بھی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکا۔

''بھگوان قسم ایسا لگ رہا تھا، مانو دیوی جی کے گلے میں سرسوتی بول رہی ہو۔ میں نے اتنی مدھر، منوہر آواز آج تک کسی کی نہیں سنی۔''

نوشابہ نے سچ کہا تھا کہ ہم لوگوں کے نو بھی نو بجے نہیں بجتے۔ ساڑھے نو بجے کے لگ بھگ کوپی نے ہمیں ساحل پر اُتارا اور جب تک ہم سڑک پر نہیں پہنچ گئے، کشتی پر کھڑا ہاتھ ہلاتا رہا۔ بند کی دیوار کی دوسری طرف، نہ سڑک پر، نہ مسجد کے سائے میں، نہ کھیل کے میدان میں، نہ دائیں، نہ بائیں غرض کہیں بھی وہ پولیس افسر نہیں تھا، جس نے مجھ سے وہاں نو بجے ملنے کا انتظار کہا تھا۔

''شاید وہ میرا انتظار کر کے مایوس ہو گیا ہو اور واپس چلا گیا ہو۔'' میں نے کہا۔

''یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ آیا ہی نہ ہو۔'' فضیلہ نے کہا۔

ہم نے مسجد کے سامنے کھڑے ہوئے خوانچے والے سے معلوم کیا۔ فضیلہ کا خیال درست نکلا۔ خوانچے والا وہاں آٹھ بجے سے کھڑا تھا۔ اس نے کسی پولیس والے کو وہاں آتے اور وہاں رُکتے نہیں دیکھا تھا۔ دھوپ تیز تھی اور ہوا گرم سے گرم تر ہوتی چلی جارہی تھی۔ گرمی سے میرا حال ہو رہا تھا۔ فضیلہ کی حالت مجھ سے بھی زیادہ ابتر تھی۔ وہ سرتاپا پسینے میں نہائی ہوئی تھی۔ لباس بھیگ کر جسم سے چپٹ گیا تھا اور زمین کے جس حصے پر کھڑی تھی، وہاں پسینے کا چھوٹا سا تالاب بن گیا تھا۔

''چلو!'' میں نے فضیلہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''میدان کی دوسری جانب اسکول کے پاس ہمیں کوئی رکشہ یا تانگہ مل جائے گا۔ پولیس آفیسر آئے یا نہ آئے، ہمیں بہر صورت ڈاکٹر جیلانی کے پاس جا کر اس کا شکریہ ادا کرنا ہے۔''

''جس جگہ آپ جانا چاہتے ہیں، وہ یہاں سے کتنی دور ہے؟''

''کم از کم دس میل تو ہو گی۔'' میں نے جواب دیا۔ ''بارہ تیرہ میل بھی ہو سکتی ہے۔''

''اتنی سخت گرمی میں ہم لوگ اتنی دور کیسے جا سکیں گے؟''

''رکشہ یا تانگے میں ہوا لگتی رہے گی۔ جس کی وجہ سے گرمی کی شدت کم ہو جائے گی۔''

''چلیے۔'' اُس نے اس طرح منہ بنا کر کہا، جیسے اپنی مرضی کے خلاف میری بات ماننے پر مجبور ہو گئی ہو۔

دیوار کے سائے سے نکل کر ہم نے اس میدان کی طرف، جو لوہار کی بھٹی کی طرح تپ رہا تھا، چند ہی قدم اٹھائے تھے کہ بھورے رنگ کی ایک تیز رفتار کار چیختے ہوئے بریکوں کے ساتھ ہمارے پاس آکر رکی۔

''معاف کرنا، سکندر!'' پولیس افسر نے کار سے اُتر کر کہا۔ ''تمہیں انتظار کی زحمت کرنا پڑی۔ میں ذاتی کام کے لیے محکمے کی گاڑی استعمال کرنے سے گریز کرتا ہوں۔ جن صاحب سے کار مستعار لینا تھی، ان کا لڑکا سویرے ہی کار لے کر کہیں چلا گیا تھا۔ اب آیا ہے تو سیدھا ادھر ہی دوڑا چلا آرہا ہوں۔ آؤ...... تم دونوں کار میں بیٹھ جاؤ۔ دھوپ میں کھڑے کھڑے تو پگھل جاؤ گے۔''

کار ایئر کنڈیشنڈ تھی۔ اس میں بیٹھتے ہی ایسا معلوم ہوا جیسے دوزخ سے نکل کر ہم جنت میں پہنچ گئے ہوں۔ اگلی سیٹ پر باپ کے برابر فریحہ بیٹھی تھی۔ دُبلی پتلی سی خوب صورت لڑکی۔ اتنی دُبلی نہیں، جتنا اُس کے باپ نے بتایا تھا۔ اُس نے چہرہ گھما کر ایک نظر مجھے دیکھا اور معنی خیز انداز میں مسکرائی۔

اگلے ہی لمحے کار اونچی نیچی، ناہموار سڑک پر دوڑنے لگی۔

بستی پہنچنے تک ہم میں سے کسی نے کسی سے گفتگو نہیں کی۔ کار کی خنکی کے باعث کچھ ایسا سکون ہوا کہ کچھ بولنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔

ڈاکٹر جیلانی اپنے مطب میں اکیلا تھا۔ اُس نے خندہ پیشانی سے ہم لوگوں کا استقبال کیا۔ محبت کے ساتھ ہمیں کرسیوں پر بٹھایا۔

میں نے کہا۔

''ڈاکٹر صاحب! سب سے پہلے تو مجھے آپ کا شکریہ ادا کرنا ہے۔ آپ نے ہمیں نئی زندگی ہی نہیں دی، بلکہ زندگی کی خوشیوں سے بھی ہمکنار کیا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ آپ کے احسان کا بدلہ کس طرح اُتار سکوں گا۔ میں نے اپنی زندگی میں آج تک کوئی شخص ایسا نہیں دیکھا، جو انسانیت کی بے غرض اور بے لوث خدمت کرتا ہو۔''

ڈاکٹر ہنسنے لگا۔

"کوئی نئی بات کرو۔ یہ بات تو ہر وہ شخص مجھ سے کہتا ہے، جسے مجھ حقیر پُر تقصیر کے عمل سے کوئی فائدہ ہوا ہو۔ شافیِ مطلق تو اللہ تعالیٰ ہیں۔ کام ہم فقیروں سے لے لیتے ہیں۔ جو چاہیں ہیں، آپ کرے ہیں۔ ہم کو عبث بدنام کیا ہے۔"

پھر اُس نے مسکرا کر پولیس افسر کو دیکھا۔ "اگر میں غلطی نہیں کر رہا ہوں تو آپ کا تعلق پولیس کے محکمے سے ہے؟"

پولیس افسر سادہ لباس میں تھا۔ حیرت سے سر ہلاتا ہوا بولا۔

"جی ہاں...... جی ہاں......"

ڈاکٹر نے فریحہ کی طرف اشارہ کیا۔ "اور یہ آپ کی صاحبزادی ہیں؟"

"جی ہاں...... جی ہاں......"

"اور آپ اپنی صاحبزادی کو علاج کی غرض سے میرے پاس لائے ہیں؟"

"جی ہاں...... جی ہاں......"

"کیونکہ آپ بھوت اُتروانا چاہتے ہیں، جو اس پر سوار ہے۔"

"جی ہاں!"

"مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی کوئی خدمت نہیں کر سکوں گا۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "اس کے سر پر جو بھوت سوار ہے، اسے بڑے سے بڑا عامل بھی نہیں اُتار سکتا۔"

جیلانی کا انکار سن کر مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ کیا ترشولی اور اس کے بھائی سے بڑا بھی کوئی بھوت ہو سکتا ہے؟ صرف ایک فریحہ ایسی تھی، جس نے اطمینان کا سانس لے کر اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔ شاید اُسے ڈر تھا کہ جس طرح دوسرے عامل مرچوں کی دھونی دے کر اور مار پیٹ کر بھوت اُتارنے کی کوشش کرتے رہے ہیں، اسی طرح جیلانی بھی اس سے بدسلوکی کرے گا۔

"میں تو آپ کی بڑی تعریفیں سن کر، بڑی بڑی اُمیدیں لے کر آپ کے پاس آیا تھا۔" پولیس افسر نے کہا۔ "خدارا، مجھے مایوس نہ کیجیے۔ میری ایک ہی بچی ہے۔ اس کی خاطر ہر قربانی دے سکتا ہوں۔ بڑی سے بڑی رقم خرچ کر سکتا ہوں۔"

فریحہ نے آنکھیں کھول کر باپ کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے دو موٹے موٹے قطرے ٹپک پڑے۔

"میرے ساتھ برابر کے کمرے میں چلئے۔" جیلانی نے کہا۔ اور پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ "تم بھی چلو۔ مجھے تم سے بھی کچھ ضروری گفتگو کرنا ہے۔"

میں نے فضیلہ سے کہا۔ "فریحہ کا خیال رکھنا۔"

اس علاقے میں خس کی ٹٹیوں کا کام کھجوروں اور چھتوں اور جڑوں جیسی چھال سے لیا جاتا تھا۔

جیلانی ہمیں جس کمرے میں لے کر گیا، اس میں انہی چیزوں کی ٹٹیاں لگی تھیں، جن پر پانی کا چھڑکاؤ کیا گیا تھا۔ گرم ہوا اُن ٹٹیوں سے چھن کر اور ٹھنڈی ہو کر اندر آ رہی تھی۔ کمرے میں خنکی کے علاوہ سوندھی سوندھی سی خوشبو بھی پھیل گئی تھی۔

جیلانی نے ہمیں وہاں بچھے ہوئے موڑھوں کی طرف بیٹھنے کا اشارہ کیا اور پھر خود ایک موڑھے پر بیٹھ کر پولیس افسر سے مخاطب ہوا۔

"آپ کہتے ہیں، آپ کو اپنی بچی اتنی عزیز ہے کہ اس کی خاطر ہر قربانی دے سکتے ہیں؟"

"جی ہاں۔"

"آپ کی بچی پر چڑھا ہوا بھوت اُتر سکتا ہے۔"

"مگر آپ تو ابھی کہہ رہے تھے......"

"درمیان سے بات مت کاٹیے۔ پہلے مجھے جملہ پورا کر لینے دیجیے۔" جیلانی نے کہا۔ "آپ کی بچی پر چڑھا ہوا بھوت اُتر سکتا ہے اور وہ لڑکی یہاں سے مکمل صحت یاب ہو کر جا سکتی ہے، لیکن اس کے لیے آپ کو اپنی مونچھ نیچی کرنا پڑے گی۔"

"کیا مطلب؟"

"جس وقت آپ لوگ میرے مطب میں داخل ہوئے، میں آپ کی بچی کو دیکھتے ہی سمجھ گیا تھا کہ اسے علاج کے لیے لایا گیا ہے۔ آپ کے علم میں لائے بغیر میں نے وہ دعا پڑھی، جس کی برکت سے کیسا ہی خطرناک جن کیوں نہ ہو، فوراً حاضر ہو جاتا ہے۔ مگر بچی پر اس دعا کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ جس طرح بیٹھی تھی، اسی طرح آرام سے بیٹھی رہی۔"

"آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اس پر کوئی اثر نہیں ہے؟ حالانکہ میں نے جس جس عامل سے اس کا علاج کرایا ہے، سب نے تسلیم کیا ہے کہ وہ شاہ جنات کے زیر اثر ہے۔"

"انہوں نے آپ سے کالے بکرے بھی لیے ہوں گے...... نیاز اور نذر کے نام پر بڑی بڑی رقمیں بھی وصول کی ہوں گی۔ پھر بھی وہ شاہ جنات سے نجات نہیں دلا سکے۔ اس لیے نجات نہیں دلا سکے کہ بچی پر شاہ جنات نہیں، کوئی اور ہی سوار ہے۔"

"کوئی اور ہے؟...... کون ہے وہ؟"

"محترم! وہ آپ خود ہیں، آپ کی انانیت اور جھوٹی شان ہے۔"

پولیس انسپکٹر کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا اور وہ جیلانی کا چہرہ تکنے لگا۔

جیلانی نے کہا۔ "آپ کی بچی کب سے بیمار ہے؟"

"تین سال سے زیادہ کا عرصہ ہو چکا ہے۔ اس کے مرض کا ہمیں اس وقت پتہ چلا، جب کھاتے پیتے اعلیٰ گھرانے میں اس کی شادی طے کی گئی۔"

"اس سے پہلے بھی کہیں اس کے رشتے کی بات چلی تھی؟"

"جی ہاں......رشتے تو آتے ہی رہتے تھے، لیکن باقاعدہ کہیں بات طے نہیں ہوئی تھی۔"

"یہ بات آپ پورے یقین سے کہہ رہے ہیں؟"

پولیس آفیسر نے چند لمحوں تک سوچا۔ "میرا خیال ہے، ایسا ہی ہوا تھا۔"

"ایسا نہیں ہوا تھا۔" جیلانی نے غصے سے کہا۔ "آپ نے لازمی طور پر کسی جگہ اس کا رشتہ طے کر دیا تھا۔ آپ کی بچی کو وہ لڑکا بہت پسند تھا، لیکن جب بقول آپ کے، ایک کھاتے پیتے اعلیٰ خاندان کے ایک لڑکے کا رشتہ آیا تو آپ نے پچھلا رشتہ ختم کر دیا۔"

"فریحہ کا رشتہ طے نہیں ہوا تھا۔ تاہم ہم نے فریحہ کے کزن کو پسند کر لیا تھا۔ وہ میرے چھوٹے بھائی کا لڑکا تھا اور ایم۔اے میں پڑھتا تھا۔ آج کل شہر کے ایک کالج میں لیکچرر لگا ہوا ہے۔"

"آپ کے چھوٹے بھائی کیا کرتے ہیں؟"

"ایک فرم میں کلرک ہیں۔"

جیلانی نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا۔ "ایک پولیس آفیسر جو تیزی سے ترقی کی سیڑھیاں طے کر رہا ہے، بھلا وہ ایک معمولی سے کلرک کے بیٹے کو اپنی لڑکی کیسے دے سکتا تھا؟ چھوٹے بھائی کو انکار کرتے ہوئے آپ نے یہ نہیں سوچا کہ غریب بھائی کا ہی نہیں، اپنی بیٹی کا بھی دل توڑ رہے ہیں۔"

"جیلانی صاحب! آپ ذاتیات پر حملہ کر رہے ہیں۔"

جیلانی نے اس طرح کہا، جیسے اُس نے افسر کا جملہ سنا ہی نہ ہو۔ "بیٹی کے احساسات اور جذبات کا خیال نہ کر کے اس کزن کو ٹھکرا دیا تو بیٹی نے فیصلہ کر لیا کہ اگر آپ کو اس کی خوشیوں کا احساس نہیں ہے تو وہ بھی آپ کو خوش نہیں رہنے دے گی۔ جو رشتہ بھی آئے گا، اسے ختم کرا دے گی۔"

"فریحہ تو بہت معصوم بچی ہے......وہ ایسا نہیں کر سکتی۔"

"معصوم اور نیک نہ ہوتی تو جس وقت آپ نے اس کے کزن کو انکار کیا تھا، وہ علمِ بغاوت بلند کر کے آپ سے صاف صاف کہہ دیتی کہ وہ کزن کے علاوہ کسی اور سے شادی نہیں کرے گی۔ بھوت اور جن کے ڈرامے وہی لڑکیاں رچاتی ہیں، جن میں اتنی جرأت نہیں ہوتی کہ ماں باپ کے سامنے زبان کھول کر اپنی مرضی کا اظہار کر سکیں۔"

"مجھے یقین نہیں آتا کہ آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں، وہ درست بھی ہو سکتا ہے۔ میری بچی پر واقعی کوئی ایسی شے سوار ہے، جو......"

جیلانی نے کہا۔ "سانچ کو کیا آنچ۔ ہم ابھی آپ کی بیٹی کا عندیہ معلوم کیے لیتے ہیں۔"

"وہ مر جائے گی، لیکن حجاب سے اپنے دل کا راز نہیں کھولے گی۔"

"گویا تھوڑا بہت اندازہ آپ کو بھی ہے کہ اس سے زیادتی کی جاتی رہی ہے۔" جیلانی نے کہا۔ پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ "سکندر! اپنی بیوی سے کہو کہ وہ لڑکی کو یہاں لے آئے۔" پھر اُس نے پولیس افسر سے پوچھا۔ "اس کے کزن کا نام کیا ہے؟"

"شہزاد۔"

"میری غیبت میں ان دونوں نے جو گفتگو کی، اس کا مجھے کوئی علم نہیں ہو سکا۔ چند لمحوں بعد فضیلہ اور فریحہ کو لے کر کمرے میں پہنچا۔ دونوں اپنے اپنے موڑھے پر بیٹھ گئیں تو جیلانی دھاڑتا ہوا بولا۔

"تمہارے باپ نے ایک وڈیرے سے تمہاری شادی طے کر دی ہے۔ نکاح تھوڑی دیر میں چپ چپاتے یہیں پڑھا جائے گا۔ کیونکہ وہ شے، جو تم پر سوار ہے، یہاں اس مطب میں آنے کی جسارت نہیں کر سکتی۔ آئے گی تو جلا کر راکھ کر دی جائے گی۔"

فضیلہ نے کہا۔ "یہ زیادتی ہے۔ فریحہ کو علاج کے بہانے بلا کر......"

"چپ رہو، لڑکی!" جیلانی گرجا۔

اچانک فریحہ جھومنے لگی۔ اس کے بال دھمال ڈالنے والی عورتوں کی طرح بکھر گئے اور سر اور چہرے کے گرد گھومنے لگے۔ منہ سے کف جاری ہو گیا۔ آواز بدل گئی۔

"فریحہ میری ہے......" اس نے بدلی ہوئی آواز میں کہا۔ "میرے ہوتے ہوئے اس کا کسی سے نکاح نہیں ہو سکتا۔ تم سے یہ کس نے کہہ دیا بڈھے! کہ میں یہاں نہیں آ سکتا؟ جہاں فریحہ جا سکتی ہے، وہاں میں جا سکتا ہوں۔ مجھے اور فریحہ کو دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت بھی الگ نہیں کر سکتی۔ تم بھی اپنا علم آزما لو۔"

جیلانی نے احترام سے اپنا سر جھکا لیا اور فریحہ کے سامنے دوزانو ہو کر بیٹھ گیا۔ اس وقت وہ اتنی اچھی اداکاری کر رہا تھا کہ حیرت ہو رہی تھی۔

"آپ، شاہ جنات ہیں حضور والا؟"

"نہیں......ہم ایک دیو ہیں۔ ہمارا نام زمبا ہے۔ تم نے کبھی زمبا کا نام نہیں سنا؟"

"وہی زمبا، جس میں سو دیوؤں کی طاقت ہے؟"

"ہزار دیو کی طاقت ہے مجھ میں۔"

"آپ کیا چاہتے ہیں، زمبا دیو صاحب!"

"ہم صرف فریحہ کو چاہتے ہیں۔ ہمیں اور فریحہ کو تنہا چھوڑ دیا جائے۔"

"آپ نہیں چاہتے کہ فریحہ کا نکاح وڈیرے سے کیا جائے؟"

"ہم کسی سے بھی فریحہ کا نکاح نہیں ہونے دیں گے۔ اور اگر تم اپنی جھاڑ پھونک والی حرکتوں سے باز نہ آئے تو کسی دن ہم فریحہ کو لے کر کوہ قاف چلے جائیں گے۔ تم لوگ ہاتھ ملتے رہ جاؤ گے۔"

"زمبا دیو صاحب!" جیلانی نے کہا۔ "وڈیرے کا نام ہم نے آپ کو بلانے کے لیے لیا تھا۔ ہمیں معلوم تھا کہ اس کا نام سنتے ہی آپ غضب ناک ہو کر یہاں پہنچ جائیں گے۔ آپ نیک اور شریف دیو معلوم ہوتے ہیں۔ آپ کو علم ہے کہ آدم زاد اور دیو کا ساتھ نہیں ہو سکتا۔"

"ہو سکتا ہے۔"

"آپ کی جگہ کوئی دوسرا دیو ہوتا تو وہ اپنی راہ میں آنے والے نہ جانے کتنے افراد کو موت کے گھاٹ اُتار دیتا۔ آپ کو اپنی خاندانی شرافت و نجابت کا واسطہ، خاموشی سے ہماری چند معروضات سن لیجیے۔ فریحہ آپ کو ہی نہیں، شہزاد نامی ایک لڑکے کو بھی پسند کرتی ہے۔ وہ فریحہ کا کزن ہے اور ایک کالج میں پڑھاتا ہے۔ فریحہ کے والدین کی آرزو ہے کہ شہزاد اور فریحہ کو رشتۂ ازدواج میں منسلک کر دیا جائے۔ لیکن انہیں آپ سے ڈر لگتا ہے کہ عین نکاح کے وقت اگر آپ فریحہ کے سر پر سوار ہو گئے تو سارے کیے کرائے پر پانی پڑ جائے گا۔"

فریحہ کا جھومنا کم ہو گیا۔ جیلانی کی بات جاری تھی۔

"اس بات کا مجھے اچھی طرح اندازہ ہو گیا ہے کہ آپ کی ہزار دیووں والی طاقت کے سامنے میرے سارے اعمال، اوراد اور وظائف ماند پڑ جائیں گے۔ آپ کو سختی سے نہیں، نرمی سے پیار و محبت کی باتوں سے سمجھایا جا سکتا ہے۔ آپ کے کوہ میں ایک سے بڑھ کر ایک پریاں پائی جاتی ہیں۔ میں آپ سے ہاتھ جوڑ کر درخواست کرتا ہوں کہ فریحہ کو شہزاد کے لیے چھوڑ کر اپنے وطن واپس چلے جائیے۔ ورنہ اگر شہزاد کو پتہ چل گیا کہ فریحہ پر دیو سوار ہے تو وہ شادی سے صاف انکار کر دے گا اور فریحہ بے چاری کنواری بیٹھی رہ جائے گی۔"

فریحہ کا جھومنا بند ہو چکا تھا۔ اُس نے اپنے سر کو اوپر اُٹھائے بغیر کہا۔

"فریحہ کے ماں باپ ظالم ہیں، انہیں جھوٹی شان و شوکت زیادہ عزیز ہے۔ وہ شہزاد کو پسند نہیں کرتے۔"

"اب پسند کرنے لگے ہیں۔ وہ سمجھ چکے ہیں کہ شہزاد ان کی فریحہ کو خوش رکھ سکتا ہے۔"

"اگر تم جھوٹ نہیں بول رہے اور اگر ہمیں دھوکا نہیں دیا جا رہا ہے تو فریحہ کی خوشی کا خیال کر کے ہم کوہ قاف واپس چلے جائیں گے۔ لیکن ایک بات سمجھ لو، تم نے جو کچھ کہا ہے، اگر اس سے سر مو بھی انحراف کیا گیا تو ہم واپس آ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے فریحہ کو اپنے ساتھ لے جائیں گے

تمہیں صرف فریحہ کی لاش ملے گی۔"

فریحہ فرش پر گر کر سسکنے لگی۔ پولیس افسر نے پستول پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"مکار!...... ننگ خاندان......"

میں نے جلدی سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور سرگوشی میں کہا۔

"بیٹی کی زندگی عزیز ہے تو اس کی آرزوؤں کا خون مت کیجیے۔ بصورت دیگر یاد رکھیے، وہ دھمکی دے چکی ہے کہ دوسری جگہ شادی کی کوشش کی گئی تو وہ خودکشی کر لے گی۔"

سسکنے، تڑپنے کی تھوڑی سی اداکاری کے بعد فریحہ ہوش میں آ گئی اور سہمے ہوئے انداز میں فضیلہ کی طرف دیکھ کر بولی۔

"میں کہاں ہوں؟"

فضیلہ نے جھک کر اُسے اُٹھایا اور موڑھے پر بٹھا دیا۔ نہ جانے کیوں فریحہ پر رقت سی طاری ہو گئی۔ آنکھوں سے ساون بھادوں کی جھڑی لگی تھی۔

پولیس افسر مجھے باہر لے گیا۔ وہ کافی متاثر اور متاسف نظر آتا تھا۔

"یہ آدمی......" اُس کا اشارہ جیلانی کی طرف تھا۔ "یہ آدمی تو کمال ہے۔ میں نے لاکھوں روپے عاملوں کی نذر کر دیے، لیکن کبھی اپنی بچی کے دل میں جھانک کر نہیں دیکھا۔ وقتی طور پر مجھے اس کی مکاری پر غصہ آ گیا تھا۔ دل چاہ رہا تھا کہ گولی مار دوں۔ مگر اب سوچتا ہوں، اس نے ٹھیک ہی تو کہا ہے۔ اگر وہ جن بھوت کا بہانہ نہ بناتی تو اب تک ہم اس کی شادی کہیں نہ کہیں ضرور کر چکے ہوتے۔ دنیا کے اس عجیب و غریب انسان کو نذرانے کے طور پر کیا دیا جائے؟

جیلانی بلاشبہ دنیا کا عجیب و غریب انسان ہے۔" میں نے کہا۔ "اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو محل کھڑے کر لیتا۔ کیا آپ نے میرے اور اس کے درمیان ہونے والی گفتگو سے یہ اندازہ نہیں لگایا کہ وہ بلا امتیاز سارے بندگانِ خدا کی بے لوث اور بے غرض خدمت کرتا ہے۔ معاوضہ، نذرانہ، ہدیہ لینا تو درکنار وہ آپ کی بھیجی ہوئی مٹھائی بھی قبول نہیں کرے گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کی کامیابی کا اصل راز بھی یہی ہے۔ اس کی نظریں دنیا والوں پر نہیں، دنیا کے خالق پر لگی رہتی ہیں۔"

جیلانی نے مجھے اور فضیلہ کو روک لیا تھا۔ فضیلہ اور اس کے باپ کو رخصت کر دیا تھا۔ حالانکہ میں نے یہ بھی بتایا تھا کہ ہم نے دوپہر کی ٹرین سے شہر اپنے گھر واپس جانا ہے لیکن اس کی ضد کے آگے ہماری ایک نہ چلی۔

"آج رات تک تم دونوں کا دانہ پانی یہیں پر ہے۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ "عصر اور مغرب کے درمیان میرے ایک کرم فرما یہاں آئیں گے اور نماز مغرب کے بعد تم دونوں کو اسٹیشن پر چھوڑ دیں گے۔"

ضد کرنا فضول تھا۔ بزرگوں سے بحث نہیں کی جاتی، ان کے حکم پر عملدرآمد کیا جاتا ہے۔ چنانچہ میں نے اور فضیلہ نے ان کے حکم پر سرِ تسلیم خم کر دیا اور اس کمرے میں، جسے کھجور کے تنوں اور چھال کی مدد سے ایئر کنڈیشنڈ بنایا گیا تھا، ڈیرے ڈال دیے۔ جیلانی نے مریضوں کو دیکھنے جانا تھا۔ اس لیے وہ جلد آنے کا وعدہ کر کے مریضوں کو دیکھنے چلا گیا۔ میں نے فضیلہ کو اوّل تا آخر فریحہ کے بھوت کی کہانی سنائی۔

فضیلہ نے کہانی سن کر تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔ "نہیں...... میں اسے ذہانت نہیں کہوں گی۔ اس نے جو طریقہ اختیار کیا، وہ انتہائی احمقانہ تھا۔ جو لڑکی جن اور بھوت کا بہانہ کر کے طرح طرح کی اذیتیں جھیل سکتی ہے، اس میں اتنی ہمت اور جرأت ہونی چاہیے تھی کہ براہ راست یا سہیلیوں کی مدد سے ماں باپ کو اپنی پسند سے مطلع کر دیتی اور صاف کہہ دیتی کہ اگر انہوں نے اس کی بات نہ مانی تو وہ عین شادی کے وقت شادی کرنے سے انکار کر دے گی۔"

"ہو سکتا ہے کہ ساری باتیں اس کی نظر میں ہوں اور وہ اپنے باپ کی عادت سے واقف کہ اس کی مرضی سے آگاہ ہو جانے کے باوجود بھی وہ اسے اپنی پسند کے کسی لڑکے کے ساتھ منڈھ دیں گے۔"

"پھر بھی...... میرے نزدیک اس نے کوئی عقل کا کام نہیں کیا۔" فضیلہ بولی۔ "کوئی لڑ آسیب زدہ مشہور ہو جائے تو ساری زندگی کنواری بیٹھی رہ جاتی ہے۔ اس کا محبوب تک اسے دیتا ہے۔ اعزہ واقرباء اس کے سائے تک سے بدکنے لگتے ہیں۔"

دوپہر کا کھانا، جو دال چاول اور چپاتیوں پر مشتمل تھا۔ جو ڈاکٹر جیلانی کا شاگرد خاص اپنے گھر سے لے کر آیا تھا۔ اس نے بتایا کہ سیمنٹ فیکٹری میں کسی مزدور کو سانپ نے ڈس لیا ہے اور ڈاکٹر جیلانی زہر اُتارنے کے لیے فوری طور پر سیمنٹ فیکٹری روانہ ہو گئے ہیں۔

"ڈاکٹر صاحب زہر بھی اُتار لیتے ہیں؟" فضیلہ نے پوچھا۔ "میں نے تو سنا ہے کہ یہ کام صرف سپیرے ہی کر سکتے ہیں۔"

"ایسے سپیرے تو اب صرف دو چار ہی ہوں گے۔" شاگرد نے کہا۔ پھر بتایا۔ "ڈاکٹر صاحب مریض کے جسم پر کچھ پڑھ کر پھونکتے ہیں، پھر زخم سے منہ لگا کر زہر چوستے ہیں اور پھر تھوک دیتے ہیں۔ ایسا وہ تین بار کرتے ہیں۔ تیسری بار میں مریض بھلا چنگا ہو جاتا ہے۔"

"اگر میں سیکھنا چاہوں تو یہ عمل مجھے سکھا دیں گے؟" فضیلہ نے پوچھا۔

"کیوں نہیں۔ ڈاکٹر صاحب تو خود یہ چاہتے ہیں کہ ایسے لوگ سامنے آئیں۔ بس عمل کرنے والوں کو ایک عہد کرنا ہوتا ہے کہ چالیس میل کے اندر اندر سے اگر کہیں سے سانپ کے کاٹنے کی اطلاع آئے تو فوراً وہاں پہنچنے کی کوشش کرے گا اور جب تک زہر نہیں نکال دے گا، اس وقت تک نہ کچھ کھائے گا، نہ پیئے گا۔"

فضیلہ نے کہا۔ "میں یہ عہد کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

"پھر تو ڈاکٹر صاحب آپ کو زہر اُتارنے کا یہ عمل ضرور بتائیں گے۔"

ڈاکٹر تین بجے کے لگ بھگ واپس آ گیا۔ بہت زیادہ تھکا ہوا تھا۔ سب سے پہلے اس نے وعدہ خلافی کی معافی مانگی، پھر بولا۔

"تم دونوں کی طرف دیکھتا ہوں تو ایک عجیب سی مسرت کا احساس ہوتا ہے۔ پھر یہ خیال آتا ہے کہ تمہارے اوپر مصائب و آلام کے پہاڑ ٹوٹنے والے ہیں تو دل خون ہونے لگتا ہے۔"

"کیا فرما رہے ہیں، ڈاکٹر صاحب؟" میں نے پوچھا۔ فضیلہ بھی بھری بھری آنکھوں سے ڈاکٹر کا چہرہ تکنے لگی۔

"تم دونوں صرف میرا شکریہ ادا کرنے نہیں آئے ہو۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "نہ تمہیں فریحہ کے علاج سے کوئی دلچسپی تھی۔ بلکہ یہ دریافت کرنا مقصود تھا کہ آئندہ ترشولی اور اس کے بھائی بندوں سے بچنے کی کیا سبیل ہو سکتی ہے۔"

"جی ہاں...... یہاں آنے کا اصل مقصد یہی تھا۔"

"مجھے افسوس ہے، سکندر! کہ تم خود کو اور اپنی بیوی کو اس بدذات سے زیادہ عرصے تک محفوظ نہیں رکھ سکو گے۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ......" ڈاکٹر جیلانی کو اچانک غصہ آ گیا۔ "کیونکہ وہ تمہیں خرید چکی ہے۔ اس نے تمہاری قیمت ادا کی ہے۔ تم اس کے غلام بن چکے ہوں۔ مجھے یا کسی کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ اس کی خریدی ہوئی چیز کو واپس لے۔" اُس کا لہجہ ایک بار پھر نرم پڑ گیا۔ "تم دونوں مجھے معاف کر دینا۔ جو بات مجھے ابھی تھوڑی دیر پہلے معلوم ہوئی ہے، اگر چند روز پہلے معلوم ہو جاتی تو میں تمہاری مدد کرنے راج کنڈل بھی نہیں پہنچتا۔ تمہاری قسمت اچھی تھی کہ حقیقت معلوم نہ ہونے کے باعث میں نے تمہیں اس کے چنگل سے آزاد کرا لیا۔ اب وہ دوبارہ جال بچھائے گی اور تم دوبارہ اس کے جال میں پھنسو گے اور میں تمہاری مدد نہیں کر سکوں گا۔"

ڈاکٹر جیلانی نہ جانے کیا کیا کہتا رہا۔ میری نظروں میں ساری دنیا تاریک ہو چکی تھی۔ جن پہ تکیہ تھا، وہی پتے ہوا دینے لگے...... میرا چکراتا ہوا سر فضیلہ کے کندھے سے جا لگا تھا، جس کا بازو کٹا ہوا تھا۔ فضیلہ اپنے واحد ہاتھ سے میرے سر میں اُنگلیاں پھیر رہی تھی۔ اور میں لامتناہی اندھیروں میں، جہاں ترشول نسی کے انداز میں منہ پھاڑے میری منتظر تھی، ڈوبتا چلا جا رہا تھا۔

⊛

میرے پاس وہ الفاظ نہیں ہیں، جن کے ذریعے اپنی ہیجانی کیفیت کا صحیح طور پر اظہار کر سکوں۔ ایک ایسے شخص کو، جسے گرداب اور بھنور سے نکالا جا چکا تھا۔ بچانے والے نے اس وقت، جب ٹھیک کنارہ نظر آ رہا تھا، زندگی کی آس ہو گئی تھی۔ مسرتیں اور شادمانیاں خیر مقدم کے لیے دامن پھیلائے کھڑی تھیں۔ اچانک چھوڑ کر دوبارہ بلا خیز لہروں سے تھپیڑوں کے حوالے کر دیا تھا۔ میں بہت پہلے راج کنڈل پہنچتے ہی ہمت ہار کر مغلوب ہو چکا تھا۔ اتنی طاقت اور سکت نہ پہلے بھی تھی اور نہ اب تھی کہ اس ظالم اور پُراسرار ہستی کا مقابلہ کرتا، جسے ہنستے ہوؤں کو رُلانا ہی آتا تھا۔ جب کبھی بھی میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی تھی، اس نے انتہائی بے دردی سے چیل کی طرح جھپٹا مار کر اسے چھین لیا تھا۔ نا اُمیدیوں کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں کہیں دُور روشنی کی ہلکی سی کرن نظر آتی تھی تو دوسرے ہی لمحے یلغار کر کے اس کو ہڑپ کر لیا جاتا تھا۔ کون کہہ سکتا تھا کہ ڈاکٹر جیلانی جیسا جواں حوصلہ اور مجاہد و غازی، جس نے مجھے اور فضیلہ کو بچانے کے لیے جان کی بازی لگا دی تھی۔ ایکا ایکی برگشتہ ہو کر مجھ بے قصور اور بے گناہ کو قصوروار اور گناہ گار گرداننے لگے گا۔ مسیحا مسیحائی سے انکاری ہو گیا تھا۔ مریض کی موت یقینی تھی۔ دعا اور دوا دونوں ہی بے فائدہ تھے۔

میں سوچ نہیں رہا تھا۔ بلکہ کھلی آنکھوں سے اپنی تباہی و بربادی کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ تقدیر شاید اسی لیے تنکے چنوائے تھے کہ آشیاں تیار ہوتے ہی نذرِ آتش کر دیا جائے۔ مجھے ترشو خوشیاں مناتی، بغلیں بجاتی محسوس ہو رہی تھی، جو ہارتے ہارتے معاً جیت گئی ہو۔ اس کے پا ترپ کا پتہ موجود تھا۔

حالت فضیلہ کی بھی اچھی نہیں تھی۔ ڈاکٹر کے بدلے ہوئے لہجے اور تیور کو دیکھ کر وہ بھی بھونچکا سی ہو گئی تھی۔ لیکن خان زادی تھی، رگوں میں پٹھان باپ کا خون گردش کر رہا تھا۔ میری طرح وہ آسانی سے شکست تسلیم کرنے والی نہیں تھی۔ چند ہی لمحوں میں اس نے اپنے غم اور غصے پر قابو پا لیا اور مجھے اپنی تمام تر توجہات کا مرکز بنا کر اپنے واحد ہاتھ سے آہستہ آہستہ میری گردن کو سہلانے لگی۔

"ڈاکٹر صاحب!" اس نے طیش میں آئے بغیر انتہائی نرم لہجے میں، ٹھہر ٹھہر کر کہا۔ "ہم فریحہ اور اس کے ڈیڈی کے ساتھ واپس جا رہے تھے، مگر آپ نے روک لیا۔ آپ کے لہجے میں محبت آمیز خلوص تھا۔ آپ ہمارے نجات دہندہ تھے، آپ نے ہمیں زندگی دی تھی۔ ہم نے سوچا، انکار کیا تو آپ کے خلوص و محبت کی ناقدری ہو گی۔ آپ کے احسانات کے بدلے میں اگر ہم دونوں آپ کے ہاتھ پاؤں دھو کر پیتے، وہ بھی کم تھا۔ پس ہم نے آپ کی بات مان لی۔ ہم لوگ رُک گئے۔ کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ کیا آپ نے ہمیں اس لیے روکا تھا؟...... خونخوار بلا کے شکنجے سے اسی لیے آزاد کرایا تھا کہ ایک بار پھر اس کے حوالے کر دیں؟ آپ ڈاکٹر ہیں۔ اور ڈاکٹر کی تعریف میں نے یہ سنی ہے کہ وہ مریض کی آخری سانس تک نہ خود نا اُمید ہوتا ہے اور نہ مریض کو ہونے دیتا ہے......"

ڈاکٹر نے فضیلہ کے جملے کو منقطع کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے سبق پڑھانے اور نصیحت کرنے کی کوشش نہ کرو، بیٹی! میں اپنے فرائض سے اچھی طرح واقف ہوں۔ مجھے قبل ازیں اگر اس سودے بازی کا علم ہوتا، جو تمہارے شوہر اور اس آتشی مخلوق کے درمیان ہو چکی ہے تو میں راج کنڈل ہرگز نہ جاتا اور اسے اس کی سزا بھگتنے دیتا۔"

"میں نہیں جانتی کہ سودا کب ہوا، کہاں ہوا، کیوں ہوا؟ لیکن اتنی بات یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ کوئی سودے بازی ہوئی ہے تو چھل کپٹ کے ساتھ کی گئی ہے۔ اس میں اس کی مرضی شامل نہیں ہے۔"

"نئی نئی دُلہنوں کو شوہر کی برائیاں بھی اچھائیاں نظر آتی ہیں۔ پسینہ گلاب معلوم ہونے لگتا ہے۔ تمہیں یہی کہنا اور سمجھنا چاہیے۔"

"ہم ایک دوسرے کے لیے نئے نہیں ہیں۔" فضیلہ نے جواب دیا۔ "میں نے انہیں جیومیٹری کی طرح پڑھا ہے۔ ان کا کوئی رخ، کوئی زاویہ مجھ سے مخفی نہیں ہے۔ یہ درست ہے کہ میں آپ کی طرح پڑھی لکھی نہیں ہوں۔ حقیقت کیا ہے اور کیا نہیں ہے، میں آپ سے زیادہ نہیں جان سکتی۔ پھر بھی اپنے مطالعے اور مشاہدے کی روشنی میں اپنی دینیات کی مس کا یہ مقولہ ضرور دہراؤں گی۔ جب تک فریقین راضی نہ ہوں، سودا نہیں ہو سکتا۔ یہ بھی یاد رکھیے کہ مس قرآن اور

حدیث کے حوالے سے بات کرتی تھیں۔

"آخر تم کہنا کیا چاہتی ہو؟"

"صرف یہ بتانا چاہتی ہوں کہ اگر میں آپ کی مرضی کے بغیر آپ کی کوئی چیز اُٹھا لوں اور اپنے طور پر اس کی قیمت بھی ادا کر دوں، تب بھی، جب تک آپ کی ہاں شامل نہ ہو، ایسے یک طرفہ سودے کا کوئی اعتبار نہیں۔"

ڈاکٹر نے فضیلہ کی طرف اس طرح دیکھا، جیسے اسے فضیلہ کے جواب پر حیرت ہوئی ہو۔ پھر زیرِ لب مسکرایا۔

"نا انصافی ہوگی اگر میں اس ٹیچر کی تعریف نہ کروں، جو بچوں، بچیوں کو نصابی باتوں کے علاوہ دین کی اچھی اچھی باتیں بھی بتایا کرتی ہیں، جو روزمرہ کی زندگی میں کام آتی ہیں۔ ٹھیک ہے، میری مرضی کے بغیر تم میری کسی چیز پر قبضہ کر لو اور اپنی دانست میں اس کی پوری پوری قیمت بھی دے دو، لیکن جب تک میں راضی نہ ہو جاؤں، ایسا سودا اور ایسی بیع فاسد ہے۔"

میں سنبھل کر بیٹھ گیا اور پُر اُمید نظروں سے ڈاکٹر کے چہرے کو تکنے لگا۔ فضیلہ واقعی بڑی دور کی کوڑی لے کر آئی تھی۔

"لیکن بیٹی!" ڈاکٹر کہہ رہا تھا۔ "میں زبان سے کتنا ہی کیوں نہ راضی ہوں، پر تم نے میری چیز کی جو قیمت ادا کر دی ہے، اسے اُٹھا کر جیب میں رکھ لوں تو بیع از خود درست ہو جاتی ہے اور سمجھ لیا جاتا ہے کہ بالآخر میں نے تمہاری ادا کی ہوئی قیمت کو قبول کر لیا ہے۔ شاید تمہاری ٹیچر نے تمہیں یہ نہیں سمجھایا۔"

فضیلہ کا منہ لٹک گیا۔ چھوٹی سی بچی کی طرح نیچے کے ہونٹوں کو دانتوں میں دبا کر بولی۔

"نہیں۔"

میں نے بے اختیار فضیلہ کے گداز کندھے پر ہاتھ رکھا اور اسے دبانے لگا۔

ہماری دینیات کی مس بلاشبہ ایک جنتی عورت تھیں۔ لیکن وہ طلباء اور طالبات بھی کچھ کم قابلِ تعریف نہیں تھے جو غور سے ان کی باتیں سنا کرتے تھے اور زندگی میں ان پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ فضیلہ نے بیع اور شرع کے گمبھیر مسئلے کو چھیڑ کر مجھے ایک نئی جیت دکھلائی تھی۔ مرنے والا، موت کا پیغام سنتے سنتے اچانک جی اُٹھا تھا۔

"جیلانی صاحب!" میں نے عزم و جذبے کے ساتھ کہا۔ "تم بھی سنو، فضیلہ! بات بہت دنوں کی ہے۔ ترشولی نے میری قیمت پچیس لاکھ روپے لگائی تھی۔ مجھے یا گھر کے کسی فرد کو کوئی علم نہیں تھا کہ کمرے میں فرش کھودنے سے جو رقم حاصل ہوئی، وہ میری قیمت تھی۔"

"قیمت ادا کر دی گئی، کھلے دل سے قبول کر لی گئی۔ اس کے بعد یہ کہنا کہ ہمیں خرید و فروخت کا بالکل علم نہیں تھا، بالکل باطل ہے۔" ڈاکٹر بولا۔ "ترشولی نے یقیناً دھوکا دیا ہو گا کہ وہ اپنی فطرت سے مجبور ہے۔ مگر جب تم نے رقم حاصل کر لی اور اسے اپنے استعمال میں لے آئے تو یہ کہنا کہ سب کچھ تمہاری منشا اور مرضی کے خلاف ہوا ہے، بالکل باطل ہے۔ دین اور دنیا دونوں کے قوانین کے تحت متذکرہ حقائق کی روشنی میں یہی سمجھا جائے گا کہ جو سودا ہوا، اس میں تمہاری مرضی شامل تھی۔"

"میری مرضی کا اس لئے سوال پیدا نہیں ہوتا کہ جس وقت خرید و فروخت کا ڈرامہ رچایا گیا، اس وقت میری عمر چودہ پندرہ سال تھی۔ گویا قانون کے لحاظ سے میں نابالغ تھا۔ نابالغ کو بیع اور شرا کی اجازت نہیں ہوتی۔ وہ جو کچھ بیچے یا خریدے، اسے فاسد کہا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ محتاط لوگ بچوں سے خرید و فروخت کا کوئی کام نہیں کرتے۔"

ڈاکٹر کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ لیکن اگلے ہی لمحے ساری چمک معدوم ہو گئی۔

"تمہارے والد۔" اُس نے کہا۔ "وہ تمہارے سرپرست ہیں۔ انھیں تمہاری طرف سے خرید و فروخت کا مکمل اختیار ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ ساری رقم انھوں نے ہتھیا لی۔"

"آپ کو غلط بتایا گیا ہے۔" میں نے ڈاکٹر کا جملہ کاٹتے ہوئے جواب دیا۔ "میں ہمیشہ اس پر خلق کیا کرتا تھا کہ ابا جی کی بلاوجہ کی ایمانداری کے باعث ہم لوگ اتنی بڑی رقم سے محروم رہ گئے، جس کے صرف خواب ہی دیکھے جا سکتے ہیں۔ مگر آج معلوم ہوا کہ ایمانداری ایک ایسی صفت ہے، جس کو اپنانے والا کبھی نامراد نہیں رہتا۔ بظاہر وہ بہت کچھ گنوا بیٹھتا ہے، جبکہ درحقیقت سب کچھ پا لیتا ہے۔ بتانے والے نے آپ کو یہ تو بتا دیا کہ انہوں نے میری حیثیت سے زیادہ قیمت ادا کر دی تھی، لیکن یہ نہیں بتایا کہ ابا جی نے اس رقم کو لینے سے صاف انکار کر دیا اور جب رقم کا کوئی دعویدار نہیں ملا تو سارے نوٹوں کو نذرِ آتش کر ڈالا۔ کیونکہ ابا جی کے نزدیک یا تو چوری کے تھے یا جعلی تھے۔ اور یک طرفہ کیے جانے والے سودے سے لاعلم تھے۔"

میں سمجھ رہا تھا کہ میرے انکشاف پر ڈاکٹر کی آنکھوں میں دوبارہ چمک آ جائے گی۔ اس کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ جائے گی۔ لیکن ہوا بالکل برعکس....... اس نے دائیں ہاتھ کا گھونسہ بنا کر بائیں ہاتھ پر مارا۔ آنکھیں شعلے برسانے لگیں۔ بھیڑیے جیسی غراہٹ کی آوازیں نکالتا ہوا کھڑا ہو گیا۔

"سکندر!" اس نے کہا۔ "میں تمہاری بیوی کو تھوڑی دیر کے لیے معمول بنا رہا ہوں۔"

"کیا بنا رہے ہو؟"

وہ انتہائی طیش اور عجلت میں تھا۔ یا تو اُس نے میرا جملہ نہیں سنا یا اس کا جواب دینا مناسب نہیں سمجھا۔ اور زیرِ لب جلدی جلدی کچھ پڑھنے لگا۔ فضیلہ بھی تعجب سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

اچانک فضیلہ کے منہ سے گھٹی گھٹی سی چیخ نکلی۔ اس کے ساتھ ہی وہ کئی انچ اوپر اُچھلی اور تڑپ کر فرش پر اس طرح گری کہ وہ موڑھا، جس پر وہ بیٹھی تھی، اس کے جسم پر جا گرا۔ میں نے دوڑ کر موڑھا ہٹایا۔

ڈاکٹر نے ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنی طرف کھینچ لیا۔

"درمیان سے ہٹ جاؤ۔ ضروری باتیں کرنے دو۔"

"کیا ہو گیا ہے فضیلہ کو؟" میں پریشان ہوتے ہوئے بولا۔ "اس کی حالت کے ذمے دار آپ ہیں۔ آپ نے ایسا کیوں کیا؟...... بتایئے، اس معصوم نے آپ کا کیا بگاڑا تھا؟"

"خاموش ہو کر ایک طرف ہٹ جاؤ اور تماشہ دیکھو۔"

"دوستی کے پردے میں ہم سے دشمنی کیوں کر رہے ہیں؟" میں نے کہا۔ "خدانخواستہ فضیلہ کو کچھ ہو گیا تو میں آپ کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ چاہے بعد میں مجھے پھانسی کیوں نہ ہو جائے۔"

"کسی کو کچھ نہیں ہو گا۔" اس نے جواب دیا۔ "مجھے غلط مت سمجھو۔ میں تمہیں ہمیشہ کے لیے اس بلا سے چھٹکارا دلانا چاہتا ہوں، جس نے تمہاری زندگی اجیرن کر رکھی ہے۔ بیٹھ جاؤ۔"

"میں...... میں نہیں بیٹھ سکتا۔"

فضیلہ نے جھرجھری لی اور اپنے واحد ہاتھ کا سہارا لے کر اٹھ بیٹھی، پھر چہرہ گھما کر اس نے اطراف کا اس طرح جائزہ لیا، جیسے پہلی بار اس کمرے کو دیکھ رہی ہو۔

"نام بتاؤ؟" جیلانی نے کرجدار آواز میں کہا۔

فضیلہ نے عجیب سے انداز میں جیلانی کی طرف دیکھا۔ "اتنے معصوم تو نہیں ملا جی! کہ میرا نام ہی بھول جاؤ۔"

"نام بتاؤ؟"

"میں وہی فضیلہ ہوں، جسے راج کنڈل میں دیکھتے ہی تم دل دے بیٹھے تھے۔" فضیلہ نے کہا۔ پھر مجھ سے مخاطب ہوئی۔ "آپ کیسے شوہر ہیں؟ آپ کی نظروں کے سامنے ایک بوالہوس ملا آپ کی بیوی کے ساتھ شرمناک سلوک......"

جیلانی نے کچھ اور پڑھ کر پھونکا، فضیلہ درد سے دوہری ہو گئی۔ جملہ مکمل ہونے کے بجائے منہ سے گھٹی گھٹی چیخ نکلی۔

"نام بتاؤ۔ ورنہ ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا۔"

"اس جادوگر کی باتوں میں نہ آیئے۔" فضیلہ نے روتے ہوئے کہا۔ "یہ میرے جسم پر جادوئی کوڑے رسید کر رہا ہے، تاکہ میں اس کی بات مان لوں اور گناہ پر راضی ہو جاؤں اور آپ سے بے وفائی کا ارتکاب کر بیٹھوں۔"

"بے حیا...... بدمعاش......" جیلانی نے دانت پیس کر فضیلہ پر کچھ دم کیا۔ وہ فرش پر اس طرح تڑپنے لگی جیسے اسے دہکتے ہوئے انگاروں پر ڈال دیا گیا ہو۔

میرے لیے یہ منظر ناقابل برداشت تھا۔ جو شخص فضیلہ کے جسم پر کانٹا چبھتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا تھا، وہ فضیلہ کو تڑپتے کس طرح دیکھ سکتا تھا۔ میں نے لپک کر ڈاکٹر کو دبوچ لیا۔

"بہت ہو چکا، جیلانی صاحب! اس سے پہلے کہ میں آپ کی شان میں گستاخی کروں، اپنی زبان کو لگام دیجیے۔ گالیاں بکنے، پھونک کرنے سے باز آ جایئے۔"

"میں تمہارا دشمن نہیں ہوں۔" اس نے میری گرفت سے نکلنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"دوست بھی نہیں ہو۔" میں نے گرفت مزید سخت کر دی اور "آپ" سے "تم" پر اتر آیا۔

"اگر اب تم نے فضیلہ کو ذرہ برابر بھی گزند پہنچایا تو میں تمہارا ٹینٹوا دبا دوں گا۔"

"شاباش!" فضیلہ نے کہا۔ "دبا دو ٹینٹوا اس حرام زادے کا۔" اور جملہ مکمل کر کے بے تحاشا گالیاں بکنے لگی۔

میری گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ اس وجہ سے نہیں کہ ڈاکٹر نے اپنے عمل سے مجھے بے بس کر دیا تھا۔ وجہ کچھ اور تھی۔ جس منہ سے پھول جھڑا کرتے تھے، اسی سے فضیلہ ایسی گندی اور فحش گالیاں بک رہی تھی، جنہیں بازاری لوگ سنتے تو وہ بھی دانتوں میں انگلیاں دبا لیتے۔ جونہی میری گرفت ڈھیلی ہوئی، ڈاکٹر غوطہ کھا کر فضیلہ کے پاس پہنچ گیا۔ اگلے ہی لمحے اس کے سنہری بال ڈاکٹر کے ہاتھوں میں تھے۔

"بتاؤ۔" ڈاکٹر سر کو جھٹکا دیتے ہوئے چنگھاڑا تھا۔ "کون ہو تم؟"

میں نے اطراف میں نظریں دوڑائیں۔ کمرے کے گوشے میں چھوٹی سی کلہاڑی لٹک رہی تھی۔

"تمہاری موت تمہارے سر پر منڈلا رہی ہے، ڈاکٹر!"

ڈاکٹر نے فرش پر پوری قوت سے فضیلہ کو مارتے ہوئے کہا۔ "نام بتاؤ...... نام بتاؤ......"

میں نے کلہاڑی اُتار لی تھی اور ڈاکٹر کا سر تن سے جدا کر دینے کے ارادے سے نپے تلے قدم اٹھاتا ہوا اس کی طرف بڑھ رہا تھا کہ فضیلہ کی گھٹی گھٹی سی آواز آئی۔

"میں...... دیودھری......"

میرے قدم جہاں تھے، وہاں رک گئے۔

ڈاکٹر نے کہا۔ "میں نے ترشولی کو بلایا تھا۔ وہ کیوں نہیں آئی؟"

فضیلہ نے بڑی حقارت سے فرش پر تھوک دیا۔

"تم جیسی چھوٹی حیثیت والے حرام زادوں کے پاس آنا اُس کی توہین ہے۔ مجھے بتاؤ، اس

سے کیا کہنا چاہتے ہو؟ میں تمہارا پیغام اس تک پہنچا دوں گی۔"

ڈاکٹر نے فضیلہ کے بال چھوڑ دیئے اور ایک طرف ہٹ کر بولا۔ "سیدھی انگلیوں سے گھی نہ نکلے تو مجبوراً انگلیاں ٹیڑھی کرنا پڑتی ہیں۔" پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ "کلہاڑی پھینک دو، سکندر! ورنہ تم ہمیشہ کے لیے اپنی بیوی سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔"

میں نے پہلے ہی دیودھری کا نام سن کر ڈاکٹر پر حملہ کرنے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ ایک بار پھر وہی دیودھری فضیلہ کے سر پر سوار ہو گئی تھی، جو ایک عرصہ دراز تک اُس کے جسم پر قابض رہ کر مجھے اُس کی محبت سے محروم کیے رہی تھی۔ میں نے خاموشی سے کلہاڑی ایک طرف پھینک دی اور موڑھے پر بیٹھ کر فضیلہ کی طرف دیکھنے لگا، جس کی حالت جال میں پھنسی ہوئی ایک وحشی ہرنی جیسی تھی۔

ڈاکٹر سکون سے دوسرے موڑھے کی طرف بڑھا اور بیٹھ کر مراقبے کے انداز میں اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ میں نے دوبارہ ڈاکٹر کی جانب سے نظریں ہٹا کر فضیلہ کی طرف دیکھا۔ اُس کے منہ سے ہلکی سی سسکیاں نکل رہی تھیں، جسم اکڑ رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اُس کے دونوں ہاتھ پاؤں مڑ گئے۔ واحد ہاتھ دونوں ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ فضیلہ، فضیلہ نہیں رہی، گٹھڑی بن گئی۔

"ملا جی!" ٹانگوں کے درمیان سے فضیلہ کی کراہتی ہوئی آواز آئی۔ اُس کی ناک اور آنکھیں چمک رہی تھیں۔ باقی چہرہ ٹانگوں میں دبا ہوا تھا۔ "مجھے کس بات کی سزا دے رہے ہو؟ میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟ "تم نے بلایا تو میں کچے دھاگے سے بندھی چلی آئی۔"

جیلانی نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ بڑے ظالمانہ انداز میں مسکرایا۔ "اپنا نام بتاؤ۔"

"کتنی بار بتاؤں، میں دیودھری ہوں۔" فضیلہ نے بمشکل ٹوٹی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ درد کے باعث اُس کی حالت غیر ہو رہی تھی۔

"میں نے دیودھری کو نہیں، ترشولی کو بلایا تھا۔"

"تو مجھے کیوں گرفتار کر رکھا ہے؟ مجھے کس جرم کی سزا دے رہے ہو؟"

"نام بتاؤ۔" جیلانی نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگا لی۔

فضیلہ کی ہڈیاں چٹخنے لگیں۔ آنکھیں باہر نکل پڑیں۔ میرے لیے اس کی طرف دیکھنا مشکل ہو گیا۔ دل چاہا کہ مسکراتے ہوئے جیلانی کے سارے دانت باہر نکال دوں، مگر مجبور تھا۔ فضیلہ کو اس کے اصل روپ میں حاصل کرنے کے لیے ضروری تھا کہ خاموش اور بے حس و حرکت بیٹھا رہوں۔

"میں......دیو......"

"نہیں......تم ترشولی ہو۔"

مجھے ایسا معلوم ہوا، گویا فضیلہ کی ساری ہڈیاں ٹوٹ جائیں گی۔

"ہاں......" فضیلہ نے کہا۔ "میں ترشولی ہوں۔"

اگلے ہی لمحے یوں لگا، جیسے یکے بعد دیگرے نظر نہ آنے والی وہ زنجیریں ٹوٹ گئی ہوں جنہوں نے فضیلہ کے ہاتھ پیروں کو جکڑ رکھا تھا۔ گٹھڑی کھلتی چلی گئی۔ ایک منٹ بعد فضیلہ فرش پر لمبی لمبی پڑی گہری گہری سانسیں لے رہی تھی۔

"تم یقیناً یہ جاننے کے لیے بے چین ہو گی کہ میں نے تمہیں کیوں بلایا ہے۔" جیلانی نے موڑھے سے اُٹھے بغیر کہا۔ "لیکن اس سے پہلے میں یہ جاننا پسند کروں گا کہ تم نے خود کو کیوں چھپایا تھا؟"

فضیلہ نے کروٹ بدل کر اپنا چہرہ جیلانی کی طرف کر لیا۔ "میرا خیال تھا کہ دیودھری کا نام سن کر تم مجھے چھوڑ دو گے اور آزاد ہوتے ہی میں اپنے گرد ایسا حصار کھینچ لوں گی کہ مجھے وہاں سے نکالنا تمہارے لئے ناممکن ہو جائے گا۔"

"آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا کہ میں نے بلایا کسی کو ہو اور میرے مؤکل کسی اور کو پکڑ لائے ہوں۔" جیلانی نے کہا۔ "اب یہ بھی بتا دو کہ جب میں سانپ کے کاٹے ہوئے شخص کا زہر اُتار کر آ رہا تھا تو وہ بڑھیا کون تھی، جس نے راستہ روک کر مجھ سے کہا تھا کہ سکندر پچیس لاکھ روپے میں خریدا جا چکا ہے۔ اور اس کے ابا ان روپوں کو اپنے کاروبار میں لگا چکے ہیں؟"

"وہ دیودھری تھی اور میرے کہنے پر اس نے تمہیں سکندر سے دُور رہنے کا مشورہ دیا تھا۔"

"کیا تمہیں اس بات کا علم نہیں تھا کہ تمہارے دیئے ہوئے روپوں کو ذاتی استعمال میں نہیں لایا گیا، بلکہ انہیں جلا کر راکھ کر دیا گیا ہے؟"

"میں پہلی بار تم سے یہ انوکھی بات سن رہی ہوں۔" فضیلہ نے کہا۔ "لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ روپوں کو کاروبار میں لگایا گیا ہو یا جلا کر ضائع کیا گیا ہو، دونوں صورتوں میں سکندر میرا ہے۔ کیونکہ میری رقم مجھے واپس نہیں دی گئی۔"

"تم نے پچیس لاکھ روپے کسے دیئے تھے؟"

"سکندر کو۔"

"سکندر نابالغ تھا۔ اسے کچھ خریدنے یا بیچنے کا ادھیکار نہیں تھا۔ تم نے اسے جو رقم دی، گویا کنوئیں میں پھینک دی۔ اس نے رقم کو ضائع کیا یا کسی کو دے دی، اس کی ذمہ داری اس پر عائد نہیں ہوتی۔ اور اگر تم یہ کہو کہ رقم اس نے نہیں، اس کے والد نے ضائع کی ہے تو انہیں اس کا حق پہنچتا تھا۔ کیونکہ ان کے نزدیک رقم مشتبہ تھی اور مشتبہ رقم کو سینت کر رکھنے کے بجائے ضائع کر دینا ہی مناسب سمجھا جاتا ہے۔ ان حقائق کی روشنی میں سکندر پر تمہارا یہ دعویٰ باطل ہے۔"

فضیلہ اُٹھ کر بیٹھ گئی اور دانت نکال کر بولی۔ "میں یقیناً تمہاری بات مان لیتی، مگر افسوس کے

ساتھ کہتی ہوں کہ تمہیں حقائق کا علم نہیں ہے۔ میری دی ہوئی ساری رقم ضائع نہیں کی گئی، بلکہ اس کا ایک حصہ بچالیا گیا ہے۔ اور اس بچے ہوئے حصے کو سکندر اس وقت اپنے استعمال میں لایا، جس اس پر نماز فرض ہوئی۔ اور ملا جی! تمہیں تو یہ معلوم ہی ہوگا کہ نماز بلوغت میں ہی فرض ہوتی ہے۔ گویا جس وقت سکندر نے میری دی ہوئی رقم کو استعمال کیا، وہ عاقل و بالغ تھا اور تمہارے قانون کی زبان میں اس نے وہ کام باہوش وحواسِ خمسہ انجام دیا تھا۔

جیلانی نے پلٹ کر میرے چہرے پر سوالیہ نظریں ڈالیں۔ "یہ مکار درست کہہ رہی ہے؟"

میں نے ندامت سے سر جھکالیا۔ اتنی جرأت نہیں ہوئی کہ ڈاکٹر سے آنکھیں چار کرتا۔ "مجھے کچھ کتابیں مدرسے سے لے جانا تھیں۔ کتابیں کافی وزنی تھیں اور ان کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ بس کے ذریعے انہیں لے جانا ممکن نہیں تھا۔ ابا جی نے رکشہ کا کرایہ دینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ دو دو، تین تین کتابیں مختلف پھیروں میں لے جاؤ۔ خان صاحب نے میری پریشانی کا احساس کر کے سو سو کے نوٹوں کی ایک گڈی سے ایک نوٹ نکال کر دیا۔ پچیس لاکھ کے سامنے اس کی حیثیت سمندر سے نکالے گئے ایک قطرے سے زیادہ نہیں تھی۔"

"تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ صرف اتنا بتاؤ کہ اس نے جو کچھ کہا ہے، وہ درست ہے یا نہیں؟"

"جی ہاں......اس حد تک درست ہے کہ میں صرف سو روپے اپنے استعمال میں لانے کا گناہگار ہوں۔"

"کاش......" جیلانی نے کہا اور جملہ مکمل کرتے کرتے رک گیا۔

میں نے کہا۔ "آپ نے کاش کہہ کر مجھے کشش و پنج میں مبتلا کر دیا ہے۔"

"اور تم نے۔" فضیلہ نے بھرپور قہقہہ لگایا۔ "اور تم نے حقیقت کا اعتراف کر کے ملا جی کی سٹی گم کر دی۔ کیوں ملا جی! کیا اب بھی مجھ ہی کو موردِ الزام ٹھہراؤ گے؟......کیا اب بھی کہو گے کہ سکندر پر میرا کوئی حق نہیں ہے؟......کم سے کم مجھے اتنا اختیار تو دو کہ میں اپنے سو روپے سوارت کرسکوں۔"

"سکندر کی بیوی کو ایک ہاتھ سے محروم کرنے اور سکندر کو اپنا غلام بنا کر رکھنے کے باوجود تمہارے سو روپے آج تک سوارت نہیں ہوئے؟"

میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر سو سو روپے کے کئی نوٹ نکال لیے۔

"خدارا، میرا اور میری بیوی کا پیچھا چھوڑ دو۔ میں ایک سو کے بدلے میں تمہیں کئی سو روپے دینے کے لیے تیار ہوں۔ بولو، کتنی رقم چاہیے؟"

فضیلہ دوبارہ ہنسنے لگی۔ "دیکھے اور ان دیکھے سودوں میں بہت بڑا فرق ہوتا ہے، بھولے

بادشاہ! ترازو کے ایک پلڑے میں میرے سو روپے رکھ دو اور دوسرے پلڑے میں سارے خزانے، پھر بھی میرا پلڑا بھاری رہے گا۔ کیوں ملا جی! کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟"

جیلانی نے بے چارگی سے میری طرف دیکھا۔

"تم ان باریکیوں سے واقف نہیں ہو، سکندر! ترشولی درست کہہ رہی ہے۔ دیکھے اور ان دیکھے سودوں میں بڑا فرق ہوتا ہے۔"

ڈاکٹر کا خیال تھا، اس نے جن باریکیوں کی طرف اشارہ کیا تھا، میں انہیں سمجھ سکتا تھا۔ مدرسے کی چند سالہ تعلیم نے مجھے بہت کچھ دیا تھا۔ صدر مدرس صاحب کا کوئی بھی درس نکتوں سے خالی نہیں ہوتا تھا۔ ایک بار دورانِ درس انہوں نے غیب کی وضاحت کرتے ہوئے بہت ہی عجیب تاریخی واقعہ سنایا تھا۔ وہ واقعہ گویا ترشولی کی بات کی تشریح تھی، جو انہوں نے بہت پہلے کر دی تھی۔

صدر مدرس صاحب نے واقعہ سناتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا۔

"ہارون رشید کے زمانے میں، بہلول دانا نام کے ایک مجذوب ہوا کرتے تھے۔ جو لوگ ان کے مرتبے سے واقف تھے، وہ انہیں دانا کہتے تھے۔ جو واقف نہیں تھے، وہ انہیں پاگل سمجھتے تھے۔ ان کی باتیں اتنی عجیب و غریب ہوتی تھیں کہ عام لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔ ایک بار کسی قافلے والوں نے آبادی کا پتہ پوچھا تو انہوں نے قبرستان کا پتہ بتا دیا کہ آباد تو درحقیقت قبرستان ہو رہا تھا۔ بستی میں جو شخص بھی تھا اور جو بچہ بھی پیدا ہو رہا تھا، وہ قبرستان ہی کو آباد کرنے والا تھا۔ ایک مرتبہ یہی بزرگ سڑک کے کنارے بیٹھے ہوئے مٹی کے گھروندے بنا رہے تھے۔ ہارون رشید کی ملکہ کی سواری ادھر سے گزری اس نے انہیں دیکھ کر پالکی رُکوائی، کنیزوں کے جلو میں ان کے پاس گئیں، سلام کیا اور پوچھا۔

"کیا بنا رہے ہو، بابا؟"

بہلول دانا نے کہا۔ "جنت کے محل بنا رہا ہوں۔ خریدو گی؟"

ملکہ زبیدہ نے قیمت پوچھی۔ انہوں نے کہا۔ "یہ محل دو ریال کا ہے، یہ تین ریال کا ہے، یہ پانچ ریال کا ہے۔"

ملکہ نے اس کنیز سے، جو مالی امور کی انجام دہی کرتی تھی کہا کہ تینوں محلوں کی قیمت ادا کر دو۔ پھر وہ سلام کر کے پالکی میں سوار ہو گئیں اور اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئیں۔ ملکہ زبیدہ کوئی معمولی ملکہ نہیں تھیں، بڑی اللہ والی تھیں۔ اُن کی بنوائی ہوئی میلوں طویل نہر زبیدہ آج بھی عرب کے ریگزار سیراب کر رہی ہے۔ لاکھوں بندگانِ خدا اس سے فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔ نہر بنوانے سے پہلے اس نے خواب دیکھا کہ وہ زمین پر پڑی ہے۔ جوق در جوق لوگ آ رہے ہیں اور اس سے

عشق کر رہے ہیں۔ بیدار ہو کر بہت پریشان ہوئی۔ لونڈی کو بلوایا اور خواب سنا کر ایک بزرگ کے پاس بھیجا، جنہیں خواب کی تعبیر بتانے میں ملکہ حاصل تھا۔ ملکہ کی ہدایت کے مطابق لونڈی نے خواب بزرگ کو یہ کہہ کر سنایا کہ یہ خواب اس نے دیکھا ہے۔

خواب سن کر بزرگ بہت ناراض ہوئے۔ کہنے لگے کہ جھوٹ بولتی ہے۔ ایسا خواب تو نہیں دیکھ سکتی۔ یہ خواب ملکہ یا کوئی شہزادی ہی دیکھ سکتی ہے۔ لونڈی نے تسلیم کیا کہ یہ خواب ملکہ زبیدہ نے دیکھا تھا۔ بزرگ نے فرمایا کہ جاؤ، اپنی ملکہ سے کہہ دو کہ وہ کوئی ایسا عالیشان کارنامہ انجام دے گی، جس سے رہتی دنیا تک لوگ فیض یاب ہوتے رہیں گے۔

اس کے بعد ملکہ نے عراق سے مکہ معظمہ تک نہر تعمیر کروائی۔ نیکی کا کوئی بھی کام کیوں نہ ہو، وہ اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی تھی۔ غرض بہلول دانا کو محلوں کی قیمت دس ریال ادا کر کے وہ چلی گئی۔ کچھ دیر بعد وزراء اور امراء کے جلو میں ہارون رشید اس مقام سے گزرا، جہاں بہلول دانا مٹی کے گھروندے بنا رہے تھے۔ مہاوت کو حکم دیا کہ ہاتھی روکو۔ پھر ہاتھی سے اُترا، بہلول دانا کو سلام کیا، پوچھا۔

"حضرت! کیا بنا رہے ہیں؟"

جواب ملا۔ "جنت کے محل تعمیر کر رہا ہوں۔ خریدو گے؟"

بادشاہ ہنسنے لگا، کہا۔ "قیمت تو بتایئے۔"

بہلول دانا نے کہا۔ "یہ محل دو ریال کا ہے، یہ تین ریال کا اور یہ پانچ ریال کا۔"

بادشاہ ہنستا ہوا کھڑا ہو گیا۔ مصاحبوں سے کہا۔ "بزرگوں کی باتیں بزرگ ہی جانیں۔"

پھر بہلول دانا سے درخواست کی کہ وہ سلطنت کے استحکام کی دعا کریں اور سلام کر کے محل روانہ ہو گیا۔

دوپہر کو جب قیلولے کے لیے لیٹا تو خواب میں سونے چاندی اور زر و جواہر سے بنے ہوئے تین ایسے عالیشان محل نظر آئے کہ نہ پہلے کبھی دیکھے تھے نہ کبھی ان کا تصور کیا تھا۔ پوچھا۔

"یہ کون سی جگہ ہے؟ اور یہ محلات کس کے ہیں؟"

بتایا گیا۔ "اس وقت آپ فردوسِ بریں میں ہیں اور یہ تینوں محل ملکہ زبیدہ کے ہیں، جو انہوں نے آج ہی بہلول دانا سے خریدے ہیں۔"

بادشاہ چیخ مار کر اُٹھ بیٹھا۔ ملکہ ایک بار پھر اس پر بازی لے گئی۔ اسی وقت گھوڑا تیار کروایا، بھاگم بھاگ بہلول دانا کی خدمت میں پہنچا۔ وہ اس روز بھی گھروندے بنا رہے تھے۔ بادشاہ کے سلام کا جواب دیتے ہوئے بولے۔

"کیوں آئے ہو؟"

بادشاہ نے کہا۔ "جنت کے محل خریدنے آیا ہوں۔"

بہلول دانا نے ان گھروندوں کی جو قیمت بتائی ان میں سب سے چھوٹے گھروندے کی قیمت اتنی تھی کہ ساری دنیا کی دولت دے دی جاتی، تب بھی کم پڑتی۔ بادشاہ نے کہا۔

"حضرت! سویرے تو آپ نے اس کی قیمت صرف دو ریال بتائی تھی۔"

بہلول دانا نے مسکرا کر جواب دیا۔ "وہ اَن دیکھے کی قیمت تھی اور یہ دیکھے کی قیمت ہے۔"

اس واقعہ کے ذریعے مدرس صاحب کو یہ بتانا مقصود تھا کہ دیکھے بغیر غیب کی باتوں کو تسلیم کرنے ہی کا نام اسلام ہے۔ دیکھ کر تو بڑے سے بڑا کافر بھی ایمان لے آئے گا۔ مگر اس وقت ہارون رشید کی طرح اس کے ہاتھ بھی کچھ نہیں آئے گا۔

ترشولی نے جس دیکھے اور ان دیکھے سودے والی بات کی تھی، اس میں بھی وہی امر پوشیدہ تھا۔ جب تک ہم نے اس کی ہلاکت خیزی نہیں دیکھی تھی اور پراسرار طاقت و قوت کا مشاہدہ نہیں کیا تھا، وہ سو روپے، جو میں نے اپنی ذات پر خرچ کیے تھے، واقعی سو روپے تھے۔ لیکن اب جیسا کہ ڈاکٹر جیلانی نے کہا تھا، فضیلہ کو ہاتھ سے محروم کرنے اور ایک مخصوص مدت تک مجھے اپنا بندہ بے دام بنا کر رکھنے کے باوجود سوارت نہیں ہوئے تھے۔ لہجے سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی تو سو روپوں میں سے اس نے پورا ایک روپیہ بھی وصول نہیں کیا تھا۔

"جیلانی صاحب!" ایک نیا خیال آتے ہی میں نے تقریباً چیخ کر کہا۔ "اس کی باتوں میں نہ آیئے۔ یہ سدا کی جھوٹی، فریبی اور دغا باز ہے۔ اس نے فضیلہ کو ہی نہیں، نہ جانے کتنے بے گناہ لوگوں کو ہاتھ سے محروم کیا ہے۔ مان لیا کہ فضیلہ میری تھی، اس کا بازو کاٹ کر مجھے سزا دی گئی ہے کہ میں نے اس کے دھوکے سے دیئے گئے سو روپوں سے کیوں اُٹھایا۔ لیکن ایک طویل فہرست ایسے لوگوں کی ہے، جنہوں نے اس سے کچھ حاصل نہیں کیا، پھر بھی اپنے ایک ہاتھ سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ دوسروں کو چھوڑو، میں پوچھتا ہوں کہ میری گڑیا، میری رخسانہ نے اس کا کیا بگاڑا تھا؟ اس وقت روپے لینا تو درکنار، مجھے یہ تک نہیں معلوم تھا کہ اس کا نام کیا ہے؟"

"سکندر!........ سکندر!" فضیلہ نے اپنا واحد کٹا ہوا ہاتھ اُٹھا کر کہا۔ "بدگمانی اچھی عادت نہیں ہے۔"

"گویا یہ کہنا چاہتی ہو کہ تم نے بلاوجہ میری بہن کی جان نہیں لی؟"

"بہت دنوں بعد تمہارے منہ سے عقل کی بات سنی ہے۔ ہاں، ترشولی کسی کو بلاجواز تنگ نہیں کرتی۔"

دل چاہا کہ آگے بڑھ کر اس کا منہ نوچ لوں، لیکن منہ فضیلہ کا تھا۔ ترشولی کو کوئی نقصان نہ پہنچتا، فضیلہ کا چہرہ بگڑ جاتا۔

”ترشولی!“ میں نے دانت پیس کر کہا۔ بے پناہ غصے کے باعث سمجھ میں نہیں آیا کہ آگے کیا کہوں۔ وہ میری بہن کو موردِ الزام ٹھہرا رہی تھی۔ کہہ رہی تھی کہ اس نے رخسانہ کو بلاوجہ اور بلاجواز قتل نہیں کیا۔ یہ بہتان طرازی نہیں تو اور کیا تھا۔

”ترشولی میری مہمان ہے، سکندر!“ جیلانی نے کہا۔ ”میرے بلانے پر آئی ہے۔ تمہیں اس سے اُلجھنے کی ضرورت نہیں۔ مجھے بات کرنے دو۔“

پھر اس نے فضیلہ کی طرف اپنا چہرہ گھمایا۔ ”سکندر سے کس بات کا انتقام لے رہی ہو؟“

”اس کا جواب انتقام لینے کے بعد ہی دیا جا سکتا ہے۔“

”میری قید میں ہونے کے باوجود تمہیں اُمید ہے کہ انتقام لینے میں کامیاب ہو جاؤ گی؟“

”تمہیں امید ہے کہ مستعار لیے ہوئے اس جسم میں مجھے ہمیشہ محبوس رکھ سکو گے؟ کیا سکندر اس سے دستبردار ہونے پر راضی ہو جائے گا؟“

”مجھے غصہ مت دلاؤ، ترشولی! میں صلح و سلامتی کی ایسی راہ تلاش کرنے کی کوشش کر رہا ہوں، جو تمہارے اور سکندر کے لیے نا قابلِ قبول ہو۔ تم انتقام کی آگ میں جلنے، جھلسنے سے بچ جاؤ اور سکندر خوف و تردد کی زندگی گزارنے سے محفوظ ہو جائے۔“

”تمہیں ایسا کوئی راستہ نہیں ملے گا۔“ فضیلہ نے بندریا کی طرح خوخیاتے ہوئے کہا۔

”کیونکہ میں انتقام سے کم پر راضی نہیں ہوں گی۔“

”ایسی صورت میں مجبور ہو کر سکندر ہی کے نہیں، انسانیت کے تحفظ کی خاطر مجھے انتہائی قدم اٹھانا پڑے گا۔ میں تمہیں بوتل میں بند کر کے سمندر میں پھینک دوں گا۔“

”یہ گیدڑ بھبکیاں کسی اور کو دینا، ملا جی!“ فضیلہ نے کہا۔ ”تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں اکیلی نہیں ہوں اگر تمہیں اپنے بیوی بچے عزیز ہیں تو تم ایسا ہرگز نہیں کر سکتے۔“

”اور تم بھی اچھی طرح جانتی ہو کہ جس وقت میں نے خلقِ خدا کی خدمت کا بیڑا اُٹھایا تھا۔ اپنے شیخ اعلیٰ مقام سے عہد کیا تھا، اپنے فرض کی راہ میں دنیا کی محبت کو حائل نہیں ہونے دوں گا۔ یوں بھی میں نے بہنوں، بچوں کی حفاظت کا پہلے ہی انتظام کر رکھا ہے۔ اب بتاؤ، سکندر کا پیچھا چھوڑنے کے لیے تیار ہو یا نہیں؟ فضول بحث میں میرا اور اپنا وقت برباد مت کرو۔ اپنی وہ شرائط بتاؤ، جو ہمارے لیے قابلِ عمل ہوں۔“

”صرف ایک شرط ہے، سکندر ہنسی خوشی فضیلہ کے بطن سے پیدا ہونے والی اپنی پہلوٹھی کی اولاد کو، جب اس کی عمر سات سال ہو، میرے حوالے کر دے۔“

”یہ ناممکن ہے۔“ میں نے تڑپ کر کہا۔

”خاموش بیٹھے رہو۔“ جیلانی نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا، پھر فضیلہ کی طرف چہرہ کیا۔ ”میں

نے قابلِ عمل شرائط پوچھی ہیں۔ تم نے جو شرط بتائی ہے، اس پر سنگدل سے سنگدل انسان بھی عمل نہیں کر سکتا۔“

”ہتھیلی پر سرسوں جمانا چاہتے ہو، ملا جی؟“ فضیلہ طنزیہ انداز میں ہنس پڑی۔ ”کم از کم تین دن کی مہلت دو تو اچھی طرح سوچ بچار کر کے کوئی ایسی شرط بتا سکتی ہوں، جو تم سب کے لیے قابلِ عمل ہوگی۔“

”مہلت کے بہانے آزاد ہونا چاہتی ہو؟ مچھلی کے بچے کو غوطہ دینے کی کوشش کر رہی ہو؟ خوب اچھی طرح سمجھ لو، ترشولی! تمہیں اس وقت تک رہائی نہیں مل سکتی، جب ہم لوگ کسی آخری نتیجے پر نہ پہنچ جائیں۔“

”چاہے پورا سال کیوں نہ لگ جائے؟“

”اگر تم ضدی ہو تو میں بھی ضد میں کسی سے کم نہیں ہوں۔ جب تک فیصلہ نہیں ہوگا، تم میری قید میں رہو گی اور چوبیس گھنٹوں میں تیئیس گھنٹوں تک تمہارے جسم پر آگ کے کوڑے پڑتے رہیں گے۔ تمہارا کوئی دوست، کوئی ہمدرد تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکے گا۔“

”بڑے ظالم ہو، ملا جی!“ فضیلہ نے اس طرح اِٹھلا کر کہا جیسے ڈاکٹر کا مذاق اُڑا رہی ہو۔ ”پھر تو مجھے تمہاری بات ابھی ماننا پڑے گی۔“

جیلانی نے فخریہ انداز میں کہا۔ ”یقیناً۔“

”ڈاکٹر صاحب!“ اچانک مطب والے حصے سے کسی کی گھبرائی ہوئی آواز آئی۔ ”اپنے گھر کی خبر لیجیے۔ کسی نے اس میں آگ لگا دی ہے۔ سب کچھ جل کر راکھ ہوئے جا رہا ہے۔“

جیلانی تیزی سے باہر بھاگا۔ گھبراہٹ اور وحشت کے باعث جوتے تک پہننا بھول گیا۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔

آیا ڈاکٹر کی مدد کے لیے اس کے پیچھے جاؤں، یا وہیں فضیلہ کے پاس بیٹھ کر اس کی آمد کا انتظار کروں۔ فضیلہ کو چھوڑنا کسی طرح بھی مناسب نہیں تھا۔ پھر بھی کمرے سے نکل کر مطب کے دروازے تک گیا۔ جیلانی ننگے پاؤں تپتی ہوئی زمین پر تنہا اپنے گھر کی طرف دوڑا چلا جا رہا تھا۔ اطلاع دینے والا اطلاع دیتے ہی آگ بجھانے کے لیے ڈاکٹر سے پہلے ہی واپس بھاگ گیا تھا۔

میں دل ہی دل میں سلامتی کی دعا کرتا ہوا فضیلہ کے پاس پلٹ آیا، جو فرش پر گہری سوچ میں بیٹھی تھی۔ آہٹ پر اس نے اپنا سر اوپر اٹھایا، میری طرف دیکھا، پھر درد بھری آواز میں بولی۔

”مجھے افسوس ہے، سکندر! ڈاکٹر کو مجھ سے نہیں، تم سے بغض ہے۔ وہ اپنی من مانی کرنے کے لیے عرصۂ دراز تک تمہیں فضیلہ سے دور رکھنا چاہتا ہے۔“

جس وقت جیلانی نے فضیلہ سے کہا تھا کہ جب تک فیصلہ نہیں ہوگا، وہ اس کی قید میں رہے

گی، میری حالت اسی وقت سے غیر ہو گئی تھی۔ فضیلہ کے جملے نے جلتی پر تیل کا کام کیا، منہ سے سرد آہ نکل گئی۔

فضیلہ نے کہا۔

''راج کنڈل سے رخصت ہوتے وقت میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ تم سے رابطہ نہیں رکھوں گی، مگر داڑھی کی آڑ میں شکار کھیلنے والے ڈاکٹر نے اپنے جادوئی عمل سے مجھے یہاں کھینچ کر بلا لیا۔ صرف اس لیے کہ وہ اس بہانے سے تمہاری فضیلہ کو حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس کی نیت میں کھوٹ ہے۔ اس نے جب سے فضیلہ کو دیکھا ہے، اس پر مرتا ہے۔ اگر تم اخبارات پڑھتے رہے ہو تو یقیناً جانتے ہو گے کہ جادو ٹونے اور جھاڑ پھونک کا کاروبار کرنے والے لوگ اکثر بڑے رنگین مزاج ہوتے ہیں۔''

میں نے دوبارہ سرد آہ بھری۔

''سکندر!'' فضیلہ کی تقریر جاری رہی۔ ''عزت و آبرو سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ہے۔ مجھے آزاد کر دو۔ اور جتنی جلدی ممکن ہو سکے، اپنی فضیلہ کو لے کر یہاں سے نکل جاؤ۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ ساری زندگی احسان مند رہوں گی۔ اور اب تک جو ہوا، سو ہوا۔ آئندہ تمہیں کبھی تنگ نہیں کروں گی۔''

میں نے کھنکار کر اپنا گلا صاف کیا۔ ''میں تمہیں کیسے آزاد کرا سکتا ہوں؟''

''اس حصار کو توڑ کر، جس نے مجھے محبوس کر رکھا ہے۔'' وہ بولی۔ ''تمہیں صرف اتنا کرنا ہو گا کہ میرے پاس آؤ اور اپنی گود میں مجھے اٹھا کر اس کمرے سے باہر نکل جاؤ۔ حصار ٹوٹ جائے گا۔ اس سے پہلے کہ ڈاکٹر کے ہاتھوں تمہیں کوئی ناقابلِ تلافی نقصان پہنچے، تمہیں تمہاری فضیلہ صحیح و سلامت مل جائے گی۔ اور میں دوبارہ کبھی تمہارے پاس نہ آنے کے لیے آزاد ہو کر اپنے بھائی کے پاس چلی جاؤں گی، جو میری محبت میں دیوانہ ہو رہا ہے۔''

''اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ جو کچھ تم کہہ رہی ہو، وہ بالکل درست ہے؟'' میں نے پوچھا۔ حقیقت یہ ہے کہ مجھے ثبوت کی نہیں فضیلہ کی ضرورت تھی۔ میں اسے عرصۂ دراز تک ڈاکٹر جیلانی کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا کہ میں نے کسی سے وعدہ کیا ہو اور بعد میں اسے ایفاء نہ کیا ہو۔ وہ بولی۔

''لاکھوں برائیاں ہوں، لیکن ہماری اس خوبی سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہم روحیں وعدہ نبھانا جانتی ہیں۔ چاہے دنیا اِدھر کی اُدھر کیوں نہ ہو جائے، ہمیں اپنی زبان کا پاس رہتا ہے۔''

میں اس کی طرف بڑھتے بڑھتے رک گیا۔ ''جیلانی تو کہہ رہے تھے کہ تم جن ہو؟''

''جن، چڑیل، بھوت، جس نام سے چاہو پکارو، میری ذات پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ غیر

ضروری باتوں میں وقت برباد مت کرو۔ ڈاکٹر کے آنے سے پہلے پہلے مجھے آزاد کر دو اور اپنی فضیلہ کو بے عزت ہونے سے بچا لو۔ فضیلہ کی بے عزتی تمہاری بے عزتی ہے۔ سکندر! ڈاکٹر کچھ ہی دیر میں واپس آ جائے گا۔ اس کے سامنے تم بالکل بے دست و پا ہو کر رہ جاؤ گے۔''

میرے اور فضیلہ کے درمیان بظاہر ایسی کوئی رکاوٹ نہیں تھی، جسے حصار کا نام دیا جاتا۔ لیکن میں جونہی فضیلہ کے پاس پہنچا، ایسا معلوم ہوا جیسے کسی لوہار کی دہکتی ہوئی بھٹی میں آ گیا ہوں۔ فضیلہ تپتے ہوئے لوہے کی طرح گرم تھی۔ بار جھلسنے لگے۔ اس وقت احساس ہو چکا تھا، جب ذہنی ہسپتال سے واپس آنے کے بعد پہلی بار فضیلہ سے تنہائی میں ملاقات ہوئی تھی۔ لیکن ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی ناقابلِ برداشت تپش پر میری محبت غالب آ گئی۔ میں نے گردن اور پشت کے نچلے حصے پر ہاتھ ڈال کر فضیلہ کو گود میں اُٹھا کر کمرے سے باہر جانے کے لیے قدم اُٹھانا شروع کر دیئے۔

چند ہی قدم اٹھائے ہوں گے کہ فضیلہ، گلاب کی پنکھڑی کی طرح ہلکی پھلکی ہو گئی۔ جسم کی تمازت جاتی رہی۔ ایک سرور آمیز خنکی کا احساس ہونے لگا۔

ٹھیک اسی وقت جب میں کمرے سے نکل کر مطب میں داخل ہو رہا تھا اور فضیلہ ہوش میں آ کر مجھ سے کچھ اور چمٹ گئی تھی، جیلانی وہاں پہنچ گیا۔ فضیلہ کو میری گود میں دیکھ کر ایک ثانیے کے لئے اُس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا۔

''تم نے میرے سارے کیے کرائے پر پانی پھیر دیا۔'' وہ بولا۔ ''اب اس منحوس کو عرصہ دراز تک قابو میں نہیں کیا جا سکتا۔''

میں نے اطمینان سے فضیلہ کو گود سے اُتار کر موڑھے پر بٹھا دیا۔

''مجھے افسوس ہے کہ میں طویل عرصے تک فضیلہ سے دور نہیں رہ سکتا۔ جبکہ آپ کی گفتگو سے صاف صاف اندازہ ہو رہا ہے کہ آپ اسے ہفتوں یہیں رکھنا چاہتے ہیں۔''

فضیلہ کی آنکھوں میں نیند بھری تھی، جماہیاں آ رہی تھی، پھر بھی وہ کوشش کر رہی تھی کہ اس کی آنکھیں کھلی رہیں۔ ہمارے درمیان ہونے والی بات چیت کی آوازیں اس کے کان میں جاتی رہیں۔ جیلانی نے کہا۔

''ترشولی کا یہاں آ کر بچ نکلنا اچھا شگون نہیں ہے۔''

''فضیلہ نے لمبی سی جماہی لی اور موڑھے کی پشت سے ٹیک لگا کر اظہار اطمینان کرتی ہوئی بولی۔ ''ترشولی یہاں آئی تھی؟''

ڈاکٹر، میز کے پاس پڑی ہوئی اس کرسی پر جا بیٹھا، جہاں بیٹھ کر وہ مریضوں کا معائنہ کیا کرتا

تھا۔اس کے چہرے سے بیک وقت غم و غصے دونوں کا اظہار ہو رہا تھا۔

"جیلانی صاحب!" میں نے کہا۔ "آپ کی خفگی سر آنکھوں پر، مگر میں چاہتا ہوں کہ چند باتوں کی وضاحت کر دوں۔"

"کسی وضاحت کی ضرورت نہیں۔ وہ چالباز مجھ جیسے تجربہ کار اور جہاں دیدہ انسان کو دھوکا دے سکتی ہے تو اس کے سامنے تم ایک طفلِ مکتب سے زیادہ نہیں ہو۔ غلطی میری ہے کہ میں نے سے نکل جانے کا موقع فراہم کیا۔"

"فضیلہ نے "اونہہ" کہہ کر آنکھیں بند کر لیں۔ اس پر غنودگی طاری ہو رہی تھی اور ہماری باتیں اس کے لیے بالکل بے سروپا تھیں۔

"آپ نے موقع فراہم کیا؟" میں نے پوچھا۔

"میں بھول گیا تھا کہ بلا کبھی یکا و تنہا نہیں ہوتی۔ خاص طور پر اس وقت، جب کوئی بلا گرفتار ہو جائے تو دوسری بلائیں اسے آزاد کرانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتی ہیں۔ میرے مکان اور مطب دونوں میں اصحابِ کہف کے اسمائے گرامی چسپاں ہیں۔ جس مقام پر یہ بابرکت نام ہوں، وہاں آگ لگ سکتی ہے، نہ آسیب نقصان پہنچا سکتا ہے۔ میری حماقت اس سے زیادہ اور کیا ہوگی کہ چالباز ترشولی کے کسی چالباز ساتھی نے گھر میں آگ لگنے کی ہانک لگائی تو میں اندھا دھند بھاگ کھڑا ہوا۔ یہ نہ سوچا کہ اسمائے گرامی کی برکت سے مکان ہر قسم کی آفات و بلیات سے محفوظ ہے۔ یہ نہ خیال کیا کہ میری غیبت میں تمہیں چکمہ دے کر ترشولی کے لیے فرار ہو جانا آسان ہو جائے گا۔"

میں نے دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کیا کہ جیلانی نے مجھے برا بھلا کہنے کے بجائے سارا الزام اپنے سر پہ لے لیا۔

میں نے کہا۔

"وعدہ کر کے گئی ہے کہ آئندہ مجھے تنگ نہیں کرے گی۔"

"بکواس کرتی ہے۔ جسے گھر اُجاڑنے اور دل توڑنے میں لطف آتا ہو، وہ وعدہ توڑنے میں کیا عار کر سکتا ہے؟"

"یقین دلا رہی تھی کہ اِدھر کی دنیا اُدھر اور اُدھر کی دنیا اِدھر کیوں نہ ہو جائے، وہ اپنی زبان کا پاس کرے گی۔"

"زبان کا پاس صاحبِ کردار لوگ کیا کرتے ہیں۔ وہ ذلیل اور بے ایمان کیا کرے گی، جسے جب بھی موقع ملتا ہے، دو چار بے گناہ، بے قصور افراد کو ختم کر کے روپوش ہو جاتی ہے۔"

میں نے سرسری سی نظر فضیلہ پر ڈالی۔ وہ مونڈھے کی ٹیک لگائے آنکھیں بند کیے گہری نیند

رہی تھی۔

"ڈاکٹر صاحب!" میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ پوچھا۔ "کیا میں سمجھ لوں کہ خطرات کم نہیں ہوئے، کچھ اور بڑھ گئے ہیں؟"

ڈاکٹر نے اثبات میں سر ہلایا۔ "تمہی کو نہیں، ساری دنیا کو اس کے وجود سے خطرہ ہے۔ ترشولی تشدد پسند ہے۔ لوگوں کو قتل اور زخمی کر کے لطف اندوز ہوتی ہے۔ انسانی چیخیں، کراہیں اور سسکیاں اس کی دل پسند موسیقی ہیں۔ عورت ہونے کے باعث جہاں تک میں نے اندازہ لگایا ہے، اسے خوب صورت لڑکیوں سے خصوصی نسبت ہے۔ لڑکیاں خاص طور پر اس کے ظلم و ستم کا نشانہ بنتی ہیں۔ جبکہ نوجوان لڑکوں کو وہ اپنے بے ہودہ اغراض و مقاصد کے لیے استعمال کرتی ہے اور انہیں سمجھانے، رجھانے اور اُکسانے کے لیے ایک سے ایک بڑھ کر حسین اور پُرکشش روپ اختیار کر کے ان کے سامنے جاتی ہے اور بعد میں ان لڑکیوں کو بھی، جو اس کے حُسن کے جال میں پھنس جائیں، گاجر مولی کی طرح کاٹ کر آگے بڑھ جاتی ہے۔"

جیلانی نے کوئی نئی بات نہیں بتائی تھی سب کچھ مجھے معلوم تھا۔ ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس نے ترشولی کے کردار کی ایک ترتیب کے ساتھ تشریح کر کے میرے خیالات اور خدشات کی توثیق کر دی تھی۔

آخر کار ہم واپس پہنچ گئے۔

فضیلہ کی امی کو رات بھر ہمارے انتظار میں نیند نہیں آئی تھی۔ آوازیں سن کر گلی میں پہنچ گئیں۔

فضیلہ کو بعد میں گلے لگایا، پہلے مجھے سینے سے لگا کر پیار کیا۔

"بالکل ذرا سا منہ نکل آیا ہے میرے بچے کا۔"

پھر فضیلہ کو گلے لگاتے ہی اُچھل کر ایک طرف ہٹ گئیں۔ غلطی سے انہوں نے محبت کے جوش میں اس کے دائیں بازو کو بھینچ لیا تھا، جس کی وجہ سے اسپرنگ پھیل گیا تھا اور سانس کی مدد سے حرکت میں آنے والے ہاتھ کی دونوں آہنی اُنگلیاں ان کی اس حرکت سے ان کی پیٹھ میں پیوست ہو گئی تھیں۔

بھائی جان اور ابا جی سامان لے کر اندر جا چکے تھے۔ فضیلہ کے ابو اپنا ہولڈال سنبھالے میرے برابر کھڑے تھے۔ بیگم کو اچھلتے دیکھا تو قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔

"کیا سمجھیں؟" انہوں نے فضیلہ کی امی سے پوچھا۔

فضیلہ کی امی پیٹھ سہلا رہی تھیں اور حیرت زدہ نظروں سے فضیلہ کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ پشت میں چبھنے والی سخت چیزیں فضیلہ کی انگلیاں تھیں۔

"نہیں سمجھیں؟" فضیلہ کے ابو نے دوسرا قہقہہ لگایا، پھر سنجیدہ ہوتے ہوئے بولے۔ "بیٹی میری جیب میں لگا ہوا قلم ذرا اپنی امی کو تو دے دو۔"

"کیوں، میں قلم کا کیا کروں؟" فضیلہ کی امی کا اندر کا سانس اندر اور باہر کا باہر رہ گیا. انہوں نے فضیلہ کو اپنے بائیں ہاتھ سے قلم نکال کر دائیں ہاتھ سے اپنی طرف بڑھاتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

"میں....... مر گئی۔" وہ بولیں اور سر پکڑ کر وہیں بیٹھ گئیں۔

"کچھ عقل شریف میں آیا، یا نہیں؟" خان صاحب نے پوچھا۔

فضیلہ کی امی کی نظریں فضیلہ کے دائیں ہاتھ پر جمی ہوئی تھیں، جسے فضیلہ نے اپنے دوپٹے کے پلو سے ڈھانپ رکھا تھا۔

"فضیلہ کے ابو!" انہوں نے کپکپا کر کہا۔ "یہ تو صاف معجزہ ہو رہا ہے۔"

"معجزہ؟" ہنستے ہوئے خان صاحب اچانک ناراض ہو گئے۔ "تم عورتوں کی عقل گدی میں ہوتی ہے۔ نادان عورت! تمہیں یہ بھی نہیں معلوم کہ معجزے صرف اور صرف نبی ہی دکھا سکتے ہیں۔ اللہ کے ولی کرامت دکھاتے ہیں۔ اور......."

"کسی اللہ کے ولی کی کرامت ہے؟" فضیلہ کی امی نے پوچھا۔ "کسی اللہ کے ولی نے اپنی کرامت سے یہ معجزہ دکھایا ہے؟"

"پھر وہی حماقت؟" فضیلہ کے ابو بولے۔ حالانکہ یہی حماقت اسٹیشن پر خود ان سے سرزد ہوئی تھی۔

"تمہاری آنکھیں جو کچھ دیکھ رہی ہیں وہ معجزہ ہے نہ کرامت۔ اسے سائنس جاننے والے ایک ذہین سائنس دان کی ذہانت کہا جا سکتا ہے۔"

فضیلہ کی امی دونوں ہاتھوں سے اپنے پیٹ کو سنبھالتی ہوئی کھڑی ہو گئیں۔ "اللہ کے اس نیک بندے کا نام کیا ہے؟"

خان صاحب نے میری طرف دیکھا۔ "کیوں سکندر! کیا نام ہے اس کا؟"

"فہمید۔" میں نے بتایا۔ "ذہانت فہمید کی ہے اور محبت نوشابہ کی۔"

فضیلہ کی امی نے قریب جا کر ہاتھ کا معائنہ کیا۔ اسپرنگ دیکھ کر تھوڑی سی دلبرداشتہ ہوئیں لیکن جلد ہی انہیں احساس ہو گیا کہ اسپرنگ ہاتھ کا متبادل ہے۔ شہر کا شاید ہی کوئی ڈاکٹر بچا ہو جس کے پاس وہ فضیلہ کو لے کر نہ گئی ہوں۔ سب نے ایک ہی بات کہی تھی کہ فضیلہ کو ہمیشہ ہاتھ کے بغیر ہی زندگی گزارنا پڑے گی۔ کندھے پر اگر ایک انچ بھی باہر ہڈی نکلی ہوتی تو شاید کوئی ایسا مصنوعی ہاتھ لگا دیا جاتا جو حرکت تو نہ کرتا تاہم جسم کی بدنمائی کو بڑی حد تک دور کر دیتا۔ مگر فہمید کی ذہانت اور نوشابہ کی محبت سے فضیلہ کو ایسا ہاتھ حاصل ہو گیا جس نے بدنمائی کو ہی دور نہیں کیا تھا بلکہ حرکت بھی کر سکتا تھا اور بیس پچیس سیر کا وزن بھی اٹھا سکتا تھا۔

فضیلہ نے کہا۔

"امی! آپ اندازہ نہیں لگا سکتیں کہ میں کتنی خوش ہوں۔ ایک ایسی لڑکی نے، جس سے ہماری کوئی زیادہ جان پہچان نہیں تھی، ہم پر اتنا بڑا احسان کیا ہے جس کا ہم بدلہ نہیں اتار سکتے۔ پہلی بار اسے دیکھا تو یقین کیجیے امی! ایسا لگا، جیسے وہ میری چھوٹی بہن ہو، جو بچپن ہی میں بچھڑ گئی ہو اور عرصۂ دراز کے بعد اچانک اس چھوٹے سے جزیرے میں اس سے ملاقات ہو گئی ہو۔ اور پھر ریلوے اسٹیشن پر وہ رحمت کا فرشتہ بن کر مل گئی۔ میں نامکمل تھی، اس نے مجھے مکمل کر دیا۔ کبھی کبھی تو مجھے اپنی مجبوری کا احساس ہوتا تھا تو دل مسوس کر رہ جاتی تھی۔ خودکشی کر کے حرام موت مر

جانے کے بارے میں سوچنے لگتی تھی۔ اللہ! اس دنیا میں ایسے لوگ بھی پائے جاتے ہیں۔"

"دنیا ایسے ہی لوگوں کے دم قدم سے باقی ہے، بیٹی!" فضیلہ کی امی نے اس کی پیشانی کو بوسہ دیا۔ "اب جاؤ، آرام کرو۔ صبح کو تم دونوں آنا۔ اس وقت دل کھول کر باتیں ہوں گی۔"

"صرف فضیلہ آئے گی۔ میں نہیں آسکوں گا۔" میں نے کہا۔ "میری قسمت میں تو دشت نوردی ہے۔ صبح کو کالج میں پھر سے پڑھنے جاؤں گا اور دوپہر کو اسکول میں پڑھانے کے لیے۔ شام کو ملاقات ہوگی۔"

"جہاں اتنی چھٹیاں کی ہیں، ایک دن کی اور چھٹی کر لینا۔ سفر سے تھکے ہارے آئے ہو۔ نیند بھی پوری نہیں ہوئی ہے۔"

فضیلہ کے ابو بولے۔ "یہیں پر کھڑی کھڑی صبح کر لینا۔ نہ خود سونا، نہ بیٹی داماد کو سونے دینا۔ میں گھر جا رہا ہوں۔ کچھ دیر اور کھڑا رہا تو یہیں ڈھیر ہو جاؤں گا۔"

"ٹھہرو، میں بھی چل رہی ہوں۔"

انہوں نے باری باری پہلے میری اور فضیلہ کی بلائیں لیں۔ فضیلہ کو دودھوں نہاؤ، پوتوں پھلو کی دعائیں دیتی ہوئی شوہر کو گھر کے اندر لے گئیں۔ لیکن گھر میں جا کر بھی انہیں چین نہیں آیا۔ دیوار کے پاس آکر بولیں۔ "کسی چیز کی ضرورت ہو تو تکلف سے کام مت لینا۔ فوراً مانگ لینا۔"

"اچھا امی!" فضیلہ نے منہ بنا کر جواب دیا۔

"میں نے تم سے کہا تھا کہ پابندی سے دودھ پیتی رہنا۔ عمل کر رہی ہو یا نہیں؟"

"کر رہی ہوں امی!" اس نے صریح جھوٹ بولا تھا۔ کیونکہ نہ کبھی اس نے دودھ پیا تھا، نہ ہی اسے ماں کی ہدایت یاد تھی۔ یاد بھی کیسے ہوتی۔ شادی کے وقت تو اس پر دیودھری سوار تھی۔

"سنو بیٹی!" دیوار کے دوسری طرف سے آواز آئی۔ "تمہارے گھر میں پاؤڈر کا دودھ استعمال کیا جاتا ہے۔ وہ مت پینا۔ میں اذان کے وقت دیوار پر بھینس کے دودھ کی دیگچی رکھ دوں گی۔ سکندر سے کہنا کہ کرسی پر چڑھ کر دیگچی اتار لے۔"

"ٹھیک ہے امی!"

خدا خدا کر کے ان سے جان چھوٹی تو بھائی جان کا دوست، جسے گھر چھوڑ کر گئے تھے، مجھے پکڑ لیا۔

"سکندر!" اس نے کہا۔ "اباجی سے تو میں نے کچھ نہیں کہا، لیکن تمہیں بتائے دے ہوں، تمہارا گھر آسیب زدہ ہے۔ ایک منٹ بھی آنکھ نہیں لگی۔ ادھر آنکھیں بند کرتا تھا، ادھر معلوم ہوتا تھا، جیسے میرے قریب ہی کسی لڑکی کو ذبح کیا جا رہا ہو۔"

"نیا گھر ہو اور تنہائی بھی ہو تو کبھی کبھی ایسا ہی محسوس ہونے لگتا ہے، رفیق بھائی!" میں نے جواب دیا۔ "ہمارے آجانے کے بعد تنہائی دور ہو چکی ہے۔ اب کسی کے ذبح ہونے کی آواز نہیں سنائی دے گی۔ جائیے، آرام سے جا کر سو جائیے۔"

"اب کیا سوؤں گا؟ زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے کی رات رہ گئی ہے۔ دروازہ بند کر لو۔ میں اپنے گھر جا رہا ہوں۔"

باہر جا کر اس نے کہا۔ "اپنی بیوی کا خیال رکھنا۔"

"مجھے یا میری بیوی کو اب کچھ نہیں ہوگا۔" میں نے کہا اور اندر سے دروازہ بند کر لیا۔

اندر کمرے میں فضیلہ میری منتظر تھی۔ اس نے لباس تبدیل کر لیا تھا اور ہاتھ اتار کر احتیاط سے ایک طرف رکھ دیا تھا۔ میں لیٹ گیا اور اس کے سنہری بالوں سے کھیلنے لگا۔

"ابو امی کیا سوچتے ہوں گے؟" اس نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"ابو کے متعلق تو کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ہاں، امی نے تمہیں جو دودھوں نہاؤ، پوتوں پھلو کی دعائیں دی ہیں، اس کی روشنی میں صاف طور پر کہا جا سکتا ہے کہ وہ کیا سوچ رہی ہیں۔"

"ہشت۔" فضیلہ نے ہنس کر میرے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ "میرا یہ مطلب تھوڑی ہے؟ آپ تو ہمیشہ کچھ کا کچھ سمجھ لیتے ہیں۔"

"پھر کیا مطلب ہے؟"

"کیا میں واقعی رات کے وقت دیوار سے اتر کر آپ کے پاس آگئی تھی؟ پوری رات یہیں، اسی کمرے میں رہی تھی؟ کیا میں نے سچ مچ ابو امی سے کہہ دیا تھا، آپ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی؟"

"اب افسوس ہو رہا ہے؟"

"تعجب ہو رہا ہے۔ میں مر کیوں نہیں گئی؟ ابو نے مجھے گولی کیوں نہیں مار دی؟"

میں نے پیار سے اس کی چھوٹی سی ناک مروڑ دی۔

"ترشولی نے سچویشن ایسی شاندار بنا دی تھی کہ سب کے سب تمہیں میرے حوالے کرنے پر مجبور ہو گئے۔ حالانکہ ایک روز پہلے امی نے میری درخواست پر صاف انکار کر دیا تھا کہ ابھی تو فضیلہ بہت چھوٹی ہے۔ ابھی تو اس نے میٹرک بھی پاس نہیں کیا۔ ابھی شادی کیسے ہو سکتی ہے؟"

"اللہ......!" وہ لجانے لگی۔ آنکھیں خمار آلود ہو گئیں۔ چہرہ میرے سینے میں چھپا لیا۔

"چھوٹی تو بے شک ہو۔" میں نے اس کے چہرے کو اپنے چہرے کی طرف گھماتے ہوئے کہا۔ "لیکن اتنی ہی کھوٹی بھی ہو۔"

"آپ کون سے پارسا ہیں۔" اس نے اِٹھلا کر جواب دیا۔ "دنیا والوں کو دکھانے کے لیے ہروقت جوبھنو کرتے رہتے ہیں۔ جبکہ دل ہی دل میں......" وہ خاموش ہوگئی اور مسکرانے لگی۔

ایک ہفتہ بخیر وخوبی گزر گیا۔ اس دوران میں صبح سے شام تک کی غیر معمولی مصروفیات کے باوجود دو مرتبہ پروفیسر چراغ علی کے دولت خانے پر گیا۔ ایک مرتبہ اپنی شادی کی مٹھائی دینے کے بہانے اور دوسری مرتبہ فضیلہ کو ان سے ملوانے۔ ان دنوں فضیلہ پھر ایک ہاتھ کی رہ گئی تھی۔

فضیلہ کا ان دنوں باہر آنا جانا بالکل موقوف تھا۔ اسے پسند نہیں تھا کہ لوگ اس کی خالی لٹکتی ہوئی آستین کو دیکھ کر اس پر ترس کھائیں۔ مگر اسے پروفیسر چراغ علی سے اور ان کی بیگم سے ملوانا ضروری تھا۔ دونوں میاں بیوی اس سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ بیگم چراغ علی نے اسے پورا گھر دکھایا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ فضیلہ کو دیکھ کر ان دونوں کو بہت دکھ ہوا لیکن انہوں نے اس کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اس کے برعکس مبارک باد دی تھی کہ اس دور میں جب اچھی لڑکیوں کا قحط پڑا ہوا تھا، مجھے اتنی اچھی اور پیاری بیوی ملی تھی۔

بیگم چراغ علی نے یہ کہتے ہوئے کہ لڑکیوں کے ناک میں کیل نہ ہو تو ان کا چہرہ لڑکوں کی مانند بھدا اور سپاٹ سا معلوم ہوتا ہے، فضیلہ کی ناک میں ہیرے کے نگ والی کیل پہنا دی۔ میں نے رسمی سا احتجاج کیا تو مجھے ڈانٹ دیا۔

"تم چپ رہو۔ فضیلہ ہماری بہو ہے۔ ہمارا جو جی چاہے گا اسے اوڑھائیں گے، پہنائیں گے۔ تمہیں نکٹی بیوی پسند ہے تو گھر جا کر کیل اتار دینا۔"

میں ہنسنے لگا۔ سچ تو یہ ہے کہ فضیلہ کی سڈول ستواں اور چھوٹی سی ناک ہیرے کے نگ والی اس کیل سے کھل اٹھی تھی۔ فضیلہ کے حُسن میں چار چاند لگ گئے تھے۔

انہوں نے مجھے اور فضیلہ کو کھانا کھلائے بغیر واپس نہیں آنے دیا۔ اور جب ہم واپس جانے کے ارادے سے باہر نکلے تو ان کا ڈرائیور کار لیے ہمیں گھر پہنچانے کا منتظر تھا۔

پچھلے چھ سات دن سے فضیلہ کی طبیعت گری گری سی رہنے لگی تھی۔ چکر آتے تھے، متلی ہوتی تھی۔ بھائی جان سے ذکر کیا تو وہ کالج کی لیبارٹری میں ٹیسٹ کرنے کے لئے فضیلہ کا خون اور یورین لے گئے۔ ان کے بلانے پر جب آج ان کی خدمت میں پہنچا تو انہوں نے مبارک باد دیتے ہوئے مژدہ سنایا کہ فضیلہ اُمید سے ہے۔

میں نے فضیلہ سے کوئی غلط بات تو نہیں کی تھی۔ اس نے سمجھنے میں دیر لگائی تو میرا کیا قصور سمجھ گئی تو پورا ایک گھنٹہ لال بھبھوکا ہونے اور شرمانے کی نذر کر دیا۔ پھر اپنے واحد ہاتھ سے گھونسے مارتی ہوئی سینے سے لگ گئی۔

فضیلہ نے میٹرک کا امتحان اچھے نمبروں سے تو نہیں، لیکن جیسے تیسے پاس کر ہی لیا تھا۔ اُ

دنوں جب وہ امتحان دے رہی تھی، اللہ میاں نے اسے ایک ننھا منا بھائی بھی عطا فرما دیا۔ ہوبہو فضیلہ کی شکل کا تھا۔ اذان اقامت کہنے کے لیے ابا جی کی خدمات حاصل کی گئیں۔ انہوں نے ماشاءاللہ کہتے ہوئے نوزائیدہ بچے کو ہاتھوں میں اٹھالیا۔

"ارے بھابی! یہ تو ہماری فضیلہ ہے۔ سکڑ کر اتنی سی کیسے ہوگئی؟"

ولادت کے وقت خان صاحب دکان پر گئے ہوئے تھے اور فضیلہ امتحان دینے۔ میں نے کالج سے چھٹی لی تھی۔ فضیلہ کو اس کے امتحانی سنٹر تک چھوڑنے گیا۔ چھوڑ کر واپس آیا تو خوشخبری سننے کو ملی۔ خان صاحب کا گھر پڑوس کی عورتوں سے بھرا ہوا تھا۔ عورتیں خوش کم تھیں، متحیر زیادہ تھیں۔ مجھے ہاتھوں ہاتھ زچہ بچہ کے کمرے میں لے جایا گیا۔ ابا جی اس وقت اذان اور اقامت سے فارغ ہوئے تھے اور کھجور چبا کر اس کا رس بچے کو چٹا رہے تھے۔

"اپنے سالے کو غور سے دیکھو، سکندر!" ابا جی نے ہنستے ہوئے کہا۔ "میں تو دھوکا کھا گیا تھا۔ یہ خان زادہ اپنی فضیلہ کا پاکٹ ایڈیشن ہے یا نہیں؟"

میٹرک کا رزلٹ آنے کے تقریباً تین ماہ بعد جب کہ میں بی۔اے پارٹ ون کے پیپرز دے رہا تھا، بی فضیلہ ایک عدد پیاری سی بچی کی امی جان بن گئیں۔ اذان و اقامت کے فرائض خان صاحب نے انجام دیئے۔ اس وقت تک ان کے صاحبزادے اٹھ کر بیٹھنے لگے تھے اور ہاتھ میں آئی ہوئی ہر چیز کو پھینک کر اس کی آواز سننے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ رونا تو انہیں پیدائشی آتا تھا، اب کھلکھلانا بھی آگیا تھا۔ ہنسنے کا انداز وہی فضیلہ والا تھا۔ نچلا ہونٹ قدرے نیچے لٹک جاتا۔ دونوں ہونٹوں کے گوشے چاہ زنخدان بناتے ہوئے پھیل جاتے۔ خان صاحب نے اس کا نام فیصل رکھا تھا۔ جبکہ ابا جان نے میری بیٹی کا نام رخسانہ رکھا تھا۔

ہم انسان بھی خوب ہیں۔ پریشانی آتی ہے تو سمجھنے لگتے ہیں گویا زندگی میں ہمیشہ پریشان ہی رہے۔ خوشیاں آئیں بھی تو پل بھر کے لیے آئیں۔ اتنی دیر بھی نہیں ٹھہریں جتنی دیر جاڑوں میں آنگن کی دھوپ ٹھہرتی ہے۔ خوشی آتی ہے تو بھول جاتے ہیں کہ کبھی پریشان بھی ہوئے تھے۔ کوئی پریشانی یاد آتی ہے تو اس کا ثبات اتنا بھی نہیں ہوتا جتنا پلک جھپکنے میں ہوتا ہے۔ کم و بیش یہی معاملہ ترشولی کے سلسلے میں ہوا۔

ڈاکٹر جیلانی کے روحانی نسخوں کی بدولت اس سے نجات ملی تو بھول گیا کہ بچپن سے جوانی تک اس نے مجھے تنگ کرنے اور خون کے آنسو رلانے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا تھا۔ اس خون آشام بلا سے نجات حاصل کیے پورا ایک سال بھی نہیں ہوا تھا، پھر بھی ایسا محسوس ہوتا تھا، جیسے بہت بہت دنوں پہلے ایک بھیانک خواب دیکھا تھا۔ اور خواب بھی نہ کچھ زیادہ طویل تھا، نہ اس کا اثر دیرپا تھا۔

اس دن لڑکیاں لہک لہک کر زچہ گیریاں گا رہی تھیں اور فلک شگاف قہقہے لگا رہی تھیں۔ جب امی جان زندہ تھیں اور پڑوس میں ہونے والی کسی ولادت پر لڑکیوں کو زچہ گیریاں گاتے ہوئے سنتی تھیں تو بہت ناک بھوں چڑھاتی تھیں۔ کہتی تھیں۔ "توبہ، توبہ! کتنا خراب زمانہ آ گیا ہے۔ لڑکیاں اتنے گندے گانے گا رہی ہیں۔ ہمارے زمانے میں تو ڈومنیاں اور بھانڈ ایسے گانے گاتے تھے۔"

بھائی جان کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات دیکھ کر میں نے بھی خیال کیا کہ انہیں امی جان کی باتیں یاد آ رہی ہیں۔

"میں نے تو منع کیا تھا، بھائی جان!" میں نے صفائی پیش کی۔ "مگر ابا جی کے سامنے ایک نہیں چلی۔ کہنے لگے، خوشی کے مواقع بار بار نہیں آتے۔ میں تم سے زیادہ تمہاری ماں کو جانتا ہوں۔ اللہ بخشے آج زندہ ہوتی تو ڈھولک لیے خود بھی لڑکیوں کے ساتھ گا رہی ہوتی۔"

"سکندر بھائی! یہ مت سمجھنا کہ تمہاری خوشی میں میری خوشی نہیں ہے۔" دیکھتے ہی دیکھتے ان کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ "کس طرح ممکن ہے کہ ہماری برسوں کی بچھڑی ہوئی رخسانہ آئے اور مجھے خوشی نہ ہو۔ مجھے تو اتنی خوشی ہے، اتنی خوشی ہے......" انہوں نے میرے کندھے پر سر رکھ لیا اور ہچکی لے کر جملہ مکمل کیا۔ "اتنی خوشی ہے کہ بیان نہیں کر سکتا۔"

رخسانہ کے تصور پر میری آنکھیں بھی بھر آئیں۔ میں اپنی بیٹی کو کتنا ہی رخسانہ، رخسانہ کہتا۔ وہ اس بہن کا نعم البدل تو نہیں ہو سکتی تھی، جسے موت کے بے رحم ہاتھوں نے ہم سے چھین لیا تھا۔ وہ اور فضیلہ دونوں ہم عمر تھیں۔ آج وہ فضیلہ جتنی بڑی ہوتی اور گھر کے ہر حصے میں اس کے قہقہے گونج رہے ہوتے۔

"بھائی جان!" میں نے انہیں دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔ "بھائی جان! ہم قدرت کے سامنے مجبور اور لاچار ہیں۔ اللہ کو یہی منظور تھا۔"

بھائی جان سسکنا بھول گئے۔ تڑپ کر بولے۔ "اللہ کو بیچ میں کیوں لائے؟ قصوروار میں ہوں۔ جرم میرا ہے۔ میں گناہ گار ہوں۔ مجھ سے اتنا بڑا گناہ سرزد ہوا ہے، جس کی تلافی کبھی نہیں ہو سکتی۔"

میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ بھائی جان پتہ نہیں کیا کہہ رہے تھے۔

اسی دوران لڑکیوں کے ساتھ گاتی ہوئی نورین کی آواز گونجی۔

"تم جیو ہزاروں سال...... ہاں، ہاں، اے رخسانہ! تم جیو ہزاروں سال۔"

"یہ...... یہ کیسی آواز سن رہے ہو؟" بھائی جان نے مجھ سے کہا۔

"بھابی کی آواز ہے، بھائی جان! نورین بھابی کی۔" میں نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔

"نہیں......" وہ چیخ پڑے۔ "یہ نورین نہیں ہے۔ اُس دھوکے باز، فریبی اور مکار عورت کی آواز ہے، جو پولیس سے مقابلہ کرتی ہوئی ماری گئی تھی۔"

حیرت سے میری آنکھیں پھیل گئیں۔ بھائی جان سسکیاں بھرنے لگے اور میرے سینے سے چمٹ گئے۔

"اس منحوس عورت کے بہکاوے میں آ کر میں نے نورین کو قتل کر دیا ہے، سکندر! میں نورین کا قاتل ہوں۔ جسے تم نورین سمجھ رہے ہو، وہ نورین کا جسم ہے، نورین نہیں ہے۔"

گھر میں خوشیاں منائی جا رہی تھیں۔ ابا جی اور خان صاحب مسجد میں فرائض اور سنن کی ادائیگی کے بعد شکرانے کے نفل پڑھ رہے تھے اور باہر پنڈال میں ہم دونوں بھائی منہ بسورے بیٹھے تھے۔ ترشولی ایک بار پھر ایسا کاری وار کر گئی تھی، جس کا کوئی توڑ نہیں تھا۔

یہ بات کہ چڑیاں چگ گئیں کھیت تو پچھتانے سے کچھ نہیں ہوتا۔ کہاوت کی حد تک تو درست ہے، لیکن انسان کی نفسیات سے مطابقت نہیں رکھتی۔ کچھ ہو یا نہ ہو، پچھتاوا تو ہوتا ہی نقصان کے بعد ہے۔ نقصان سے پہلے کوئی نہیں پچھتاتا۔ اس وقت تو کھیت کو چڑیوں سے بچانے کی تدابیر کی جاتی ہیں۔

عاقل میں بھی نہیں ہوا تھا۔ نورین اور بھائی جان کو حسب معمول پیار بھری نوک جھوک کرتے دیکھ کر اگرچہ مجھے یقین ہو چکا تھا کہ وہ رانی کو بھول بھال چکے ہیں، پھر بھی میں نے اصحاب کہف کے متبرک نام نورین کے گھر اور بھائی جان کے ہوسٹل والے کمرے میں اس طرح چسپاں کر دیئے تھے کہ آئے گئے کی نظر نہ پڑنے پائے۔

صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا تھا، بلکہ صبح و شام کے معمولات کے بعد پابندی سے جن لوگوں کا تصور کر کے دم کیا کرتا تھا، ان میں بھائی جان اور نورین سرفہرست تھے۔ ان تدابیر کے باوجود ترشولی اپنا داؤ دکھا گئی تھی۔ تقریباً سال بھر پہلے کی ہاری ہوئی بازی کو جیتنے کے لیے اس کے پاس ترپ کا پتہ نکل آیا تھا۔

تھوڑی دیر پہلے میں نے کتنے فخر اور یقین کے ساتھ پروفیسر چراغ علی کو ترشولی سے محفوظ رہنے کا تیر بہ ہدف وظیفہ بتایا تھا۔ وظیفہ کتنا پُر اثر تھا، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا تھا کہ خود عامل کے، یعنی میرے کام بھی نہیں آ سکا تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ترشولی کی گندی اور ناپاک نظریں نورین کے جسم پر ہیں، میں نورین کو مرنے سے پہلے نہیں بچا سکا تھا۔

بھائی جان نے بالآخر رانی کو نئے روپ میں حاصل کرنے کے لیے نورین کو ختم ہی کر ڈالا اور اب ٹسوے بہا رہے تھے کہ ڈھول کی کھال بھی گئی۔ پھول نے نورین کے جسم کو اپناتے ہی ان سے یوں آنکھیں پھیر لی تھیں، جیسے کوئی جان پہچان ہی نہ ہو۔

بھائی جان سے شکوہ کرنا کہ انہوں نے نورین کا خون کیوں کیا، بعد از وقت تھا۔ سانپ نکل گیا تھا، لکیر چھوڑ گیا تھا۔ لکیر کو پیٹنا بے سود تھا اور بے فائدہ۔ رانی نے ان کے ذہن پر اتنا اثر چھوڑا تھا کہ وہ انتہائی قدم اٹھانے پر مجبور ہو گئے۔ رانی کو بھولنے کی ایک ہی ممکنہ صورت تھی کہ

محبت کی جس چاشنی سے اس نے بھائی جان کو اپنا بندہ بے دام بنایا تھا، کم و بیش ویسی ہی محبت انہیں نورین سے حاصل ہوتی۔ مگر یہ ناممکن تھا۔ نورین آزاد خیال تھی، تیز طرار تھی۔ بھائی جان کو دل و جان سے چاہتی تھی، ان کے اشاروں پر ناچتی اور کنایوں پر جان دیتی تھی۔ پھر بھی رانی کی طرح بدنفس اور بدکردار نہیں تھی۔ میں سمجھتا ہوں، یہی بات ہمارے وطن کی ہر لڑکی کے بارے میں کہی جا سکتی ہے۔ تیز اتنی کہ ستاروں پر کمند ڈالیں اور باکردار اتنی کہ حضرت مریم کی یاد تازہ کر دیں۔

بھائی جان نے، جیسا کہ حالات کے پیش نظر اندازہ لگایا جا سکتا ہے، نورین سے رانی والی محبت کی توقعات وابستہ کی ہوں گی۔ نورین کے مسلسل انکار پر انہیں رانی کی ضرورت محسوس ہوئی ہو گی۔ اس نے پولیس کی گولی کا نشانہ بننے سے پہلے بھائی جان کو ہموار کر لیا تھا کہ وہ نورین کو مار کر اپنی پسند کے جسم کا انتظام کریں گے۔ تقریباً وہ ایک سال تک نورین کو رام کرنے اور شیشے میں اتارنے کی کوشش کرتے رہے۔ صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تو یہ سوچ کر کہ نورین کی محبت پابند رسوم ہے، انہوں نے وہ قدم اٹھایا جس کا وعدہ وہ رانی سے کر چکے تھے۔ انہیں نورین کی موت کا غم اتنا زیادہ نہیں تھا، جتنا دکھ اس بات کا تھا کہ رانی نے ان کی ساری اُمیدوں اور آرزوؤں کو ٹھکرا کر سارے خواب کرچی کرچی کر دیئے تھے۔

دل ہی دل میں حالات اور واقعات کا سرسری سا تجزیہ کرنے کے بعد میں نے دبی زبان میں پوچھا۔

"یہ واقعہ کب پیش آیا؟"

میری طرح وہ بھی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ انہیں شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ عجلت و حماقت سے وہ سارا دودھ بہا چکے تھے۔ اور دوبارہ اسے سمیٹنے اور اکٹھے کرنے سے قاصر تھے۔ میرے سوال پر چونک اٹھے۔ پھر بھری بھری آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

"یہ اُس صبح کی بات ہے، جب ننھی رخسانہ دنیا میں آئی تھی۔"

"پوری بات بتایئے۔"

"تم کالج میں تھے۔ ہوسٹل میں فضیلہ کی امی کا فون موصول ہوا کہ شاید سکندر کے کالج کا فون خراب ہے۔ وہ تم سے رابطہ نہیں کر پا رہی تھیں۔ فضیلہ کی حالت ٹھیک نہیں ہے، اسے میٹرنٹی ہوم لے جا رہے ہیں، فوراً گھر آ جاؤ۔ یہاں پہنچا تو سب گھر جا چکے تھے۔ صرف ابا جی میرے منتظر تھے کہ میں آؤں تو وہ پیش امام صاحب سے تسہیل ولادت کے لیے گڑ پڑھوا کر لے جائیں۔ نورین خیر خبر معلوم کرنے اس وقت آئی، جب دونوں گھروں میں میرے علاوہ کوئی اور نہیں تھا۔ میں نے وقت کا پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ اس مکار اور دھوکے باز عورت کی، جس نے پولیس کی گولی کا

نشانہ بننے سے قبل مجھے کچھ ہدایات دی تھیں، باتیں یاد کر کے تمہارے کمرے میں تکیے کی مدد سے نورین کو سانس لینے سے روک دیا۔ کہا گیا تھا کہ سانس ڈوب جائے، دھڑکنیں رُک جائیں، نبض کا پتہ نہ چلے، نورین بے دم ہو کر بازوؤں میں جھولا جھولنے لگے اور پورا پورا یقین ہو جائے کہ اب اس میں کچھ بھی نہیں رہا تو بے جان جسم کو پلنگ پر ڈال کر چند منٹ کے لیے باہر چلا جاؤں۔ نہ خود اندر جاؤں نہ کسی دوسرے فرد کو اندر جانے دوں۔"

چند لمحوں کے لیے بھائی جان سانس لینے کے لیے رُکے۔ انہوں نے جو کچھ بتایا تھا، وہ میرے لیے نیا نہیں تھا۔ اس قسم کی ہدایات ترشولی نے مجھے بھی دی تھیں۔ میں تو بفضلِ خدا ان پر عمل پیرا نہیں ہو سکا تھا۔ شاید اسی لیے کہ نورین کی موت بھائی جان کے ہاتھوں لکھی تھی۔ انہوں نے اس کی پراسرار حرکتیں دیکھ کر اور چکنی چپڑی باتوں میں آ کر نورین کو، جو زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ سال بعد ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اُن کی ہونے والی تھی، گہری نیند سلا دیا تھا۔

"میں ساری زندگی اس بھیانک منظر کو نہیں بھول سکوں گا۔" بھائی جان نے پُر تاسف لہجے میں گفتگو کے سلسلے کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "میرے جسم پر رعشہ سا طاری تھا۔ نورین گرفت سے نکلنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ناک اور منہ بند ہونے کے باوجود اس کے سینے سے گڑگڑاہٹ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ بدن اس طرح اُچھل رہا تھا، گویا اُسے بجلی کے شاک دیئے جا رہے ہوں۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ موت کے خوف سے یا تو اُس کا پسینہ بہا تھا، یا کوئی اور بات تھی، کیونکہ فرش کا وہ حصہ، جہاں میں نے اُسے اپنی گرفت میں لیا تھا، پانی سے تربتر ہو گیا تھا۔ آہستہ آہستہ اس کی مزاحمت ختم ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ جیسا مجھ سے کہا گیا تھا، وہ میرے بازوؤں میں جھولنے لگی۔ میں نے گرفت ڈھیلی کی۔ نورین مچھلی کی طرح تڑپی۔ میں نے دوبارہ گرفت مضبوط کر لی۔ اس ایک لمحے میں نورین کے اندر دوبارہ طاقت آ گئی تھی۔ لیکن بالآخر وہ بے دم ہو گئی۔ میں نے نبضیں دیکھیں، دل کی حرکت کا اندازہ لگایا اور مطمئن ہو گیا کہ نورین ختم ہو چکی ہے تو اسے تمہارے پلنگ پر لٹایا۔ اس کی آنکھیں بند کیں جو پپوٹوں سے اُبلی ہوئی تھیں۔ سانس لینے کی کوشش کرتے ہوئے منہ کھلا رہ گیا تھا، اسے درست کیا اور خاموشی سے باہر کمرے کے دروازے پر کھڑا ہو گیا۔ دل کی عجیب حالت تھی۔ ضمیر کچوکے لگا رہا تھا۔ اُمید و بیم کی کیفیات عروج پر تھیں۔ ڈر لگ رہا تھا کہ نورین کے جسم میں دوسری روح داخل نہیں ہوئی تو کہیں کا نہیں رہوں گا۔ دنیا کی کوئی طاقت مجھے پھانسی کے تختے پر جانے سے نہیں روک سکے گی۔ ایک طرف نورین کی جواں مرگی کا دُکھ ہو رہا تھا، دوسری طرف عجیب عجیب سی، کبھی کبھی سی خوشی ہو رہی تھی کہ مکان وہی تھا۔ صرف مکین کی تبدیلی عمل میں آنے والی تھی۔ میں نے نورین کو ہمیشہ کے لیے نہیں کھویا تھا، بلکہ اسے زیادہ بہتر انداز میں پانے والا تھا۔

تقریباً چار منٹ کے صبر آزما انتظار کے بعد، جس میں مجھے کئی بار نزع جیسی کیفیت سے گزرنا پڑا تھا، چرچراہٹ کے ساتھ کمرے کا دروازہ کھلا۔

سوکھے دھانوں میں پانی پڑ گیا۔ چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ وہی نورین، جسے میں نے بڑی بے دردی سے قتل کر دیا تھا، نئی روح کو اپنے جسم میں سمو کر شرابیوں کی طرح جھومتی ہوئی اور لڑکھڑاتی ہوئی آ رہی تھیں۔

میں مسرت سے پھولا نہیں سمایا۔ دیوانہ وار بازو پھیلا کر اس کی طرف لپکا لیکن محبت کا جواب محبت سے دینے کے بجائے اس نے میرا ہاتھ جھٹک دیا۔ اس میں اتنی طاقت آ گئی تھی کہ میں اس کا وار نہیں سہہ سکا اور اوندھے منہ فرش پر گر پڑا۔

آنکھوں کے گرد رنگ برنگ ستارے جھلملانے لگے۔ جتنی دیر میں اُٹھ کر دوبارہ اُس کی طرف دوڑا، وہ گھر سے باہر گلی میں کھڑے ایک خالی رکشہ میں بیٹھ چکی تھی۔ میں آوازیں دیتا رہ گیا۔ رکشہ دیکھتے ہی دیکھتے ہوا ہو گیا۔

نورین کی کار، جس میں بیٹھ کر وہ فضیلہ کی خیر و عافیت معلوم کرنے آئی تھی، گلی کے موڑ پر جوں کی توں کھڑی تھی اور تب مجھے یاد آیا کہ وہ کار کیوں چھوڑ گئی تھی۔ دراصل نورین، نورین ہوتے ہوئے بھی نورین نہیں رہی تھی۔ نئی نورین ڈرائیونگ سے بالکل نابلد تھی۔ پھر میری سمجھ میں اس کی برہمی بھی آ گئی۔ میں نے اسے ایک سال تک فضا کی پہنائیوں میں بھٹکنے، ہجر و فراق کی تکلیفیں جھیلنے کا دکھ دیا تھا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ادھر وہ پولیس کی گولی کا نشانہ بنتی اور ادھر اسے نیا جسم فراہم کر دیا جاتا۔ وعدہ کرنے کے باوجود میں نے تساہل سے کام لیا تھا۔ اس کی خفگی بجا تھی۔ محبت کرنے والوں کے لیے ایک سال کا عرصہ صدیوں سے کم نہیں ہوتا۔ گویا میں نے اسے سینکڑوں سال تک اذیتوں پر اذیتیں دی تھیں۔

تم ان باتوں کو نہیں سمجھ سکو گے۔ یہ اس محبت کی باتیں تھیں، جس سے تم شادی شدہ ہوتے ہوئے بھی نا آشنا ہو۔ تمہیں نہیں معلوم، ستاروں کی جھلملاہٹ کسی وقت اچھی لگتی ہے اور کبھی وہی روشنی رگ و جان پر ہتھوڑے برسانا شروع کر دیتی ہے۔"

بھائی جان ایک بار پھر خاموش ہو گئے۔ لیکن ان کی خاموشی نے طول نہیں کھینچا۔ صرف لہجہ بدل گیا۔

"وہ دن ہے اور آج کا دن۔ نورین کا جسم اپنانے کے بعد ابھی تک اس نے مجھ سے سیدھے منہ بات نہیں کی۔ اور میں دو مرتبہ بے حیا بن کر اسے منانے کے لیے اس کے گھر گیا ہوں اور دونوں مرتبہ اس نے مجھ سے ملنے سے انکار کر دیا۔ آج شام عقیقے میں آئی۔ میں نے ملنا چاہا تو مہمانوں کی موجودگی میں صاف صاف کہہ دیا کہ وہ مجھے جانتی ہی نہیں۔ آنکھیں نکال کر بولی۔ آخر

تم ہو کون؟ خوانخواہ میرے پیچھے کیوں پڑے ہو؟ مجھ سے تمہارا کوئی رشتہ ناتا نہیں۔ سامنے سے ہٹ جاؤ۔ ورنہ میں تمہیں دھکا دے کر اندر چلی جاؤں گی۔ میں معذرت کرنا چاہتا تھا۔ اُسے یقین دلانا چاہتا تھا کہ رہین ستم روزگار ہونے کے باوجود اس کے خیال سے غافل نہیں رہا تھا کہ فضیلہ کی امی آ گئیں اور انہوں نے مجھے اگربتیاں لینے بازار بھیج دیا۔"

اس مرتبہ وہ خاموش ہوئے تو دیر تک گم سم بیٹھے رہے۔ گھر کے اندر سے گانے والیوں کی آوازیں آنا بند ہو گئی تھیں۔ گانے والی لڑکیاں ہنسی مذاق کی باتیں کرنے میں مصروف ہو گئی تھیں۔ پنڈال کے وہ بلب جو پڑوسیوں سے لی ہوئی بجلی سے جگمگ کر رہے تھے، بجھا دیے گئے تھے۔ صرف ایک بلب روشن تھا۔ بلب کے قریب متعدد کیڑے اکٹھے ہو گئے تھے۔ ایک چھپکلی اچھل اچھل کر ان پر حملے کر رہی تھی۔ بھائی جان دنیا و مافیہا سے بے نیاز تھے اور میری نظریں اس چھپکلی پر جمی ہوئی تھیں۔ اور میرے ذہن میں جیلانی کی باتیں گردش کر رہی تھیں۔ وہ کوئی پیشہ ور عامل کامل نہیں تھا۔ ایک چھوٹے سے دیہات میں بیٹھا دنیاوی لالچ اور طمع کے بغیر مخلوقِ خدا کی خدمت کر رہا تھا۔ لالچ ہوتا تو کبھی کا کسی بڑے شہر میں منتقل ہو کر اشتہارات کے ذریعے اپنی دکان چمکاتا، دونوں ہاتھوں سے ضرورت مندوں کو لوٹتا، بارونق علاقوں میں بنگلے اور کوٹھیاں تعمیر کراتا اور کم از کم تین بیویوں کا بلاشرکتِ غیرے شوہر ہوتا۔ مگر وہ لالچی نہیں تھا۔ حُبِ جاہ، حُبِ مال اور حُبِ دنیا کا شکار نہیں تھا۔ خود غرض اور دھوکے باز نہیں تھا۔ جھوٹ تو اس کے قریب سے ہو کر نہیں گزرا تھا۔ اس نے ترشولی اور دیگر ارضی و سماوی آفات و بلیات سے محفوظ رہنے کا جو طریقہ بتایا تھا، وہ بھلا کس طرح غلط ہو سکتا ہے؟

اندر سے اچانک نورین کے ہنسنے کی آواز آئی۔ دوسری لڑکیاں بھی اس کے ساتھ ہنس رہی تھیں۔ لیکن نورین کی آواز سب پر حاوی تھی۔

"میں نفرت کرتا ہوں اس آواز سے۔" بھائی جان نے بڑبڑا کر کہا۔ "اگر مجھے معلوم ہوتا کہ مجھے دھوکا دے کر نورین کے جسم پر قبضہ کیا جا رہا ہے تو اس دھوکے باز کی بات ہرگز نہ مانتا۔ معصوم نورین کے خون سے اپنے ہاتھ کبھی نہ رنگتا۔ دنیا مجھے قاتل سمجھے یا نہ۔ میں بہر حال قاتل ہوں۔ میں نے اس لڑکی کو قتل کیا ہے، جو دل و جان سے مجھے چاہتی تھی۔ میں اپنے آپ کو کبھی معاف نہیں کروں گا۔"

لڑکیوں نے دوبارہ اپنے ساز سنبھال لیے۔ تالیاں بجنے لگیں۔ ڈھولک پر تھاپ پڑنے لگی۔ گھنگھرو چھنچھنانے لگے اور کھلکھلاتی ہوئی لڑکیوں نے ایک عجیب سا گیت گانا شروع کر دیا تھا۔

"مجھے نفرت ہے ان قہقہوں سے، ان گیتوں سے، ان لڑکیوں سے۔" بھائی جان بولے۔

"میں ہوسٹل جانا چاہتا ہوں، سکندر!"

"اتنی رات گئے؟" میں نے کہا۔ "آپ تو کہہ رہے تھے، گیارہ بجے تک ہوسٹل کا گیٹ بند ہو جاتا ہے۔ اور اب تو ایک بجنے والا ہے۔"

"جب تک یہ آوازیں کانوں میں پڑتی رہیں گی، احساسِ گناہ کی شدت میں اضافہ ہوتا رہے گا۔ میں نورین کا قاتل ہوں۔ یہ آوازیں بار بار میرے غم کو تازہ کر رہی ہیں اور بار بار یاد دلا رہی ہیں کہ میں نے کتنا گھناؤنا جرم کیا ہے۔ افسوس تو یہ ہے کہ میں اپنے ضمیر کی ملامت دور کرنے کے لیے اپنے آپ کو پولیس کے حوالے بھی نہیں کر سکتا۔ نورین کے موجود ہوتے ہوئے کسے یقین آئے گا کہ میں اپنے ناپاک ہاتھوں سے اسے موت کے گھاٹ اتار چکا ہوں۔"

"بھائی جان!" میں نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "میں نہیں چاہتا کہ تصدیق کیے بغیر آپ کو اصل بات بتاؤں۔ لیکن آپ کی بے چینی اور پریشانی کو دیکھ کر یہ کہنے پر مجبور ہو گیا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے جن ہاتھوں کو مسیحائی کے لیے تخلیق کیا ہے، وہ کسی کی جان نہیں لے سکتے۔ نورین کل بھی زندہ تھی، آج بھی زندہ ہے اور کل بھی زندہ رہے گی۔ کسی چڑیل کی مجال نہیں کہ اس کے جسم کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھ سکے۔"

"کیا بک رہے ہو؟" انہوں نے بے اعتقادی سے کہا۔ مگر آنکھیں پُر اُمید انداز میں میرے چہرے پر جم گئیں۔

"ابھی تک میری ملاقات نورین سے نہیں ہوئی ہے۔ پھر بھی میں نے جو اصحابِ کہف کے بارے میں پڑھا ہے اور مدرسے کے اساتذہ کرام سے جو سنا ہے، اس کے پیشِ نظر پورے یقین اور اعتماد سے کہہ سکتا ہوں کہ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ نورین صحیح سلامت ہے۔"

"اگر صحیح سلامت ہے تو مجھ سے سیدھے منہ بات کیوں نہیں کرتی؟"

"یہ بھی ثبوت ہے اس بات کا کہ میں غلط بیانی نہیں کر رہا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ "آپ نے اس کا گلا گھونٹا اور آنکھیں باہر نکال دیں، اس کو بے دم کر دیا، بلکہ اس کو اپنی دانست میں قتل کر ڈالا۔ پھر بھی اس سے توقع کر رہے ہیں کہ وہ سیدھے منہ بات کرے؟ شریف لڑکی ہے کہ آپ کے وحشیانہ سلوک کے باوجود رخسانہ کے عقیقے میں شرکت کے لیے آ گئی۔ کوئی اور لڑکی ہوتی تو آپ کو ناکوں چنے چبوا دیتی۔ آپ کے خلاف اقدامِ قتل کا مقدمہ درج ہو چکا ہوتا۔ اور اس وقت آپ حوالات میں بند ہوتے۔ رہی یہ بات کہ جب وہ کمرے سے باہر نکلی تو لڑکھڑاتی ہوئی کار کے بجائے رکشہ میں بیٹھ کر تو دو گیارہ ہو گئی۔ تعجب ہے کہ ڈاکٹر ہونے کے باوجود آپ کو اصرار ہے کہ جانے والی نورین نہیں تھی۔ نورین ہوتی تو کار میں واپس جاتی، رکشہ میں نہیں۔ سوچئے کہ آپ نے اسے ڈرائیونگ کے قابل رہنے ہی کب دیا تھا۔ وہ نیم مُردہ ہو چکی تھی۔ ہاتھ

پاؤں قابو میں تھے، نہ ذہن۔ اور وہ آپ ہی کے کہنے کے مطابق شرابیوں کی طرح جھوم رہی تھی۔ کیا کوئی ایسا شرابی جو بہت زیادہ پیے ہوئے ہو اور جسے ایک کی جگہ چار چار چیزیں نظر آ رہی ہوں، وہ ڈرائیونگ کرنے کی حماقت کر سکتا ہے؟"

بھائی جان نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے بولے۔

"کیا وجہ ہے کہ اس دن کے بعد سے اس نے آج تک ڈرائیونگ نہیں کی؟"

"بہت سی وجوہات ہو سکتی ہیں۔" میں نے کہا۔ "جسمانی بھی اور نفسیاتی بھی۔ آپ ڈاکٹر ہیں، اس لیے بخوبی روشنی ڈال سکتے ہیں۔ میں تو صرف اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ دل ٹوٹ جائے تو ہر چیز زہر لگنے لگتی ہے۔ تفریح سے خوف آنے لگتا ہے۔ دلجمعی سے کوئی بھی کام نہیں ہو سکتا۔"

"پھر یہ کیا ہو رہا ہے؟" بھائی جان نے گھر کی طرف منہ کر کے پوچھا۔ اُن کا اشارہ قہقہوں بھرے اُس قوالی نما گیت کی طرف تھا، جسے لڑکیاں گلے پھاڑ پھاڑ کر گا رہی تھیں اور نورین سب میں پیش پیش تھی۔

"محبت کرنے والوں کا، ارے ہاں محبت کرنے والوں کا یہی انجام ہوتا ہے۔"

"میں نہیں جانتا کہ کیا ہو رہا ہے اور کیوں ہو رہا ہے۔" میں نے جھنجلا کر جواب دیا۔ حالانکہ جانتا تھا کہ اپنے غموں کو چھپانے کے لیے کچھ لوگ اسی قسم کی بے تکی حرکتیں کرنے لگتے ہیں۔

"اگر نورین زندہ ہے اور بظاہر ایسی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ تم نے اس کی زندگی کا جن تعویذات کے ذریعہ یقین دلایا ہے، انہیں غلط سمجھا جائے۔ تمہارے کہنے کے مطابق نورین زندہ ہے تو طب کی اصطلاح میں نورین کے قہقہوں کو اور گانوں کو اور زور زور سے بولنے کو ایک قسم کے ہسٹریا سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اس اسٹیج پر انسان زندگی سے فرار حاصل کرنے کے لیے زندگی کی طرف بھاگتا ہے، چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو ڈھونڈتا ہے۔ لیکن خوشیاں باہر نہیں، خود ہمارے اندر ہوتی ہیں۔ اندر تاریکی ہو تو بیرونی روشنیاں بے فائدہ ہوتی ہیں۔ مریض کو جو یہی احساس ہوتا ہے کہ وہ کتنی ہی کوشش کیوں نہ کرے، خوشیوں کو حاصل نہیں کر سکتا۔ نہاں خانۂ دل کی تاریکی میں روشنی کی ایک کرن بھی نہیں چمک سکتی، سوچتا ہے کہ ناکامی اُس کا مقدر بن چکی ہے۔ تو یا تو مایوس ہو کر پاگل ہو جاتا ہے یا خودکشی کر لیتا ہے۔"

"ڈاکٹر صاحب!" میں نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بھائی کو مخاطب کیا۔ "سنا ہے مرض کی صحیح تشخیص ہو جائے تو علاج کرنا مشکل نہیں رہتا۔ مرض بھی آپ کا، مریض بھی آپ کا۔ اور اب اس کا علاج بھی آپ ہی کو کرنا ہوگا۔"

وہ ہنسنے لگے۔ ہنستے ہوئے انہوں نے ڈاکٹروں والا گھسا پٹا فلمی مکالمہ دہرایا۔

"میں خدا نہیں ہوں، سکندر! لیکن بندہ اپنی سی کسر اٹھا نہیں رکھوں گا۔"

بھائی جان بھی ہنس رہے تھے، میں بھی ہنس رہا تھا۔ لیکن چور ہم دونوں ہی کے دل میں تھا۔ نورین ہنوز نورین ہی تھی، اس کا یقین مجھے آیا تھا، نہ بھائی جان کو۔ انہوں نے اپنے ہاتھوں سے اسے ختم کیا تھا، اس کی ڈوبی ہوئی نبضوں اور رکی ہوئی دھڑکنوں کو محسوس کیا تھا، بازوؤں میں لے کر پلنگ پر لٹایا تھا، کھلے ہوئے منہ اور پھٹی ہوئی آنکھوں کو بند کیا تھا۔ کس طرح ممکن تھا کہ نورین کو مارنے میں یا اسے مُردہ سمجھنے میں ان سے کوئی غلطی ہوئی ہو؟ کم و بیش یہی کیفیت میری بھی تھی۔

اصحابِ کہف کے پاک ناموں کی برکت و فضیلت کے بارے میں اگرچہ مدرسے میں اور ڈاکٹر جیلانی کی زبانی بہت کچھ سنا تھا۔ اور پروفیسر چراغ علی کے سلسلے میں ان ناموں کی برکت کا مشاہدہ بھی کر چکا تھا، پھر بھی ترشولی کے کرتوت یاد آتے تھے تو یہ احتمال ہوتا تھا کہ کہیں وہ بچ بچ نورین کے مُردہ جسم پر قابض تو نہیں ہے۔ کبھی کبھی تنہائی میں یہ احساس ہوتا تھا کہ میں نے کہاں سے اپنی زندگی کا آغاز کیا تھا اور کہاں پہنچ گیا تھا۔ اب تو یوں بھی لگتا تھا، جیسے میرا دین و ایمان، کچھ نہ رہ گیا ہو۔ زندگی اتنے بدترین حادثات کے ساتھ گزری تھی اور ایسے ایسے واقعات پیش آئے تھے کہ ایمان کا تصور ہی مٹ جاتا تھا۔

اس دن کسی کام سے ایک ایسے علاقے سے گزر رہا تھا، جہاں جانے کے لیے درمیان میں قبرستان پڑتا تھا۔ کوئی باقاعدہ راستہ نہیں تھا، دوسری طرف کے دروازے تک جانے کا۔ قبروں کے درمیان سے ہو کر گزرنا پڑتا تھا۔ ایک قبر کے درمیان سے ہی گزر رہا تھا کہ اچانک میرا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا۔ کسی نے پاؤں پکڑ لیا تھا۔ اور پھر یہ بھی نہ دیکھ سکا کہ پاؤں پکڑنے والے ہاتھ کیسے تھے؟........ مجھے پوری قوت سے گھسیٹا گیا۔ وہ ایک کھلی ہوئی قبر تھی اور مجھے قبر میں گھسیٹا جا رہا تھا۔ بہرحال انسان ہی تھا۔ میرے حلق سے ایک خوفناک دھاڑ نکل گئی اور میں نے بچاؤ، بچاؤ چیخنا شروع کر دیا۔

میرے ہوش و حواس میرا ساتھ چھوڑ گئے تھے اور بدن کئی جگہ سے چھل گیا تھا۔ بات صرف ایک قبر کی ہی نہ رہی، بلکہ مجھے یوں لگا، جیسے مجھے کسی سرنگ میں گھسیٹا جا رہا ہے۔ اس سرنگ میں بے پناہ گھٹن تھی اور شاید جھاڑ جھنکاڑ بھی اُگے ہوئے تھے........ تب مجھے اپنے جسم کے کھلے ہوئے حصوں پر شدید خراشیں آئیں۔ اور پھر کسی نے مجھے کسی اونچی جگہ سے چھوڑ دیا۔ بڑی زور سے نیچے گرا تھا۔ وحشت زدہ انداز میں اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

پھر جو کچھ میں نے دیکھا، اسے دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے........ میرے چاروں طرف سفید چغوں میں ملبوس بے شمار افراد کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ سامنے ہی ایک اسٹیج بنا ہوا تھا، جس پر ایک انتہائی بزرگ صورت شخص، جس کی داڑھی سینے تک لٹکی ہوئی تھی، بیٹھا ہوا تھا۔ اس

کے اطراف میں دو اور آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک نے کھڑے ہو کر کہا۔

''امیر المعظم! یہ ہے وہ شخص، جسے راستے سے بھٹکایا گیا ہے۔ ہم پہلے بھی آپ کے سامنے اس قسم کے مقدمات پیش کر چکے ہیں۔ بنیادی طور پر بد ارواح شیطان کے کہنے پر نیک لوگوں کو راستے سے بھٹکا کر نجانے کہاں سے کہاں پہنچا دیتی ہیں۔ امیر المعظم! اس شخص کے ساتھ بھی یہی ہوا ہے۔ یہ ایک معصوم لڑکا تھا، تعلیم حاصل کرتا تھا۔ ایک مرتبہ اپنے اسکول کے لوگوں کے ساتھ ایک سیاحت پر گیا اور اس نے وہاں ایک میوزیم کا سفر کیا۔ یہ میوزیم سکندر اعظم کے زمانے کا تھا اور اس میں سکندر اعظم کی باقیات موجود تھیں۔ اس کا نام بھی چونکہ سکندر تھا، چنانچہ کچھ غلط فہمیاں ہو گئیں اور اسے سکندر کے قدیم تخت پر لے جا کر بٹھا دیا گیا۔ اسے ایک مقدمے کا فیصلہ کرنا تھا۔ ایک بد باطن جادوگرنی، جو ترشول سنگھاسن کے حصول کے لیے جادو منتر کر رہی تھی، اس نے اس جادو کی تکمیل کے لیے سکندر اعظم کا تاج چوری کیا اور پکڑی گئی۔ اگر یہ سکندر اعظم کا تاج حاصل کر لیتی تو اسے ترشول سنگھاسن کے حصول کے لیے زیادہ محنت نہ کرنا پڑتی۔ لیکن یہ چوری کرتے ہوئے گرفتار ہو گئی اور اسے سکندر اعظم کے دربار میں پیش کر دیا گیا۔

امیر المعظم! اس وقت چونکہ یہ لڑکا سکندر نامی وہاں پر موجود تھا، اسی لیے اسے سکندر سمجھ کر تخت پر بٹھا دیا گیا اور اسی کے نام سے اس جادوگرنی کے ہاتھ کاٹنے کا فیصلہ کیا گیا۔ جادوگرنی کا ہاتھ کاٹ دیا گیا اور وہ اس کی جان کی دشمن ہو گئی۔ ترشولی نے اس کے پورے خاندان کو تباہ و برباد کر دیا اور اسے اتنا زچ کیا کہ اس سے اس کا ایمان تک چھین لیا گیا۔

میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں، امیر المعظم! کہ یہ تو بے گناہ تھا۔ اس کے ساتھ جو کچھ بھی ہوا، وہ جادو کا کرشمہ تھا اور ایک مسلمان کو، جبکہ اس کے دل میں ایسی کوئی چاہت بھی نہ ہو، جادو کے جال میں جکڑ کر تباہی کے آخری سرے تک پہنچا دیا جائے، اس کے خاندان کو، اس کے عزیز و اقارب کو فنا کر دیا جائے، یہ تو ایک غیر مناسب قدم ہے۔ میں یہی عرض کرنا چاہتا تھا۔''

''مجھے اعتراض ہے، امیر المعظم! یہ خود بھی تو صاحب عقل تھا۔ بے شک اس کی بہن کا باز کاٹ دیا گیا۔ ترشولی چاہتی تھی کہ کوئی ایسا مکمل بدن اسے مل جائے جس میں اس کے دونوں باز بھی ہوں اور وہ اس کے ذریعے ترشول سنگھاسن کے حصول کے لیے اپنا عمل پورا کر سکے۔ وہ انہ کوششوں میں مصروف تھی اور یہ نوجوان اس کی مدد کر رہا تھا۔''

''بالکل نہیں۔ اسے جادو کے جال میں جکڑ لیا گیا تھا اور اسے کافی نقصان پہنچایا گیا تھا۔''

دونوں میں وکیلوں کی طرح بحث ہونے لگی اور امیر المعظم ان کے دلائل سنتے رہے۔ پھر انہوا نے کہا۔

''نہیں، سب سے بڑا ظلم یہ ہے کہ ایک مسلمان سے اس کا ایمان چھین لیا جائے۔ جو

کردار اس کے اردگرد بکھرے ہوئے ہیں اور جنہوں نے اس کے ساتھ ظلم کیا ہے، انہیں سزا کے لیے طلب کر لیا جائے اور اسے آزادی دی جائے۔ یہی نہیں امیر المعظم! ایک بھرا پرا گھر تھا اس کا۔ اس نے اپنا سب کچھ کھو دیا ہے۔ ترشولی کو ترشول سنگھاسن کے حصول میں ناکامی ہوئی ہے۔ وہ مسلسل اپنی جادوگری سے اس پر تباہ کاری نازل کیے ہوئے ہے۔ اسے تحفظ بھی دیا جائے اور امیر المعظم! اس کا سب کچھ اسے واپس کیا جائے۔''

''اس پر غور کیا جا سکتا ہے، لیکن ترشولی اپنا عمل جاری رکھے گی۔''

''ترشولی کو گرفتار کر کے اسے سزا دی جائے۔''

''وہ ایک جادوگرنی ہے۔ اور وہ ترشول سنگھاسن کو حاصل کر کے اس دنیا کو اپنی برائیوں کا شکار بنانا چاہتی ہے۔''

''تب تو اسے فوراً ہی گرفتار کیا جائے۔''

اور جب ترشولی کو گرفتار کر کے زنجیروں میں جکڑ کر لایا گیا تو وہ بری طرح پھنکار رہی تھی۔ اس وقت اُس کی صورت اصلی صورت تھی۔ اُس کا بازو کٹا ہوا تھا اور وہ انتہائی بھیانک نظر آ رہی تھی۔ وہ چیختی چلاتی، غراتی چلی آ رہی تھی۔

امیر المعظم نے کہا۔

''ترشولی! تُو نے ایک بے گناہ نوجوان کو زندگی سے اتنے فاصلے پر کر دیا کہ اب اس کے لیے جینا بھی مشکل ہو گیا ہے۔''

''میں ترشول سنگھاسن حاصل کر کے رہوں گی......تم لوگ میرا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے۔''

''یہ تو ہر برے اعمال والے نے کہا ہے۔ اسے خاکستر کر دو۔'' امیر المعظم نے کہا اور کئی افراد مشعلیں لے کر ترشولی کی جانب گئے۔ پھر انہوں نے یہ مشعلیں ترشولی کے بدن کو دکھا دیں اور اس کی ہولناک چیخیں فضا میں گونجنے لگیں۔ اس کا پورا بدن شعلوں کے حصار میں آ گیا تھا اور وہ چیخ چلا رہی تھی۔ وہ لوگ اس کی زنجیریں پکڑے ہوئے تھے۔ ورنہ شاید ترشولی بھاگ بھی جاتی۔ اور پھر تھوڑی دیر کے بعد اس کا جسم خاکستر ہو گیا۔

میں خواب جیسے عالم میں یہ تمام چیزیں دیکھ رہا تھا۔ میری حسیات جواب دیتی جا رہی تھیں۔ اور پھر مجھ پر غشی سی طاری ہو گئی۔ اور میں بے سدھ ہو کر زمین پر گر پڑا۔

⊛

ہوش آیا تو زندگی کا یقین ہی نہ آیا۔ فوراً ہی خیال آیا کہ میں عالم بالا میں ہوں۔ آخر کار انجام ہو گیا تھا۔ لیکن اگر انجام ایسا ہے تو اس سے خوبصورت انجام اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ اگر انسان کو یہ پتہ چل جائے کہ مرنے کے بعد عالم بالا میں اُس کے وہ عزیز اسے

مل جائیں گے، جو اس سے بچھڑ گئے ہیں تو موت سے زیادہ خوشی کی کوئی چیز اس کے لیے نہیں ہو سکتی۔

میں بھی اپنی اس موت سے بے حد خوش ہو گیا تھا۔ کیونکہ مرنے کے بعد میں نے جو پہلی صورت دیکھی، وہ میری بہن رخسانہ کی تھی۔ وہ مجھ سے کچھ فاصلے پر کھڑی پیار بھری نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ جیسے ہی اُس نے مجھے آنکھیں کھولتے ہوئے دیکھا، ایک دم چیخی۔

"امی!........ بھائی جاگ گئے۔"

"امی!" میرے حلق سے سسکی نکل گئی۔ امی اور رخسانہ میرے پاس آ گئیں۔

"کیسے ہو جانی؟" امی نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔

"میں ٹھیک ہوں۔ آپ........" میں نے رخسانہ کو سینے میں سموتے ہوئے کہا۔

اتنے میں ابو ایک صاحب کے ساتھ اندر داخل ہو گئے۔ یہ شاید ڈاکٹر صاحب تھے۔ انہوں نے آ کر میرا معائنہ شروع کر دیا۔ تب میرا ماتھا ٹھنکا۔ ڈاکٹر صاحب؟........ یہ کیا؟

"فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ اب یہ بالکل ٹھیک ہیں۔ تھوڑی سی کمزوری ہے۔ دور ہو جائے گی۔ کھانے پینے کا پرہیز رکھا جائے۔"

کچھ دیر بعد ڈاکٹر صاحب چلے گئے تھے۔

"امی! یہ سب کیا ہے؟"

"بس بیٹے! اللہ کا فضل ہے۔ اب تم ٹھیک ہو۔ پتہ نہیں کس کمبخت نے جادو کرا دیا تھا۔ مگر اب کچھ اثر نہیں ہے۔"

میں پاگل ہوا جا رہا تھا۔ مجھ پر تو اتنا طویل وقت گزر گیا تھا۔ لیکن یہ لوگ اور حالات بتا رہے تھے کہ سب کچھ ایک خواب کی مانند تھا۔

لیکن........ خواب ایسے نہیں ہوتے کہ وقت کی طنابیں کھنچ جائیں۔ مجھے اُن بزرگوں کی عدالت یاد تھی جو یقیناً آتش زادے، یعنی جن تھے۔ اور جس میں میرے وکیل نے سفارش کی تھی کہ اس کا ماضی اسے دیا جائے۔ اور گزرے لمحات مٹا دیے جائیں۔ ان پر عمل وہی کر سکتے تھے۔ آپ ایسے کسی شخص کی خوشی کا اندازہ نہیں لگا سکتے، جس کا سب کچھ کھویا ہوا مل جائے۔ خدا کرے آپ کی زندگی میں بھی ایسی ہی خوشیاں بکھر جائیں۔ آمین!

(ختم شد)